

ذاتی بین الاقوامی شہزادوں کے لیے مہاراجہ اور املاک

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM  
خواتین کی دنیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING  
Section





کہنی مستنی  
ہمارے نام،  
محمود ریاض ۱۴  
شادہ خاتون ۲۹۲

۳۶ طائر لاہوتی رفعت سراج  
۲۶۸ شکستِ شب، قریدہ اشفاق



۱۴۰ چرائِ غجاں تمجے بچھے ہوئے ایم سلطانہ فخر  
۹۲ تاباں ہے بخت کا ستارہ عظمیٰ نازلی

۱۵ اے دور نگر کے بجا رہے ابنِ انشاء



میری ڈگری سے  
امت الصیو ۲۹۱

۲۲۸ اس کارِ محبت میں، رخ چودھری



باتیں نبیل سے  
شاہین رشید ۲۹۶



۵۸ ساٹباں کی ماطر، آسیہ رفاقی



رفعت ناسید سبجا  
۲۹ روبرو،

۱۴۶ نگہت عبد اللہ، یہ عجیب کسیل میں

۸۲ بندھن رکھا، نسیم امت

۱۳۰ سعیدہ بتول گورما، توازن

۱۵۶ ساثرہ یامین راؤ، یہ انداز تمہارا

۲۰۸ رعبنا حساب، موسموں کا

۲۲۲ عالیہ حسرا، موسم اک

۳۰۱ جوریہ جلیل سے ملاقات، شاہین رشید

۳۰۵ خیریں و بریں، ساثرہ غلام نبی

۳۱۱ آپ کے سوال، ذوالقصرین

جلد ۲۶ شماره ۱۱

اکتوبر ۱۹۹۷ء

قیمت ۳ روپے

READING  
Section

## محمود با بر فیصل کی یاد میں

- ۸ دردِ دل جو کبھی کم نہ ہوگا محمود خاؤں  
۲۳ ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ رابعہ بلال  
۱۱ آئی جو تیری یاد، شگفتہ سلیمان  
۱۷ کہنا کہ مسافر تو گیا، نجمہ جبین علیزئی



ایک رنگارنگ سلسلہ شگفتہ سلیمان ۲۸۷



آپ کی بیاض سے بلقیس بھٹی ۳۰۹



موسم کے پھول سائو غلام نجی ۳۱۲



نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان ۳۹



بیوی بکس کے مشورے امت الصبوح ۳۲۱

فون: ۷۷۲۶۶۷  
۷۷۲۷۷۷

پبلسر و ایڈیٹر آف دی بیاض، عمران محمود، ۷۷۲۶۶۷  
پرنٹنگ پریس، چیمپو کس شائع کیا  
مطلعہ اشاعت: ۱۹/۱۱/۹۱ علامہ اقبال ٹاؤن کراچی

READING  
Section



کہتے ہیں وقت سب سے بڑا امر ہے۔ گزرتا وقت گہرے زخم مندمل کر دیتا ہے۔ یادوں کے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں۔ لیکن شاید وقت ٹھہر گیا ہے، تب ہی خود کے زخم ہر وقت رستے رہتے ہیں، آنکھیں نم رہتی ہیں، وہ میرے آس پاس رہتا ہے، کانوں میں اس کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ وہ تیز تیز چلتا میرے کمرے میں آیا ہے اور کرن کا ہنڈل میرے سامنے رکھ دیا۔

پاپا! کرن آ گیا ہے، آپ دیکھیے! میں نے ہنڈل کھول کر پر جان کالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ میں ایک ایک صفحہ کھول کر دیکھ رہا ہوں ساتھ تعریف کا سلسلہ جاری ہے، وہ سر جھکائے بیٹھا ہے، پرچا دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں۔

بابر! یہ بھائی جان کی نظم تم نے اچھے اور خوبصورت انداز میں لکائی ہے، بس کچھ لوگوں نے طے کر لیا ہوتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیں گے، تم بھی ان ہی میں سے ہو ورنہ تم سے اچھا پرچا کوئی نہیں ترتیب دے سکتا۔ تم ایک بہترین ایڈیٹر ہو۔

اس کے خوبصورت چہرے پر ایک چمک آمش۔ ایک دم ہنس پڑا۔ وہ ایسا ہی تھا، ذرا سی بات پر خوش ہو جانے والا، بچوں کی طرح معصوم۔

پرچا آتا تو پہلے میرے پاس لے کر آتا۔ بڑے احترام اور عقیدت سے ہنڈل میرے آگے رکھتا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے میں دفتر نہ آ پاتا تو وہ ہنڈل اٹھا کر گھر لے آتا۔

کرن! اب بھی آتا ہے۔ لیکن!

وہ ہر کام بڑے جوش و خروش سے شروع کرتا تھا، بڑے جذبے کے ساتھ، اس کا جوش و خروش اس کے ساتھ کام کرنے والوں میں بھی سرایت کر جاتا تھا۔ یہ اس پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

وہ خوشی سے بے قابو ایک جوش کے عالم میں میرے کمرے میں آیا ہے۔

پاپا! مجھے اخبار کا ڈیکوریشن مل گیا ہے، پرسوں ٹوڈے اسپیشل بازار میں آجائے گا۔ میں نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا، آج ڈیکوریشن بلا ہے اور پرسوں اخبار بازار میں آجائے گا، بغیر کسی تیاری، بغیر اسٹاف کے، یہ آسان کام تو نہیں ہے، میں نے سختی سے منع کیا۔

بابر! یہ مذاق نہیں ہے، آج ڈیکوریشن بلا ہے اور دو دن بعد اخبار لا رہے ہو، کوئی اسٹاف نہیں ہے، اکیلے یہ سب کرنا بہت مشکل ہے۔

لیکن وہ مصر تھا کہ اخبار پرسوں آئے گا۔ اس کا جوش و جذبہ دیکھ کر میں خاموش ہو گیا لیکن دل ہی دل میں پریشان تھا کہ یہ سب کیسے ہوگا؟

تیسرے دن وہ اخبار لے کر آیا تو میں حیران رہ گیا۔ ہر لحاظ سے ایک خوبصورت، معیاری روزنامہ میرے سامنے تھا، کہیں کوئی کمی نہ تھی۔ وہ اسی طرح مجھے حیران کر دیا کرتا تھا۔

آٹھ ماہ کا تھا جب پہلی بار اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھا تھا، وہ کھڑا ہوا اور ایک دم، ورنہ لگا، تب بھی میں حیران رہ گیا تھا۔

پھر وہ دوڑتا ہی رہا۔ ہر چیز، ہر کام میں آگے آگے، پرچے کا کام لے لی این ایس کی انڈاریاں دعوتیں اور میٹنگز، اخبار کی مصروفیات، وہ اپنے لا آبالی انداز کے باوجود ہر کام بڑی خوب سے کرتا تھا۔ اور میں حیران رہ جاتا تھا۔ میں اب بھی حیران ہوں۔

وہ مجھے چھوڑ کر کیسے چلا گیا؟ وہ تو کبھی میری اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا، کہیں نہیں ہانا تھا میں حیران ہوں کہ وہ۔ میری اجازت کے بغیر اتنے بے سفر پر کیسے اور کیوں چلا گیا!



خواتین ڈائجسٹ میں

لکھنے والی اور

اسے پڑھنے والی

## تمام بہنوں سے درخواست

ہمارے پیارے محمود بابر فیصل (ذوالقرنین) آج سے چار سال پہلے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء بروز ہفتہ کو اُن کی پھوٹھی بوسہ سی ہے، اُن کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا انتظام دوپہرتین بجے سے نمازِ مغرب تک اُن کی رہائش گاہ B-91 'چاندنگر' ابن انشاء روڈ، بلاک ڈبلیو، علامہ اقبال ٹاؤن نارٹھ ناظم آباد، کراچی میں کیا گیا ہے (خواتین اور مرد حضرات، دونوں کے لیے انتظام گھر پر ہی ہے)۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ضرور شرکت کریں اور محمود بابر فیصل کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔

دوسرے شہروں اور ملکوں میں بستے والی بہنوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی محمود بابر فیصل کے بلند درجات کے لیے دعا کریں۔

READING  
Section



## نوٹ

اے دُورنگر کے بنجارے کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے  
یہ بارش، کچھڑ، سرد ہوا اور راہ کٹھن انجانی ہے  
آنکھل چپ چپ بیٹھی ہے آنکھل کا جی شاد کریں  
وہ لوگ کہ تیرے عاشق ہیں کے روز سے تجھ کو یاد کریں  
وہ مٹوڑ ٹھکانے ڈھونڈ چکے وہ منزل منزل چھوٹے  
اب اس لگائے بیٹھے ہیں اکب دسک ہو کٹوٹے  
اے دُورنگر کے بنجارے، گر چھوڑ کے ایسا جانا تھا  
کیوں چاہ کی راہ دکھانی تھی، کیوں پیار کا ہاتھ بڑھانا تھا  
ہے دنیا کے ہنگاموں میں رنگینی بھی رعنائی بھی  
ہر چیز یہاں کی پیاری ہے، محرومی بھی رسوائی بھی  
سب لوگ یہاں پر قسمت کے بے طور تھیسرے بستے ہیں  
پر جیتے ہیں اور جینے کی اک اس سے چھٹے رہتے ہیں  
اور تو تو ایک کھلاڑی تھا، کیوں کھیل ہی سے مڑ مڑایا  
کیوں جان کی بازی ہار گیا، کیوں عمر کا رشتہ توڑ لیا  
گو جانے کے مشاق یہاں ہم جیسے لاکھ بچارے ہوں  
وہ لوگ ہی رخصت ہوتے ہیں جو لوگ سب کو پیارے ہوں  
ہر سال رتوں کی گردش سے جب بیس دسمبر گئے گی  
یہ اشک چھما چھم برسیں گے یہ آہ گھٹا بن جانے گی

## اے دُورنگر کے بنجارے

ابن انشاء

تم عرش کے ایک فرشتے تھے، بس فرشت کی چوکت چوم گئے  
تم تیس برس تک دنیا میں معصوم رہے، معصوم گئے  
ہم یاد کی روشن شمعوں سے اس جی میں اجلا رکھیں گے  
اور سینے میں آبادی کا سامان زارا رکھیں گے  
تم اجنبی اجنبی راہوں میں جب تھک جاؤ، اک کام کرو  
اس دل میں ان قیام کرو، اس سینے میں بسرام کرو  
اس جگ کی رات اندھیری میں اک تارا تھادہ ڈوب گیا  
اور وعدے ساتھ بھلنے کے سب بھول بھلا کر خوب گیا  
یہ انشاء، ہاروں، زید بکر، شیشول کا مسیحا کوئی نہیں  
سب دوست ہمارے اچھے ہیں، پر کون ہے اس سا، کوئی نہیں  
کیوں نازک نازک سینوں پر تم غم کا توڑ پہاڑ چلے  
کیوں جگ کے کھیل تماشوں کا تم رنگ اور روپ اجاڑ چلے  
پھر دیکھ زمیں پر کچھڑ ہے، پھر دیکھ فلک پر پانی ہے  
اے دُورنگر کے بنجارے، کیوں آج سفر کی ٹھانی ہے

اکتوبر کے ناول نمبر کی

ریٹ جھلک

اکتوبر کا شمارہ ناول نمبر شائع ہو گیا ہے

سینوں کا شعاع  
ایمانا پنامہ



زمرہ ممتاز اور ماہانہ ملک کے ناول،  
مذاقِ بیاں اپنا، ساغر صدیقی کے کلام کا انتخاب،  
مشہور مزاحیہ فنکار اطہر شاہ خان کا پہلا دیکھ،  
شاعری سچ بولتی ہے، ایسا منظر امریکائی  
کا اہتمام،  
شادی مبارک ہو، نبی کی باتیں اور دیگر  
مستقل سلسلے،  
شعاع کا ناول نمبر آج ہی خسریدیں

یہی سچ ہے، نگہت عیالہ کا مکمل ناول،  
سین میں لکھیا سوہنایاں، ثمرہ بخاری کا مکمل ناول  
میں نے شاعر ہاری ہے، شازیہ چوہدری کا  
مکمل ناول،

ستاروں سے سجائے گن، اسیمہ قریشی  
کے ناول کی آخری قسط،  
غزالہ نگار زویہ اعجاز، ساگرہ یامین راز اور  
رُخ چوہدری کے افسانے،

READING  
Section



## دردِ دل۔ جو کبھی کم نہ ہوگا

محمود خاں

رسالہ ماہنامہ 'کرن' شروع کیا۔ میں نے اسے 'کرن' کے ساتھ ہر ماہ ایک مفید کتاب دینے کا مشورہ دیا جس پر — عمل کرتے ہوئے 'کرن' کو اس نے منفرد پرچا بنا دیا۔

'کرن' میں اس نے بہت سے تجربے کیے مینا بازار کے نام سے ایک پروگرام ٹی وی پر ہوا کرتا تھا۔ باہر سے اس پروگرام پر 'کرن' کا مینا بازار نمبر نکالا جس میں رنگین صفحات بھی شامل کیے۔ باہر سے 'کرن' کو دلچسپ بنانے کے لیے کئی جدتیں کیں۔ بہت سے خوبصورت سلسلے شروع کیے۔ ہم مل کر بیٹھتے تو ہم سے بھی ڈسکس کرتا تھا۔ اس زمانے میں میں نے عمران ڈائجسٹ کے ساتھ

میں سے بھائی، میرے دوست محمود باہر فیصل نے بچپن سے ہی محبتوں کو بانٹنے اور سنیٹے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اسکول کے زمانے میں ہی اس نے بچوں کے لیے ناول لکھنے شروع کر دیے پھر اچانک افسانوں اور کہانیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شعر کہتا تھا اور اسے اپنی ڈائری میں بھجوا کر رکھتا۔ کالج کے زمانے میں ہی عمران ڈائجسٹ کی ایڈیٹری سنبھال لی، جس عمر میں اس وقت بھی ادب بھی لڑنے لگیوں میں گئی ڈنڈا، فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے ہیں۔

وقت کچھ زیادہ ہی تیزی سے گزرنے لگا اور اس نے بہنوں کے لیے ایک بہت ہی خوبصورت



کرکٹ میگزین دیا تھا جو بے حد پسند کیا گیا تھا۔ لوگوں نے اسے بہت سراہا تھا۔ بابر نے ہمیشہ کی طرح مجھ سے سوال کیا۔

”خاور! کرن کے لیے کوئی ایسا سا آئیڈیاء دو۔“  
تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ کرن کے ہر شمارے کے ساتھ ایک کرن کتاب ’مفت ہونی چاہیے۔ کتاب کا موضوع ایسا ہو جو بہنوں کی دلچسپی کا بھی ہو اور ان کے لیے مفید اور کارآمد بھی ہو۔“  
بابر کو یہ آئیڈیاء بہت پسند آیا۔ اس سے پہلے کسی بھی میگزین کے ساتھ ایسا تحفہ نہیں دیا گیا تھا۔ اس نے اسی ماہ سے اس پر عمل کیا اور یوں

”کرن کتاب“ کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور آج تک بے شمار مفید اور اہم موضوعات پر کتابیں دی جا چکی ہیں۔ بہنیں اس عظیم نبھائی کے خوبصورت پریسے ’کرن‘ کے ساتھ ’کرن کتاب‘ کا تحفہ پا کر یقیناً خوش ہوتی ہوں گی۔

جہاں اس کے اس تحفے نے قارئین بہنوں تک بہت سی اہم معلومات پہنچائیں، وہیں بہنوں نے دیکھا کہ اس نے ایک اور دھماکا کر دیا۔ محمودیابرقیصل، ذوالقرنین کے نام سے شعر کہتا تھا۔ اب اس نے اسی نام سے ایک ہنستا مسکراتا سلسلہ ’نہلے پر دہلا‘ شروع کیا۔ وہ جب ذوالقرنین ’ذوق بھیا‘ کے نام سے سامنے آیا۔ تو بہنوں کے کیے ہوئے سوالات کے ایسے سگفتہ جواب دینے شروع کیے کہ اس کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ مزاج کا، بھرپور اور شفاف محبت کا، رنگ کا، پھولوں اور بہاروں کا، شعروں کا اور محاوروں کا۔ غظوں کے انبار لگے ہوتے، ذوالقرنین کے نام بھرمار ہوتی بہنوں کے خوبصورت سوالات کی یہاں تک کہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ بہنوں نے ذوق بھیا کو مات دینے کے لیے مشکل مشکل سوالات کی پوچھا ڈگری۔ مگر اس کے ہنستے مسکراتے جوابات ان کے سوالات پر حاوی ہو جاتے۔ اور بہنیں اس پر بھی اس کا شکریہ ادا کرتیں۔ سب ذوق بھیا

سے محبت جو کرتی تھیں۔ جی ہاں محبت، قارئین بہنوں کی اپنے ذوق بھیا سے۔

مے چاہتا ہوں کہ اسے نذر محبت کر دوں  
زندگانی مری شاید کسی قابل ہو جائے

محبت کون نہیں کرتا تھا میرے بھیا، میرے دوست سے۔ پاپا، امی، بہن بھائی، گھر اور خاندان کے تمام لوگ، دوست، احباب وہ جو ان ملاقات کا شرف رکھتے تھے وہ بھی اور وہ بھی جو ان سے مل سکے۔ وہ ایک شخص جو ہم سے روٹھ گیا۔ کتنی ہی محبتیں بانٹ کر اور نہ جانے کتنی ہی محبتیں ہمیشہ کر ہم سے جدا ہو گیا۔

سے جدا ہونا میں یہ شرط ضبط غم تو مار ڈالے گی

ہم ان کے سامنے کچھ دیر رو لیتے تو اچھا تھا  
کیسے کہوں کہ ہمارا پیارا بابر ہم سے جدا ہو

بلانے کا بھی وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہی صبر بھی دیتا ہے۔ مگر اس دل کا کیا کریں؟

لے کہاں لے جائیں؟  
آخر ہمارا دل اس بات پر کب یقین کرے گا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہے، وہ مالک حقیقی سے جا ملا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر درد دل کب تک نکھوں۔ وہ سمندر کی لہروں کی طرح بار بار ساحل پر آتا ہے اور پھر واپس کہیں دور چلا جاتا ہے۔ دور۔



گیا ہے۔ کیسے نکھوں کہ وہ اب ہم میں نہیں ہے۔ لفظ ہے "کو تھکا" میں کیسے بدل دوں، کس طرح پہلاؤں اس دل کو کہ تمہیں ہم سے پچھلے چار برس ہونے کو ہیں۔

کہنے کو تو چار برس بہت لگتے ہیں مگر تمہیں ابھی کوئی پیلے ہی تو مسکراتے اور پھر قبضے لگاتے دیکھا تھا۔ ابھی چند لمبے پیلے تو ہم سب گھر والے تباری مزے دار باتوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ پھر یہ اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا کیوں چھا گیا؟ گھڑی کی سوئیاں اتنی تیز کیوں بھاگیں؟ کنڈر کے صفحات اتنی تیزی سے کیوں پلٹے کہ چند لمحوں پہلے کی بات کو چار سال بیت گئے۔ کتنے موسم بدل گئے، مگر تم کہاں تھے؟ کہاں ہو؟ جو بات کیوں نہیں دیتے؟ ہاں شاید تم اب ہماری کسی بات کا جواب نہیں دو گے، وقت جو تیزی سے گزر گیا ہے۔

سے پت چھڑاتوں نے کس کس کو حیران کیا ہے؟  
بارش سے پھول اور پھول سے بھورا چھین لیا ہے  
اور وہ چلا گیا۔

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن مالک حقیقی کے پاس واپس جانا ہے۔ اللہ پاک کی ذات ہی اپنے بندوں کو دنیا میں بھیجتی ہے اور پھر اُس نے واپس

۲۵ اکتوبر ۹۷ء کو اُس کو گئے چار برس ہو جائیں گے۔ گھر میں برسی کا اہتمام ہوگا۔ اس کے دوست احباب چاہنے والے جمع ہوں گے اور اُس تک اللہ پاک کا کلام پڑھائیں گے، اس کی مغفرت کے لیے دعا کریں گے۔

دوسرے شہروں اور ملکوں میں رہنے والے بھی اپنے پیارے محمود بابر فیصل کی اس چوتھی برسی پر اللہ پاک کا کلام پڑھ کر اسے تحفے میں بھیجوائیں گے اور اسے تحفے ہی تحفے ملیں گے۔ اور اسے ہم دنیا میں رہ کر کیا دے سکتے ہیں۔

دعا کریں کہ وہ جہاں بھی ہو، خوش ہو۔  
یقیناً کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد۔  
اے میرے اللہ!  
یہ زمین آسماں تم سے صدقے  
میں ہی کیا دو جہاں تم سے صدقے

★

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

# آئی جو تیری یاد

شگفتہ سلیمان

تم پھر یاد آ رہے ہو  
لیکن تم تمہیں بھولے کہاں ہیں  
تم تو ہمارے دلوں کے اندر دُور دُور تک  
بسے ہوئے ہو  
تمہاری یادیں تنہائی میں اکثر لادتی ہیں  
دن کی روشنی میں آنسو آنکھوں سے اتر کر  
قطرہ قطرہ دل پر گرتے رہتے ہیں  
کتنا وقت بیت گیا تم کو گئے  
یقین پھر بھی نہیں آتا  
تم بھلائے جلنے والوں میں سے نہیں  
کاش کہ تم واپس آسکتے  
آ جاؤ  
ایک بار صرف ایک بار  
چند لمحوں کے لیے ہی  
ایک بار ہم تمہیں جی بھر کر دیکھ تو سکیں  
چھو کر محسوس کریں  
میرے پیارے میرے بہن میرے دوست  
میرے بھائی

میں تمہارے رازوں کی امین ہوں  
تمہارے آنے کی بات بھی کسی سے نہ کہوں گی  
گزرے چار سالوں میں  
ماں کے چہرے پر حسرت  
باتوں میں اداسی، دل میں تڑپ  
پاپا کی آنکھوں کا کرب اور آنسو  
دل میں تمہارے کھوجنے کا غم  
تمہاری یادیں ان کی آنکھوں میں بس گئی  
ہیں  
ہجے ٹوٹ گئے ہیں الفاظ بے ربط  
مضبوط لائٹ ٹوٹ گئی ہے اور ہو گئی  
عمارت کمزور  
جلنے ان برسوں میں کتنے  
صفحے لکھے کتنے پھاڑے  
منتشر یادیں لفظوں کا روپ نہ دھاڑ سکیں  
بس ایک کسک باقی ہے  
تمہاری جگہ کوئی نہ پُر کر سکے گا

بلکتی ہیں  
صرف تمہارے لیے

ہاں تم تو ایک مسافر تھے  
جو شہروں شہروں گھومتے تھے  
جو ملکوں ملکوں جاتے تھے

اور جاتے تھے پھر آتے تھے

یہ شہر تو تمہارا اپنا تھا

یہ گھر تو تمہارا اپنا تھا

اب کیسے سفر پر جانکے

جو واپس اب تک نہ آئے

ہاں ایک بات تو ابھی ہے

کچھ چہرے تھے کچھ لوگ بھی تھے

جو اپنے اپنے لگتے تھے

جو پیارے پیارے لگتے تھے

اب ان کے چہرے ننگے ہیں

اب ان پر کوئی نقاب نہیں

جو دھوکا تھے سراب بھی تھے

ان چہروں کی تاب نہ لاسکتے تم

وہ چہرے بڑے گھناؤنے تھے

چہرہ اور چہرہ اتھا ان کا

اور روپ بمیانگ تھا ان کا



جلنے سے ایک ماہ پہلے

تمہاری آنکھوں میں وقت جیسے ٹھہر گیا تھا

تمہاری باتیں تمہارے راز، تمہارے شکوے

تمہارے دکھ، تمہارے درد

کچھ نظر میں کچھ سلوک

لوگ شاید بھول گئے ہوں

لیکن میں نہیں بھولی

وہ سب میرے دل میں اتر گئی ہیں

تم سا پیارا کہاں سے لاؤں

کہاں ڈھونڈنے کو جاؤں

ماں کو بہلانا کتنا مشکل ہوتا ہے

جب وہ تمہیں یاد کرتی ہیں

READING  
Section

# انصورتوں کو ترسے گی حشمت

تابعہ بدلال



ہے۔ !!  
کیوں بابر صاحب! کیا کوئی اس طرح بھی رلاتا

ہے۔ ؟  
میری آن سے پہلی ملاقات ۱۹۸۹ء دسمبر میں ہوئی تھی۔ وہ محمود ریاض صاحب کے کمرے میں فرج کے پاس والے صوفے پر بیٹھے تھے۔ پہلی نظر میں وہ ایک لاابالی سے انسان دکھائی دیے۔ خوبصورت وجیہہ و شکیل شخصیت تھی۔ زیادہ تر فی مشرط استعمال کرتے تھے۔ انداز کچھ بے گانہ اور لاتعلق سا تھا۔ جیسے وہ اس کمرے میں رہتے ہوئے بھی اس کا حصہ نہ ہوں۔ مجھے ان کا چہرہ جانا پہچانا سا محسوس ہوا۔ جی ہاں یہ تو ذوالقرنین ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کے انہیں پہچان لیا لیکن نہیں، ان کی شخصیت کے تو بہت سے روپختے اور بہت سے رنگ! انہیں

ہ کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے وہ جو ایک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا اور منہ پھیر کے جانے والے پلٹ کر نہیں دیکھتے کسی پر کیا گزرتی ہے۔ پہلے ان کے دیکھ جانے سے بزم کے چراغ بجھ جاتیں اور دنیا اندھیر ہو کر رہ جائے اول و نظر کی دستیں دکھ سے لبالب بھر کر چھلک پڑیں، انہیں برسیں بھی اور ترسیں بھی۔  
مگر وہ ہر تعلق کو توڑ کر ہر رشتہ چھوڑ کر بے نیاز و ہلکا ہونے والا کس راہ کا مسافر ہوا کہ ہر محبت بھری صدا، صدائے بے صحرا ٹھہری۔  
وہ رشتوں کی مضبوط زنجیریں مجھے رہ جانے والوں کے ہاتھوں میں محبت کے اچھے سگھے چمکے دھاگوں کی شکل میں رہ گئیں کہ ہنساتے ہنساتے کوئی اس طرح بھی رلاتا

کے دوست تھے۔ رُخلاق اور زندہ دل!  
 ہمارے دفتر کی ایک خوبصورت روایت یہ تھی کہ  
 دوپہر کا کھانا سب ریاض صاحب کے کمرے میں کھاتے تھے  
 دوپہر کے وقت کچھ سستی سی آجاتی ہے۔ لہذا جب ساتھ  
 مل کر بیٹھتے۔ ہنستے بولتے اور مذاق کرتے۔ تو خود بخود  
 لڑیشن آجاتی۔ اور آدمی پھر سے تازہ دم ہوجاتا۔ یہ  
 وقت بھی یادگار بن گیا کہ جب لطفول کا مقابلہ ہوتا تھا تو اشعار  
 کے دریغ کی جاتی۔ مزے مزے کے قصے سنانے جاتے۔  
 اب وہ صحبت برہم گئے وقتوں کی حسین یاد۔ بن کر

ان کو بھی جاننے کا دعویٰ نہ کیا جاسکتا تھا۔  
 وہ بظاہر لڑا پروانہ نظر آتے والا شخص انتہائی ذمہ دار تھا۔  
 بے حد حساس۔ فذکار ذہن کے مالک۔ خوش باش پڑھلوں  
 مانتی انتھک غنتی اور نہ رہا بردار بیٹھے۔ ان کی شخصیت  
 میں رنگ ہی رنگ تھے۔  
 کبھی وہ ہنستے ہنساتے نظر آتے۔ بذلہ سنجی عروج پر ہوتی  
 ربات پر برنل لطیفے سنانے جاتے۔  
 کبھی خاموش اور سنجیدہ سے۔ اپنے کام کی بات کی  
 دریں۔



مازندگی ساتھ رہی۔ بار بار صاحب کی مخصوص جگہ جہاں وہ  
 آکر بیٹھا کرتے تھے سنوئی سنوئی سی لگے گی۔  
 کئی بار بار صاحب کے آفس میں بھی کھانا کھایا گیا۔  
 اس وقت وہ پورے میزبان بن جایا کرتے تھے۔ ان کے  
 دفتر کی ہر چیز سے سلیقہ اور قربت نہ ٹپکتا تھا۔ سامنے ہی اشافی  
 کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوتی تھی جن سے وہ بہت پیار کیا  
 کرتے تھے  
 ایک بات ان سب میں مشترک ہے۔ وہ بہت خوبصورت  
 آواز۔ محمود ریاض صاحب کی آواز بہت خوبصورت ہے

کبھی کام کرنے پڑتے تو دوسروں کے ہاتھ پاؤں پھیلا  
 دیتے۔ ہر ٹھوڑی دیر بعد تھا صا کہ جیٹی ٹولہ بن کی محفل کی آواز  
 بھجوا دیں۔  
 کبھی اسٹل ان کے آفس کے دس چکر لگاتیں کہ بار بار صاحب  
 جلدی جواب لکھ دیں۔  
 ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا رکھ رکھاؤ  
 اور ادب و لحاظ تھا۔ گفتگو ہمیشہ شائستہ اور برنل شوہروں  
 سے مزین کرتے۔ درمیان میں لطیفے بھی سنانے جاتے خود بھی  
 ہنستے جاتے اور دوسروں کو بھی ہنساتے جاتے۔ دوستوں

READING  
Section

خاور صاحب باہر ہی مل گئے۔ دکھی دکھی سے بڑھ چلا  
 لہجے میں بولے: ابھی اس کے جانے کی عمر تو نہ تھی۔ بس پتا  
 نہیں کیا ہو گیا پھر مجھ سے کہا۔  
 ”رابعہ! ذرا سولے سے بات کرنا پاپا کی طبیعت  
 خراب ہے۔“ میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ظاہر ہے جس کا سرمایہ حیات اس کے سامنے لٹ  
 جانے جس باپ کا جوان، ہونہار زمین اور فرما بندوار  
 بیٹا اتنا بڑا کم، اتنا بڑا زخم سے جانے لے اس سہاڑ  
 جیسے دکھ کو سہنے کے لیے پہاڑ جیسا حوصلہ درکار ہوتا ہے  
 ریاض صاحب بالکل خاموش، خالی خالی آنکھوں  
 سے اس طرح بیٹھے تھے جیسے اپنی سب سے قیمتی متاع  
 ہار گئے ہوں۔

میرے بھی حلق میں کوئی چیز ایسی محسوس ہو رہی تھی۔  
 بولا مجھ سے بھی نہ جا رہا تھا۔ وہ بھی خاموش تھے۔ تسلی  
 کے سوا کچھ تو کھیلے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے  
 تام حوصلے یکبا کر کے بھرائی ہوئی آواز پر قابو پا کر کہا۔  
 ”سرا حوصلہ کریں۔“



اور یہ خوبی خاور صاحب اور بار صاحب دونوں میں لائی  
 ہوتی ہے۔

سے اس نے آواز کا رشتہ بھی نہ رکھا تو گو !!  
 دل لگاں سے خالی ہے کہ سماعت اپنی آواز کو ترسے گی  
 بار صاحب کو حیرت زدہ کر دینے کا فن آتا تھا اور وہ اس  
 سے سیکھتا بھی ہوا کرتے تھے۔ زندگی میں ہزاروں مہربانوں  
 لیے والے نے موت کا دامن بھی اس طرح چھانا کہ حیرت  
 سے بہت بنا کر رکھ دیا۔

مے گئے دنوں کا سہرا لے کر کہہ کر سے آما کہ بھر گیا وہ  
 عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ  
 وہ بھر کی رات کا ستارا وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا  
 سدا رہے اس کا نام پیا پیا سننے کے کل رات مر گیا وہ  
 میں نے خبر نہ مانے میں یہ خبر جانکاہ سنی تو کتنی دیر ساکتوں  
 کا اتبار نہ رہا۔ اتنی جلدی کوئی اس طرح جاتا ہے اور وہ  
 ہم بار صاحب جیسا پارہ صفت انسان جس کے آگے  
 سنا قبل کے بڑے بڑے منصوبے تھے۔ وہ تو بہت کچھ  
 رہا ہوا تھے۔ میں اسی وقت بلال کے ساتھ ان کی  
 رائل گاہ پہنچی۔ ہر شے پر اداسی کی دبیران دکھی دھند  
 سے کہانی ہوتی تھی۔

سے اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ  
 ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش



ہاں۔ اب یہی کرنا ہے کہنے کو تو بہت آسان  
جملہ ہے پر سہنے کو بہت مشکل ہے۔ اور دکھ سے کاچی  
اور آتشو بہہ نکلے۔

میں نے جنہیں ہمیشہ سنتے مسکراتے، جاندار تھے  
رہتے دیکھا تھا۔ اسی شخص کو آنا ٹوٹا ہوا، اتنا دکھی



دیکھا نہ جا رہا تھا۔ میں نے اُن کا ہاتھ تھام کر تسلی کا  
احساس دلایا۔ لیکن اس وقت وہ غم کے احساس میں  
ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بول رہے تھے مگر بات نہیں کر  
رہے تھے۔ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے مگر موجود  
نہیں تھے۔

بابر صاحب آپ نے بھی کیسے کیسے امتحان میں  
ڈالا ہے۔ آپ کا دکھ اتنا بڑا ہے کہ میرا حوصلہ جواب دہ  
جاتا ہے۔ میری تمہرت ریاض صاحب کا سامنا کرنے  
کی نہیں پڑتی ہے۔ میں نے تمام سیرت اور حوصلہ جمع  
کر کے دفتر میں قدم رکھا۔ ہر شے مانوس تھی مگر مانوس سی  
آہا سی میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہر شے سے اُن کی یاد وابستہ تھی۔  
وہ یہاں آکر بیٹھے تھے۔ اس ٹیلیفون کو استعمال کرتے  
تھے۔ ان کی اور امتل کی مزیدار نوک جھونک ہوتی تھی سب  
کچھ ویسا ہی تھا مگر اس شخص کے نہ ہونے سے ویسا نہ رہا

حقاً۔ امتل نے کہا۔

”راہجہ! سر کو یاد آئی کہ تم اس دن آئی تھیں۔“

میں نے کہا اچھا میں ان سے مل کر آئی ہوں۔“

ریاض صاحب کا استقبال کرنے کا انداز بہت  
گرم ہو گیا تھا۔ مگر اس دن وہ بالکل خاموش تھے۔ مجھے  
دیکھ کر کہنے لگے۔

”راہجہ! امتل نے مجھے بہت یاد دلایا کہ تم آئی

تھیں۔ میں نے کہا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ راہجہ

سے ملے اور مجھے یاد نہ ہے لیکن جب انہوں نے

کہا کہ وہ رات کو بلال بھائی کے ساتھ آئی تھی تو مجھے

یاد آ گیا۔“

”دکھ آدمی کو اسی طرح ہوش و خرد سے بے گما نہ کر

دیتا ہے۔ آنکھیں جاگتی ہیں اور ذہن سوتا ہے۔ ریاض صاحب

بہت حساس انسان ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے بھائی انشاہی

کا غم نہیں بھول سکے۔ یہ دکھ، یہ غم جانکاہ تو ان کی برکت

کی آہٹوں کا امتحان ہے۔“

وہ ضبط کے پیرے لگاتے ہیں اور آتشو تمام بند

توڑ کر بہہ نکلنے میں۔

ریاض صاحب کئی بار بولتے بولتے روئے اور

رہتے روئے بولے۔

انہوں نے گلو گیر آواز میں بتایا۔ میں نے تقد کے

حضور اپنی زندگی اس کے بدلے لینے کی دعا کی مگر میری

یہ دعا بھی قبول نہ ہوئی۔ ابھی تو باہر گئے بہت ہی

بچھوئے ہیں۔ اس نے خود بھی دیا میں ابھی کیا دیکھا تھا

وہ دوستوں جیسے باپ ہیں۔ ان کا غم بہت بڑا

ہے۔ اور تسلی کا ہر لفظ بہت چھوٹا۔ میں دکھا ہوا

دل اور دل پر فوجیوں بولنے کے اس سنسان راہداری

میں نکل آئی جس کے چپے چپے پر بابر صاحب کے قدموں

کے نشان ہیں۔ اُن کے دفتر کے سامنے سے گزرتے

ہوئے نظر ٹھہری، بھٹکی اور بے ساختہ زبان پر یہ شعر آ گیا۔

سے ان صورتوں کو ترسے گی چشم جہاں کہ آج

کیا ب میں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

★

کی شادی تھی۔ گھر میں ہنگامہ اور خوب شور شرابا تھا۔ میں بچاوتے  
 دوڑتے مہانوں کی آؤ بیگت میں مصروف تھی کہ اچانک ہی  
 میرے بیٹے نے مجھے نومیبر کا نوڈین ڈائجسٹ آکر تمنا دیا اور  
 اور میری پرانی عادت ہے کہ چاہے کتنی ہی مصروفیات کیوں  
 نہ ہوں سکتے ہی ان گزرت کام کیوں نہ شمار ہی ہوں ڈواک  
 سے آسے والا تازہ شمارا سرسری جانوس کے لیے فوراً کھول  
 کر پڑھتی اور دیکھتی ہوں۔ اس کی بڑی وجہ نگہت عبد اللہ  
 کی تحریر افسانے یا ناولٹ کی صورت میں یا پھر سماجی کا قسط وار  
 ناولٹ اور رفعت سراج کا سلسلہ وار ناول ہوتے ہیں۔ ان

حکم قلم کار بہت حساس اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو  
 محسوس کرنے اور رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں کسی غیر کا دکھ  
 بھی ہمارے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ پھر جو لوگ ہمارے قریب  
 ہوں جن سے اچھی طرح آشنائی ہو۔ اللہ کا دکھ برداشت کرنا  
 عذاب جان بن جاتا ہے۔ آج سے چند دن پہلے تک میرے  
 گان میں ہی نہ تھا کہ مجھے خالدہ اس جیسی لکھنوی کے ساتھ  
 ساتھ ذوالقرنین کی اچانک اور بے وقت موت کا صدمہ  
 بھی پہننا پڑھا ہے گا۔  
 یہ غالباً نومیبر کے وائل ہفتے کی بات ہے۔ میری نند

## کہنا کہ مسافر تو گیا

نجمہ جبین علینزی



بہنوں کی تحریروں میں شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔  
 بالخصوص وہ بھی کبھی کبھار ہی قلم کا چہرہ تحریر کے روپ  
 میں دکھاتی ہے۔ بہر حال مجھے ہی ادارہ پر دھاتوں میں بیٹے  
 سناٹوں کی زد میں آگئی۔ دل اور آنکھوں کو فریب دینے  
 کے لیے بار بار وہ ادارہ پر دھاتا اور پھر میرے لیے خود کو  
 سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

اس سے پہلے خالدہ اسد کی وفات کا پڑھ کر ذہنی  
 طور پر اپ سیٹ تھی۔ دو تقریریں کے روپ میں محمودیہ  
 فیصل کی ناگہانی اور اچانک موت کا پڑھ کر میں کتنی دیر  
 گم سم اور ساکت کھڑی رہ گئی۔ باہر مہمانوں کا شور مچا  
 اور اندر کمرے میں میری آنکھیں اس ہنستے مسکراتے زندہ  
 دل بندے کی جواں موت پر اٹھکھار گئیں جس کے ساتھ  
 میرا تحریروں اور جریدے کے ذریعہ گہرا رشتہ تھا۔ جس نے  
 پیچودہ برس پہلے مجھے بطور لکھاری کرن میں روشناس کر دیا  
 تھا۔ ماہنامہ حور کے بعد بار بھائی نے ہی میری ادب  
 کی دنیا میں آگے بڑھنے میں حوصلہ افزائی کی۔ میری تحریروں  
 کو تو اتنے کبھی افسانے اور کبھی ناولٹ کے روپ میں  
 چھاپا۔ اور میرے لیے یہ بات بھی باعث فخر اور خوشی ہے  
 کہ میرے زیادہ تر افسانے اور ناولٹ ان کے زیر ادارت  
 نکلنے والے رسالے کرن میں ہی شائع ہوئے۔ وہ اکثر و بیشتر  
 خط لکھ کر افسانے اور ناولٹ کی فرمائش کرتے۔ کبھی عید بنز  
 کے لیے افسانے منگواتے اور کبھی ہائے کبھی کبھی طومر و وفات  
 کی بنا پر میرا مودہ بھی ہوتا۔ مگر خط آتے ہی مجھے لازماً افسانے  
 لکھنا پڑتا۔

میں ایک افسوس سدا رہے گا کہ کرن میں شروع ہونے  
 والے ایک مئی ناول سیریل کے لیے مجھ سے ناول لکھنے کی  
 فرمائش کی۔ مگر میں اپنی چند ذاتی مجبوریوں اور مصروفیت  
 کی وجہ سے اس وقت ناول نہ لکھ کر دے سکی۔ کائن کہ  
 مجھے پتا ہوتا۔ انہوں نے اتنی جلدی اس دنیا سے چلے  
 جانا ہے تو میں ان کی یہ خواہش طرز پوری کرتی  
 پہلے پہ وہ بلا کی وہ خوبصورت مضمون جو بار بھائی  
 کے چمکدار جواہروں سے سمیٹتی تھی۔ اب کتنی بے رونق  
 اور ویران لگے گی۔ اب ہماری قاری نہیں کس سے  
 ادب پنانگ سوال کر کے بوجہ جواب مانگا کریں گی۔  
 کرن شاہیں کون سہائے گا۔ میرے خدا کتنی ظالم اور

READING  
Section

ٹھوس وائل حقیقت ہے۔ یہ بے رحم موت جو ساعتوں  
 میں بندے کو اپنے پیاروں سے اپنے پہلے والوں  
 سے جدا کر دیتی ہے۔

بار بھائی کی ڈیڑھ ساری یادیں تحریروں کی صورت  
 میں ہمارے ذہن پر نقش رہیں گی۔ بقول ان ہی کے  
 انہوں نے ناول لکھا تھا۔ مجھے محضوڈ محضوڈ ہار  
 کاش بھائی آپ ایسی جگہ نہ چھپتے جہاں اب میں واقعی  
 محضوڈ محضوڈ کر ہارنا پڑ جائے گا۔ مگر آپ نہیں ملیں گے۔  
 آپ کے مصحوم کھلونے آپ کو بھاریں گے۔ سوجا بی  
 سماں دیں گی۔ ماں باپ تڑپ تڑپ کر بلا میں گئے  
 مگر آپ بیٹ کر نہیں آسکیں گے۔ آپ تو بس کہنا  
 یہ مسافر تو گیا، کی مانند کبھی نہ لوٹنے کے لیے چلے گئے ہیں  
 میری ان سے کبھی براہ راست بات چیت نہیں  
 ہوئی تھی۔ ودی کی وجہ سے بس خط و کتابت کے ذریعے  
 ہی بات چیت ہو جاتی۔ تاہم جس انداز میں وہ اکثر و بیشتر  
 افسانے لکھنے کے اعزاز میں کرن شاہ کے نام سے مضمون  
 لکھتے۔ اور اپنی خوبصورت کپیرنگ اور برجستہ جملوں کی  
 ادائیگی کے ساتھ مضمون میں شریک مہمانوں کو غفلت کر کے  
 وہ سب کرن میں پڑھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی۔

یقین جانے میں تو اس حقیقت سے بھی لاعلم تھی کہ  
 ذوالقرنین کے نام سے شہرت پلے ولے عمر و بار فیصل ہیں، اصل میں  
 وہ خط میں بھی ذوالقرنین ہی لکھتے تھے۔ اور کرن میں آئی  
 نام سے مقبول تھے۔ پہلے پہ وہاں میں جس جالا کی سے شہرت آئی  
 روپ کے ساتھ وہ بے چاری ہماری بہنوں کو لاجواب کرتے  
 تھے۔ وہ ان کا اپنا ہی انداز تھا۔

مجھے تو یہ پڑھ کر بھی خاصی حیرت ہوئی کہ وہ اپنی معصوم  
 میں اس سلسلے کے ذریعے لڑکیوں کو کیسے مزے مزے کے  
 جواب دیتے تھے۔ اتنے نہیں بکھرا اور زندہ دل بار بھائی  
 نہ صرف شادی شہ نہیں۔ بلکہ بچوں کے باپ بھی ہیں۔ شاید  
 اتنی کم عمری میں انہوں نے اس دن کے لیے ساری خوشیاں  
 یوں سمیٹنی ہوں گی۔  
 وہ واقعی ایک بے مثال اور خاص انسان تھے۔  
 خداوند کریم انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)۔  
 اور کرن کے روپ میں ان کی یادگار کاوشوں کو مزید تازگی  
 سے دہم آئیں۔



ذوہدو

## رقعتہ ناپید سجاد

(امت الصبور)

امت الصبور کی یہ کمال عادت ہے کہ وہ کسی کو سکون کی نیند سونے نہیں دیتی۔ بس ایک مرتبہ آپ کی اس سے واقفیت ہوتی چاہے کتنی دفعہ دل چاہا بس اُردو ادب کی بہت خدمت کر لی۔ ایم اے کے نصاب میں اس سال تو ذرا بے ایمانی ہو گئی ہے اگلے سال ہمارے افسانے شامل ہو ہی جائیں گے لہذا پاؤں پسا کر سب تالیا جاتے یوں بھی رہتی تو نیا نیا نام چھوڑ ہی دیا ہے، لیکن وہ بیچھا نہیں چھوڑی۔ چار چار ماٹھا پانچ سال کے طویل عرصے میں بھی اس نے نہ بہت باری نہ فون کی گھنٹیاں بجانی چھوڑیں۔ ہر دفعہ میں شذوذ سے سوچتی کہ بہت بڑی بات ہے وہ اتنی مرتبہ کہہ چکی ہے اور افسانے میں کون سے ہاتھی گھوٹتے تھے، لیکن ایک دفعہ آرام کی مدت تک جائے تو مشکل سے چھوٹی ہے۔ بہر کیف ان پانچ سالوں میں اگر اتل پیچھے ہی نہ پڑی رہتی تو کھٹانا ناگن ہو گیا تھا۔

یہاں بھی پہلا حملہ امت الصبور کی طرف سے ہی ہوا ہے۔

۱۹۸۶ء میں آپ کا پہلا افسانہ موصول ہوا تو بار بار اٹ پلٹ کر دیکھا۔ مجھے حیرانی یہ تھی کہ آپ نے اس ریسے کیوں نکھا۔ کیلے پہلے کہیں اور کھتی تھیں؟

جی ہاں! کھتی تو تھی، لیکن پہلے دفعہ اس سے بھی طویل ہوتے تھے اور کوئی جگہ نہ والا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں ایم اے کر رہی تھی تو لاہور ڈی وی کے لیے میں نے بہت سے ڈرامے کھے تھے۔ کبھی ادب لطیف اوزانِ دفعہ میں بھی سبھی تھی لیکن یہ شکل سے اتنی دیر کے بعد آتے تھے کہ آدمی ککھ کر بھول بھی جاتا تھا اور اس نے اظہار بھی نہیں ہوتا۔ پھر ایم اے سے بھی پہلے ایف اے میں میں نے خورہ کے سالناموں کے لیے لکھا تھا

READING  
Section

ان دونوں یہ عورتوں کا واحد چلنے والا رسالہ تھا اور اس میں صرف ڈھائی افسانے ہوتے تھے۔ پھر بار بار گپ آتا تھا ویسے بھی وہ بکھنے کی نہیں پڑھنے کی عمر تھی۔ لاہور کالج کی بڑی وسیع لائبریری تھی پھر ہمارے پونچھ ماؤس کالونی کی اپنی لائبریری تھی۔ لائبریریاں زیادہ تھیں، پڑھنے کا وقت کم۔ لہذا سبندگی سے بکھنے کی طرف توجہ گئی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے پڑھنا بکھنے سے کہیں زیادہ ضروری ہے، اس کے بغیر آدمی کچھ نہیں سکتا۔ اتفاقاً میں نے ڈائجسٹ اس عمر میں پڑھنے شروع کیے جس عمر میں لوگ پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس زمانے میں بشری رحمن اور ایم سلطانہ فخر تھیں۔ پھر ساجدہ حلیب اور آسیہ رزاقی کا دور آیا۔ سوچا ان سے مقابلہ کر کے دیکھوں۔ مقابلہ تو کر نہیں سکی، ان کی نقل مارنی شروع کر دی۔ ایم سلطانہ فخر کی کہانی تو خواب میں بھی آتی تھی۔ کہانیاں آج جس رنگ میں لکھی جاتی ہیں اس کی بانی سلطانہ فخر ہیں۔

”آپ کی ہیروئن بے حد صاف گو اور خوفناک مدہک سچ بولتی ہے۔ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ہیروئن میں آپ کا عکس ہے؟“ (دوسرا سوال)

یہ وہ والا سچ نہیں ہے اتل! جو نرسری میں پڑھا تھا سچ کہہ بھت پر جا، پل پر چڑھ رہے بچپن میں بھی ان گستاخانہ احکامات پر شدید اعتراض تھا، ہیروئن میں ہمارا عکس تو شاید ہوتا ہے کہ نہیں لیکن وہ ہمارا آئیڈل ضرور ہوتی ہے۔ وہ سچ جو آپ سے بولے نہیں جاتے آپ کی ہیروئن بول دیتی ہے۔ آپ کی تسلی ہو جاتی ہے آپ کے اپنا سفر من ادا کر دیا۔

سوال کا دوسرا حصہ ”عمل زندگی میں لوگ آپ کی اس سچائی کو برداشت کر لیتے ہیں؟“ خوش قسمتی سے میں ایک ایسی نوکری کر رہی ہوں، جہاں لوگوں کو مجھے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ بھی ہے۔ ”آپ کی کہانیوں کے کردار اکثر اوروں کو نظر آتے ہیں کیا کبھی کسی نے خود کو سچان کرنا راستگی کا اظہار کیا؟“ منفی کرداروں کو اپنا آپ پہچاننے کی عادت نہیں ہوتی۔ انہیں تو شیشہ بھی ان کی مرضی کی صورت دکھاتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے کسی خاندان کے باسے میں ایک ڈراما لکھا۔ خاندان کے بزرگ رات کو ڈراما

دیکھ کر صبح میرے پاس آئے اور بڑی رقت سے کہا۔ تم نے یہ سب کچھ اپنے گھر کے باسے میں دکھا ہے۔ تیار ہی نہیں چلتا تھا، سگڑھا اتنی بندھیں ہیں۔ آنا حساس ہونا بھی ٹھیک نہیں بیٹی۔ اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

جو کردار منفی نہیں ہیں اور میرے ارد گرد بھی ہیں ان پر بکھنے کو دل چاہتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ حالانکہ جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تو طلوع سے کہا تھا۔ میں ننھی چھوٹی پر افسانہ لکھوں گی، لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ میرا لکھا ہوا کوئی لفظ ان کے پڑھنے سے چوک جائے۔ پھر وہ غلے ماریں گی بھی۔

یاسمین نشاط نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ میں سوچ ہی ہوں کہ سوال کروں۔ سوال کرنا میرے لیے بہت مشکل رہا ہے۔ میں کسی کا مواخذہ نہیں کر سکتی۔ خواہ اس پر کتنے ہی قلم چلتے ہوں۔

کتنا اچھا ہوا یاسمین آپ کی اس عادت کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے خود کو خشک کا فائدہ دیا اور باعزت بری کر لیا۔

سوال تو خیر یاسمین نے کیے ہیں بس روایتی نمبر نہیں ڈالے۔ وہی سلوک جو بادشاہ، بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

انہوں نے کہلے میرے افسانوں کی ہیروئن ویسے تو بڑی ایکٹو ہوتی ہے مگر دل کے معاملے میں ملت

کہا جاتی ہے۔

دیکھا آپ کو پڑھنے کی انتہا کیا ہے آپ کا۔ میں نے ایک سرے میں پڑھا تھا کمپیوٹر اور آپ کے بابے

میں، گویا دل کا معاملہ سست اور کام چور لوگوں کی ذمے داری ہے۔  
انہوں نے کہا ہے نومات کھانے کے اور بھی سوچتے ہیں۔  
کیا کروں یا سہیں دل کو یہی والا بھاتا ہے۔

انہوں نے مزید بکھا ہے وہ آپ کی کہانی میں ہیرو کا کردار بہت کم ہوتا ہے۔ کیوں؟ اور پھر یہ کہ یہی کم کردار خارج؟

ان کا جملہ ادھورا ہے اور میرے جواب میں بھی خاموشی ہے۔ قارئین کو جواب دینا ضروری ہوتا ہے  
آپ کو نہ بھی دیا تو کیا ہرج ہے؟ ہاں کم کردار۔ یہ بات ہے ذرا غور طلب۔

کم سے کیا مراد ہے۔ کمزور؟ مختصر بے اثر؟  
پتا نہیں کتنے والی کی غلطی ہے یا ہیرو کو پردہ اسکرین سے دور رکھنے کا شوق۔ بھئی خود بھی پتا نہیں  
اور کسی نے پہلی دفعہ شکایت کی۔ اب ذرا دیکھوں گی ایسا کیوں ہوتا ہے۔

پھر آپ نے میرا خیال پوچھا ہے کہ عورت مظلوم ہے یا مرد؟ مرد کی برتری تسلیم کرتی ہیں یا نہیں؟

عورت مظلوم ہے یا مرد؟ ظلم تو ایک اصنافی اصطلاح ہے۔ کبھی مل بیٹھے تو بحث کریں گے۔ آپ غالباً  
اسلام آباد میں رہتی ہیں، کبھی تشریف لائیے۔ یہ عجیب خدا داد فطرت ہے کہ جی چاہتا ہے مرد کو آپ سے  
برتر ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یونہی زبردستی آپ اس کو برتر تسلیم کر ڈالیں۔ شاز و نادر ہی کسی  
ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو برتر لگتا ہو۔ پھر بھی اس کی برتری تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اس کا  
نہ کوئی ایسا رشتہ ہوتا ہے نہ حق۔ وہی آپ کی بات تسلیم کر کے قبول کرنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ میں کسی شخص  
کی کوئی بات نہیں مان سکتی جب تک اسے برتر تسلیم نہ کر لوں۔

دائمہ الونے کسی کھنے والے کے نام پہ پہلہ خط بھیجا ہے اور ان کو شک ہے کہ خط پڑھنے کے بعد  
ان کا نام بھی ذہن سے محو ہو جائے گا۔

نام تو بہت مختلف ہے اور بالکل نیا۔ کبھی سنا ہی نہیں۔ عموماً بعد میں ہوگا پہلے مطلب تو بتائیے۔ اس

قدر محبت کا شکر یہ دائمہ۔ اور چونکہ یہ محبت آپ کے اور میرے مابین ہے لہذا آپ نے جو خوش کن  
اور اچھے اچھے الفاظ میرے لیے استعمال کیے ہیں انہیں شائع کر کے میں کسی کو اس میں شریک نہیں  
کرنا چاہتی۔ شیک ہے نا!

ان کا خط پہلے رنگ کے کاغذ پر ہے اور ان کا اصرار ہے کہ پہلے کاغذ اہم ہوتے ہیں۔ یہ اچھا  
ہے اور ان زرد صفحات پر جو آپ نے میری ڈائری بکھری مرتب کی ہے وہ اور بھی اچھی لگی۔

انہوں نے کھا ہے آپ کا ہیرو اتنا اکڑ و جھپ ہوتا جتنی کہ محترمہ۔ بڑی جدوجہد کے بعد رضا مندی دیتی ہیں  
میرے زمانے کا ہیرو وحید مراد تھا اور اس کے زمانے میں اسی طرح ہوتا تھا۔

عاموشی سے ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کوئی میدان مارنے کی تگ و دو نہیں کرتیں۔ پھر بھی میدان  
مار ہی لیتی ہیں۔ آپ کو ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جو اپنی انا اور خود داری پر آج نہیں آنے دیتیں۔

ایک طرف آپ نے دو معنی تعریف کے بھر دیے۔ اسے آپ کو اعتراف کرنا چاہیے کہ سب سے آخر ایک ہی کہانی  
آپ کیوں کہ رہی ہیں۔ چلے اگلے خط میں پوچھے کہ اگر وہ ہیروئن اور خوشامدی ہیرو کی کہانی کب تک چلے گی۔

آپ کو اگر مجھ میں تنقید کی گنجائش نظر نہیں آتی تو آپ کی محبت ہے جس میں انہوں نے کھا ہے اگر کوئی تنقیدی  
خط آئے تو ضرور چلیے گا پھر انہوں نے دعویٰ بھی کیا ہے کہ میری تحریر میں تنقید کی گنجائش ہو ہی نہیں  
سکتی۔ اگر ہے تو پتا چلے کہ جائز ہے یا ناجائز؟

واہ معنی دائمہ! یہ تو خود ہی فیصلہ ہو گیا کہ اگر مجھ پر کوئی تنقید ہوگی تو ناجائز ہوگی۔ ایسا تو نہیں  
 تنقید تو آپ کو نظر آ رہی ہے اور وہ ناجائز بھی نہیں۔ ہاں آپ کی فرمائش یقینی طور پر پوری کی جائے  
 گی۔ تعریفی خطوط نظر انداز کئے جاسکتے ہیں۔ اس انداز میں کہ ان کی تفصیلات میں نہ جایا جائے، لیکن تنقیدی  
 سوالات کی تفصیل میں ضرور جاؤں گی اور ہاں سوال کہاں ہیں جہاں؟

انگلا خط ارم سلطانہ کہے۔  
 انہوں نے نکھاسے میں آپ کی سب سے بڑی فنین ہوں مگر چلانے والا نہیں۔  
 آپ نکھتی میں بہت بہت پیاری نوکیلی کیشلی رفعت سجاد۔  
 اتنی بے شمار تعریفوں کا شکر یہ۔ اتنی تعریفیں سن کر میں جاے میں نہیں رہتی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔  
 سوالوں کے سلسلے وار جواب عرض ہیں۔

» ایک موسم دل کی بستی کا آئیڈیا آپ کے ذہن میں کہاں سے آیا؟  
 ایک دن فرح دیبانے فون کیا تھا کہ ایک ناول لکھنا ہے اور یہ کہ ہم جس کی فرمائش کرتے ہیں پوری  
 کروا کے دم لیتے ہیں سبھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ میں نے مرعوب ہو کر اسی وقت لکھنا شروع کر دیا۔ اس ناول  
 کی کہانی میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں ماحول خاص تھا۔ وہ بھی غزالہ نگار بتا سکتی ہیں۔ درست تھا کہ  
 غلط ہے کہ میں نے ان کے علاقے کے لوگوں پر طبع آزمائی کی تھی۔ میں اس علاقے میں گئی تھی اور وہاں کی  
 خوبصورتی اور ماحول میں نے مہوت کر دیا تھا۔ کہانی وہیں بن گئی تھی۔ یہ محل دو محلے اور چھوٹے پڑیاں تو ذہنی  
 اختراع ہوتی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔

» آپ کا ہر میر و آنا سسپنس کیوں پھیلاتا ہے؟  
 (فرصت کے وقت عمران ڈائجسٹ پڑھنے کا عادی ہے۔ شاید سسپنس نہیں پھیلاتا) میں آپ کی  
 بات غلط قرار نہیں دے رہی، اپنی وضاحت کی کوشش کر رہی ہوں) ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ پہلی  
 مرتبہ کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ پھر اتفاقاً بار بار آپ کا اس سے  
 سامنا ہوتا ہے اور وہ بتدریج آپ پر لکھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ جاننے کا عمل ہی دراصل سسپنس ہے۔

» آپ کی ہیروئن شروع میں ہیرو سے ناراض کیوں ہوتی ہے؟  
 اسے اصولاً تو ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ ناراضگی بڑا محبت بھرا تعلق ہے اور یہ تو ابھی شروعات  
 ہے۔ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں، محبت بھی نہیں کرتی پھر ناراضگی کا ہے کی۔ ایسے ہی شواہت کرتی ہوگی۔  
 » آپ کی ہیروئن میں انا اور خود داری بہت زیادہ کیوں ہوتی ہے؟

آپ کو تپا ہے دائمہ! جنہیں ہم کوئی خاص پسند نہیں کرتے اور جن سے ہمارے مراسم رسمی ہوتے  
 ہیں ان شے سے ہمارے ہم اپنی خود داریوں کا بوجھ نہیں اٹھاتے۔ ہماری انا وہیں مجروح ہوتی ہے، جہاں ہم  
 اپنی عزت نفس ذرا بھی نیچا پڑتی نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ ہیروئن ہے، محبت کر رہی ہے، بھیک نہیں  
 مانگ رہی۔ خود داری کیوں نہ دکھائے۔

» آپ کے افسانوں کا انجام منگنی ہوتا ہے شادی کیوں نہیں؟  
 واہ... واہ! بہت شاندار نشاندہی کی ہے۔ ایک بڑی پرانی بات یاد آگئی۔ آپ کو یاد ہو گا اک موسم  
 دل کی بستی کا انجام بھی منگنی تھا۔ آخری قسط چھپنے کے بعد بابر صاحب (خدا ان کے درجات بلند کرے)  
 اور فرح دیبا کا فون آیا کہ ایک بڑی کی بہن ہمارے پاس آئی بیٹھی ہے۔ لڑکی کا کہنا ہے وہ اس سانسے  
 قے کی چشم دید گواہ ہے۔ اس لڑکی کو جگر۔ کائینبر تھا۔ ڈاکٹروں نے سخت ناامیدی کا اظہار کیا تھا۔ شاید

ایک ماہ، وہ بھی مشکل۔ اس لڑکی کی خواہش تھی کہ ایک قسط لو بھی جائے جس میں شادی دکھائی جائے۔ وہ لوگ بہت سنجیدہ تھے کہ کیا ہرج ہے ایک مرتے ہوئے شخص کی خواہش پوری ہو جائے تو۔ پتا نہیں مایوسی کے اس عالم میں وہ شادی کی عقل میں شریک ہو کر کس قسم کی خوشی منانا چاہتی تھی۔ ہم نے متفقہ طور پر طے کیا کہ ایک قسط اور بھی جائے اور اسے چھاپنے کے بجائے بطور خاص اسکی کو بھیج دیا جائے۔ میں نے مرینہ سے رابطہ کیا تو پتا چلا وہ تو کوما میں پٹی گئی ہے۔ ان کے والد صاحب نے امید بھر سے انداز میں کہا تھا۔ جو یہی وہ ٹھیک ہوئی آپ کی قسط پڑھ لے گی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ ان کے گھر والوں نے میرے متعدد خطوں میں سے کسی کا جواب نہیں دیا۔ ذہن پر آج تک بوجھ عسوی ہوتا ہے۔

۱۲ تا ۱۳ کیوں کہتی ہیں!

یہ سوال ساری ڈاک میں موجود ہے لہذا جواب آخر میں۔

شادی شدہ زندگی پر کیوں نہیں لکھا؟

لکھا تو تھا۔ تب شاید آپ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہوں گی۔ اس کا نام تھا 'من شراوساں' میرے بہت پسندیدہ افسانوں میں سے ایک ہے۔ ایک اور بھی لکھا تھا، 'تارے ماندنی' سے پھول خرشورہ لیکن غلطی میں اس کہانی پر بہت احتجاج کیا گیا تھا۔ اور پوچھا تھا اس قسم کی کہانیاں کیوں لکھی جاتی ہیں۔ دماغ میں اور سجاد بہت غیر مداخلتی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملے میں قطعی غیر اختیار اور آزاد۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہ ڈرنا ہیں نہ غذاب۔ یعنی تجربے کے میں کچھ لکھ نہیں سکتی۔ اور مشاہدہ تجربے کے مقابلے میں کمزور چیز ہے۔

ریت پر چیرتے جزیرے کے لیے کوئی ایک آدمی ضروری نہیں۔ ہماری اسمبلیاں بھری پڑی ہیں۔

مزدور میلے۔ میں راولپنڈی میں رہتی ہوں۔ اور گورنمنٹ کاغذ فاروین کپورٹ میں ملازمت کرتی ہوں۔ ناول کے سب حقے تیرے پاس ہیں۔ آپ کو بھیج دوں تو اپنے پاس کیا رکھوں۔ یہ تو میں نے بڑھاپے میں پڑھنے کے لیے رکھ پھوڑے ہیں۔

تصویر دیکھ لیں۔ بالکل سانس کے رخ کی ہے۔ چہرہ دیکھنے کا شوق پورا کریں۔

ضلع مانسہرہ سے امینہ خان کہتی ہیں۔

میں آپ کی بے پناہ محبتوں کی مترہن ہوں۔ لیکن مکمل خط کیسے چھاپا جا سکتا ہے۔ پھر تو خواتین ڈائجسٹ والے اس دورہ میں رہیں گے۔ آپ کی محبت کا اظہار میرے لیے ہے۔ میں نے اسے دل میں لکھ لیا ہے۔ باقی لوگ بڑھ کر کیا کریں گے۔

لکھنے کا آغاز کیسے بیس پچیس سال ہو گئے ہیں۔ کالج میگزین۔ ماہنامہ حور۔ ستارہ ڈائجسٹ۔ ادب لطیف نون و جیزو۔ تب میرا نام رفعت نامید فداوی تھا۔ میں سجدہ کہانیاں کہتی تھی اچھا والا ادب۔ جس پر میری پروا کچھ نہ تھی نہیں اور اس کو منانے کے لیے یوں چالیس پچاس صفحوں کی مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پھر جب بتلی ہوئی کہلتی پرائی تو سوچا تاکہ نام کو کیا بنا لگانا۔ خور کا نام ہی کیوں نہ خوار کیا جائے۔

لکھنے پڑھنے پر ہمارے گھر میں کبھی اعتراض نہیں کیا گیا۔ نہ لکھنے اور نہ پڑھنے پر کیا جاتا تھا۔

پسندیدہ کتابیں۔ ادیب۔ شاعر۔

کیمو پٹا۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ میں اس سلسلے میں بہت جذباتی ہوں۔ مجھے تو وہ لکھنے والے بھی یاد ہیں جو ماہ حور کو خود ہی بھول بھی گئے ہوں۔ شہناز گل رضوی تھیں۔ ان کے افسانے میں ایسی شدید گرفت ہوتی تھی کہ آپ افسانہ ختم کرتے ہی پھر سے صفحے پلٹ کر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور پھر لگتا تھا آپ پہلی دفعہ پڑھ



رہے ہیں۔ اس زلملے میں اور طرح کے افسانوں کا رواج تھا۔ فرضی شہر۔ مافوق الفطرت سمجھتیں۔ غموں کا نام یا خودکشی۔ افسانے میں جس قدر شدید مایوسی ہو اسی قدر کامیاب۔ ایسے میں شہناز گل رضوی ایسے سچے اور تازہ۔ خوشبوؤں سے بھرے افسانے لکھتی تھیں جن میں ذرا بھی غیر قدرتی بات نہیں ہوتی تھی۔ مہر تاباں کسی کو یاد ہیں، کیا بات ہسان کی تھی۔ کم لکھنے کی شکایت ان سے کرتی چاہیے۔

ایک کٹورہ عمر تھیں۔ ان کا افسانہ "آن" میں ہر روز دو سو سو کوڑھی تھی۔ (میں عصمت چغتائی وغیرہ کا نام نہیں لے رہی۔ وہ سکتے بند اویب ہیں۔ انہیں کسی کے سرٹیفکیٹ کی حاجت نہیں)

پسندیدہ کتابیں: 1۔ آواز دوست۔ آگ کا ادبیا۔ دشت سوس NAUSEA WORDS اور بھی بہت سی ہیں۔ پھر کبھی بتلنے لگوں تو کچھ اور نام ہوں شاید۔

پسندیدہ ادیب: 1۔ درجینا وولف۔ البرٹو مورایا۔ مختار مسعود۔ مشتاق احمد رومی اور ایک زلملے میں شفیق الرحمن پر جان دیتے تھے۔

شاعر: 1۔ فیض۔ مصطفیٰ زیدی۔ میر نیازی اور اگر اس کو جانب داری نہ سمجھا جائے۔ فرمن کیا سمجھ بھی لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ میری عزیز ترین دوست شہناز پروین سحر۔ وہ بھی اب قصہ پارینہ ہیں۔

میں موضوعات کا انتخاب سن سنا کر کرتی ہوں لیکن مختلف مائتیں کیفیت وہی بیان کرتی ہوں جو مجھ پر کبھی نہ کبھی ضرور ہوتی ہو۔ دوسری بات بھی آپ کی درست ہے۔ سچی کہا۔ نول کو افسانے میں اس طرح مدغم کر دیں کہ سچ جھوٹ کا پتا ہی نہ چلے۔

میری بیرونی کو علم روزگار کیوں لاحق ہوتا ہے؟  
 "شاید اس لیے کہ میری بیرونی بالی عمری کبھی نہیں ہوتی۔ کم عمری میں اپنا وصال عشق کرنے کے بجائے اور کسی مصروفیت میں لگانا چاہیے۔ کتابیں پڑھیے۔ نئی نئی چیزیں سیکھیے۔ تفریح کیجیے۔ اچھائی وی دیکھیے۔ یہ سولہ سال کی لڑکی اور اٹھارہ سال کا لڑکا زینتی وی کی دین ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ ایک خاص عمر سے پہلے کی محبت دراصل غلط نہیں ہوتی ہے اور اگر انجام بخیر نہ ہو تو محبت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر صبح عمر میں یہ اور اک ہوتا ہے کہ محبت کے لیے مناسب عمر تو یہی ہے۔ وہ جذبہ ایک نثر قائم رہتا ہے اور پھلی ہاتھ محبتیں اور مزید محبتیں ہی لگتی ہیں۔ تو باتوں کی بی بی کہ آپ علم عشق میں مبتلا ہونے سے بچ گئے۔ تو علم روزگار میں تو انہیں گئے ہی نال۔ بے کار ہونے کا کیا کر سکتے۔"

ہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ دعا کرتی ہوں خدا ان کی شکل نہ دکھائے۔ مثلاً ہنٹا ہر سا وہ نظر اگر مٹا دیاں کرنے والے۔ اور یہ فقرہ بولنے والے: "ہا۔ آپ نے اب بتایا ہے اگر مجھے پہلے بتاتے تو یہ سا منہ بہت تعریف کسا اس کے رونا ہوتے ہی عیب نکالنے والے۔ ویسے تو مجھے خود بھی برائی برائی کھینچنے میں بہت مزا آتا ہے لیکن بس اس فرق سے کہ اس کے منہ پر بھی تعریف نہیں کی جاتی۔ میرا بھائی انور کھانے کی کوئی چیز سب کے درمیان لاکر رکھ دیتا تھا۔ اور کتنا تھا: "او برائی برائی کیلیں! (کچھ کھانے کی چیز درمیان میں رکھی ہو تو برائیاں بڑی تیزی سے کی جاتی ہیں۔)

کوئی ایسا شخص جواب کا آئیڈیل ہو؟"

(باقی آئندہ)

بڑی امثال اپنے پانچ پوتوں اور ایک پوتی رسیا کی ذمے داریاں تن تنہا سنبالے ہوئے تھیں۔ ایک پوتا چاند شاہی کر کے امریکہ چلا گیا تھا۔ رسیا لڑکوں کے ساتھ رہ کر ان ہی کی طرح بولنے کی عادی ہو گئی تھی۔ باوجود بڑی امثال کی شدید ڈانٹ ڈپٹ کے وہ خود کو لڑکی سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

پاشا بظاہر ایک ہینڈ سم وجیہہ نوجوان تھا۔ لیکن اپنی اوباش فطرت اور ناجائز طریقوں سے دولت کے حصول کی وجہ سے بدنام تھا۔ ماہ نور اسی کے محلے میں رہتی تھی۔ ماہ نور کی طرف ایک بہن تھی شمسہ، والد بیمار رہتے تھے۔

شاہانہ اور نفیس خواجہ اپر کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ شاہانہ سے ان کا صرف ایک بیٹا تھا سنی جبکہ دوسرا بیٹا مون نفیس خواجہ کا تھا۔ مول اور بانگی کو ان کے گھر والے عزت کی وجہ سے شہر میں شاہانہ کے گھر چھوڑ گئے تھے۔ شاہانہ کا ان کے ساتھ سلوک اچھا نہیں تھا۔

## رفعت سراج

# طائر اللہ

چوتھی قسط

دستک دینے کے بعد انتظار کا دورانیہ۔ جیسے وقت ٹھہر گیا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ لینے میں شرا بور ہو چکی تھی۔ خاندان بھر میں جتنے کزن تھے آج تک اس کی طرف ان سے رسمی بات چیت ہوتی تھی۔ اس میں سراسر اس کی اپنی طبیعت کا دخل تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کے تاثرات لکھے نظر آتے تھے کہ خواہش کے باوجود کوئی اس سے اپنے طور پر بات نہیں کر پاتا تھا۔ خوبصورت چہرے پر جمی ہوئی برف اتنی واضح ہوتی تھی کہ سامنے والے کے اپنے احساسات ٹھنڈے جاتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مظاہر نے دروازہ کھولنے کے بعد بڑی حیرت و استعجاب سے پہلے اس کی طرف پھر وال کلاک کی طرف دیکھا۔

اڈ۔ اندر آ جاؤ۔ خیریت؟ وہ کسی دھیان سے چونک کر گویا ہوئے۔

ماہ نور خاموشی سے اندھا گئی۔ مظاہر نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔

ماہ نور نے پلٹ کر بیٹھنے سے قبل ان کی سمت دیکھا۔

دروازہ بند کر دیجیے مظاہر بھائی۔ اس کی آواز مڑوں کی طرح پھوٹی۔

نہیں۔ ٹھیک ہے۔ مظاہر نے اس کی واضح تاکید پر واضح انکار کیا۔ اور واپس آ کر اپنے بیڈ کے ایک

کونے پر ٹنگ گئے۔ ماہ نور ایک ثقافت کا نشانہ کی آرائشی کرسی پر پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

چند لمحوں خاموشی سے سرک گئے۔ مظاہر سراسر سوالیہ بنے ہوئے تھے مگر خاموش تھے۔



READING  
Section



وہ۔ مظاہر بھائی، ماہ تو نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں واضح لرزش تھی۔  
 دراصل۔ ایک بہت پریشان کن مسئلہ ہے۔ اسی وجہ سے آج یہاں آئی ہوں۔ اس نے الفاظ ترتیب  
 دینا شروع کیے۔

ہوں۔ ہوں۔ کہو۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ کہ تم ہمیں اس قابل سمجھتی ہو۔ اطمینان رکھو مسئلہ بیان  
 ہونے سے پہلے تمہارا ہے اور اس کے بعد جب سمنے آہلے گا تو ہم سب کا یعنی یہاں جتنے لوگ ہیں وہ  
 سب تمہارے اپنے ہیں۔  
 انہوں نے بھر پور اطمینان دلایا۔ گولڈن پھولوں والے کان کے سینڈ ناٹ سوٹ میں وہ زندہ بھری آنکھوں  
 میں الجھن لیے بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

نہیں۔ نہیں۔ جو بات میں جتنے جا رہی ہوں۔ وہ بس آپ تک رہنا چاہیے۔ وہ بے ساختہ  
 گھبرا کر بولی۔

چلو ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ کہو۔ کیا بات ہے؟ تجسس اپنے کمال کی طرف بڑھ رہا تھا۔  
 ماہ تو نے ہونٹ کاٹتے ہوئے نگاہ اٹھا کر ان کی سمت دیکھا۔ وہ ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس نے فوراً  
 نظریں جھکالیں۔

وہ ایسا ہے مظاہر بھائی، وہ پھر جھمک کر رگ گئی۔

مظاہر خاموش رہے۔

ایک شخص مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ میرا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ تا تا کہتے ہی وہ ہچکیوں سے  
 رو پڑتی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ اچھپا لیا تھا۔

مظاہر بڑی طرح چونک پڑے۔ اس کے رونے کے انداز نے نہیں بے حد پریشان کر دیا تھا۔ ایک تلوار  
 سے پریشان کن خیالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

اول۔ ہوں۔ رونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیا کہتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ وہ بڑی  
 ٹکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔

رہتا تو پتا نہیں کہاں ہے۔ مگر روز راتے میں پریشان کرتا ہے۔ شاید بہت بڑا بد معاش ہے۔ فدا  
 چلتوں کی پروا کرتا ہے نہ کسی اور بات کی؟ وہ رگ رگ کر بتا رہی تھی ساتھ ہی آنسو بھی صاف کر  
 رہی تھی۔

کیا نام ہے اس کا؟۔ مظاہر گہری سوچ کے پاتال سے باہر آئے۔

پاشا کہتے ہیں۔ اس کی ماں نے اس کا پورا نام منہاج حسین پاشا بتایا تھا۔ وہ بولتی چلی گئی۔

ماں؟ اس کی ماں کو تم کیسے جانتی ہو؟۔ جیکہ تمہیں تو یہی نہیں پتا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟۔ مظاہر  
 بڑی طرح الجھ گئے۔

وہ ساکت سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ جو کچھ منہ سے نکل گیا تھا اب اس کی وضاحت درویش تھی۔

مظاہر ہنوز سوالیہ اور حیران نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔

اس نے جھجکتی ہوئی نظریں اٹھائیں مگر فوراً ہی جھکالیں۔ مظاہر دونوں ہاتھ جوڑ کر مونٹوں پر رکھے بغیر  
 اسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

وہ پرو لوزل لے کر آئی تھیں۔ اس کی آواز بے حد آہستہ تھی۔

تمہارا؟۔ وہ پھر چونک پڑے۔

READING  
Section

ماہ نوردے اثبات بھری خاموشی اختیار کیے رہی۔  
 اسی کا یہ میرا مطلب ہے یا شا کا؟ مظاہرہ کو پتہ نہ تھے۔  
 اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”تمہیں پسند نہیں تو انکار کرو۔ مسئلہ کیا ہے؟ سیدھی سی بات ہے۔“ مظاہر نے اُلجھ کر کہا۔  
 سیدھی سی بات نہیں ہے نا۔ اس نے دھکی دی ہے کہ انکار نہیں ہونا چاہیے۔  
 اس کی ماں کے ذریعے دھکی لی ہے؟“ مظاہر اب فکر مند ہوئے۔  
 نہیں؟ وہ نہیں کہہ کر میری خاموشی ہو گئی۔

”اس نے خود دی ہے۔“ مگر کہاں؟“ مظاہر نے پوچھا۔ آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ اب وہاں اطمینان  
 حیرت تھی، فکر مندی تھی۔

”کیا راستے میں اتنی بات کرنا ممکن ہے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”اس کے لیے تو ممکن ہے۔ ماہ نوردے کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔  
 کیا تم فیور ہو کہ وہ بد معاش ہے؟“ وہ بہت کچھ اپنے طور پر سمجھ کر اگلے سوال کی طرف آئے۔  
 تو اور کیا۔ انسان کا اسٹائل بتا رہے؟“ وہ بولتی۔

”ہو سکتا ہے اسٹائل دھوکا دے رہا ہو۔ معلومات کیسے لیتے ہیں اگر نارمل ہے، ٹھیک ہے تو؟“  
 نہیں نہیں؟ ماہ نوردے جیسے تڑپ کر انہیں ٹوکا کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں اسی لیے  
 آئی تھی آپ کے پاس؟“ وہ برا مان گئی۔

”بہت بڑی شکل ہے؟“ مظاہر نے پہلی بار صورتاً شگفتہ انداز اختیار کیا۔ لہجہ معنی خیز تھا۔  
 ماہ نوردے کو ٹوٹ کر حیا آئی ان کے انداز پر۔

”انسان اندر سے اچھا نہ ہو تو کتنی اچھی شکل ہو پوری ہی لگتی ہے۔“ وہ بڑی سمجھدگی سے کہہ رہی تھی۔  
 ”اس کا مطلب ہے شکل اچھی ہے۔“ خیر جب نہیں ہی اچھی نہیں لگتی تو بے کار ہے۔ ٹھیک ہے میں  
 پھوپھو کو کہ دوں گا کہ ماہ نوردے پر پولیوزل منظور نہیں آپ انکار کر دیں؟  
 آبا جان پہلے ہی انکار کر چکے ہیں۔ آپ بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟“ انکار تو ہونا ہی ہے۔ مسئلہ انکار  
 کے بعد کب ہے؟“ اس نے گویا اپنا سر پیٹ لیا۔

”بہت دیتے ہیں لوگ گیدڑ بھجکیاں۔ کوئی ضرورت نہیں ڈرنے کی۔ تم نے پھوپھو سے یہ پراہم و کس  
 کی ہے؟“ مظاہر نے اس مرتبہ قدرے پُرسکون اور لا پرواہ انداز میں اس سے بات کی۔  
 ان سے کہہ بھی مت دیجئے گا کھانا پینا سونا سب چھوٹ جلتے گا ان کا۔ میری اور شمس کی شامت آجائے  
 گی۔ مجھے بھی چھوڑے بے چاری شمس کو کاٹاجے اٹھائیں گی۔ آبا جان آل ریڈی بیمار ہیں۔“  
 وہ اپنی ملازمت کی اہمیت کا ذکر گول کر گئی کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی نازک لمحے میں مظاہر سے معاشی  
 تعاون کا یقین دلا بیٹھیں اور ماں سے پہلے اسے ملازمت چھوڑنے کا مشورہ دینے لگیں۔ اس کی خود وار طبیعت  
 کو یہ سب گوارا نہیں تھا۔

”ان سے کہہ سکتی تو پھر آپ سے کیوں کہتی؟“ اس نے جھلنے کے انداز میں کہا۔

”یہ بس شک ہے۔ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی، سو؟“ مجھے اندازہ تو ہونا چاہیے؟“ مظاہر کو واقعی اندازہ  
 نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

”آپ اس سے ایک مرتبہ مل لیں اور اسے ڈانٹ دیں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہے میرے آگے پیچھے کوئی“

نہیں سے نو ماہ نوردنے وضاحت کی۔  
مگر کہاں؟ مظاہر پھر اچھڑ گئے۔

وہیں راستے میں نو ماہ نوردنے جواب دیا۔

لیکن راستے میں تو مناسب نہیں ہے۔ بقول تمہارے وہ بد معاش ہے۔ بات کسی اتہا تک بھی پہنچ  
سکتی ہے۔ اس طرح تم سب کی نظروں میں آسکتی ہو پھر تمہارے لیے ہی مشکلات پیدا ہونے لگیں گی۔  
پھر۔۔۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو گئی۔

پھر یہ کہ تم میرے فون نمبر لے لو۔ اور مجھ سے کونٹیکٹ میں رہو۔ اس کی والدہ جواب لینے کب آئیں گی؟  
مظاہر نے سوال کیا۔

پتا نہیں! اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انہوں نے بھی اپنے بیٹے کے اسٹائل میں بات کی تھی۔ یا نارمل انداز تھا؟ مظاہر نے کچھ سوچتے ہوئے  
انکا سوال کیا۔

نارمل انداز تھا۔ وہ ہرگز اس کی والدہ نہیں لگتیں۔ بہت مختلف ہیں۔ ماہ نوردنے دبے دبے لہجے میں  
جواب دیا۔

ہوں۔ پھر تو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے طور پر اس کا آنا پنا اور کار گزاریاں  
معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سائڈ ٹیبل سے چرسے اٹھا کر اپنا  
وزیٹنگ کارڈ نکالنے لگے۔  
ماہ نوران کے آخری جملے کے بعد نہایت پُر سکون نظر آنے لگی تھی۔

ہمارے اہل لڑکیوں کی اتنی لمبی لمبی زبانیں پسند نہیں کی جاتیں۔ اپنے بڑے بھائیوں کو کبھی دیکھا ہے جواب  
دیتے ہوئے؟

آج پھر ریشا کو جھاڑ بڑی تھی۔

لیکن بڑی اماں! آپ میری صرف بڑی اماں ہی نہیں ہیں۔ امی جان بھی ہیں۔ نانی جان بھی ہیں۔  
خالہ جان بھی ہیں، دوست بھی ہیں، کزن بھی ہیں؟

ہیں۔ ہیں۔ ایں۔ کیا بولے علی جا رہی ہے۔ میں صرف تمہاری دادی ہوں۔ بڑی اماں رشتوں کی اتنی  
طویل فہرست سنتے ہی پریشان ہو گئیں۔

پھر آپ مجھے میری اتنی لاکر دیجئے۔ کیونکہ اور رشتوں کے بغیر تو گزارا ہو سکتا ہے اتنی مگر بہت ضروری  
ہیں۔ اس نے پچھکانہ انداز میں بھٹک کر کہا۔

تلمیہ باہر نکلنے کے لیے لاؤنج کا دروازہ پار کر چکے تھے۔ ایک دم پلٹ کر واپس آئے۔  
ریشا! کیوں تنگ کرتی ہو بڑی اماں کو؟ اب تم کوئی بہت پھولی پوچی نہیں ہو۔ بڑی اماں بہت

کمزور ہیں اور بہت تنگ بھی لگی ہیں۔ دنیا میں بہت سے انسان ایسے ہیں جو والدین کے بغیر بڑھاپا  
چڑھتے ہیں۔ مت پریشان کیا کرو بڑی اماں کو۔ کیوں اپنے آپ کو یقین نہیں دلاتے کہ تمہارے ماں باپ  
اب دنیا میں نہیں ہیں؟

اللہ نے کرتے۔ بڑی اماں نے ہول کر دل ہی دل میں کہا۔ تلمیہ بہت تلخ لہجے میں کہہ کر باہر چلے گئے تھے  
بڑی اماں ریشا کو سنجیدہ اور اندر اندر دیکھ کر تڑپ سی گئیں۔ انہوں نے بہت محبت سے اس کی پیشانی

پر سے بال ہٹائے۔ وہ ان کے زانو پر سر رکھے لیٹی تھی۔

” بڑی اماں۔ کیا ان دونوں کی ایک ہی روزنہ تھی۔ اگر نہیں تو پہلے کس کی ڈیوٹی تھی؟“

اس نے نظر میں اٹھا کر بڑی اماں کا سنا ہوا پریشان چہرہ دیکھا۔  
ان کی آنکھوں سے چند قطرے نکلے اور جھرتیوں میں بھٹک گئے۔  
انہوں نے جھک کر ریشیا کی پیشانی پر ہوسہ دیا۔ اللہ تمہیں ہر مشکل اسر ڈکھ سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین؛  
یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔ بڑی اماں نے اس کی آواز میں سنجیدگی اور الجھن تھی۔ بڑی اماں نے  
جواب میں مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی۔

جمال اور انظار آج صبح سے نکلے ہوئے ہیں۔ شام ہونے کو آئی۔ اللہ جلنے کہاں رہ گئے بیٹھے؟  
آج میں نے تمہارے لیے بروسٹ لانے کے لیے کہا تھا۔ ظہر سے۔ تمہیں پسند ہے نال؛ مگر شت تو  
تم شوق سے کھاتی نہیں ہو۔ اسی لیے ظہر سے کہتی ہوں ہنٹے میں ایک بار لے آیا کرے۔ تمہاری بڑھنے کی  
عمر ہے۔ دودھ تم شروع سے ناپسند کرتی ہو۔ مجھے تو یہی لگتا رہتا ہے کہ کمزوری نہ رہ جائے۔ اس عمر میں تو  
بچوں کو ہر چیز کھانا پینا چاہیے۔ نیا خون بنتا ہے۔ امتحان اچھی ہوتا ہے؛  
ان کے بچے کا زور ٹوٹنا ہوا تھا۔ دھیمی اور ملائم آواز میں وہ اس سے یوں مخاطب تھیں جیسے ویرے  
ان کے درمیان یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

مومل نے اسے قریب سے سنی کی آواز سنائی دی۔ اور گویا اس کی روح پرواز کر گئی۔ پتھر اکہڑی جگہ کھڑی ہو  
گئی۔ آواز کہیں گم ہو گئی۔

” مومل یہ اس بار سنی کی آواز تیر تھی۔“

” جی صاحب؛ اس نے بمشکل علی سے آواز نکالی۔“

” بڑھیا کہاں ہے؛ اس کا روپ اس وقت صبح سے قطعی مختلف تھا۔“

” وہ تو سو گئی ہوگی؛ وہ لرزتے ہوئے کہہ رہی تھی۔“

” تمہاری بہن کہاں ہے؛ وہ عجیب سے بچے میں پوچھ رہا تھا۔“

” وہ بھی سو گئی صاحب؛“

” تم کیوں جاگ رہی ہو؛“ وہ غراہا۔

” م۔ میں بھی سو رہی ہوں؛ اس کا رنگ خوف سے سفید پڑ چکا تھا۔ گھوم پھر کر بکھت رات پھرا گئی تھی۔“

میرا بیڈروم فرنیچر خراب ہے۔ جب تک ٹیبلک نہ ہو تم روز رات کو اسی وقت میرے بیڈروم میں

برف لایا کروگی؛

مومل پتھر پتھر کا پتے لگی۔ سنی اتنا کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ مومل نے بمشکل گردن موڑ کر اس کو جلتے ہوئے دیکھا۔  
کچھ دیر کھڑی اپنی سالیس سنحالی رہی پھر خوف کے اس مقام سے ایک اڑان بھری جہاں استہالی خوف  
یکدم بے خوفی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ بلا ارادہ بے اختیار یون کے بیڈروم تک چلی آئی تھی۔ اس نے  
دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری تیسری بار بھی خاموشی رہی تو اس نے ہینڈل کھا کر اندر جھانکا۔ اندر کوئی  
بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اندر داخل ہو گئی پھر دروازہ بند کر دیا۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ مون کی واپسی رات گئے ہوتی ہے۔ اس نے اندر سے چٹخنی لگائی تھی اور دروازے سے  
ہان لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا روال روال دغا کرتا تھا۔

اس کے پاس علم نہیں تھا۔ اسے کائناتی ذہن سے رابطہ کا سلسلہ نہیں آتا تھا۔ مگر روح لاشعوری طور پر اپنے خالق سے ہمہ وقت مربوط رہتی ہے۔ اور وہ اس کا تقاضا لگتی کا محتاج نہیں۔  
روز اول جب خالق کائنات نے انسانیت پر برکت (پہچان کو میں تمہارا رب ہوں) کہا تو تمام ارواح نے بلی کہہ کر پہچاننے کا اقرار کیا تھا۔

اسے فاضلانہ وظائف و درود نہیں آتے تھے مگر جیتی سانس تو خالق سے پیوست تھی۔ پکار کا عمل تو جاری تھا۔ اس لیے کہ خالق و تخلیق جسے بیچ بلی موجود ہے۔ جانے کب تک وہ میز موجود ہو کر صرف دعا ہی رہی۔ باہر کسی کے چلنے پھرنے کی آوازیں کئی مرتبہ ابھر کر معدوم ہوئی تھیں۔ اور ہر مرتبہ اس کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔ اسے گھڑی میں وقت دیکھنا نہیں آتا تھا مگر گھیر بھی گھڑی کی سوئیوں کو ایک ٹکے تک جاری تھی۔ شاید اس احساس ہی سے تعویذ پڑھ رہی تھی کہ گھڑی کی سوئیاں اسے کھسک رہی ہیں تو وقت گزر رہی رہا ہے۔

بیٹے بیٹے اس کی ٹانگیں سن ہونے لگیں۔ تب اسے عسوس ہوا کوئی اینٹل گھا رہا ہے۔ اس نے قدموں کی چاپ سنی تو تھی مگر ڈر رہی تھی کہ ہو سکتا ہے سنی اسے تلاش کر رہا ہو۔

اس نے بہت بہت کر کے پوچھا تھا: "کون؟"

کون ہے اندر؟ سوال کے جواب میں بھی سوال تھا۔

اس نے مون کی آواز پہچان کر جھٹ پٹنئی گرا دی۔

مون اسے اپنے بیڈ روم میں پا کر حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

کیا کر رہی ہو ادھر۔ اس وقت؟ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

مون نے جواب دینے کے بجائے دروازہ بند کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا۔

صاحب۔ میں کہاں جاؤں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے! اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

کیوں لگ رہا ہے ڈر اور کس سے؟ وہ نے ہونے انداز میں ہاتھ کر کے دونوں حصوں پر جمائے اسے

گھور رہا تھا۔ ساتھ ہی سوچ اس کی نظروں تک میں آسانی تھی۔

وہ سنی صاحب!

مون بڑی طرح چونک بڑا۔ کیا ہوا ہے؟

کچھ نہیں جی۔ وہ پھر مجھ سے برف منگ رہے تھے، وہ بچکھاتے ہوئے گویا ہوئی۔

پھر سے کیا مطلب؟ گزری ہوئی رات کے معنی اس پر آنا فانا منکشف ہونے لگے۔

مم مجھے ان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیں وہ ماسی سے برف منگا لیا کریں! وہ بہت

آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی۔

کیوں لگتا ہے تمہیں اس سے ڈر؟ جس سوال کا جواب خوف ہی پتا ہوا اس سوال میں صرف بے روح

الفاظ کی قطار ہوتی ہے۔ اس لیے مون خاموش رہی۔ سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

کل رات کو جب تم بجاتی ہوئی باہر آئی تھیں اس وقت بھی اس نے تم سے برف منگائی تھی؟ مون نے

گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کلائی سے رسٹ واچ اتارتے ہوئے پوچھا۔

مون خاموش گھڑی کا ریٹ کو گھورتی رہی۔

مون نے رسٹ واچ سائیڈ بیبل پر رکھ دی اور قیص کا اوپری ہٹن کھولنے لگا۔ اسے ایک گہری سوچ

لاحتی تھی۔



”حالانکہ میں نے تم سے کل بھی کچھ پوچھا تھا۔ تم انتہائی احمق ہو۔ اسٹوڈنٹ۔ ماسی کو کیا بتایا تم نے؟“ مون کوئی اسٹینڈ لائن سے پہلے ٹیک ٹھاک باخبر ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں صاحب۔ اب اوسان قدرے بحال ہو چکے تھے۔“

”مون نے ایک اچھتی نگاہ اس کی بد رنگ اور مٹی پر ڈالی۔ جس کو اس کے ہاتھ بھی چھو چکے تھے۔ کل یہ زینے پر پڑی ہوئی تھی۔ مومر مل ہو چکا تھا مگر پیشانی پر لکیریں بکھری تھیں۔“

”تمہارے ماں باپ تم سے ملاقات کرنے کہاں گئے؟ وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔“

”اللہ سائیں جانے صاحب۔ سوشل کی اداسی برآمد ہوئی۔“

”ٹھیک ہے۔ بابا اللہ یار کل تمہیں گوٹھ چھوڑ آئے گا۔“ مون نے کہا۔

”سوشل کی آنکھیں غوشی سے چمکتے تھیں۔ گوٹھ۔ جہاں بادام کے درخت کے نیچے اس کی ڈھیروں سکھیاں اس کی راہ دیکھ رہی تھیں۔“

”آپ بہت اچھے ہیں صاحب۔ لیکن صاحب۔ ماسی کو ارٹریں سو چکی ہے۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“

”کو ارٹریں یہاں سے فوری طور پر اور میں کو مٹی میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے باہر نکل کر بہت ڈر لگے گا۔ میں اوسر تالین پر سو جاؤں گی۔ پھر صبح چاچا اور بانگی کے ساتھ گوٹھ چل جاؤں گی۔“

”نہیں بھئی۔ تم اوسر نہیں سو سکتیں۔ واٹس ایپ بلا لیں۔ وہ بھلا یا۔“ میں گھر میں موجود ہوں، کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ۔ کہیں بھی جا کر سو جاؤ۔ ہری آپ۔“ اس نے قدرے ناگواری سے اس کے وجود کی طرف دیکھا۔

”درحقیقت وہ خود بڑی طرح الجھ گیا تھا۔“

”وہ اسی طرح اپنی جگہ جمی کھڑی رہی۔ مون کی موجودگی سے جو خوف کی دھند چھنی تھی وہ ابھی اس بڑسکون احساس میں دیر تک بھٹکے رہنا چاہتی تھی۔“

”جاؤ بھئی یہ وہ برہم ہو گیا۔“

”وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مون اپنا نائٹ شوٹ نکال کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔“

”سفید کائٹ کے نائٹ ڈریس میں باسرا یا تو وہ ہنوز اپنی جگہ ایسا وہ مٹی زندگی کی ناخوشگوار یوں سے بوجھل اعصاب نئی مصیبت پر صبح بچھنے لگے۔“

”جی تو جانتا تھا دکھانے کے باہر کرے۔ اس نے تھکی ہوئی خوابد مگر فہرا کو نظر اس پر ڈالی۔ وہ بے آواز زور ہی مٹی۔ اور اپنی بوسیدہ اور مٹی سے آنسو بھی پونچھ رہی تھی۔“

”ناگ، کان، ہاتھ۔ کوئی نقلی زیور بھی نہیں تھا۔ وہ خود ہی سراپا زیور تھی جس کی چوری کے دھڑکے لگ گئے تھے گندی رنگ، سرخی مائل بھورے بال، بھرے بھرے پیاز می ہونٹ، حواسکوں کی روانی روکنے کی کوشش میں کانپ رہے تھے۔“

”لوگ آج کہیں آدھا تو لہ کسوتا بھی رہیں رکھیں تو ڈھائی سزار مل جائیں۔ اور ان کے بے بس والدین دو تین لال لٹولوں کے عوض پورا خزانہ رہن رکھ گئے۔ جہلنے لگے، ہی لمحے میں اپنے اصل کی طرف پل دوپل کو متوجہ ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر، اتنی بھاری ذمے داریاں۔“

”رات کے چند گھنٹے ہی تو باقی ہیں۔ صبح مصیبت گوٹھ روانہ ہو جائے گی۔ باقی مٹی کو ہینڈل کرنا رہ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم دروازے کے پاس سو جاؤ۔“

”سوشل کی گریبا جان میں جان آگئی۔ اس نے تشکر بھری نظروں سے مون کی طرف دیکھا۔“

”سکے نیچے رکھنے کے لیے لاؤنج سے کوئی کٹن اٹھالو۔ اس وقت وہ اسے معمولی نوکرانی نہیں ایک بے بس روح نظر آ رہی تھی۔ اور کل اس نے اور مٹی زینے سے بڑھٹھائی ہوئی۔ تو شاید طبیعت میں اتنی گہرائی بھی بدلنے ہوئی۔ اس کے لئے اند کوئی اسے پڑھو و تا کید کر رہا تھا کہ اس عزیز کو بند دروازوں کے نیچے نہا چھوڑنا۔“

”یونیورسل بلنڈر ہو گا اور اس کے ہاتھوں ہو گا۔“

۱۰ میں لائٹ آف کر رہا ہوں۔ فہرہ و لہ بند کر کے سو جانا وہ تو۔ اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ اس کی تاکید کے باوجود کون تک لینے باہر نہیں آگئی تھی۔  
 مون نے لائٹ آف کی اور اپنے بیڈ پر چلا گیا۔ مون نے دروازہ اچھی طرح بند کیا بلکہ چٹخنی بھی لگا دی اور اوڑھنی کو گول گول کر کے سینے تک بٹا کر رکھ دیا۔ احساس تحفظ کی تھکیوں نے تھکے ہوئے وجود کو چاند لہلوں کے اندر ہی بندگی وادوں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ بالکل دروازے کے ساتھ لی سو رہی تھی۔  
 مون کو اگرچہ اس کی موجودگی کے احساس سے بہت کوفت ہو رہی تھی مگر وہ خود کو سمجھا کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

مون نے نیند سے چور آنکھوں سے جو آخری منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ مون بائٹھ روم میں داخل ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ سو گئی تھی۔  
 پھر نیند ٹوٹی تو ایسی کر بس ہمیشہ کے لیے قسمت کے کھاتے میں جا پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی کے سخت پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ وہ دم۔ خود دوسرا سیر بیک وقت تھی۔ وہ سبز کارپٹ پر لیٹی بیٹی بیٹی آنکھوں سے اندھیرے میں جیت کو یوں گھور رہی تھی جیسے ادھر کوئی روزن تلاش کر رہی ہو۔  
 مقوڑی ہی دیر بعد فجر کی آذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ مون اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ اور جلتے ہوئے دروازہ بند کر گیا تھا۔ اب اس کی خواب گاہ میں وہ نہا تھی۔ وحشت زدہ دل بے تبت۔

۱۱۔ بس۔ مقوڑا سا اور پڑھ لوں پھر جی۔ ٹی پائلٹ بننے کی ٹرائی کروں گا۔  
 اللہ کی شان یہ جی۔ ٹی پائلٹ بنیں گی۔ ناسا میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ آخر ایک دن تو انشا اللہ پاکستان بھی کوئی بیٹل خلاء میں بھیجے گا۔ کتنی اچھی لگو گی تم مثل میں بیٹھی ہوئی۔ ہم سب تمہیں سی آف کریں گے اچھوں کی طرح دیر تک ہاتھ ملاتے رہیں گے حالانکہ تم تو اسٹاپ واچ کا ایک چکر پورا ہونے سے پہلے کئی لاکھ کلومیٹر طے کر چکی ہو گی۔ بلکہ کئی کروڑ کلومیٹر۔  
 ۱۲۔ اظہار بھائی۔ آجیکشن۔ مثل کو کم از کم روشنی کی رفتار سے تو چلا میں۔ زیادہ تیز از رسی ہے۔ آپ تو یورینورسل فار مولے میں گڑ بڑ کر رہے ہیں۔ قیامت بھی آسکتی ہے۔ منظر نے لڑکا۔  
 بے چارہ جمال آنکھیں بھاڑ کر تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ ریا تو جھلا کر ان کے درمیان ہی سے اٹھ گئی۔ کتنے اہتمام سے وہ جمال کو اپنا فیور چر پلان بتانے لگی تھی۔ کبھی جو یہ دونوں اسے کوئی بات سنجیدگی سے کرنے دیں۔

ماہ نور دور کھڑی اپنی چادر پلاستی کر رہی تھی۔ مظاہر کہہ گئے تھے کہ وہ شام چھ بجے اسے گھر ڈراپ کرنے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ بڑی بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کی ٹوک جھونک سن رہی تھی۔

۱۳۔ آپ تو ویسے ہی اتنے حاضر جواب ہیں۔ میدان کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ جمال نے ریا کو جانے سے باز رکھنا چاہا۔

۱۴۔ اور کیا ہیں دیکھو۔ حضرت و اے جہاں بیٹھے بیٹھے گئے۔ منظر نے مکرال لگایا۔  
 ۱۵۔ آپ لوگ انہیں انسانہ ستایا کریں۔ آخر چھوٹے ہیں یہ۔ جمال نے پھر سمجھایا۔  
 ۱۶۔ نہ انوں ٹیٹ کرتے ہیں آپ کی طرح نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ آخر مجھے سمجھتے کیا ہیں؟  
 ۱۷۔ ریا، جمال کے انداز پر مسکراہٹ دبا کر گویا ہوئی۔

۱۸۔ میں انوں ٹیٹ کرنے کے لیے اسپیشل لوگ آئے ہیں۔ ہندوستان سے اتنے اخلاقی تعاون کی امید تو

تھیں تھی۔ بہر حال یہ بہت باصلاحیت ہیں۔ بہت کونفیڈنٹ ہیں۔ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ جمال نے نظریں جھکا کر تعریفی مسند جاری کی۔

جمال بھائی بالکل ہنس مکھ کہہ رہے ہیں۔ ماہ نور استری کا یلگ نکال کر ان کے قریب چلی آئی۔ عورت کا ووٹ تو توڑا ہوتا ہے ناں کو ای کی طرح آدھا تو نہیں ہوتا۔ اظہار نے منظر سے سوال کیا۔ پوچھی تو ہوتا ہے تب ہی ساری دنیا میں آج تک جمہوریت استحکام نہیں پکڑ سکی۔ منظر نے بڑی آزر دگی سے جواب دیا۔ "کن لیں۔ یورپے ووٹ ہو گئے ہیں۔" اسی دوران مظاہر بڑی عجلت میں لاؤنج میں داخل ہوئے۔

السلام علیکم آکا جان۔ ریبا کا سلام سب سے پر جوش اور نمایاں تھا۔ دسلام۔ ریلی ہیں ناں ماہ نور۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔ وہ اسی عجلت بھرے انداز میں گویا ہوئے۔ جی میں بالکل تیار ہوں۔ نانی جان کو خدا حافظ کہہ دوں۔ وہ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے گویا ہوئی۔ کتنی اچھی ہیں ماہ نور آپنی۔ ہے ناں جمال بھائی، ریبا نے چور نظروں سے مظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ہنس مکھ کہہ رہے ہیں آپ۔ بہت دھیما مزاج ہے۔ ویری بولا ٹیٹ۔ جمال نے جواب دیا۔ ان کے لیے لڑکا دیکھنے گئے تھے ہم لوگ۔ پھوپھو بڑی اتاں اور میں۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ مگر میری سنے گا کون؟۔ حقوڑے دنوں میں موٹا ہونے والا ہے وہ۔ اس نے بڑی آزر دگی سے کہتے ہوئے چوری چوری مظاہر کی طرف دیکھا۔

مظاہر قدرے جھنک پڑے تھے۔ انہوں نے ابرو اٹھا کر ایک اچھٹی نگاہ ریبا پر ڈالی تھی۔ اسی ٹے بڑی اتاں اور ماہ نور ایک ساتھ لاؤنج میں واپس آئیں۔

آجایا کرو بیٹی اس طرح۔ یقین جان مجھے بہت خوشی ہوئی تمہارے آنے سے۔ تم تو کہیں بھی آتی جاتی نہیں ہو۔ عذر سے کہنا ذرا جلدی چکر لگا لیا کرے۔ بڑی اتاں کا الوداعی اٹلہ خاصا طویل ہو جاتا تھا۔ مظاہر احتضاری انداز میں پہلو بدل رہے تھے۔

اچھا نانی اتی اللہ حافظ۔ بڑی اتاں کے خاموش ہوتے ہی ماہ نور نے جلدی سے کہا۔ اور مظاہر کے پیچھے چل پڑی۔

پانچ منٹ کی خاموش ڈرائیو کے بعد مظاہر نے اسے مر میں دیکھا۔ کوئی اور پروپوزل بھی آیا ہوا ہے ریبا بتا رہی تھی۔ انہوں نے گیسٹر کو حرکت دیتے ہوئے سوال کیا۔ ماہ نور ایک دم جھجک سی گئی۔ کر کیا جواب دے گا اس سوال کا۔ جی۔ آبا جان کے اجاب میں سے ہیں۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

ہوں۔ تو یہ انداز ہی ہو گیا ہے۔ ریبا پتھی ہے اس کے دیکھنے اور سوچنے کا انداز سلی ہے۔ اگر مناسب پروپوزل ہے تو اس کے ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے ریبا کی رائے کو قطعی غیر اہم باور کرتے ہوئے کہا۔ مبادا بعض ریبا کی وجہ سے ماہ نور غور کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔

شادی شدہ لڑکی کی پوزیشن بہر حال سوسائٹی میں بہت مضبوط ہوتی ہے۔ تمہارے لیے تمہارے اچھے پارٹنر کی بیک کافی ہوگی۔ خدا نخواستہ پھر بھی کوئی بد مزگی درمیان میں آجاتی ہے تو ہم ہیں ناں۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر یہ پروپوزل مناسب ہے تو قی انور تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ باقی باتیں پھر وہ بھی جائیں گی۔ سمجھ رہی ہوں اب میری بات۔ مظاہر نے پھر مر میں اس کے چہرے کے تاخرات دیکھنے کی کوشش کی۔

READING  
Section

ماہ نور فائوش رہی۔ اسے مظاہر سے بہت جیا محسوس ہو رہی تھی۔  
گھر نزدیک آچکا تھا۔ تیار لوگ کولڈ اسٹاپٹ پلاس کی نگاہ پڑی۔ سارے وجود میں قہر تھری وود گئی۔  
پیشانی پر سینے کی بوئیں جگنے لگیں۔

ایک دم سیاہ پنٹ اور پلین سیاہ شرٹ میں اپنے مخصوص ریڈ اسکارف اور گلاسنز کے ساتھ دکھاؤ نڈر  
پر کبھی نکلتے ان کی گاڑی ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور نے بہت بے ساختہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ  
دکھاتا تھا۔ اس کی یہ چونکا دینے والی ادا مظاہر سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ یوں بھی اس کے علاقے میں داخل ہوتے  
ہوئے کانشس ہو رہے تھے۔

کہا ہوا: انہوں نے گاڑی سے باہر اُدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔  
ہلکے۔ کچھ نہیں: وہ بوکھلا سی گئی۔

مظاہر نے گاڑی روک دی: کیا کہیں کھڑا ہوا ہے؟ ان کا ذہن بہت سرعت سے کام کر رہا تھا۔  
ماہ نور نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”کدھر؟ کہاں؟“ وہ گاڑی بیک کرنے لگے۔  
”آپ۔ گھر چلیں مظاہر بھائی!“ اسے ڈر سلگنے لگا۔

”میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے بھی اس کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے تسلی دینے والے انداز  
میں جواب دیا۔

”وہ۔ کولڈ اسٹاپٹ پر بلیک کپڑوں میں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔  
مظاہر نے فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اور ماہ نور نے وحشت زدہ ہو کر بے اختیار ان کا بازو  
دبویج لیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ بس۔ بے سوچے سمجھا بھی کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ پلین مظاہر بھائی: وہ روانہ ہی ہو گئی۔  
میں کچھ نہیں کر رہا۔ شمس کے لیے آٹس کریم پیک لے کر آیا ہوں۔“ اس کے خوف و سراسیمگی کو دیکھ  
کر وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ ”ارتری ماہ نور: وہ اپنا بازو ہیزا کر گاڑی سے اتر گئے۔

ماہ نور قرآنی آیات کا ورد کرنے لگی۔ ساتھ ہی کاہے گلہ سے گردن موڑ کر بیچھے بھی دیکھ رہی تھی۔ مظاہر  
اسٹاپٹ پر پہنچ گئے تھے۔ پاشاب سرو قد کھڑا ہوا تھا۔ وہ قدرے رچھکانے ہوئے جھکتے لائٹ سے سگریٹ  
سدکار ہاتھ اس کے چہرے کے گرد دھوئیں کے سرخولے تھے۔ مظاہر اس کے بے حد قریب کھڑے تھے۔  
مظاہر چند منٹوں بعد واپس آگئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں شانگ بگ تھا جو انہوں نے گاڑی میں بیٹھے ہی  
ماہ نور کو ہتھا دیا۔ اور کھٹاک سے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ اور گاڑی اسٹارٹ کر کے خاصی اسپید سے  
دوڑا دی۔

انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ ماہ نور نے بہت بہت کر کے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں  
میں گہری سوچ کا عکس بہت واضح تھا۔

”میں زکوں گا نہیں ماہ نور۔ پھو پھو کو بھادینا کبھی وہ کچھ خیال کریں؟“ مظاہر نے کہا۔  
(حیرت ہے آپ کو بھی اتنا خیال آسکتا ہے؟) وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

اسے بہت تیز بخار تھا۔ ماسی نے اپنے ایک کمرے کے کوارٹر میں اس کو ایک پلنگ پر لٹا دیا تھا۔  
”ہ بڑی دلہن سوزی سے اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔“

اس کی اوٹ خاموشی کو وہ اس کی طبیعت کی خرابی پر محمول کر رہی تھی۔ بانگی اور دوسرے بچے کئی مرتبہ آکر اس کی خیریت معلوم کر چکے تھے۔ وہ جیت لیٹی اس چیت ہی کو گھورے جا رہی تھی۔

آج تو کوئی بھی نہیں۔ سب نوکر فارغ ہیں۔ صاحب میں سے کسی کا میلی فون بھی نہیں آیا کہ کھانا تیار کر رہے یا نہیں۔ کوفتے اور مچھلی کے کباب رکھے ہوئے ہیں۔ سات کا سالن میں پنجوں کے لیے اٹھالائی تھی۔ آدھا کا کوئی ماں کو روئے دیا۔ پتا نہیں کہاں سے بڑا سا ایک آیا تھا چار دن سے قریح میں رکھا ہوا تھا۔ آج میں نے تسمی کو جگر سے نوکروں کے پنجوں میں بانٹ دیا۔ پچھلے ہفتے بھی پیسٹریاں پڑے پڑے ٹوکھ کئی تھیں۔ رزق کی بربادی تو کوئی ان لوگوں کے ہاں دیکھے۔

اس مارے تو بڑے ان کے جوتے کھاتے رہتے ہیں کہ ہمارے بال پنجوں کو کھانے کو اچھا مل جاتا ہے۔ پرتو نے تو صبح سے سوکھی ذیل روٹی کا ٹکڑا بھی منہ میں نہیں ڈالا۔ کچھ کھا کر دوانی لے لے تو یہ بخار ٹوٹے۔ اللہ یار نے مجھے بیس روپے دے دے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں تجھے۔ چل شاباش۔ اٹھ میری بچی۔ یہ چلنے ذیل روٹی کھائے۔ ماسی بہت محبت و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

وہ اسی طرح خاموش بیٹی ماسی کو خالی خالی نگاہوں سے گھورتی رہی۔

اس طرح تو بخار نہیں اترنے کا خدشہ نہیں کرتے۔ دیکھ تو سہی سارا پنڈا آگ ہو رہا ہے۔ اس نے پھر چمکارا۔

مومل کے انداز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

پھر میں اللہ یار کو بلا کر نے آؤں گی۔ اگر تو نے میری بات نہیں سانی ماسی نے مصنوعی مٹکی کا اظہار کیا۔

اللہ سلاں کی قسم۔ میرا دل نہیں جاہ رہا ماسی! بالآخر اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

بیماری میں کس کا دل چاہتا ہے مومل۔ خالی پیٹ دوائی بھی تو نہیں کھاتے۔ ڈاکٹر منع کرتے ہیں۔ حضور! سی ذیل روٹی کھا کر چلے پی نے پھر یہ بخار کی گولیاں کھائے۔ نہیں تو ہمت کر میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چل۔

مجھے پریشان نہ کرو ماسی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ بچلے سے تم میرے ٹکڑے کر دو۔ اس نے قلعی انداز میں کہہ کر روٹ بدل لی۔

وہ کہہ بیماری سب کے ساتھ۔ دوا دارو تو کرتے ہی ہیں ماسی نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بہت ہمدرد طبع کی عورت تھی۔

مومل پر مطلق اثر نہ ہوا۔ ماسی کو اس کے پنڈے کی آنج محسوس ہو رہی تھی۔ اور عمر بھکے حیمیر کی جو برف اس کے اعصاب پر جم گئی تھی۔ وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی تھی۔ جمو کا یہ عالم تھا کہ سورج کو ایک ہی نقطہ پر ٹھکی ہوئی تھی۔ خیالات کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ نہ کوئی احساس تھا نہ خیال۔ ہر سمت ایک خلا کا احساس تھا۔

تو نہیں مانے گی۔ رات بڑھتی جا رہی ہے۔ بلا کر لاتی ہوں اللہ یار کو! ماسی تنگ آ کر باہر چلی گئی۔

باہر کوئی نظر نہیں آیا۔ شمسی بھی سیکنڈ فلور پر اپنی خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ حقیقی معنوں میں پوری کوئی کا منتقل وہی تھا۔ اللہ یار کا کچھ پتا نہیں چل سکا البتہ مون کو اس نے پوری سے لابی کی طرف آتے مزہ دیکھ لیا۔

سلام علیکم صاحب۔

ہوں! اس نے اشاراتی جواب دیا۔ اور گئے بڑھا گیا۔

READING  
Section

کھانا کھائیں گے صاحب؟" وہ پیچھے پیچھے چل دی۔ پوچھنا اس کا فرض تھا۔  
 نہیں! مختصر جواب آیا۔

صاحب۔ آپ سے ایک بات کرنا ہے۔ ماسی ٹو بارہ انڈیز میں کبہ رہی تھی۔  
 مون کے قدم زمین نے پکڑ لیے تھے۔ وہ جہاں تک پہنچا تھا وہیں جم گیا۔ مگر مڑا نہیں۔  
 "صاحب۔ آپ اللہ ریلو کو ذرا لٹو۔ کس۔ دن میں بھی جلتے کہاں غائب رہتا ہے، اور بات کو بھی پتا نہیں  
 کہ صر غائب ہو جاتا ہے۔ اب موئل اور بائسکی تو اس کی ذمے داری ہیں۔ اسے ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ بخار  
 میں جھلس رہی ہے مگر نہ کچھ کھاتی ہے نہ دوائی لیتی ہے۔ ایک گھنٹے سے اس کی خوشامد کر رہی ہوں؟  
 عاجز آئی ماسی کو مون ہی سے کچھ امید ہو چلی۔  
 کس کی بات کر رہی ہو؟ وہ کسی دھیان سے چونک کر پھر آگے بڑھنے لگا۔

موئل کی۔ صاحب جی۔ اور کس کی؟  
 ماسی اس کی تیز رفتاری کے سبب اپنے بھاری وجود کو اسی حساب سے گھسیٹ رہی تھی۔  
 تو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اللہ بار کا انتظار کرو۔ وہ خشک لہجے میں کہہ رہا تھا۔  
 آپ ذرا سانسے ڈانٹ دیں تو وہ شاید آپ کی مان لے۔ ماسی نے گویا درخواست کی۔  
 "میرے پاس فالٹو وقت نہیں ہے۔ پر ابلم کرتی ہے تو اسے اس کے گوتھ بھجوا دو۔ اور آئندہ نوکروں  
 کی وجہ سے مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ گوتھ بھجوا سے۔ مٹی کو میں ہینڈل کروں گا؟  
 ص۔ صا۔ صاب۔ وہ ماسی خود آجھنے لگی۔  
 گو۔ ہیل۔ و۔ وہ برہم ہوا اور زینے چڑھنے لگا۔

سنی سیٹی پر کوئی خوبصورت سی دھن گنگناتے کی رنگ جھلاتے بڑی سرمستی میں لاڈلج میں داخل  
 ہوا تھا۔ مگر ایک دم ٹھٹھک گیا تھا۔  
 سر کے نیچے فلور کشن رکھے ہاتھ میں ریموٹ لیے مون کا ریپٹ پر دوڑا تھا اور اسکرین پر بڑے فلٹ  
 میوزک میں کوئی انڈین ڈوٹ سائنگ چل رہا تھا۔ غصے غصے بعد اس نے مون کوئی وی نے سلمنے  
 براجمان دیکھا تھا۔ بلکہ درحقیقت گھر ہی میں غصے غصے بعد وہ ایک دوسرے کے سلمنے تھے۔  
 مون نے اس کی آمد پر صرف ایک لحظے کے لیے ٹی وی اسکرین سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔  
 مٹی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے تیرو پہلے۔ رنگ کر لینا۔ فون کے پاس ایک چٹ پر لکھا ہے؟  
 مون نے آواز اہستہ کر کے اسے اظہار دی۔ اور دوبارہ آواز بڑھا دی۔  
 سنی نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر مون پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر زینے کی طرف بڑھ گیا۔  
 مون نے وی سی آسٹاپ کیا اور دوسری کیسٹ لگا دی اور وی سی آر دوبارہ آن کر دیا۔ اب  
 اسکرین پر رنگ نہیں تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ سائنگ ڈیسے ہو رہا تھا۔  
 میں خطا کار ہوں یا مجھ کو بتانے والا  
 چاند کے مکھڑے پہ بھی وار ہے کالا کالا  
 جل کے دل خاک ہوا۔ آنکھ سے رویا نکلا  
 گانا ختم ہوا۔ اس نے ریو اینڈ کر دیا۔ پھر ختم ہوا اس نے پھر ریو اینڈ کر دیا۔ دوبارہ، دوبارہ، پھر  
 ریو اینڈ کرنے لگا تو میک سے سنی کی آواز آئی۔  
 بار۔ اسٹاپ اسٹاپ۔ مجھے فون کرنل ہے؟ جلے کب آکر ہوا تھا۔

اس نے چونک کر سر گھمایا اور وی سی آر آف کر دیا۔ اور ریپورٹ وہیں پینک کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے اس کے قدم لان کی سمت اٹھ رہے تھے۔ ایک انتشار و  
اضطراب اس کی مجال سے مترشح تھا۔

لان میں خامی ویر چہل قدمی کرنے کے بعد اس نے سروٹ کو اڑ بڑکا کر رخ کیا تھا۔  
ڈارک گریے لکڑی کے دروازے پر اس کی دستک بہت آہستہ تھی۔ کئی مرتبہ کی دستک کے بعد  
دروازہ کھلا تھا۔ سامنے ڈرا۔ ٹیڈر منڈ بھری آنکھوں میں حیرت سمیٹے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سلام صاحب۔ کہیں جانلے ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔  
”نہیں۔ نہیں۔ کہیں نہیں جانا۔ وہ ماسی! مون! لہجا۔  
”اچھا۔ اچھا۔ وہ برابر والا دروازہ ہے صاحب۔ دراصل آپ کبھی ادھر آتے ہی نہیں ہیں ناں۔  
مٹھریے۔ میں بلاتا ہوں ماسی کو۔ وہ قد و یا نہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھا اور برابر والے دروازے پر دستک  
دینے لگا۔

دروازہ دوسری دستک ہی پر کھل گیا تھا۔ ماسی کے انداز سے ظاہر تھا وہ جاگ رہی تھی۔ پہلی نظر  
ڈرا۔ ٹیڈر پر اور دوسری مون پر پڑی تو ایک دم گھبرا گئی۔

”صاحب۔ آپ۔ خیریت؟“  
”ہوں! اس نے ہنسا کر بھرا اور ڈرا۔ ٹیڈر کو گلے کا اٹھا لیا۔ وہ خود آؤد مانہ انداز میں پلٹ گیا۔

”روانی کھانی اس نے؟“ وہ بے حد آہستہ آواز میں پوچھ رہا تھا۔  
”نہیں۔ ابھی بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی! ماسی نے بے جا لگی سے جواب دیا۔

”اچھا۔ ہٹو سامنے سے! وہ بولا تو ماسی جھٹ ایک طرف ہو گئی۔  
”مون کی چال بہت آہستہ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو وہ بان کی چار پائی پر سامنے ہی دسی نظر آ گئی۔

پٹ آنکھیں کھولے وہ اسی کو آتے دیکھ رہی تھی۔  
”مون چار پائی کے پاس آ کر مٹھریا گیا۔

”کیوں پریشان کر رہی ہو ماسی کو؟“ وہاں کیوں نہیں کھاتیں؟“ وہ اس سے نظر میں چڑا کر مخاطب تھا۔  
”ماسی! پہلے اسے کچھ کھاؤ! وہ ماسی سے مخاطب ہوا۔

”جی صاحب۔ آپ بیٹھیں! ماسی نے بڑے پر جوش انداز میں موڑھا پیش کیا۔  
”ہوں۔ تمھیں کب ہے۔ تمھیں کب ہے۔ تم جاؤ۔ کچھ لے کر آؤ اس کے لیے! وہ اٹھے اٹھے انداز میں

کہتے ہوئے موڑھے پر بیٹھ گیا۔ اور کمرے میں نظر میں دوڑنے لگا۔  
”ماسی کے وہاں سے جانے کے بعد ایک پر کھول سناٹا ماحول پر طاری ہو گیا۔ وہ نظر میں جھکائے

اپنے سلیپر کو بغور دیکھ رہا تھا۔  
”دیکھو۔ ماسی جو کہے اس کا کہنا مانو۔ میں جلد ہی تمہیں گوٹھ واپس بھجوا دوں گا! بالآخر اس کی آواز

سے سکوت ٹوٹا۔

مومل اسی طرح بے خواب بھٹی بھٹی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے بے تاثر  
چہرے پر خوف کے اثرات بھی نمایاں تھے۔

”ماسی۔ میں جا رہا ہوں۔ اب یہ تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔  
”صاحب! آپ مٹھری ویر مٹھ جائیں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں! ماسی

سے سکوت ٹوٹا۔

جہاں تھی وہیں سے بلبلا کر بولی۔  
 مون نے ایک غیر راوی نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ بیٹھ گیا۔  
 ماسی ایک پیالے میں چلے اور ڈبل روٹی کے دو سلائس لے کر آگئی۔  
 اٹھ موٹل یہ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چل۔ شاباش۔ دیکھ۔ صاب اتنی رات کو بے آرام  
 ہونے ہیں تیری وجہ سے یہ ماسی نے چمکا کر۔  
 موٹل پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”دیکھ تو صبح سے بھونکی ہے۔ اب رات کا ایک بج رہا ہے۔ چل اب اٹھ بیٹھ۔“  
 موٹل ٹس سے مس نہ ہوئی۔

مون نے بمشکل نگاہ اٹھائی۔ مگر فوراً جھکالی۔ اور خاموش رہا۔  
 ”صاب کی بات بھی نہیں سن رہی۔ مائی باپ ہیں یہ ہمارے۔ اٹھ بیٹھ بیٹی۔ یہ لے یہ ماسی نے  
 ٹیے اپنے نازوں پر بیٹھی۔  
 اچھا۔ لیٹی رہ۔ میں کھلا دیتی ہوں“ ماسی ڈبل روٹی چلنے میں بھگو کر اس کے منہ کے نزدیک  
 لے گئی۔

موٹل نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا اور ساتھ ہی ٹیے پر ہاتھ پر مارا۔ ٹیے دور  
 جا کر گری۔ ماسی چند ثانیے دم بخود بیٹھی رہی۔ پھر بڑی خسر مندی اور غصے سے مون کی طرف دیکھ  
 کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اچھی بھلی عیسیٰ کل تک۔ ایک آواز پر دوڑتی تھی۔ جو کہو مانتی تھی۔  
 آپ تو اسے کوٹھڑی بھجوا دیں۔ مرحلے کی ورزش یہ توڑ۔  
 مون خود لب بستہ سانس جھکائے بیٹھا تھا۔ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”میں ڈرا ٹور سے کہتا ہوں۔ کسی طرح اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔ باقی ہاسپٹل میں وہ خود سجال  
 لیں گے۔ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ نہیں ٹھہرا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔ مون نے کتاب الٹ کر رکھتے ہوئے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ دو  
 بج کر کچھ منٹ ہو رہے تھے۔  
 ”کون؟“ جانے خوف کہاں سے درکٹے تھے۔  
 ”میں ہوں صاحب۔ ڈرا ٹور کی آواز تھی۔“  
 مون جلدی سے دروازے تک آیا۔

”ہوں۔ کیا ہوا؟“ وہ دروازہ داکر کے بہت محتاط انداز میں پوچھ رہا تھا۔  
 ”کچھ نہیں صاحب۔ وہ ماسی زینب نے کہا تھا کہ آپ کو بتا دوں کہ موٹل وہاں بھی بہت تنگ کر رہی  
 ہے۔ اس نے ڈاکٹر کا آکر (اسٹیٹو اسکوپ) نرس کے منہ پر کیسج مارا اور جو فائل ہوتی ہے ناں صاحب۔ وہ  
 بھی بساڑی۔ ایک گلاس بھی توڑا۔ بڑی مشکل سے قابو کر کے ایک انجیکشن لگایا۔ پھر کہیں بلکے ذرا آرام  
 سے لیٹی۔“

”پھر؟“ اور کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا۔ ”کیا قیامت تھی ڈرا ٹور تک سے نگاہ چرا کر بات کرنے کی  
 نوبت آگئی تھی۔“  
 ”مسئلہ تو خیر کیا ہو گا صاحب۔ پرا بٹویٹ اسپتال ہے۔ بل بنلے کے چکر میں ٹیڑھ بھی قابو کر سکتے ہیں



وہ تو ذرا سی چھوڑی ہے، ڈرا، ڈرا کی آنکھیں نیند سے مغلوب ہو رہی تھیں۔ خاصے بینر کٹن انداز میں پرہیزگاری کا نشانہ بنایا۔  
 آپ کا نام بتا دیا تھا ڈاکٹر صاحب کو۔ میں چلوں صاحب، اس نے اجازت چاہی۔  
 ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے، وہ جلدی سے بولا۔

عمر پوچھ رہے تھے ڈاکٹر صاحب۔ ماسی بولی تیسرے چودہ سال ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب بولے یہ تو ستائیس سال ہوگئی۔ ای۔ ای۔ ای۔ ڈرا، ڈرا نے انتہائی بد مزہ ماحول میں اپنی دانست میں خوشگوار پیما کر کے کی کوشش کی۔ کیونکہ صاحب کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آ رہے تھے، بولے لگتی تو نہیں ستائیس کی۔ اچھا صاحب السلام علیکم۔ اس نے مون کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ پا کر جانے میں عاقبت بھی۔  
 مون نے فوراً دروازہ بند کر لیا۔

خزانے کی موجودگی کے احساس کے ساتھ دھڑکے بھی شروع ہوتے ہیں، چوری ڈاکے کے خوف بھی ستاتے ہیں۔

ابھی تو اُدھر خزانے کی موجودگی کا ٹھیک ٹھیک شعور بھی نہیں تھا اور خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ چونکہ خزانے کا احساس نہیں تھا اس لیے ڈاکے کسی ڈاکے پر نہیں تھا۔

ڈاکہ اور صدہ اس آواز پر تھا کہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ بے بسی کے احساس سے بس یہ احساس ہوا کہ وہ کچھ باری ہے۔

وگرنہ۔ وہ حیرت سے پتھر نہ ہوتی بلکہ بہت روتی۔ ایسا بین کرتی کہ دیوار میں لپیٹ جا تیں۔ کتنی ہی زور ہوتی۔ ایک دفعہ صاحب کی طرف دیکھ کر نفرت سے تھکتی ضرور۔

ابھی تو بلو ادم کے پیڑھے مٹی کے گھر دندے بنا کر کھینے والی سکیاں راہ تک رہی تھیں۔ سنی کی وحشت سے اسے ڈر ضرور لگا تھا مگر اس ڈر کے معنی اس پر کھنے نہیں تھے۔ اگر اس ڈر کے معنی اس پر کھل جلتے تو وہ دوسرے کمرے میں بے خوف ہو کر کسے سو رہتی۔ مون اس کی موجودہ کیفیت کا تجزیہ کر سکتا تھا اور کر رہا تھا۔

اب وہ سو نہیں سکتا تھا۔  
 اب اسے سونے کے لیے نیند کی گریہوں کی ضرورت تھی، بے حسی کی مستقل قسم کی بے حسی کی سرپرست اسے دونوں میں سے ایک بھی میسر نہیں تھی۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ آج وقت سے بہت پہلے نکل کھڑی ہوگی بلکہ روزانہ یہ معمول بن لے گی کہ وقت سے بہت پہلے نکل کرے گی اور اسکول سے دیر سے نکلا کرے گی۔ چند دنوں بعد وہ خود ہی انتظار سے ٹھک جائے گا اور نئی دلچسپی تلاش کرے گا۔ اس قسم کے لوگ یہی کیا کرتے ہیں۔ اس دوران میں ممکن ہے اس کی شادی کا مسئلہ حل ہو جائے اور عارف سے ایک دو ماہ قبل گھر بیٹھنے کو کہہ دیں۔ اور جب تک یہ مرحلہ طے نہیں ہو جاتا کم از کم ایک ماہ تو مزید تنخواہ لے لے۔ عارف، شمسہ سے کہہ ہی چکی تھیں کہ وہ امتحانوں کے بعد گھر پر بچوں کو پڑھانا شروع کر دے کہ وہ جلد ہی ماہ نور کی شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ بھی شمسہ کا ہاتھ بنا دیا کریں گی۔

پیش بندی کے طور پر وہ عارف کو تاجکی مٹی کہ سمسٹریز کی وجہ سے آج کل اسکول میں بہت کام ہے وہ جلد ہی جایا کرے گی اور دیر سے آیا کرے گی۔  
 اس نے دو چار نولے لے کر برائے نام ناشتا کیا۔ نظریں مستقل گھری پر تھیں۔ وہ آدھ گھنٹہ قبل نکل

ہانا پنا ہتی تھی۔

بہت تیز رفتار تھی معمول سے ہٹ کر تھی۔ اچھا اظہار راستہ طے ہو گیا تھا اسکول سامنے آچکا تھا یہ مرحلہ تو بالآخر طے ہوا سکون سے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا مگر سانس جہاں تھا وہیں رُک گیا تھا۔  
زن سے سی۔ ڈی سیوٹی اس کے قریب براہ روکنے والے انداز میں آکر رُک گئی تھی۔  
تسلیم عرض ہے: اس نے پاؤں زمین پر جما کر بہت بھرپور انداز میں دِش کیا۔

کل جنل گاڑی میں آپ تھیں۔ اس کا نمبر B J 003 ہے۔ سرکاری گاڑی ہے سرکاری افسر کی، مظاہر موصوف کا نام ہے۔ اچھے نیک نام افسر ہیں۔ آپ کے ناموں موصوف کی ہونہار اولاد ہیں۔ پرستانچی بھی اچھی ہے۔ وہ آپ کے کزن ہیں میری خواہش ہے وہ قیامت تک صرف آپ کے کزن ہی رہیں۔ آپ کو تو ہوا بھی چھوٹی ہے تو رقیب محسوس ہوتی ہے۔ آپ بہت احتیاط رکھیے گا۔ اچھے کزن بھی قسمت سے ملتے ہیں۔ جیسے آپ ہیں قسمت سے ملی ہیں۔ ہماری والدہ محترمہ عنقریب آپ کے ہاں آنے والی ہیں۔ اس مرتبہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہوں گی۔ بہت شاندار ڈائمنڈ کی انگوٹھی ساتھ لائیں گی۔ اسے آنا مہ سے پہنچنے لے گا کہیں آتا رہے گا نہیں!

ماہ نور کی حیرت اب اشتعال میں تبدیل ہو رہی تھی۔ شریاٹوں میں حور بھانا اٹھ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا آگے بڑھے اس کے گلا سزاوارے اور چہرہ آکھٹ ڈالے۔ اور اس بری طرح سب کو دے کہ وہ خود کو نہ نہمان سکے۔ مگر اسے مظاہر کی نصیحتیں فون ممبر سمیت یاد آنے لگیں۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ اور بلا ارادہ اس کی طرف دیکھا۔

وہ گلا سز کے اوپر سے بڑے شوخ انداز میں اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ بلا کی دلچسپی نظروں سے ہو رہی تھی۔

تھینک یو۔ اس ایک نگاہ کے لیے۔ آپ کو بھلا اس کی ویڈیو کا کیا اندازہ شاعروں کی سنگدل محبوبہ والے سارے کش ہیں آپ میں! اس مرتبہ اس کی آواز سرگوشی کا انداز لیے ہونے لگی۔ بے ہی اور حیا سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اجی لعن طعن ہی کر دیا کریں۔ اسی بہانے آپ کی خوبصورت آواز تو نہیں! ماہ نور کئی کئی بار رُک رہتی تھی۔

اس نے بائیک سے اسی طرف دھکیل کر پھر اس کا راستہ بلاک کیا۔ کسی ایک بات کا جواب دیکھے۔ اس دن کی طرح برس ہی جلیںے! وہ شاید کل کا منظر دیکھ کر اپنے میں نہیں رہا تھا۔ اتنا تنگ تو کبھی بھی نہیں کیا تھا۔

ماہ نور نے سختی سے ہونٹ بیچنے لیے مبادا کچھ منہ سے نکل ہی جائے۔ اس لیے کہ برواشت جواب دہی لگ رہی تھی۔ وہ پھر ایک طرف سے آگے بڑھی۔ اس مرتبہ وہ سامنے سے گزرنے لگی تھی۔ پاشلنے بائیک دھکیل کر آگے کر دی۔

ماہ نور نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے دو قطرے ٹپک گئے۔ ایک تو وہ اسے اس تمام پر رد کرتا تھا جو مونا سنان ہوتا تھا۔

اس نے اپنے رخسار ہاتھ سے صاف کیے۔ مگر خدا اس کے اند بھی اس بلا کی آگئی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اپنی آواز اس کی سماعت تک نہیں پہنچائے گی۔

آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ میری امانت ہے۔ شادی کے بعد تو صرف آپ ہی بات کیا کریں گی۔ اس تو یوں بھی بہت مصروف بندہ ہوں۔ بھٹکڑوں میں آپ بلا سبہ روک روک کر یاد دہانیاں کرایا

کریں گی۔ بہت انتظار ہے اس غریب صورت آواز میں یاد دہانیوں کا!

اس نے چابی لگا کر کلک لگائی اور یہ جاوہ جا۔

ماہ نور نے چادر سے چہرہ لپونچا اور اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دو اور صیڑھ عمر مرد اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پاشانے غالباً نوٹ کر گیا تھا کہ وہ اسی طرف آرہے ہیں۔

کیا بات ہے بیٹی۔ تنگ کر رہا تھا۔ ہم خاصی دور سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں یوں اندازہ ہوا کہ آپ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ آپ کو آگے بڑھنے نہیں دے رہا تھا!

وقت بہت طرا ہے۔ آپ کسی کو ساتھ لے کر نکلا کریں۔ بھائی وغیرہ نہیں ہیں آپ کے؟ ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ اسے بے اختیار رونا آرہا تھا۔

اور آپ کے والد؟ آپ ان سے کہیں کہ وہ آپ کو پہنچا کریں۔ یہ شخص شاید آپ نہیں جانتیں اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ بہت پیسے اور اثر و رسوخ والا ہے۔ بھگتا ہے ساری دنیا اس کی جیب میں ہے!

کہاں کام کرتی ہیں آپ؟ دوسرے شخص نے سوال کیا۔

یہ سامنے اسکول میں پڑھاتی ہوں! اس نے اشک جیتے ہوئے جواب دیا۔

اور۔ ہو۔ اچھا۔ اچھا۔ تیلے لوگ۔ ٹیچر کو نہیں بھگتتے۔ کیا احترام ہوتا تھا کسی زملے میں استاد کا۔ غیر متعلق لوگ بھی بے حد احترام کرتے تھے! ان میں سے ایک نے جو نسبتاً زیادہ عمر کا تھا بہت تاسف سے کہا۔

جاؤ بیٹی۔ اور اکیلی مت کرنا جا یا کرو۔ عموماً کوئی بھی اس سے اُلٹنا پسند نہیں کرے گا۔ سب کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے! وہ مزید گویا ہوا اور دونوں دوبارہ اسی سمت پلٹ گئے جہاں سے آئے تھے۔

ماہ نور آفس میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ اتمتارہا تھا۔ آج وہ پی او اور ماسی کے بعد اسکول میں آنے والی تیسری تھی۔ اس نے فوراً پٹکے چلا دیے تھے۔

جی چاہ رہا تھا فوراً منظر کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے مطلع کیے۔ اس نے کلرک کی طرف دیکھ اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ منظر ہر نوٹ سے کچھ پہلے ہی آفس پہنچتے تھے زیادہ تر کبھی کبھی انہیں جلدی جانا ہوتا تھا۔ یہ وہ اسے بتا چکے تھے۔

اسے انتظار کی اذیت سے بہر طور گزرنا تھا۔

خاصی دیر وہ آنکھیں موندے کسی کی بیک سے ٹکی خال الذہن چمٹی رہی۔ بجلی کے کوندے کی طرح اس کی آنکھیں اس سے جو اس پر بار بار لپک رہی تھیں۔

اسکول میں بچوں اور ٹیچرز کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ بے سرو پا قسم کا شور ہو رہا تھا۔ ٹیچرز سلام دعا و احکام لیلیال کرنی آفس میں داخل ہوں ہی تھیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور مسکرا مسکرا کر بڑبڑ کرنے لگی۔

"غالباً حاکم وقت نے کسی انعام کا اعلان کیا ہے کہ جو شہر میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہی شہزادی کے سوال کا جواب دے گا۔ مگر پھر بھی شہزادی کی شادی کا مسئلہ تو جوں کا توں رہے گا کیونکہ یہ تو خود شہزادی ہیں۔ صرف انعام ہی مل جائے گا۔"

ماسی بتا رہی تھی کہ اسکول کا تالا کھلے ہی آج سب سے پہلے بس ماہ نور داخل ہوئی تھیں۔

خیریت! یہ صبا صونے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

ہوں۔ خیریت ہی ہے۔ شاید میری گھڑی آگے چل رہی ہے! اس کے ہونٹوں پر پھسکی سی مسکراہٹ

نہو دار ہوتی۔ مگر آئی صبح کو بھی تمہارے چہرے پر تھکاوٹ ہے؟ پھر ایک بچے دوپہر تمہاری تصویر کیسی ہوگی؟ وہ خود ایک دم فریش نظر آ رہی تھی۔

۱۰ اچھا؟ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔  
 ۱۱ آج پھر محسوس ہو رہا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ کوئی گڑبڑ ہے؟ صبا اس کی طرف جھکے ہوئے سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔

۱۲ اے نہیں۔ بس۔ تم فکر مند مت ہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ بہت جبر کر کے بھرا لہو مسکرنے کی کوشش کرنے لگی۔

۱۳ بتانا نہیں چاہتیں تو وہ دوسری بات ہے۔ مگر کچھ ہے ضرور۔ خیر تم بھی ہاتھ دھو کر پیچھے نہیں پڑیں گے۔ اب ذرا اٹھ کھڑی ہو۔ اسمبلی ہو رہی ہے۔ ہری اب یہ

۱۴ صبا۔ ایک منٹ یا اس نے صبا کو روک لیا۔ اور آفس سے پچر زکے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔  
 صبا سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ اڑھ رہی تھی۔

۱۵ چند منٹوں بعد آفس میں بس وہ دونوں رہ گئیں۔  
 ۱۶ وہ تمہارا کمر تو اسکول کے بالکل پیچھے ہی ہے نال مجھے پراٹھو سی میں ایک ضروری فون کرنا ہے۔

۱۷ ریس میں چلو گی ذرا۔ پرنسپل کے آفس میں بات ٹھیک سے ہو نہیں پائے تھی؟  
 ۱۸ اورو۔ اتنا تکلف۔ حد ہو گئی۔ مگر یہ تو سٹاڈ پراٹھو سی میں بات کس سے ہوگی؟ وہ ضرورت سے آنکھیں نیچا رہی تھی۔

۱۹ کیا انہی سے۔ پرنسپل منظور کر لیا گیا ان کا؟ وہ تنگ کرنے لگی۔

۲۰ ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس ایک پراٹھو ہے؟ وہ ہونٹ بھینچ کر آنسو پینے لگی۔  
 ۲۱ ارے۔ ارے۔ ارے۔ تم تو رونے لگیں۔ اسٹوڈنٹ کسی کو اپنا سمجھو تو پراٹھو سی کی جاسکتی ہے۔ مگر تم تو کسی کو اس قابل سمجھتی ہی نہیں ہو؟ وہ جتنی جگہ سے اٹھی اور اس کا سراپا نے سینے سے لگا لیا۔

۲۲ اچھا اب آنسو صاف کرو۔ لے چلوں گی میں تمہیں اپنے گھر ریس میں۔ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ وہ اس کے آنسو دیکھ کر بہت فکر مند نظر آ رہی تھی۔

ساڑھے دس بجے ریس کی بیل رنگ ہوئی اور وہ تو جیسے نشان پر باؤں جھائے کھڑی تھی۔ بیس منٹ کی ریس میں آنا جانا بھی تھا اور بات بھی کرنا تھی۔ صبا شاید اس سے زیادہ بے چین تھی۔ وہ براؤنڈے میں اس کی منتظر تھی۔ پرنسپل سے وہ صبح ہی پریکٹس لے چکی تھیں۔

تیسرے تیز چلتی وہ گھر تک پہنچی تھیں۔ صبا کی اتنی اور داؤنی نے آداب میزبانی کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے بے بسی سے صبا کی طرف دیکھا۔

۲۳ امی۔ ہم ایک ضروری فون کرنے آئے ہیں۔ بہت جلدی ہے۔ میں پھر کسی دن اسے گھر لاؤں گی۔

ماہ نور۔ تم ادھر آ جاؤ۔ یہ اتنی کا بیڈ روم ہے۔ دروازہ بند کر کے آرام سے بات کر لو۔ میں تمہارے لیے کوئی ایئر چینی اسکوائٹس لاتی ہوں؟ وہ باقاعدہ اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ روم میں چھوڑ گئی اور نون سینٹ کی نشان دہی اشارے سے کی اور باہر نکل گئی۔

ماہ نور نے پرس سے مظاہر کا کارڈ نکالا اور غیر ملانے لگی۔

دوسری طرف آپریٹنگ ٹیم اٹھایا تھا اور مظاہر کا نام سن کر مولد کرنے کو کہا تھا۔ وہ بہت بھرے انداز میں مددگاری میں سن رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ سے بھاری تھا۔

متوڑی دیر میں مظاہر کی آواز ابرو میں میں ابھری تھی۔

• ہیلو! گھبراہٹ، مدغم اور مکلف۔

• السلام علیکم۔ میں۔ ماہ نور بات کر رہی ہوں مظاہر بھائی!

• و سلام۔ ٹھیک ہو؟ وہاں اب ہجر بہت محتاط تھا۔

• جی۔ وہ۔ بات یہ ہے۔ آج اس نے مجھے ہمیشہ سے زیادہ پریشان کیا۔ آپ کی گاڑی کا نمبر۔ آپ کا نام آپ کا آفس۔ سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ یہاں تک کہ آپ میرے ماموں زاد ہیں۔ اور مظاہر بھائی و صاحبیل بھی دے رہا تھا کہ خدا نخواستہ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے! وہ جلدی جلدی بتا رہی تھی۔

• بلی۔ بہت بزدل ہوتے ہیں اس طرح کے لوگ۔ قطعی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! وہ بہت اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

• پریشان کیسے نہ ہوں۔ بہت بد قسمت آدمی ہے۔ آپ کو کیا پتا! وہ بہت کچھ بہر حال ان کو بھی نہیں بتایا سمجھا سکتی تھی۔

• فون کہاں سے کر رہی ہو؟

• اپنی کورلیگ کے گھر سے۔ اسکول کے پیچھے ہی گھر ہے! اسے یہ سوال اتھائی غیر ضروری لگا۔

• اسکول سے کیوں نہیں کیا؟

• وہاں اس طرح کی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ سمجھیں ناں آپ! وہ جھڈا گئی کہ یہ کیا باتیں لے کے بیٹھ گئے۔

• ہوں۔ دیکھو۔ میری بات غور سے سنو۔ تمہاری شکل پر لکھا ہے کہ تم بہت کم اہمیت ہو۔ وہ بس اس لیے ڈرا رہا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ڈرنے کی!

• مجھے واقعی ڈر لگ رہا ہے! وہ جلدی سے بولی: آپ نے اس کی عجیب عجیب باتیں نہیں سنی ناں

آپ!

• مثلاً۔ کیا باتیں کرتا ہے! مظاہر نے اس کی بے دھرمک روانی کے آگے بند باندھا۔

• اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ سگرا رہے ہوں۔ معنی خیز انداز میں۔ جیسے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ نظریں یوں جبک گئیں جیسے وہ سلتے سلتے ہوں۔

• میری جان سٹوٹی پر نشانی ہے۔ کیا فائدہ سب کچھ آپ کو بتلنے کا۔ آپ کو تو کچھ احساس ہی نہیں ہے!

• اس کی آواز بھرانے لگی۔

• ایسی بات نہیں ہے ماہ نور! تم جتنا ڈیپ لے رہی ہو ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں کے اس طرح کے

بہت سے مشغلے ہوتے ہیں!

• آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اس کی والدہ ہمارے گھر آچکی ہیں پر وپوزنل لے کر! اس کا دل مظاہر سے

بدگمان ہونے لگا کہ جیسے وہ اس کی مدد کرنا ہی نہیں چاہ رہے ہوں۔

• ان تو اصل صورت حال تو انکار کے بعد سلتے آئے کہ میں کانشس ہوں۔ تم اتنی فکر مند کیوں ہو رہی

ہو؟ جب بات کی ہے تو بھروسہ بھی کرو۔ ایزی ماہ نور! وہ اس کی ناہمتگی کے مقابل بہت پیچور تھے۔

• اسے فوراً ہی احساس ہو گیا۔

• ٹھیک۔ ہے۔ آپ فائل کر لیں۔ یہ آج کی رپورٹ تھی! وہ خاصی بشاشت سے گویا ہوئی۔

• کوئی وزن سا تھا جو سرک گیا تھا۔

• تو کیا ڈبلی رپورٹنگ کرو گی؟ وہ بھی بہت ہلکے پھلکے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

• اللہ نہ کرے کہ میرا اس سے روز سامنا ہو! وہ بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔

(باقی آئندہ)

# سہانگی کا



دشمن جانے کون کی ساعت تھی وہ جب  
مارے ہمدردی اور خلوص کے، اس نے فرمان سے  
کہہ دیا تھا۔  
بیماری اماں وہاں کہلی ہیں، سارے کام خود کرتی  
ہیں۔ اوسے بڑھاپے میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے  
بیماری انہی کو بھی دیکھو، جب سے ہوئیں آتی ہیں، ہر  
کام سے فرصت پا کر بس حکم چلاتی رہتی ہیں۔ ذرا سی  
طبیعت خراب ہو، بھائی ٹی کٹھنوں کے گھر پھرے لگاتے  
ہیں، نرم اپنی اماں کو بلا لور، کیسے بیٹے ہو تم سماں کا خیال  
نہیں کرتے انہیں تو اب تمہاری زیادہ ضرورت ہوگی، کیا  
سوچتی ہوں گی وہ کہ میں نے تمہیں منع کیا ہوا ہے۔  
یوں تو یہ بات وہ کئی بار کہہ چکی تھی مگر اس بار  
نقد سے کر کہنے پر جیسے وہ اپنا فرض ادا کر رہی تھی فرمان

بہت لاپرواہ تھا۔  
مارے، اماں کو اپنی جگہ ہی آرام ملے۔ وہ کہیں  
بھی گھر سے نہیں جاتیں۔ ہاں کبھی کبھی البتہ کسی خاص  
ضرورت کے تحت گھر سے نکلتی ہیں مگر یہاں اتنی دھند  
اونہوں کبھی نہیں۔

”پریدل تو نہیں لاؤ گے انہیں، تم کہہ کر تو دیکھو۔“  
کتنی دفعہ کہا ہے بھتی۔ اعراج سرانچ پیدا ہوئے  
تھے کتنا میں نے بلایا، نہیں آئیں۔ جب اکھوتے بیٹے  
کی شادی میں ہی شریک نہ ہو سکیں، تو بعد ااب  
کیا آئیں گی۔“

”آئیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ بیٹے کے گھر آ کر  
تو ہر ماں نہال ہو جاتی ہے پھر پلوٹے انہیں خوش  
رکھیں گے، میں خدمت کروں گی، تم ہو گے۔“

بیٹا نے آج تک اپنی ساس کو دیکھا نہ تھا۔ وہ  
شادی میں تو اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکیں مگر  
بعد میں بھی نہیں آئیں۔ یہاں فرمان کے چچا تھے،  
ان کی اولادیں تھیں۔ انہوں نے اپنی ٹکڑی کروائی تھی اور  
ابھی تک تو وہی اس کی سسرال تھی۔ گو کہ بیٹا کو اولی  
سسرال جاننے کی بھی تمنا تھی مگر نہ تو فرمان نے کبھی  
اسے لے جانے کی بات کی، نہ ساس نے بلایا۔ چچا  
کے گھر لانے ہی ٹال جاتے۔

”کیا کرو گی جا کر، گاؤں ہے ذرا سا۔ دل نہیں

لگے گا۔ پھر بیٹریں زلا زلا دیتی ہے۔ اسٹیشن سے  
اُتر کر تاکو کرو، گھنٹہ بھر بعد گاؤں آئے تو گندگی سے  
طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ٹھکن، بے زاری پچھتاہے۔“  
چچا کی بہو خاصی بیزار تھیں گاؤں کے سفر سے،  
جا چکی تھیں ایک بار، چچا تو جاب کے سلسلے میں گاؤں



READING  
Section

طویل افسانہ



READING  
Section



چھوڑے تھے۔ وہاں اب کوئی رشتہ دار نہ تھا سوائے  
فرمان کی والدہ کے، پھر بھی اختر بھائی بیوی کو اپنا گاؤں  
اور اپنا گھر دکھانے لے گئے تھے۔ وہ سخت بیزار ہوئی  
تھیں۔ فرمان نے بتایا تھا۔

• اس کی اماں بہت معنی عورت ہیں۔ ہاتھ کی پٹلی  
پر گیہوں ہیں کراٹا بناتی ہیں۔ اسی آٹے کی روٹی کھاتی  
ہیں۔ سامے مسالے ثابت منگا کر سل پرورد گرتی ہیں۔  
پسے ہوتے باز لری مسالے استعمال نہیں کرتیں۔ یہی  
نہیں، گھر کے کچے صمن کو لپیپ بوت کر سنوارا کرتی ہیں  
دیواریں بھی روز لپھا کرتی ہیں۔ کہیں کوئی داغ و جبہ نظر  
نہیں آتا۔

• ہٹے بے چاری۔ بیلا کو خاصا ترس آیا تھا۔

• ان کی تو ہتھیالیاں گھس گئی ہوں گی۔

اسی لیے وہ چاہتی تھی کہ ایک بار وہ شہر آکر بیٹے  
کا گھر بیٹے کا عیش آرام لہنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں۔  
گھر کی سجاوٹ دیکھیں۔ یہ قالین، یہ فرنیچر، خوبصورت  
پرٹے، لیکن کی الماری میں سجے قیمتی برتن۔ مسالوں کے  
ایک رنگ کے ہولڈ ڈبے، دیشے کے برتنوں میں رکھی  
وائیں، پھر وہ کس کا اودن جس پر بھی کھار وہ چکن روٹ  
کرتی تھی اور اکثر ٹیک، نان خطائیاں بناتی پھر وانگ  
مشین بھی تھی جو اس نے حال ہی میں قسطوں پر لی تھی  
ہر چیز موجود تھی ضرورت کی، وہ دیکھ کر کس قدر مسرور  
ہوں گی۔ فرمان بدل کھوں کرا اس کے سیتے کی تعریف کرتا  
تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

• تم نے میری زندگی کو بارخ و بہار بنا دیا ہے، اور

گھر کو جنت۔ کوئی گاڑی کی لڑکی ہوتی جیسا کہ اماں  
چاہتی تھیں کہ ان کی لینڈ کی پنڈو لڑکی سے شادی کر لوں  
وہ تو بے ہستی میں دھکیل دیتی اور تم... تم نے بلندیوں  
کا راستہ دکھایا ہے۔ ساری خوشیاں میری بھونٹی  
میں ڈال دی ہیں۔

اعراج، سراج کے آلے کے بعد تو وہ بیلا کا سچا  
عاشق بن چکا تھا۔ بیٹوں نے اس کے حوصلے بہت  
بڑھا دیے تھے۔ مکمل گھر، گھر کا سکون، آرام، بیلا نے  
سب کچھ ہمارا کر دیا تھا۔ وہ تعاون کرنے والی بے حد  
سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ پھر والدین کی بہترین تربیت

شیریں زبان، خدمت، اطاعت ان سب سے بڑھ  
کرا اس کا حش، فرمان تو اس کے ہاتھوں تک گیا تھا۔  
اس کے بار بار کے اصرار پر فرمان، اماں کو اپنے  
چلا گیا، لیکن لگے دن واپس بھی آ گیا کیلا۔

• دراصل میں اچانک پہنچا وہ فوراً تو نہیں آسکتی تھیں  
گھر کا انتظام بھی کرنا تھا۔ ویسے اس کے گھر کا انتظام  
بھی کیا، مگر اماں کی فکر میں، ٹرینیوں کے دانے پانی،  
گھاسے کے چائے، چوزوں کی حفاظت، کتابی بھوکوں  
نہ مریں، بس یہی انتظام کرنا تھا۔  
بیلا باپوس ہو گئی۔

• اگلے ہفتے جا کر لے آؤں گا، فرمان نے تسلی دی۔  
مگر اس کے جوش و خروش پر پانی پھر گیا تھا۔

اسے گھر مزید سجانے اور چمکانے کا از سر نو موقع  
مل گیا۔ اگلے ہفتے فرمان پھر گیا اور واپس آ گیا کیونکہ  
ان دنوں انہیں اپنے دود افتادہ علاقے میں رہنے والے  
چچا کی فیملی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں۔  
چچا کے سامنے کے سارے کی بیٹی ساتھ کے گاؤں کسی  
شادی میں آئی ہوئی تھی اور بڑی بی بی کو اس سے چچا  
کے صاحبزادوں، صاحبزادیوں، ان کی اولاد کی تعداد  
وغیرہ کا معلوم کرنا تھا۔ وہ خود تو کسی کے گھر بلا دے پر  
بھی نہیں جاتی تھیں تو ساتھ کے گاؤں کیا جاتی شادی  
میں کئی دن باقی تھے اور چچا کے سامنے کے سامنے کی  
بیٹی شادی سے فارغ ہو کر ان سے ملنے آنے والی ہے  
اس کے علاوہ۔ کوٹک مرغی کے نیچے انڈے بٹھانے  
میں۔ گائے بھی کچھ غلیل ہے۔ غرض خاصے مسائل تھے۔  
ہوتے ہوتے دو ماہ گزر گئے۔ بیلا اب باپوس  
ہو چلی تھی۔ فرمان بھی اس کے بعد گاؤں نہیں گیا۔ بلکہ  
اس معاملے میں قطعاً خاموشی اختیار کر لی تھی اس نے  
لیکن ہوا یہ کہ ایک مبارک ساعت وہ اپنے بھتیجے کے  
ہمراہ آن براجیں۔

موسم سرما جا رہا تھا اور گمانے قدم بڑھالیے تھے  
گرمی سے بیلا کی جان جاتی تھی۔ وہ بہت سست  
ہو جاتی سنہ کچن میں دل ٹھکانہ کسی اور کام میں۔ پھلے  
دنوں اس کے پاس ایک ماسی آتی تھی جو برتن دھونے



کپڑے دھونے کے علاوہ جھاڑو پوجا بھی کرتی تھی صفائی  
تو وہ چھی گزرتی تھی لیکن کچھ دن سے ٹھہر کے سامان پر  
بھی ہاتھ صاف کرنے لگی۔ بچوں کے کھلونے چھچھوئے  
وغیرہ نامحسوس طریقے پر غائب ہونے لگے تو بیلا نے  
اسے جواب دیے دیا۔

اب کوئی مددگار نہ تھا اور ساس صاحبہ تشریف  
سے آئی تھیں۔

صبح کا وقت تھا۔ فرمان آفس جانے والا تھا اماں  
کو دیکھ کر اس پر شادی مرگ طاری ہو گیا۔ بوکھلا گیا،  
بکھلا گیا۔

”اماں.... اماں.... اماں آگئیں۔ ارے میں  
.... میں....!“

وہ ان سے جا کر لپٹ گیا اور بے سرو پیر کی باتیں  
کرنے لگا۔

ارے کیوں نہ آتی میں۔ ساری بات تیرے ساتھ  
ٹپے ہو گئی تھی، بس موقع نہ تھا، اب فرصت ملی ہے

پتے کہاں ہیں؟ بہو کیڈھی ہے؟“  
بوکھلا ہٹ میں اماں کو بیلا نظر ہی نہیں آئی۔

مالا نکو وہ عین ان کی ناک کے نیچے کھڑی تھی۔ اس کے  
سلام کا جواب نہ کر پھول کو چٹا چٹ پتہ پھر فرمان

کے صدمے واری ہونے لگیں۔ ان کا بھیتجا گھوم پھر  
گرگردیکھنے لگا اور بیلا کے سلیقے کی تعریف میں زمین

آسمان ایک کرنے لگا۔  
”گھر کیلئے محل ہے، ارے یہ تو جنت ہے بجائی

لہران کیسی انھی بیوی تھے ملی ہے بالکل خور کے  
جیسی۔ شکر ادا کر بجائی۔ گاؤں کی جاہل سے جان چھوٹی

تہری کیوں پھینچو؟“  
پھینچو کو یہ بصرہ پسند آیا نہ بہو کی تعریف، مگر

ہانپ رہیں۔ ان کا بھیتجا دو دن رہا اور بیلا کی تعلیم  
تربیت سلیقہ وغیرہ سراہتا ہوا رخصت ہوا جانے

سے پہلے بیلا سے کہہ گیا۔  
”میرے لیے بھی اپنی جیسی لڑکی تلاش کرو، میں

میں گاؤں چھوڑ کر آجاتوں گا۔“  
اور فرمان کا تو بس نہ چلتا تھا کہ ماں کے آگے  
ماں توڑ کر رکھو، آگئیں پچھاوے۔

آدھی آدھی رات تک اماں کے کمرے میں گھسا  
کبھی ان کی ٹانگیں وبار بار سے کبھی ہاتھ۔ اس کا بس  
چلتا تو وہ اماں سے لپٹ کر سو بھی جاتا مگر بارہ بجے

تک انتظار کر کے بیلا لے پکار لیتی۔  
”صبح آفس بھی جانا ہے، ایند پوری نہ ہوئی، تو

طبیعت خراب ہونے کا احتمال ہے۔“  
اور وہ بادل نخواستہ اماں سے جدا ہو کر آتا، سرشار

سا، جیسے اماں نے اسے خزانہ بخش دیا ہو۔  
شادی کے بعد اماں پہلی دفعہ آئی تھیں۔ فرمان

پر تو خوشی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔  
”اماں کی خوب خدمت کرنا، انہیں تکلیف نہ ہو

اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلانا، انہیں خوش کر لو، بس  
کسی بھی طرح۔“

نصیحتیں بھی جھولی بھر کر لانا۔ وہ اقرار کر لیتی کہ یہ  
اس کا فرض ہے۔ وہ میز پر رتن لگاتی، کھانا لاکر

رکھتی، اماں کو بلاتی تو دیکھتی کہ کچن میں زمین پر نہ تھی  
وہ پیلی میں لگا ہوا سائن روٹی سے پونچھ کر کھا رہی ہیں

پہلے دن تو وہ چیخ پڑتی۔  
”زمین پر کیوں بیٹھی ہیں۔ میز پر رکھ لے کھانا تو؟“

ارے میں زمین پر نہیں پڑھی پڑھی ہوں اور  
اکڑوں بیٹھ کر کھانا تو سنت رسول ہے، مگر میں کجنت

ایسی نصیب والی کب ہوں کہ سنت ادا کروں، موٹے  
گھنے جواب دے چکے ہیں، بیٹھا نہیں جاتا۔“

”مگر اماں! یہ دہنگی تو خالی تھی، سائن تو نکال لیا  
تو میں نے۔“

چار طرف آنا سالا لگا ہوا تھا، دھو کر پھینک  
رہا جاتا۔ میں نے آدھی روٹی اسی کے ساتھ کھالی ہے

رذق کی قدر کرنی چاہیے۔ کھانے کی چیز ضائع کرنا گناہ  
ہے، بس میں تو کھا چکی۔“

”اچھا، تو میٹھا ہی چکھ لیں، سوہ مایوس ہو گئی۔“  
مگر اماں کل پیٹ بھر چکا تھا اس کی اتنی محنت

سے بنائی پڈنگ کو انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔  
دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا تو وہ ویچی میں پانی بھر

دیتی۔ رات کو فرمان ہوتا تھا وہ اماں کو خوشاہد کر کے  
کبھی گود میں اٹھا کر لانا۔ زبردستی لقمے بنا کر کھلانا۔

اماں نے غدر کیا کہ گھر چھوٹا ہے چلنا پھرنا ہوتا  
 نہیں، کھانا ہضم کیسے ہوگا؟  
 "ہائیں... بیلا! لگتا ہے تم اماں کا خیال نہیں  
 کر میں۔ جتنی انہیں تپے فلیٹوں میں لے جایا کرو سب  
 سے ملاؤ۔"  
 بیلا چپ رہی۔ نیچے کے فلیٹوں والوں سے اس  
 کے تھوڑے بہت مراسم تھے۔ کبھی کبھار وہ لوگ  
 آجاتے تھے۔

جب نئے نئے فلیٹ میں آئے تھے تو بیلا نے قرآن  
 خوانی کی تھی تمام بلڈنگ والوں کو بلایا تھا۔ کچھ لوگوں  
 نے تعلق قائم کیا کچھ نے راہ چلتے سلام ڈیا کچھ اکتفا  
 کی۔ بیلا خود بھی بہت کم لوگوں سے ملتی تھی۔ اسے  
 گھر سجانے سلوانے کا بہت شوق تھا۔ آرٹسٹک ذہن  
 تھا اس کا گھر بلڈنگ بھر کے تمام فلیٹوں سے زیادہ  
 صاف اور سجا ہوا تھا۔  
 خود اس کی بھابھیاں معترف تھیں اور چچا کی بیٹی  
 بہو، جن کے گھر دولت کے انبار تھے اور جو تہی سے  
 قیمتی اشیاء خرید کر گھر سجاتی تھیں جب آئیں اس  
 کے ہاتھ کے ہنر و محنت اور کاوش کی دلدور تھی۔  
 اب فرمان نے اماں کو فلیٹوں والوں سے سلوانے  
 کا حکم سنایا۔

اماں جس دن آئی تھیں اس دن نیلی شلوار کالی  
 قمیص پہنے ہوئے تھیں اس کے بعد انہوں نے لباس  
 تبدیل کیا تو براؤن، سفید چیک کی ننگی اور لباس لیرا  
 کرتا پہن لیا۔ اس کے بعد سٹریچ، سبز چیک کی ننگی کے  
 ساتھ نیلی قمیص پہن لی۔ پتا نہیں فرمان نے کیوں نہیں  
 نوٹ کیا۔ کبھی کہا بھی نہیں اور اب وہ اماں کو سب  
 سے سلوانے کی فرمائش کر رہا ہے کیا کہیں گی سب  
 یہ ننگی پوش خاتون بیلا کی ساس ہیں۔  
 یہاں تو تمام کام کرنے والی مایاں، خواہ کسی

گھاڑوں کی ہوں، شلوار کرتا پہنتی تھیں بلکہ شہرے تمام  
 فیشن اپنائیتی تھیں۔ کچھ تو گھر کی بیگمات کی نقل میں  
 بالوں کو سنوار کر رنگ بونگے کلب، پونی بنی ہوئی،  
 کانوں میں بائے، اس قدر ٹیپ ٹاپ سے آتی تھیں  
 کہ فرق کرنا دشوار ہو جاتا، کون بیگمات ہے کون ماما۔

اور خود بیلا، پوری بلڈنگ میں اس کی خوش  
 پوشی مشہور تھی۔ میمنگ کا تو اسے اس قدر جنون تھا  
 چپل، پرس، چوڑے مایاں، بندھے ہر چیز اس کے لباس  
 کے ہر رنگ ہوتی۔ وہ درمیانی قیمت کی چپل اور پرس  
 لیتی تھی اسے بجٹ کا بھی خاصا لحاظ رہتا تھا۔ سونے  
 چاندی کی کبھی پروا نہیں کی۔ ہمیشہ لباس کے رنگوں  
 کی جو لوری، خواہ دھات کی ہونٹوں والی یا پلاسٹک  
 کے ٹوپس کلب وغیرہ۔ اس کے پاس رنگ دار جو لوری  
 چوڑیوں اور کلب، رین وغیرہ کا خزانہ تھا ساس کے  
 میکے میں بھی بیلا کی میمنگ اور خوش لباسی کو  
 سراہا جاتا۔

"بھتی فیشن دیکھنا ہے تو بیلا کو دیکھو۔ ابھی ہم سوچتے  
 رہ جاتے ہیں اور بیلا کے کپڑے فیشن کے مطابق  
 ہو جاتے ہیں۔"

اب شلوار کے پانچے تنگ میں اب اونچی شلوار  
 ہے، کھلے گوتے کا زمانہ ہے تو سب سے پہلے وہ پہنتی  
 قنگ کا زمانہ آیا تو ہفتہ بھر میں رکھے رکھائے  
 کرتے فٹ کر لیے۔ یہ اس کا سلیقہ تیز دستی اور ذہانت  
 تھی۔ کروڑیوں کی قمیص خاندان بھر میں سب سے پہلے  
 بیلا نے پہنی خود ساگر۔ کروڑیا ہو یا شیڈ وک  
 اس کے بائیں ہاتھ کا کا نامہ ہوتا۔ راتوں رات  
 پڑانے دوپٹے صبح کنگوروں سے سج جاتے۔ یوں تو  
 بازار میں اب ہر چیز بنی بنائی مل جاتی ہے مگر بیلا  
 کے ہاتھ میں ہنر تھا اور شوق بھی تھا اس کی اتنی نے  
 بیٹیوں کو ہر کام سکھایا تھا، اسی لیے بہوؤں پر اعتراف  
 تھا جن کو بازار سے ہر چیز لانا پڑتی۔  
 "لو جی! وہ کہتیں۔"

"ہمانے زمانے میں تو بازار سے اون کی لہجیاں آیا  
 کرتی تھیں۔ آدھی رات تک سجھا کر گولے بناتے تھے  
 پھر بننے بنائے گولے آنے لگے تو اس محنت سے جان

چھوٹی۔ اب تو ہر چیز بازار سے آتی ہے۔ بچوں کے  
 نیکر چڈیاں تک۔"

سارا مارا اون عورتوں کو بازار گھومنے کے لیے  
 تو وقت ہے مگر گھر میں خود اپنے ہاتھ سے کچھ بنانا  
 گناہ۔ وقت بھی بچے پیسہ بھی۔ سوچتی ہی نہیں کہ پیسہ

کہاں سے آ رہا ہے، کون جیسے کمار ہا ہے، بس  
لٹاؤ۔ لٹاؤ۔

اچی جی! ہمارے پاس وقت ہے کہاں کہ گھر میں  
بیٹھ کر کچھ بناؤں۔ جو نے فرمایا۔

بیٹا! کوشش تو کرو، پھر اندازہ ہو گا کہ ہر چیز  
میں بازار کی نسبت پیسہ کم لگتا ہے۔

اور گھر میں بناؤ تو وقت اور اچی وقت بھی  
بہت قیمتی ہے۔ ایک بہونے کہا۔

اچی! آپ کو اندازہ ہی نہیں، وقت کتنا تیز دوڑ  
رہا ہے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے میں بھی جانا

پڑنا ہے۔ بچوں کو اسکول لے جانا پھر لانا ہے انہیں  
پڑھانا ہے، بینک سے پیسے لانے ہیں، بل جمع کرانا

ہے ڈاکٹروں کے پاس دوڑنا ہے، بسوں کے دھکنے  
کھاتے ہیں ہم۔ مرد تو کمانے کے سو اچھے نہیں کرتے۔

تو مرد تو ہمیشہ ہی کمانا ہے، عورت گھر سنبھالتی  
تھی اتنی افراتفری پہلے کیوں نہیں تھی۔

اچی بے چاری کی سمجھ میں بہوؤں کا فلسفہ کم ہی  
آتا ہے آخر سب کام پہلے بھی ہوتے تھے۔

ہوتے تو تھے، مرد خود کرتے تھے، اب...  
اب تم نے مرد کو پیسہ کمانے کی مشین بنا دیا ہے

وہ لائیں، تم لٹاؤ۔  
اچی جی! ہم نے کام بانٹ لیا ہے، میں مرد کے لیے

آسانیاں کر دی ہیں تاکہ وہ سکون سے کمانی کریں۔ وہ  
مشین اس لیے بنے کہ زمانے کا ساتھ دینا ہے بچوں

کو بہتر مستقبل فراہم کرنا ہماری دونوں کی ذمہ داری  
ہے انہیں اعلیٰ افسر معزز شہری بنانا ہے اس کے

پے پیسہ بڑھائی بہتر کرنا اور پیسہ کمانا دونوں  
ضروری ہیں۔

سب بہانے، کیا ہم نے اعلیٰ تعلیم نہیں دلائی  
افسر نہیں بنایا، مگر نقل میں ہم تو پامل نہیں ہوئے

کہ آج فلاں کے گھر ٹی وی آیا ہے تو کسی بھی طرح نہیں  
بھی لے کر آنا ہے۔ فلاں نے جیسا زیور بنایا ہمیں

بھی ویسا لینا ضروری۔ اے ہم نے تو ہر حال میں  
قناعت کی زندگی گزارنی۔

تو اچی! ہم کسی سے کم تو نہیں۔ دوسروں کی طرح  
لو گئے۔

ہم کو بھی حق ہے کہ اپنے آرام کے لیے سہولتوں سے  
فائدے اٹھائیں۔

بہوؤں کو ساس کے اعتراضات کی زیادہ پروا  
نہ تھی کہ وہ اس زمانے کا اپنے دور سے مقابلہ کرتی تھیں

جو ان کے خیال میں نادانی اور کم فہمی تھی۔ بیلا اور شاما کہ  
بھی بھائیوں کی ہم نوائی کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں

بھی سہولت کی ہر چیز موجود تھی۔ خواہ قسطوں کی  
بدولت ہو یا کیٹیوں کی۔ بیٹے بھی کھلتے۔ کہ آج

کا دور تیز رفتاری کا دور ہے۔ پچھلے پچیس تیس سالوں  
اور آج کے زمانے میں رہن سہن ہی نہیں، انسان کے

مزاج ہی نہیں ذہن بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ سہیلے  
کی قدر نہیں، چیز کی قدر ہے۔ نت نئی ایجادات اسی

لیے آتی ہیں کہ لوگ فائدہ اٹھائیں۔  
بیٹا! فائدہ تو ان کمپنیوں کا ہے جو ان چیزوں کو

مارکیٹ میں لارہی ہیں۔ اچی جی! جڑھا تیں۔  
تم کو کیا فائدہ ہو سب سے تم تو فرسٹ سو سے جو جانتے ہو

دن بھر اس میں سر کھلتے ہو اور ٹائم کرتے ہو، جہاں  
موقعے دماغ کھساکر مزید کمانی کی نگ دو کرتے ہو۔

آرام تمہیں نہیں، نیند تمہاری پوری نہیں ہوتی۔ تھکن  
سے چور کھوٹے کھوٹے رہتے ہو، صحت کب تک

ساتھ ہے گی ضرورتیں محدود کی جاسکتی ہیں بیٹا۔ صحت  
افضل ہے میرے خیال میں، مگر جوانی کے جوش میں

تمہارے فرسوش کیے ہوتے ہو۔  
بیٹے جانتے تھے۔ یہ بہوؤں سے کہ نہیں۔

بیٹوں کی صحت و زندگی کی فکر ہے جو اچی اس قدر  
تصویرتوں پر کمر بستہ رہتی ہیں۔ جیسی عنایت و مشقت

کی زندگی انہوں نے گزارنی ہے، چاہتی ہیں بہوئیں  
بھی اسی طرح کریں جو آج کے زمانے میں مشکل ہے۔

بیٹا! جسم و جان کا ہم پر قرض ہے اور ہمارا فرض  
ہے کہ اس کی حفاظت کریں۔ اس دولت کو بے دیدگی

نہ لٹائیں۔ سکھ، چین اور آرام پر تمہارا بھی حق ہے  
بیٹا اگر تم پیسہ کمانے میں تھوڑی سی کمی کر دو گے تو

اتنا بڑا نقصان نہیں ہو گا جتنا زیادہ دماغ کھانے  
میں بے آرامی اور فکر سے تم صحت میں گھٹن لگنا

لو گئے۔

اتنی کو جب موقع ملتا، نصیحت کرتی۔ بہو میں  
 کبھی بڑا مانتیں، کبھی ہنس کر ٹال جاتیں۔ انہیں بھی  
 عادت ہو گئی تھی، اس لیے پروا نہ کرتیں۔ اسی لیے نہ  
 کرنے کے باوجود گھر کے نظام کو سہارا دینے کوئی  
 تھیں۔ بہو میں جب بھی مار کھٹ کے لیے روانہ ہو  
 جاتیں۔ وہ بچوں اور اپنے لیے کچھ پکالیتیں۔ خواتین  
 جب لدی پھندی واپس آتیں تو بھوک سے بے حال  
 تھکن سے براگندہ۔ نوکر کو بازار دوڑایا جاتا، وہ گھنٹہ  
 بھر بعد نان کباب اور مٹھے لے آتا۔ اس دوران وہ  
 بستر پر لیٹی تھکن آتا رہی۔ اتنی کو جھنجھلاہٹ ہوتی۔  
 بازار سے کھانا منگوانے کے بجائے گھر میں وال  
 روٹی آدھے گھنٹے میں تیار ہو جاتی۔ بازار سے گھنٹہ بھر  
 میں یہ شوکے نان کباب آئے ہیں۔ مٹھے کس جانور کے  
 ہیں۔ تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ بیٹا جانے سے پہلے  
 ایک ایک کام بانٹ کر کھانا تیار کر جاتیں تو کتے ہی  
 مل جاتا جب معلوم ہے کہ بازار کی محنت مزدوری  
 میں دیر لگتی ہے تو پہلے سے کیوں نہیں کوکے جاتیں۔  
 اتنی! کبھی بیٹوں کو بھی کوئی نصیحت کر دیا کرتی۔  
 "مزدور کروں گی جب دیکھوں گی کہ وہ روز بازار  
 کے واری صدفے ہو رہی ہیں بچوں کا ہوش ہے نہ  
 میاں کی پروا تو نوکروں کی ہو۔  
 اور بھابھیاں تو جانتی تھیں کہ بیلا اور شامندر بازار  
 کی چیزوں کے بجائے ہاتھ سے خود بنا کر خوش ہوتی  
 ہیں۔ بھتی ہے ان کے پاس وقت۔ بیلا تو یوں بھی  
 کئی ماہ بعد نسران کے ساتھ ہی کسی ضرورت کے  
 تحت بازار جاتی۔ شامندر ساس اور نندوں کے ہمراہ  
 چیلے کا سول لینے جاتی تو ضرورت اور شوق کی چیزیں  
 بھی لے لیتی۔ اس کی بھر پوری سسرال تھی۔ بازار میں  
 میں گھومنے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔ بھابیوں  
 کا نظریہ یہ تھا کہ جب ہر چیز بازار میں موجود ہے تو  
 محنت کیوں کریں۔ خواہ غواہ کی تھکن۔

بیلا پہلے پہل ساس سے خوفزدہ رہی کہ وہ بھی  
 اتنی کی طرح نصیحت کا پتارہ کھول کر بیٹھے جائیں گی  
 مگر وہ تو ہر طرف سے بے خبر جیسے آنکھ بند کیے ہیں

نہ انہیں گھر کی جھک دمک متاثر کرتی نہ سجاوٹ  
 نظر آتی۔ وہ بیلا کو دن بھر کام میں مصروف دیکھ کر  
 تعریف بھی نہ کرتیں نہ اسے سینے کاڑھتے بٹتے دیکھ  
 کر ادا دیتیں۔ ہاں کبھی کبھار وہ اچھے کپڑے پہن  
 کر آتی تو عادتیں۔

• بوڑھے سہاگن ہو ایسے ہی رہا کر داسی بنی۔  
 مگر یہ الفاظ تھے نہ بچے میں شیر۔ بنی نہ آنکھوں  
 میں تاثر بے شمار ضرورت کی اشیاء کھٹے کے شوکیں  
 میں رکھی تھیں۔ کبھی سوال تک نہیں کیا۔ کسی چیز کا  
 استعمال بھی انہیں نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ بچھا  
 چلانے کے لیے بھی بیلا کو ادا دیتیں۔ فرمان نے  
 ریگورٹس فیکس کر دیا اب صرف سوچ دبانے سے بچھا  
 چل پڑتا۔ اماں کو سوچ سے بھی ڈر لگتا کہ کرنٹ نہ  
 لگ جائے۔ وہ پنگ پر لیٹی یا بیٹھی رہتیں۔  
 ایک روز سسران کو بخار تھا۔ بیلا اسے ڈاکٹر  
 کے ہاں لے گئی۔ واپس آئی تو کمر میں سانسے برتن دھلے  
 رکھے تھے۔ دیکھیاں پانڈی کی طرح جھک رہی تھیں  
 یہ اماں کا کارنامہ تھا۔ بیلا شرمندہ ہو گئی۔  
 ایک دن فرمان کی فرمائش پر اماں نے ساسن پکایا  
 وہ بھی بہت لذیذ۔ فرمان نے اماں سے کہا۔  
 • وہ بیلا کو بھی ایسا ساسن رکھنا سکھا دیں۔  
 گو کہ فرمان بیلا کے کھانے کی ہمیشہ تعریف کرتا  
 تھا۔ مگر ماں کے ہاتھ کی لذت ہی اور تھی سب بیلا  
 کو کام میں مصروف دیکھ کر اس کی مدد کرتیں۔  
 کبھی پیاز کاٹ دی، کبھی سبزی تلوئی۔ بیلا کپڑے  
 دھوتی تو ڈوڑھی بر ڈال دیتیں۔  
 بیلا آنا گوندہ کر تلے میں پانی ڈال دیتی۔ آسانی سے  
 دھل جاتا تھا۔ اماں اس کے ہاتھ سے تلے لے کر پانی  
 گلے میں ڈال آتیں کہ رزق کا پانی سے بے اولی ہو  
 گی نالی میں، اسی طرح برتنوں میں گچے وال چاول  
 ہڈی ابوٹی سب چھپے سے الگ کر کے رکھ لیتیں۔ اور  
 اوپر ولے فلیٹ کی چھت پر جا کر ڈال آتیں۔ اس طرح  
 وہ آدرو لے لوگوں سے متعارف بھی ہو گئیں۔ ان  
 کے دلنے ہوئے کچھ کھانے پر کوسے مینا چڑھایا  
 آجاتا۔

بھی کبھی اماں اعراج کو گود میں لے کر کونے چڑیاں دکھانے لے جاتیں۔ پھر ایک دن وہ نیچے جا کر سبزی والے سے سبزی لے آئیں اور بیلا سے کہا۔  
 "سبزی زیادہ پکایا کرو گوشت کی زلیقہ اچھی نہیں ہوتی مردوست کاہل ہو جاتا ہے۔  
 اب وہ اکثر نیچے جا کر سبزی لے آتیں۔ بیلا کو بڑا آرام ہو گیا مگر انہیں دیر بہت لگتی تھی۔ پتا نہیں کس دکان سے لاتی تھیں خوب تازہ چھانٹ کر عمدہ سبزی لاتی تھیں۔

چھانٹنے نہیں دیتا سبزی والا۔ کہتا ہے میرا سب سے اچھا مال اماں جی لے جاتی ہیں۔ اب کیا میں دن بھر باسی سبزی بیچوں؟ سنا تم نے۔ تازہ، باسی ملا کر دیتا ہے بے ایمان کہیں کا بھگے بھلا بنے وقوف بنا سکتا ہے۔ بھئی منہ مانگی قیمت دیتی ہوں پھر باسی مال کیوں لوں۔ ہیں؟

ایک دن بیلا کی اتنی عمدہ من سے ملنے آگئیں۔ ان کے ٹھنوں میں درور رہتا تھا اس لیے وہ زینہ پڑنے سے پرہیز کرتی تھیں۔ بیلا کے ہاں آکا لیے بہت ہی کم آتی تھیں مگر عمدہ من سے ملنا تو ضروری تھا۔ خلاف توقع دونوں میں بہت جلد بے تکلفی ہو گئی۔ بیلا چائے لے کر گئی تو دونوں سر جوڑے باتوں میں جٹی ہوئی تھیں۔ اتنی لے جانے سے پہلے بیلا سے سرگوشی کی۔

"بہت اچھی ہیں تمہاری ماس، ان سے کچھ سیکھ لو۔"

وہ سنس دی اور کیلکے، جتنا کہ اتنی نے سکھا دیا تھا اس کا عشر عشر بھی دوسری لڑکیوں کو نہیں آتا۔ خاصہ سینا پرانا، کارخانہ بننا تو برا رنگ، برتن برتانا سبز چھل، بروا شت معزت و وقار کی حفاظت، اخلاق انسانی، خود داری سب کچھ۔ وہ غور کرتی رہی۔ اماں

کے کیا سیکھ سکتی ہے۔

دراصل اتنی بھی عمدہ من سے پہلی بار مل رہی تھی۔ شادی تو فرمان کے چچا کے توسط سے ہوئی تھی۔ اہل کی بیٹی، بہو بیلا کو پسند کر گئی تھیں۔ چچا اچھی رشتہ لانے سے اور یہ کوئی ماہوئی نہ تھی۔

فرمان عرصے سے اپنے چچا کے ہاں مقیم تھا۔ برائے تعلیم پھر اسے اچھی جا ب بھی مل گئی۔ چچا نے ہی اس کی شادی پر زور دیا تھا۔ ہاں بارات میں والدہ کی غیر موجودگی کو سب نے محسوس کیا تھا، مگر چچی نے ان کی بیماری کا غدر پیش کر دیا۔

اس کے بعد بھی فرمان عرصے تک اپنی ماں سے ملنے نہ گیا۔ بہانا چھٹی نہ ملنے کا تھا مگر دراصل وہ بیلا سے جدا ہونے پر راضی نہ تھا۔

کچھ عرصہ بیلا چچا کے ہاں ہی رہی اور فرمان اس کے گرد پروانے کی طرح گھومتا۔ سب اس کا مذاق بھی اڑاتے، مگر اسے پروا نہ تھی۔

اس کے کافی دن بعد وہ اماں سے ملنے گیا۔ وہ بیلا کو نہیں لے کر گیا البتہ اس کی تصویریں لے گیا تھا۔ بیلا نے بار بار اپنی ماس سے ملنے، ان کی خدمت کرنے کی خواہش کا بھی باظہار کیا۔ مگر..... وہاں دس بہانے۔

چچا اچھی بھی اس معاملے میں خاموش رہتے بلکہ ایک طرح سے وہ اسے گناہ جانے سے منع ہی کرتے اور ماس کو اپنے پاس بلانے کا اختیار اسے نہ تھا۔ نہ جانے کیوں وہ انہوں میں مبتلا ہو جاتی۔

فرمان اسے یقین دلاتا کہ اماں خالص دیہاتی خاتون ہیں، ٹرین میں بیٹھنے سے ڈرتی ہیں اور کوئی بات نہیں۔ چونکہ چچا اچھی برابر رابطہ رکھتے تھے، اس لیے اس کے سیکے والوں کو بھی پریشانی نہ تھی۔ اعراج اسراج چچا کے گھر پیدا ہوتے تھے۔

پھر فرمان کو فلیٹ مل گیا۔ اعراج اسراج کی خوشخبری لے کر فرمان کا دل گیا تھا اماں تب بھی نہیں آئیں اور وہ تو کچھ گور بھی گئی کہ کہیں وہ یا گل تو نہیں ہیں مگر رافضہ آیا اور بھالی نے یقین دلایا کہ ایسی بات نہیں ہے، وہ بس عجیب ہیں۔

اس عجیب سے کچھ افذ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شکر ہے کہ وہ ماس کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئی اور ہر فذ شدہ دود ہو گیا۔

فرمان، اماں کو چچا کے ہاں لے جانے پر بھی راضی نہ کر سکا۔ انہوں نے کہا۔

” میں بیٹے کے گھر آئی ہوں جب وہ گاؤں جا کر  
 بلائیں گے تب ان کے گھر جاؤں گی۔“  
 واقعی عجیب تھیں، چچا، چچی خود آکر مل گئے۔ ان  
 کے بیٹے، بیٹی، بہو وغیرہ سب باری باری آئے۔  
 اماں نے ہچکے سے تو پر وہ ہی کیا۔ منہ سوٹھے  
 بیٹھی رہی۔

بیلا کے بھائی آئے اور اماں کو دعوت کا بلاوا  
 دے گئے۔ بیلا تو ڈر رہی تھی کہ وہ صاف انکار کر  
 دیں گی، مگر وہ چپکے ہیں۔  
 دعوت والے دن انہوں نے سُرُخ، سیاہ چیک  
 کی رنگی نکالی۔ بیلا کے ہاتھوں کے طہے اڑ گئے، دوڑی  
 فرمان کی طرف۔

” خدا کے لیے اماں کو رنگی پہننے سے روکیں۔“  
 فرمان جتنے رنگنے لگا۔

بیلا نے اپنا سفید کرتا، دو ٹیڑھے نکال کر دیا، جو اس  
 نے ابھی تک پہنا نہیں تھا۔ اماں نے سفید شلوار بھی  
 نکالی۔

صبح سویرے انہوں نے ہاتھ پیر میں مہندی  
 لگالی تھی۔ وہ پیر تک خوب رنگ چڑھ گیا۔ سُرُخ  
 سیاہ چوڑیاں پہن کر، آنکھوں میں سرمہ لگا کر انہوں نے  
 کھتے پہنے اور ان کا سنگھار تمام ہوا۔

سمدھیانے میں ماں کے اس جاہ و جلال والے  
 روپ کو سب نے پسند کیا۔

کھانا بہت لذیذ اور ذرا فرحتا۔ اماں نے خوب  
 خوب انصاف کیا اور بیلا کی بجا و جوں کو پاس بلا کر ان  
 کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ چڑھے۔ مزید لذت کے لیے دعا  
 کی۔ بھابھیاں بہت متاثر ہوئیں۔

” بیلا! کتنی خوش قسمت ہو تم، اتنی اچھی ساس  
 ہیں تمہاری۔“

” اے کاش ہماری ساس بھی ایسی ہوتیں۔“ منجلی  
 زیادہ ناشکر می تھی۔

” اللہ میاں! ہماری ساس پر ان کا سایہ ڈال دے  
 آمین۔“

چھوٹی بھابی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

شماٹھ جو شروع سے چپ چپ تھی، ناگوار سی سے  
 ان کی باتیں سن رہی تھی۔  
 ” اللہ نہ کرے اتنی پر کسی کا بھی سایہ پڑے۔“ وہ  
 غصے سے بول پڑی۔

” وہ جیسی ہیں اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ کبھی کوئی  
 لشکر بھی ادا کیا کرو کہ بے ضرر ساس ہیں۔ جو ظاہر ہے  
 وہی باطن ہے۔ کچھ کہتی ہیں تو وہ بھی تمہاری بھلائی  
 میں۔ لوگوں سے بوجھ تو ڈرا۔ کس کس فتنہ انگیز  
 ساسوں سے بہوؤں کے سالیقے ہیں۔ ناشکر می کہیں  
 گی۔ بس رشک کروالو کہ فلاں کی ساس ایسی فلاں  
 کی ساس ویسی۔ فوراً فریفتہ ہونے کو تیار۔ اندر سے  
 کون کیسا ہے۔ یہ جان لو تو خود کو خوش قسمت  
 سمجھو گی۔“

شماٹھ نے تینوں بجا و جوں کی خاصی کھنپائی کر  
 ڈالی۔ وہ دانتوں میں زبان دباکر سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔  
 شماٹھ سب سے بڑی تھی اور یہ تینوں بجا و جوں  
 اسی کی پسند اور کاوش کے نتیجے میں اس گھر میں نظر  
 آرہی تھیں، اس لیے بھی وہ اس سے دہتی تھیں۔  
 یعنی ساس سے زیادہ مذکار عیب تھا۔

اتنی تو خاندان سے ہی بہو نہیں لانے کی خواہش مند  
 تھیں مگر شماٹھ نے مخالفت کی کہ اپنوں میں نیارشتہ  
 جوڑنے سے پرانے تعلقات بھی کشیدہ ہو جاتے  
 ہیں۔ شماٹھ رشتے داروں میں سیاہ کر گئی تھی۔ شادی  
 تو بڑے جوش و خروش سے ہوئی مگر بعد میں ساس  
 کو بہو میں اُندوں کو بجا و جوں میں ہزار عیب نظر آنے  
 لگے۔ پھر شماٹھ کی اتنی سے اس کی ساس طرے تک  
 ناراض رہیں۔ شاید جیزان کی مرضی کا نہ تھا یا بعد میں  
 ان کی خواہش کے مطابق سمدھیانے سے قدم واتی  
 نہیں کی گئی۔

یہ تو شماٹھ کی ذہانت، معاملہ فہمی، ووداندیشی

تھی کہ اس کے حق میں ساس، اُندوں کے معاملت درست  
 ہوتے گئے۔ وہ بہت زیادہ محنتی، خدمت گزار، مل جل کر  
 گزارا کرنے والی تھی۔ اس کے شوہر بھی اس کے قدر دان  
 تھے اور ماں بہن کو سمجھاتے کہ شماٹھ میں کوئی خامی یا کمی  
 نہیں بلکہ وہ گھر بنانے کی شوقین ہے۔ یہیں شماٹھ سے

واسطہ سے اس کی ماں یا بھائیوں کا ہمارے گھر میں قتل ہی نہیں ہے۔ پھر ان سے کیوں لگاڑ کریں۔  
شٹائلہ بھٹ کی عادی نہ تھی۔ کسی نقصان کا احتمال ہوتا تو اختلاف کرتی، ساس مند میں آجاتیں اور پھر کام خراب ہوتا۔ تو شٹائلہ کی رائے کی قدر ہوتی۔ شٹائلہ کبھی بتاتی نہ تھی کہ میں نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ بلکہ کہتی۔ کوئی بات نہیں اتناں۔ قدرت کو یہی کرنا تھا۔ ہم کچھ بھی کر لیتے۔ ہوندا ہی تھا۔ دراصل ساس مند خود کو۔ عقل کل سمجھتی تھیں اور سب ہی سمجھتے ہیں کہ ہم عقل مند ہیں۔ دوسرا حق۔

چھوٹے چھوٹے معاملات میں گھر کے مسائل میں اس کی رائے جب بھی مانی گئی۔ فائدہ ہوا۔ پھر بھی کوئی تسلیم نہ کرتا۔ اتفاق سے کہہ کر ٹالا جاتا۔  
ایک بار زندگی شادی کی بات علی لوگ آئے۔ بار بار خواتین آئیں۔ لڑکا اچھا تھا۔ عجب بھی ٹھیک ٹھاک۔ وہ لوگ فوری نکاح اور مہینہ بھر بعد شادی پر اصرار کر رہے تھے۔ شٹائلہ نے دینی زبان سے کہہ کر نکاح کے لیے اقرار نہ کریں۔ ابھی کسی اور سے بھی معلومات کرائیں۔ آخر انہیں اس قدر جلدی کیوں ہے؟

اتفاق سے اس کی زندگی کسی سہیلی کے ذریعے معلوم ہوا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ تحقیقات کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ تو بتا چلا کہ لڑکے کی ایک شادی ہو چکی ہے۔ بیوی سے علیحدگی بھی نہیں ہے، مگر وہ یکے میں ہے اور اس نے بیوی سے شرط رکھی ہے کہ تم سے زیادہ مہین، تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر کے دکھاؤں گا۔ بال بال دھوکے سے بچے یہ لوگ۔ سب شٹائلہ کی ہنم و نسیم است کے قائل ہو گئے۔ اس کے بعد بھی بار بار شٹائلہ کی بھج بوجھ اور مروت شناسی ثابت ہوتی۔ سسرال والے بھی اب شٹائلہ سے خوش تھے

اور میکہ سسرال پھر سے خوش خرم ایک جان و دو قالب۔ آپا آپ کا خیال ہے کہ فرمان بھائی کی والدہ اند سے کچھ اود میں۔ جیسی نظر آتی ہیں۔ ویسی نہیں ہیں؟  
ہمیں کسی کے باپ سے میں رائے زنی کے حق میں نہیں

میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہیں گواکب کہ نظر آتے ہیں کچھ۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ پہچان میں غلطی ہو گئی۔ فرمان سچا، گھرا آدمی ہے اور اسی سے عرض ہے ہمیں۔ اس کی والدہ ہیں۔ آج یہ میں تو کل ملی جائیں گی، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ... خیر چھوڑو۔ فری دہا ہے کہ بیلا کے حق میں وہ منصف مزاج ساس ثابت ہوں۔

شٹائلہ سب سے پہلے واپس ملی گئی۔ بیلا اور فرمان کافی دیر بیٹھے۔ بیلا کے بھائی اور بھایاں فرمان کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کی سادگی، سچائی اور خوش مزاجی وہ جہاں جا کر بیٹھا، قہقہوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی۔ بیلا اور فرمان اماں کے ساتھ چلے گئے تو بھائیوں نے دیر تک ان کے باپ سے میں گفتگو کی خصوصاً شٹائلہ کا انداز خاصا پریشان کرنے والا تھا۔ وہ بیلا کی ساس کے باپ سے میں مشکوک تھیں کہ وہ ایسی ہیں نہیں جیسی نظر آتی ہیں۔ مشفق اور نیک بی بی۔  
پتا نہیں آ پلئے ان میں کیلویکھ لیا اور پھر بتایا بھی نہیں کہ آخر ان میں کیا خرابی ہے؟

”جب وہ اند آئی تھیں، آ پلئے گھر آکر میرا بازو پکڑ کر کہا۔ دیکھنا فائرہ کیسی عجیب تم نکھیں ہیں ان کی اور سچ بھائی! میں نے بھی خود کیا تو بڑی عجیب سی چمک جتی ان کی آنکھوں میں، دھندلائی ہوئی آنکھوں میں چمک، جیسے سوتے سے جاگ اٹھی ہوں، جیسے اندھیرے میں کوئی جگنو بھللائے۔ میں بھی کچھ حیران تو ہوتی تھی۔“

• اور آپا جو دیر سے چمک رہی تھیں ان بڑی بی کو دیکھتے ہی چپ ہو گئیں، بلکہ پریشان سی۔  
• بھئی آپا اب مافوق الفطرت ہستی بھی نہیں ہیں کہ انسان کی شکل دیکھ کر اندر تک جھانک لیں۔ چھوڑو یہ نوکر۔ اتفاق ہے کہ انہوں نے دو تین دفعہ جوڑنے دیں وہ صحیح ثابت ہوں۔“

• خیر اب آپا کا امتحان ہے۔ دیکھیں گے، ان کا شک گناہ دست ہے۔ ویسے ان کی چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں جس بھی ہے جو کمال کی ہے، ماننا پڑے گا۔  
”اچھا اب بیلا سے نہ کہنا۔ بے چاری مجھے میں گرفتار

ہو جائے گی۔ کچھ فکر مند تو شام کو آپا لے کر دیا ہے۔  
 بیلا خوش تھی۔ سب کچھ بہترین تھا اس کے  
 بیکے والوں نے اس کی سانس کی عمدہ طریقے پر بندرانی  
 کی رات ہی نے بہت قیمتی سوٹ اماں کو دیا۔ فرمان بھی  
 مطمئن تھا۔ اماں نے اس کی سسرال کو ہند کیا تھا۔  
 بیلا رات کے سناٹے میں فرمان کی آواز نے  
 بیلا کی مینڈاڑادی۔ بچب آداسی تھی آواز میں۔

”ہاں کیا ہے؟“ وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔  
 ”نہیں... نہیں... کچھ نہیں... وہ میں کہہ رہا تھا تم  
 اماں کی خوب خدمت کرو۔ ان کا دل بہت نوری  
 ”اوہ بیلا پریشان ہو گئی تھی۔ پھر سے لیٹ گئی۔  
 ”دیکھو۔ جس طرح بھی ہو۔ ان کو اپنی خوبیوں کا  
 ایسا کر لو۔ بس وہ تمہارے گن گانے لگیں۔  
 کیا بچکانہ خواہش تھی۔ بیلا کو ہنسی آگئی۔ وہ کوئی  
 منفی کلمہ تو نہیں ہیں۔ جو میرے گن گانے لگیں۔  
 ”یہ کیا بات ہوئی۔ میرا مطلب ہے کہ۔ بس کسی  
 طرح۔ خدمت۔ فرمان برداری۔ یہاں تک کہ  
 چاہیے کرنا پڑے تو وہ بھی۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو  
 جائیں کہ فرمان تو نے ایسی ہو لا کر مجھے خوش کر دیا۔  
 ”بہت اچھی ہے۔ اس سے اچھی تو اور ہو ہی نہیں  
 سکتی۔“

”کیا وہ۔ مجھ سے۔ ابھی خوش نہیں ہوئیں؟“  
 ”بیلا میں بہت حیران ہوں۔ انہیں ابھی تک  
 تمہاری خوبیوں کا کیوں علم نہیں ہوا؟  
 ”میں تو پوری کوشش کرتی ہوں۔ بیلا کی نیند  
 بالکل ہی اڑ گئی۔ ”کیا انہوں نے؟“  
 ”نہیں۔ یہی تو فکر ہے۔ وہ کچھ کہتی ہی نہیں ہیں  
 میں چاہتا ہوں بیلا کہ وہ۔ یہاں سے جاتے وقت  
 تمہارے نام کا۔ تمہاری خوبیوں کا وظیفہ پڑمتی جائیں۔  
 ”دراصل وہ ایک شرط پر ہمارا آئی تھیں۔ اور میں۔  
 پتھار ہا ہوں کہا نہیں یہاں آتے پر کیوں مجبور کیا؟  
 فرمان کے لہجے میں خاصی پریشانی تھی۔ بیلا نے  
 فرمان کو کبھی اتنا فکر مند نہیں دیکھا تھا۔  
 ”بیلا! تم بہت اچھی ہو۔ میں جانتا ہوں تم سے  
 بہتر۔ بلکہ تم جیسی بھی کوئی لڑکی مجھے مل نہیں سکتی تھی

یہ چچا بوٹی کا احسان ہے کہ انہوں نے تمہیں منتخب  
 کیا۔ اور تم نے۔ میری توقعات سے بڑھ کر مجھے  
 چاہا۔ میرا گھر بنایا۔ گھر کو جنت بنایا۔ میرے لیے  
 تم نے۔ خود کو مٹا ڈالا۔“

”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔  
 فضول۔ میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔ بس آپ  
 اب سو جائیں۔ میں اماں کی اور زیادہ خدمت  
 کروں گی۔ اتنی کہ وہ میرے گن گانے لگیں۔ بس  
 یہی چاہتے ہیں ناں آپ۔“

”میں۔ میں۔ میں تمہارے سوا کسی سے۔ بیلا مجھے  
 اتنا نہ چاہو کہ میرے راستے کھو جائیں۔ میں نے  
 تم سے محبت کی ہے۔ صرف تم سے۔ تم۔ تم۔ اور  
 کر لی نہیں۔“  
 فرمان بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔  
 ”بیلا نے اسے اس قدر فکر مند بنا دیا پریشان  
 اور ایسا جذباتی ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔  
 ”مجھے چھپا لو بیلا! اپنے وجود میں کم کر لو۔ اس  
 طرح کہ میں سب کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔  
 کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔ بیلا۔ بیلا۔ مجھے ایسا نالو  
 بیلا نے اسے پنجوں کی طرح تھپک تھپک کر  
 سلایا۔ سوتے میں بھی وہ جھجھکی لے کر بیلا کو  
 پکارتا۔

”صبح پوچھوں گی۔ اس نے سوچا۔ یہ آخر انہیں ہوا  
 کیا۔ وہ خود بھی مضطرب ہو گئی۔ لیکن صبح کو پنجوں  
 کے شور شرابے۔ چائے نہانے کی پیل۔ فرمان کے  
 آفس کی تیاری میں سب کچھ بھول گئی۔ اور پھر فرمان  
 نے بھی کوئی بات نہ کی۔“

اس دن بیلا نے اماں سے ان کی پسند کا کھانا  
 پوچھ کر لیا۔ سہ پہر کو نمک پارے تھے۔ نمک  
 پارے فرمان اور پنجوں کو بہت پسند تھے۔ فرمان  
 کے آنے سے پہلے ہی چائے تھے میں رکھ کر  
 نمک پارے ادائیگی کے گھر سے آئی ہوئی برقی پلیٹ  
 میں رکھی۔ اور سانس کے پاس آئی۔

ابھی وہ رٹے میز پر رکھ رہی تھی کہ دروازے  
 کی گھنٹی بجی۔ فرمان کے آنے میں تو کچھ دیر تھی سو دروازے



پر اوپر کے فلیٹ والی مہ بیٹی کے کھڑی تھیں۔ وہ انہیں اندر لائی۔ ڈرائنگ روم میں بٹایا۔ کچھ اخلاق برتا۔ پھر چائے لانے کے لیے کھڑی ہوئی تو انہوں نے کہا۔

میں تو۔ دراصل تمہاری ماس سے ملنے آئی ہوں۔ چھت پر دانا دنگا ڈالنے جاتی تھیں تو ان لوگوں سے جان پہچان کرنی تھی اماں نے۔ اس دن کے بعد نیچے کے فلیٹوں سے بھی خواتین خالہ جی سے ملاقات کے لیے آئے لگیں۔

بیلا جو فرماں کی خواہش اور فرمائش پر ماس کا دل جیتنے کی تگ و دو میں زیادہ سے زیادہ مصروف تھی۔ ان کے مہمانوں کے دل جیتنے کی باتوں کو سبزی لانے میں اسی لیے دیر ہوتی تھی کہ وہ نیچے والوں سے مراسم بڑھا رہی تھیں۔ اب کوئی کھانے کی کسی خاص ڈش کا معلوم کر رہی ہے تو کوئی اپنے لیے دعا کرانے آ رہی ہے۔ آنے والی خواتین جو بیلا سے واقف تھیں۔ اب اسے نظر انداز کر کے خالہ جی کے گرد ہالہ بنائے بیٹھ رہیں۔ اکثر تو کاغذ پینسل ساتھ لاتی تھیں۔ کچھ دن بیلا اخلاقیات ان کے پاس جاگزیمنی چلے خیریت سے تواضع کرتی۔ پھر اس نے وہاں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ اپنے کام میں مگنی رہتی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی برقی تار سے اماں کی شہرت پھیل رہی ہے۔ اس پاس کی دوسری بلڈنگ والیاں بھی جوق در جوق آئے لگیں۔ کوئی دم کرانے آ رہی ہے کوئی دعا کرانے۔ کسی کو تعویذ دیکھا رہے تو کوئی محض خالہ جی کی زیارت سے مستفید ہونا چاہتی ہے۔ پھر عجیب عجیب عود میں آئے لگیں اور بیلا کے حسین نفاست سے بچے ڈرائنگ روم میں موٹنگ پھل کے جھکے سے نکلنے سے گرانے اور گندے ہاتھ قالین سے توڑنے لگیں۔ تو وہ گھبرائی۔ فرمان کو بتایا۔ نت نئی عودوں کی نگرانی بھی

اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ کہ اب کسی کا کوئی وقت نہ تھا۔ جب چاہا وہ دن ذاتی گس آئیں۔ کوئی نظر ہکے لیے دم کرنے بچے کو لانی ہے جو پیشاب کرنے

میں ذرا تکلف نہیں کرتا۔ تو کسی کی آنکھوں کی کمزوری کے لیے کوئی وعدہ کا رہے۔ اور نظری کمزوری کے باعث وہ ریک پر رکھے ڈیکوریشن میں فرش پر گرنے میں کامیاب ہو جاتی۔ غرض گھر گیا سر لے بن گیا اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

روز صبح وہ گھر صاف کرتی۔ چماتی۔ کٹن جگہ پر رکھتی آگے والیاں کٹن اور ادھر پھینک دیتیں۔ جگہ جگہ شربت کے گلاس لڑھکتے۔ پیالیاں۔ یہاں وہاں ادھی بڑی ہوتیں۔ ماس کا دل جیتنے کے لیے بیلا نے اپنا آپ واٹر پر لگا دیا تھا۔ مگر آفرین ہے۔ اماں جی نے پھر بھی اس کی کوئی تعریف نہ کی۔ آخر اس نے کٹے والیوں کو ڈرائنگ روم کے بجائے ماس کے کمرے کا راستہ دکھا دیا۔ تواضع کا سلسلہ بھی ختم۔ انہیں اماں کے پاس بھیج کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ مگر یہ ضرور تھا کہ اماں سرور نظر آ رہی تھیں۔ عودوں کے ہم غنجر میں گھری ہوئی شادمان۔ شادمان۔ نہ جلنے ان کے کس جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔

بیلا سوچتی شاید اماں اسی طرح اس کے گن گانے لگیں۔ مگر فرماں کو گھر میں پھیلی ابتری کا احساس ہو گیا تھا۔ کٹے والیاں اپنی چپلوں میں مٹی کچھڑ لاتی تھیں جو سارے گھر میں پھیل جاتی۔ اور پھر آفس سے آ کر بھی آرام نہ ملتا۔ طرح طرح کی آوازیں چھاؤں پھاؤں اماں کے کمرے سے باہر نکل کر گھر میں گونجتی وہ جھنڈا کر بیلا پر برس پڑا۔

کیوں آتے دیتی ہو۔ کیوں کھولتی ہو دروازہ۔ منع نہیں کر سکتیں۔ اپنے گھر میں چھٹی کے بعد بھی سکون نہ ملنے کی وجہ سے۔ اماں کو خوش کرنا ہے۔ تو برداشت کرنا پڑے گا! بیلا پر سکون رہتی۔

ایک دن دو عود تھیں۔ جو ایک دوسرے کی حریف بھی تھیں۔ ایک ہی مقصد کے لیے آگیاں اور ایک دوسرے کے خلاف تعویذ ملنے لگیں پھر دونوں میں خوب ٹھنڈی لڑائی ہوئی۔ میں۔ فرمان اسی وقت آیا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے آرام سے چائے

بناتی بیلا سے پوچھا۔

لڑائی بیلا نے کہا۔

ادہ۔ تو۔ اس نے غصے میں بال نوحہ لے کر اس گھر میں جہاں بیلا کی ہنسی کے تھوڑے پھونکرتے تھے اعراج سرانج کی تلقاریاں گونجتی تھیں اور خود فرمان کی خوشی سے بھرپور چمکار بہا کے پھول کھلایا کرتی تھی۔ آج وہاں گالی گلوچ کے ساتھ ہاتھ پائی کڑھی آوازیں گونج رہی تھیں اور گھر میں کتے ہی جو نالوار بوا اس کا استقبال کرتی تھی۔ وہ کب تک برداشت کرتا۔ سیدھا اماں کے کمرے میں جا کھسا۔ اور بڑے رعب سے بولا۔

”جائے۔ آپ سب اپنے گھر جائیے۔ اور خبردار آئندہ یہاں نہ نظر آئیں!“

عورتیں اسے گھورتی، بڑ بڑاتی زینے کی طرف لپکیں۔ فرمان کا کمرے کی حالت دیکھ کر غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ اس کے گھر کا کراہی نہیں۔ تھوڑا سا ویٹنگ روم سے بھی بدتر ہو رہا تھا۔ کوئی چیز ابھی بگ پر نہ تھی۔ فرش پر دو جے۔ قالین سکڑا ہوا کورے کرکٹ کا ڈیم بنا ہوا تھا۔ بے تکلفی سے کھانا لینا بھی ہوتا تھا۔ کوئی بھسے کھانا ہی ہے کوئی جسنے کسی کے ہاتھ میں مروڑے ہیں تو کوئی روٹی پکڑ کر جلانے میں لگی ہے۔ ایسی ہی عورتیں تھیں وہ۔ سب کے جانے کے بعد ماں بیٹے میں معرکہ ہوا۔

”یہاں یہ سب نہیں ہو گا اماں۔ یہاں میری عزت ہے۔ آپ کیوں اسے مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔ نہ معلوم نوحہ کس طرح باتیں بنتے ہوں گے!“

فرمان کمرے سے آیا تو نہایت افسردہ تھا۔  
”واپس جانے کا کہہ رہی ہیں۔ اس نے بھٹا کر نیکہ دودھ پھینکا۔“

”میں انہیں منا لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔“ بیلا نے اس کا غصہ افسردگی رفع کرنی چاہی۔

”مگر۔ اب کوئی عورت۔ یہاں قدم نہ رکھے۔“  
فرمان! اس طرح تو اماں راضی نہیں ہوں گی۔

”نہ ہوں۔ چلی جائیں بے شک۔ مجھے نہیں پر دہ۔“

انہوں نے کب میری پروا کی ہے جو۔  
فرمان اس وقت غصے میں تھا۔ بیلا نے ساس کی چابھوسی تک کی۔ بچوں کو ان کے دائیں بائیں بٹھا کر تصویریں اتاریں۔ اماں کو جب سی لگ گئی تھی۔  
نہ بیلا سے بات کی نہ فرمان سے۔ بچوں سے انہیں ویسے بھی دلچسپی نہ تھی۔ انہوں نے کھانا بھی چھوڑ دیا۔  
”مجھے گاؤں جانا ہے۔ صبح ہی وہ بالکل تک سک سے وادہت مانگ چوٹی کیے کھڑی تھیں۔“

”میں نیکسی لے آتا ہوں۔ فرمان نے جھینار ڈال دیے بیلا ہنسا بکا رہ گئی۔ لاکھ اماں سے اپنا قصور پوچھتی رہی ہاتھ جوڑتی رہی۔“

”آج نہیں اماں بے شک کل چلی جائیں۔ آج میری خاطر رگ جائیں۔ پیری پیاری اماں۔ میں خود آپ کو پہچانے جاؤں گی۔“

اماں پر کوئی بھوت سوار تھا۔ غاموٹی کا۔ نیکسی پر فرمان کے ساتھ چلی گئیں۔ فرمان آفس نہیں گیا۔ اسٹیشن پر اماں کو پہنچا کر گھر آ گیا۔ وہ بہت ادا اس تھا۔ اکیل چلی گئیں۔ بیلا کو بہت حیرانی تھی۔  
”نہ جاننے راستے میں انہیں کتنی تکلیف ہوگی۔ کبھی تو ٹرین میں بیٹھی نہیں تھیں۔ آئی بھی ہیں۔ میں تھیں۔ کھانے پینے کی کوئی چیز بھی نہیں لے گئیں۔ فرمان باپ ساتھ چلے جاتے ناں۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مرید راستے میں بنا ہی لیں گی۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

کئی دن فرمان پر ادا سی اور بیلا پر بھٹا وے کا اظہار۔ فرمان نے ماں کو کیوں نہیں روکا۔ انہیں راضی کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ ورنہ ماں اکلوتے بیٹے کی بات بھلا نہ ملنے۔

”وہ خوش نہیں تھیں۔ ایک دن بھی نہیں بیلا۔ یہ تم تھیں۔ تمہاری ضد تھی جس نے اماں کو بلائے کی حماقت کی۔“

”حماقت۔ کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ میں نے تو حتی الامکان کوشش کی تھی اماں کو خوش کرنے کی۔ میں چاہتی تھی وہ ہمیں رہیں۔ ہمارے پاس۔ بزرگوں کی دعاؤں کی ہیں۔“

READING  
Section

کوئی ضرورت نہیں ایسی دعاؤں کی جو دل سے  
 نہ کی جائیں  
 آپ بدگمان نہ ہوں۔ بھلا ماں کے دل سے  
 دعا نہ نکلے گی

تم بہت بھولی ہو بیلا! تمہیں دنیا کا ذرا بھی تجربہ  
 نہیں۔ او میرے خدا۔ میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ حالانکہ تجھ  
 نے کتنا منع کیا تھا!

وہ کمرے میں گھس گیا۔ اور بیلا حیرت سے اس کے  
 چہرے کے تاثرات پر غور کرتی رہ گئی۔ نہ جانے فرمان  
 اس سے کیا چھپا رہا تھا۔ ماں بیٹے میں کیا گفتگو ہوئی تھی  
 جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے بدگمان  
 ہو گئے۔

چند دن فرمان خاصا پریشان رہا۔ پھر بیلا اور بچوں  
 کی قربت میں بہل گیا۔ مگر وہ کبھی کبھی پریشان ہو  
 جاتا۔ جب بھی اماں کے کمرے میں جاتا۔ وہیں بیٹھ  
 جاتا۔ سر جھکانے افسردہ۔ بیلانے کمرے کو اچھی طرح  
 دھو کر پھر بیٹے کی طرح چمکا دیا تھا۔ قالین بھی دھویا  
 تھا۔ اور کئی دن تو اس کو سوکھنے میں لگے۔ فرمان نے  
 ایک دن اس سے کہا۔

بیلا! کبھی بھی تم مجھ سے بدگمان نہ ہونا۔ خواہ  
 تمہیں کوئی میرے بارے میں کسی ہی غلط یا صحیح خبر  
 دے۔ یوں سمجھ لو کہ میں تم۔ اعراج میراج۔ ایک زنجیر  
 ہے یہ۔ اور۔ یہ کبھی ٹوٹ نہیں سکے گی۔ اسے کوئی  
 توڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم  
 ہمارے ساتھ ہے۔ اور۔ ہماری قوت نیک ہے۔  
 ہم سچے دل سے ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں۔

ہیں ناں؟ بولو بیلا! تم ہمیشہ میرا ساتھ دو گی۔ وعدہ  
 کرو!  
 بیلا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔  
 پھر بھی اس نے وعدہ کر لیا۔

آپ اور میں ایک دوسرے کے ہیں۔ ایک  
 دوسرے کے لیے ہیں۔ آپ کو کیا پریشانی ہے۔  
 مجھے بتائیں تو!

پریشانی۔ نہیں پریشانی نہیں۔ خدشے۔  
 اندیشے۔ نہ جانے کیوں میرا دل اس بارے میں۔

مطمئن نہیں ہوتا۔ بس تم میرا ساتھ دو تو یہ میں تمہارے  
 سہارے سے خود کو مضبوط بنا لوں گا!

کتنی مطمئن اور سکس زندگی تھی ان کی۔ اماں کی  
 آمد سے پہلے۔ اور ان کے جانے کے بعد فرمان بہت  
 پریشان رہنے لگا۔ زندگی میں وہ کہہ کے ملنے پر چلنے  
 لگے۔ بیلا بھی فرمان کی ذہنی کیفیت سے پریشان  
 رہتی۔ اس کا خیال تھا کہ ماں کو ناراض کرنے کا پختہ  
 فرمان کو پریشان کر رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی گھبرا کر سوتے  
 سے اٹھ بیٹھا۔ پھر بیلا سے کہتا۔

مجھ پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکو۔ کچھ بھی پڑھو  
 دعا کرو میرے لیے!

بیلا ہر وقت دعا کرتی۔  
 چار پانچ ماہ گزرنے کے بعد وہ نارمل ہوا۔ بیلا  
 نے بھی اسے بھلاتے اور دنیا کی دلچسپیوں میں حصہ  
 لینے کے لیے اکسایا پھر کوشش کی۔ اسے اپنے اور  
 بچوں کے مسائل میں الجھایا۔ ان کا گھر پھر سے خوشیوں  
 کا گہوارہ بن گیا۔ اور جسے تشکرات تو بجا پ بن کر  
 فضا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ فرمان کی ترقی ہر گز  
 وہ خوشی سے کھلا ہوا گھرا آیا۔ وہ بیلا اور بچوں کو ساتھ  
 لے جا کر تفریح کے موڈ میں تھا۔ گھر میں ماموں کا تہ  
 کیا رکھا تھا۔ اتنا سخت بیمار تھیں۔ فرمان کا چہرہ اتر  
 گیا۔

جب بھی کوئی خوشی ملتی ہے۔ کوئی نہ کوئی فکر  
 بھی لاحق ہو جاتی ہے!

اس نے لا پرواہی سے تار پھینک دیا اور منہ  
 پھینٹ کر لیٹ گیا۔ بیلا تے تسلی دے لگتی تھی  
 شکی۔

چلو۔ ہم ابھی چلتے ہیں فرمان۔ اس وقت اماں  
 کو ہماری ضرورت ہے۔ یہی وقت تو ہے۔ جب  
 اولاد کا امتحان ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس سخت  
 ان کی خدمت کریں۔ ضرورت پڑے تو علاج کے  
 لیے یہاں لے آئیں۔ فرمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 یہاں لے آئیں۔ اور پھر وہی تماشا دیکھیں۔  
 لوگوں کی باتیں سنیں!

ارے یہاں ہیں وہ۔ کیا ان کا اعلان گاؤں میں  
 ممکن ہے۔ بھئی شہر میں جسے ڈاکٹر ہیں۔  
 گاؤں میں معالجوں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے بھی  
 ماموں کو بات بڑھانے کی عادت ہے۔  
 پتا نہیں فرمان اماں کی طرف سے اتنا بدگمان  
 کیوں تھا۔ لیکن بھلا کے کہنے سے اگلے دن جانے کو  
 تیار ہو گیا۔ بیلا نے خود بھی ساتھ جانے کی پوری کوشش  
 کی۔ مگر اس نے کہا۔  
 تم کہاں جاؤ گی۔ مجھے بھی وہاں ہسپتال ہونے لگے۔  
 تمہاری حالت اتنی اچھی نہیں جو اس سفر کی تھکان برداشت  
 کرو ضرورت ہوئی تو میں اماں کو لے آؤں گا۔  
 جانے سے پہلے اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔  
 دیکھو پہلے ہی تمہارے اہرار پر اماں کو لانے کی  
 حماقت کر چکا ہوں۔ اب بھی تمہارے زور دینے پر  
 جارہا ہوں۔ اپنی خوشی سے نہیں۔ یاد رکھنا۔ تم بیچ  
 رہی ہو مجھے۔ نتیجہ بھی خود ہی چھلکتا ہے۔  
 بیلا کو حیران چھوڑ کر وہ چلا گیا۔ بیلا اس کے  
 الفاظ اور لہجہ پر غور کرتی رہ گئی۔

شام کو آیا بہت دن بعد آئی تھیں۔ اماں کے چلے  
 جانے کا سن کر پھر فرمان کی کیفیت۔ اس کے بعد  
 اماں کی بیماری کے تار کے بعد بھی فرمان کا گاؤں  
 جانے میں تاثر۔ سن کر وہ متفکر ہو گئیں۔  
 آپا۔ اس روز دعوت والے دن۔ آپ کو اماں  
 کے بارے میں کیا شک ہوا تھا۔ پلینر مجھے بتا دیں۔  
 کوئی خاص نہیں۔ بس۔ مجھے ان کی آنکھوں میں  
 ناگواری ہی محسوس ہوئی۔ اور۔ یوں لگا جیسے وہ  
 کسی بات پر بھی متاثر ہونا نہیں جانتیں۔ ضدی  
 اور ہٹ دھرم ہیں۔ مگر ظاہر میں تو وہ بہت  
 خوش نظر آ رہی تھیں بلکہ سب کے ہاتھ چومے لے  
 رہی تھیں۔ احسان مندی اور انکساری ان کے ہر  
 انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن۔ آنکھیں بے اثر۔  
 بے رنگ۔

آیا! لیکن اس کی کیا وجہ؟  
 یا تو ان کا اسٹائل ہی یہی ہے یا پھر انہیں  
 فرمان کی بیوی پنچوں اور ان کے گھر سے کوئی دلچسپی

نہیں۔ محبت تو دور کی بات ہے۔ شاید انہوں نے  
 تمہیں بول ہی نہیں کیا۔ ممکن ہے یہ شادی ان کی مرضی  
 کے خلاف ہوئی ہو۔ صرف چچا کی خواہش پر۔  
 مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ جانتی تو ہیں کہ۔  
 اب کچھ نہیں ہو سکتا۔  
 وہ اتنی بے بس یا بے اختیار نہیں۔ یہی تناظر  
 تو تھا ان کی آنکھوں کی چمک میں۔ خیر۔ اب تو سنا پ  
 گزر چکا۔ لکیر پٹنے سے حاصل کچھ نہیں۔ فرمان تم  
 سے زیادہ جانتا ہے اپنی ماں کو۔ تم نے اس پر  
 زبردستی کر کے اچھا نہیں کیا۔ وہ جو بہتر سمجھتا وہی  
 کرتا۔ تمہارے شور سے تنگ آ کر گیا ہے اور تم کو آگاہ  
 بھی کر دیا کہ نقصان کی ذمے دار تم خود ہو۔  
 ہیں۔ یہ نقصان کہاں سے آ گیا۔ بیلا دنگ  
 رہ گئی۔

کئی دن ہو گئے۔ فرمان نے کوئی خبر ہی نہ دی۔  
 بیلا فکر مند تو تھی ہی۔ مزید غلطی میں مبتلا ہو گئی۔  
 گھبرا کر شام کو فون کیا۔ اس نے کہا۔  
 وہ دفتر سے معلوم کر لو۔ شاید وہاں کوئی اطلاع  
 آئی ہو۔ پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ کوئی  
 ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ ضرور خبر دیتا۔  
 اتنی بے عقل تو وہ نہ تھی مگر گھبراہٹ میں خیال  
 ہی نہ آتا کہ آفس سے معلوم کر لے۔

ستوریلا! میں اپنی بوا کو تمہارے پاس بھیج دیتی  
 ہوں۔ اکیلی ہو اس لیے زیادہ بھرا گئی ہو نہ تھی  
 تنگ کرتے ہوں گے۔ اپنا خیال کرو۔ جس دودھ  
 وغیرہ لیتی ہوں نا؟  
 اسے اپنی بھلا کیا بردا۔ آپا کی بات کا جواب بھی  
 نہ دے سکی۔ آخر فرمان کو کون سی مشکل پیش آ سکتی  
 تھی۔ اماں جانے کس حال میں ہوں گی۔ لے ہی آتے۔  
 علاج بھی ہو جاتا۔ دیکھ بھال بھی۔ آفس میں چار  
 دن کی چھٹی کی درخواست آئی ہوئی ہے۔ چار دن  
 کی چھٹی وہ لے کر گیا تھا۔ پھر اطمینان تو ہوا۔ مگر دل  
 تھا کہ مانتا ہی نہ تھا۔ آخر بیلا کو مطلع کرنے کی ضرورت  
 کیوں محسوس نہ کی۔ وہ اتنا بھی لا پرواہ نہ تھا۔ اور آج

کل تو اسے بیلا کی محبت اور آنے والی روح کی بہت  
 فکر تھی۔ چونکہ بوا آگئی تھیں۔ اور انہوں نے اسے  
 مکمل آرام کا حکم دے کر خود گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔  
 وہ ٹی وی پر مزاحیہ ڈراموں سے دل بہلانے  
 لگتی۔ یا کبھی الماریاں درست کرنے لگتی۔ الماری سے  
 برتن نکال کر صاف کر کے ترتیب بدلتی۔ وقت تھا  
 کہ گزرتا ہی نہ تھا۔ رات اور بھی قیامت بن جاتی۔  
 جلتے جلتے فرمان نے اسے کس نتیجے کے بھگنے کی  
 وارننگ دی تھی۔ ماں بیٹے میں دو فدی کیوں ہے۔  
 بظاہر اماں شفیق اور ہمدرد تھیں جیسی کہ ہر ماں ہوتی  
 ہے۔ فرمان نے ان کے آنے پر کس قدر مسرت کا  
 اظہار کیا تھا۔ غیر معمولی خوشی۔ پھر۔ اسے کیا حد  
 پہنچے۔

نہیں دینی چاہیے مگر۔ ہم عورتیں اتنا اختیار ہی نہیں  
 رکھتیں۔ کہ انہیں باندھ کر رکھیں۔ وہی ہمیں یہ قوت  
 بناتے رہتے ہیں۔ اب یہ معلوم نہیں کہ۔ فرمان ہمیں  
 بے وقوف بنا گیا۔ یا تم نے اسے اپنی حماقت سے  
 کسی الجھن میں پھنسا دیا۔

کمال ہے آپا یہ کیوں نہیں سمجھتیں۔ فرمان اپنی  
 ماں کی بیماری کی اطلاع پر گیا ہے۔ حماقت یا بے وقوف  
 بننے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ سیدھی سی بات  
 ہے۔ مگر جانے کیسے الجھ گئی۔

سنو۔ کیا۔ فرمان کبھی بھی۔ کسی دباؤ کے تحت۔  
 تم سے بے وفائی کر سکتا ہے؟ شہناز نے تو دھماکا  
 کر دیا تھا۔ یہ خیال ان کے ذہن میں آیا بھی کیسے۔  
 آ یا! وہ بہت زیادہ جھلا گئی۔ میری جڑیں بہت  
 گہری ہیں اور ہماری زنجیریں بہت مضبوط ہیں۔ اس  
 نے بچوں کو پیار سے دیکھا۔

شہناز کے چہرے پر اداسی کی تہ جم گئی۔ اس نے  
 مایوسی سے چہرے کو دیکھا۔

عورت واقعی بہت اسحق ہوتی ہے۔ مضبوطی کا  
 یقین بھی مرد ہی دلاتا ہے۔ اور تو وہی اپنے یقین کو  
 جھٹلا دیتا ہے۔ اور عورت۔ اسی جھوٹ پر تکیہ  
 کیسے بیٹھی رہتی ہے؟

شہناز کے ذہن میں تو بہت سی تلخ حقیقتوں  
 نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے مگر وہ اپنی اس مقصوم  
 بہن کو زیادہ رنجیدہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اور اسے  
 اعتماد بھی تو بہت تھا فرمان پر۔ اپنی زندگی کی اس  
 زنجیر کی مضبوطی کا یقین بھی بہت تھا۔ اب اس سے  
 کیا کہتی۔ ہزاروں اس زنجیر کی مضبوطی سے باوجود  
 مرد کے فریب کا شکار ہو کر تنہائی اور مشقت کی  
 زندگی گزار رہی ہیں۔ بچوں کی خود پرورش کر رہی  
 ہیں اور وہ۔ جو دعوے دار ہے۔ بچوں کو دنیا میں  
 لانے کا اپنا حق کہہ کر جب چاہا انہیں ماں کی گرد  
 سے چین لیا۔ اور جب چاہا۔ ہاتھ جھٹک کر چل  
 دیا۔ نئی راہ پر نئے ہمسفر کے ساتھ۔ مرد کا راستہ  
 ہمیشہ صاف ہوتا ہے۔ رکاوٹیں۔ کانٹے۔ طوفان  
 تو عورت کے تہذیب میں ہوتے ہیں۔

شہناز چلی گئی۔ اور بیلا کسی طوفان کی زد میں

پتا ہی نہ چلا کہ مزید سات دن گزر گئے۔  
 ہر آہٹ پر۔ ہر ٹک پر کسی بھی گاڑی کے پارن  
 پر وہ یوں چونک اٹھتی جیسے اسی کے گھر کوئی آیا ہو  
 مگر پندرہ دن ہو گئے۔ کوئی آیا۔ نہ پیغام لایا۔ چمکے  
 گھر والے بھی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اعلیٰ اور نجیبوں  
 کو اپنی فکر سے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ آفس  
 فون کرنے کا سوچ رہی تھی کہ آفس سے ایک آدمی  
 آ گیا۔ وہ فرمان کی خبریت معلوم کیے آیا تھا اور  
 آئندہ پروگرام سے آگاہی بھی۔ بیلا کے جسم سے جان  
 نکل گئی۔ یعنی آفس میں بھی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔  
 اور اب کچھ نہ کچھ کرنا تھا اور اسے ہی کرنا تھا۔

شہناز کو بھی فکر لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن پھر آ  
 گئی۔ بیلا اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دی۔  
 کتنی خوشگوار زندگی تھی تمہاری۔ کوئی فکر نہ علم۔  
 تیر۔ یہ بھی زندگی کا ایک رنگ ہے۔ مجھے یقین  
 ہے فرمان بھی کسی دباؤ کے تحت ہے۔ جب بھی  
 وہ اس دباؤ سے آزاد ہوا۔ واپس آئے گا۔ اپنی تک  
 تو ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے  
 یا اس کی اماں ماں کو کچھ ہو گیا ہے؟  
 ہ اماں کو۔ کیا ہوتا۔ بیمار تھیں تو انہیں لگتے۔  
 یہی کہہ کر گئے تھے؟

”ویسے لوگ بھینک کہتے ہیں۔ مرد کو زیادہ دھیل

اُسے کمزور و رخت کی طرح کا پنے لگی۔ پھر بچوں کے سوتے کے بعد اس نے فرمان کی الماری درازوں کی تلاشی لی۔ صبح سویرے ایک بیگ میں اسے اور پتھلوں کے دو دو جوڑے ڈالے۔ اور گھبراہٹ کر دیا۔ اور اگوشا کے گھر کے پاس چھوڑ کر نیکی کرائیشن چلنے کی ہدایت کی۔ اب جو تکہ کرنا تھا اسے ہی کرنا تھا۔ اس کی سوجھ میں آگیا تھا۔ زندگی کا فلسفہ۔ اپنے راستے کے کٹے خود چنو۔ اپنی رہ گزر سے رکاوٹیں خود دور کرو۔ اور طوفان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لے پسا کرو۔ تمہیں منزل ملے گی۔

وہ حرکت میں آگئی۔ ذہن پر ایک ہی خیال عادی تھا۔ میری جڑیں بہت گہری ہیں۔ اسی اعتماد کو لے کر وہ ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ پینچر ٹرین۔ جو اسے اس کی منزل تک پہنچائے گی۔ خواہ راستہ کتنا لمبا ہو راستے میں کتنی صعوبتیں ہوں۔ جسم ٹھکن سے چور چور ہو۔ مگر ہمت جوال رکھتی ہے۔ حوصلہ نہیں ہارنا۔

وہ بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ اپنی سسرال جا ہی تھی۔ پہلی بار۔ مقرر تو قس سے بھی زیادہ لمبا ہو گیا۔ ٹرین جگہ جگہ رکتی تھی اور لہنیر کسی اسٹیشن کے بھی جنگل میں کھڑی ہو جاتی۔ بچوں نے بھی غامض اور دم چمایا ہوا تھا۔ پھر بھی کسی طرح وہ انہیں سلانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ مگر خود اس کی نیند فرمان کے گرد نثار ہونے چلی گئی تھی۔

بس خدا کرے اماں ٹھیک ہوں۔ کوئی ایسا مسئلہ نہ ہو۔ جو فرمان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ آن تک فرمان نے اتنی چھٹیاں نہیں کی تھیں آفس سے۔ نہ جانے۔ وہ خوف ہی ہمارا نہ ہو گئے ہوں۔ اماں کی خدمت کرتے کرتے۔ بارے صبح کے دم نے اس اسٹیشن کا دیدار نصیب ہوا۔ جہاں اترنا تھا۔ اور جہاں سے کوئی سواری لینی تھی۔ تقیناً تاکہ۔ چچا کی بہو۔ اور فرمان وقتاً فوقتاً اسے سفر کی داستان سناتے تھے۔ اس کی یاد کے تحت وہ بیگ کندھے پر ڈال کر دونوں چلنے پتھلوں کو اسٹیشن پر اتارنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور پھر اسٹیشن سے باہر حسب توقع تاکہ

موجود تھا۔ اس نے فرمان کے والد کا نام لے کر پوچھا کہ ان کا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے۔ تاکہ بان نے کچھ بتایا ضرور۔ جو اس کے تھکے ہوئے ذہن کی سمجھ میں نہ آسکا۔ گھڑا رہنا بھی مشکل تھا وہ تلکے پر چڑھ گئی۔ بچے خود ہی خوشی سے جنین مارتے جڑھٹے۔ سنو۔ بابا جی۔ یہ گاؤں۔ کہاں ہے۔ کتنی دیر

میں پہنچیں گے ہم؟ تاکہ والے نے امر کر پھلی سیٹ پر بیٹھی اس پر شان مال تھکی تھکی سی شہری حسینہ کو دیکھا۔ دونوں نے اگلی سیٹ پر کو جوان کے ساتھ بیٹھے ایک دوسرے سے چہلیں کرنے لگے۔

ہ بس۔ اب پہنچے۔ کہو تو اڑا کر لے جاؤں تاکہ کو جہاز کی طرح۔ اسپڈ میں۔

نہ نہ۔ بس۔ تار مل رہا۔ چلو۔ تمہیں پتہ ہے وہ قربان صاحب کی بیگم کو بیمار تھیں؟ وہ قربان صاحب کی بیگم کو جوان نے گھوڑے کو چابک رسید کر کے ہنس کر اس کے الفاظ دہرائے۔

صاف جاواں؟ (بتا نہیں کس کو کہا) بی بی۔ وہ اب کسی کی بیگم نہیں۔ خود ہی بیگم صاحب بن گئی ہے۔ پس لڑکی حضرت بیگم۔ ہمارا شمار وہ نہیں ہوتی خود ہی اپنے تعویذ گنوں کر رہی تھی ہے۔ بھگا دیتی ہے۔ ہمارے باپ کو۔ لیکن بی بی! آپ فکر نہ کرو۔ جس حال میں ہوگی آپ کو تعویذ ضرور دے دے گی۔ شہر سے آئی ہو آپ؟ پھر چار بتتے تک بلائے گی۔ ہر دفعہ ڈبل فیس۔ اس کی تو موہیں ہو گئی ہیں۔ بڑی باتوں کو جوان تھا۔

ویسے ایک بات حیرانی کی ہے۔ اس نے پھر گردن کو ذرا سا خم کر کے کن اگیوں سے بیلا کو دیکھا۔

بچے تو اللہ کے کرم سے آپ کے ہیں۔ پھر آپ اتنی دور سے کیا لے آئی ہو، غاوند۔ بے وفائی۔ دوسری شاوی۔ کہ۔ ہیروئن پینے لگا ہے۔ اُف۔ اس کے سوالات۔ اس کی نظروں کا تجسس۔ تا بڑا توڑھلے۔ باتوں۔ جاسوسی کہیں کا۔ غاوند کے معاملات۔ بہت ٹیرے ہوتے ہیں۔

فیس چوگنی ہوتی ہے۔ بتا دیا ہے میں نے۔ وہ بھی کیا کرے بے چاری۔ کمائی کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ لوگوں کے برجن دھوقے۔ کسی کی روٹی بکاتی۔ اس نے عزت کمانے کے لیے یہ دھندا اختیار کیا۔

”مگر۔ اس کا بیٹا بھی تو ہے۔ اس کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”ہا ہا ہا۔ بیٹا۔ وہ تو شہر میں شادی کر کے آرام سے بیٹھا ہے۔ اور اسے ماں کا یہ دھندا پسند بھی نہیں۔ اس بیٹے کو مانی میرانی نے بکریاں، مرغیاں پال کر لگائے کا دودھ بیچ کر پالا۔ بڑھایا لکھایا۔ وہ چچا کے پاس چلا گیا۔ تو واپسی کا رستہ بھول گیا سائیک بات گھر میں آئی ہے۔ اللہ کسی کو ایک اولاد دے۔ چارچہ تو ہوں۔ جو بڑھایے کا سہارا نہیں۔ ایک نالائق نکل جائے۔ تو دوسرا تو ہو گا تیسرا تو ہو گا۔

”بابا! آپ کے کتنے بچے ہیں۔“ موضوع بدلنے پر اس نے شکر کیا تھا۔

”بڑے۔ گھر مھر ہے۔ چھ بیٹے۔ دو بیٹیاں۔ ماشاء اللہ۔ بڑھیا کی تو مویں ہیں۔“

”بڑھیا؟“

”گھر والی کا کھر رہا ہوں۔ بیٹیاں ہاتھ دباؤں۔ پیر و باؤں۔ کھانا پکا کر کھلاؤں۔ بیٹے کمائی سے گھر بھر رہے ہیں۔ بڑھیا کی موجاں۔“

”تو بابا! پھر آپ کیوں یہ تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ تانگہ چلانے کی۔ آپ بھی گھر میں بیٹھ کر مویں کریں۔ آپ کے بھی تو ہیں بیٹے بیٹیاں۔ تو یہ کس قدر باتونی بڑھاپے۔“

”کیوں۔ میں کوئی لنگڑا اولاد محتاج ہوں جو گھر بیٹھوں۔“ وہ بڑی طرح بگڑ گیا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی۔ منگ کئی تھی۔ مگر تانگہ ایک رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی گڑھا آجاتا تو جھٹکا سا لگتا۔ پیلا کے جسم کا عضو عضو فریاد کرتا۔ ات تھکن سی تھکن ہے۔ گھر پہنچتے ہی نہا کر لیٹ جاؤں گی۔ خوب گرم چلنے اور پراٹھا شامل جائے تو۔ پنجوں کو فرمان سنبال لیں گے، جھوک۔ سیند کی گئی۔ سفر کی تکان۔ فکروں کا بوجھ۔ اللہ میاں۔ اتناں اور

فرمان بالکل خیریت سے ہوں۔ دل سے دعا نکلی۔

”بابا! اب گاؤں کتنی دور رہ گیا ہے۔“

”بس جی۔ وہ سامنے۔ یہ بات وہ کئی بار کہ چکا تھا۔

بارے کچھ آبادی کے آثار نظر آئے۔ اس نے ماڑوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور میرے خدا! بال لوگوں سے اسے بڑے بچے تھے۔ اسے گنگا کرنے کا خیال ہی نہیں آیا نہ ہی اترنے سے پہلے منہ ہاتھ دھویا۔ تو بہ۔ فرمان اس سطحے میں دیکھ کر ٹرس قدر بریشان ہوں گے۔ شاید حیران بھی ہوں۔ یا شاید خفا ہوں۔ پہلی بار سسرال میں بیٹنی بن کر جاتا۔

گاؤں کی گلیاں شروع ہو گئی تھیں کچے مکانات کا ڈھیر حائیسر جاسلس۔ گلیوں میں کھیتے رنگ و صرنگ بچے۔ نالیوں میں مکھیوں کی بلغار۔

”یہ۔ یہ۔ قربان صاحب کا گاؤں ہے، نور پور۔ بابا۔ کہیں آپ بھول تو نہیں گئے۔“

بڑھے کو اس بات سے خاصی تکلیف پہنچی۔

”ہونہ۔ شہر والے بڑے عقلمند بنتے ہیں۔ ایسے اس گاؤں میں پیدا ہوا ہوں میں۔ قربان کے ساتھ کھیل کر جوان ہوا۔ میں اپنا گاؤں بھولوں گا۔ لوگوں کو گلی۔“

ایک پچھدہ راستے سے وہ انہیں ایک گلی کے سرے پر لے آیا۔

”لو جی۔ آگیا پیرانی حضرت زکیم لاکھر۔ گلی میں پٹی چلو۔ کسی سے پوچھ لینا۔ میرا کراہی۔“

”اف کس قدر گندی گلی تھی۔ کچھ پڑھے لہریز۔ اُن اللہ۔ اس گندے گاؤں میں فرمان نے پرورش پائی ہے۔ پھر فرمان کے ماموں زاد بھائی۔ جو خاصے تعلیم یافتے تھے۔ کسی کو گاؤں کی حالت سدھارتے کا خیال نہ آیا۔“

”بابا۔ یہاں تو بہت کچھ ہے۔ ہمیں تمہارا رے تک تو پہنچاؤ۔“

”ناں جی ناں۔ اندر جانے کی اجازت ہمیں نہیں ہے۔ دیوار بکھر کر چلی جاتا۔“

”مگر۔ میں پھسل گئی تو۔ اور اسے بھر جبری سی

آگئی۔ اگر یہی ہے فرمان کا گاؤں۔ اس کے گھر کی گلی۔ تو کس قدر افسوس ناک صورت حال ہے۔ بہت کر کے تانگے سے سہرا تارے۔ چھب سے کچھڑ میں جو تازق ہوا۔ بیڑہ عزق۔ نیا جو تاتھا۔ میلان کی حالت یہ تھی کہ ایک کندھے پر کپڑوں کا بیگ۔ دوسرے کندھے پر پیرس لٹکا ہوا۔ ماتے خوف کے قدم نہ اٹھیں۔

بابا جی انہجوں کو تو اتاد کر گھر تک پہنچا دیں۔ اس نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ جو بابا نے بخوشی منظور کر لی۔ دونوں کو پھول کی طرح کندھے پر اٹھایا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھوڑ میں چھب چھب کرتا بڑھتا گیا اور سلا کو قدم اٹھانا مشکل ہو گیا شلوار کے پائچے اٹھا کر بیگ اور پیرس سنبھلے وہ اسی کچھڑ میں قدم قدم آگے بڑھی۔ ہر قدم پر پھسل جانے کا درد۔ مگر وہاں کسی عورتیں اور بچے اسی کچھڑ میں آرام سے چل رہے تھے۔ جیسے صاف ستھرے روڈ پر ہوں۔

بابا دلیسز چکر کھڑا تھا۔ وہ بھی دروازہ پکڑ کر لمبے لمبے سانس لیتے تھی۔

آپ منزل پر پہنچ کر بھی ٹھکن نہیں آتی۔ نہ جانے گھر کے اندر کس طرح کے حالات ہوں گے۔ ڈپٹے ڈپٹے دستک دی تھی۔ مگر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ایک وسیع صحن۔ لپا پتا۔ چکنا چپڑا سا۔ سائڈ میں دیوار کے ساتھ بندھی بکریاں۔ برکے سے پتھرے میں مرغیاں ساند کونے میں جگالی کرنی لگتے۔ ایک نظر میں تو یہی کچھ نظر آیا۔ پھر اس نے قدم آگے بڑھا کر اندر جھانکا۔ ہاں۔ منزل۔

ایک کمرے سے اماں دوپٹے سے منہ پونہ تھی نکلی تھیں۔ صحت مند۔ اور توانا۔ چاق و چوبند۔ اس کے ساتھ ہی سلنے کے دروازے سے ایک ہنستی کھیلداری نوجوان گئے ہوئے جسم کی سانولی سلونی لڑکی جاگتی ہوئی سی باہر آئی اور صحن میں ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر ٹھٹک کر گھڑی ہو گئی۔

میلان کی نظر اماں کی جانب اٹھی۔ ان کی آنکھیں حیرت کی بناوٹی سے پھٹ گئی تھیں۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا

میلان نے سلام کے لیے ماتے پر ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی ماتے اسی دروازے سے جہاں سے وہ لڑکی نکلی تھی۔ فرمان کو برآمد ہوتے دیکھا۔

فرمان کو بھی شاید سکتہ ہو گیا تھا۔ منہ کھل کا کھلا رہ گیا۔ میلان بھی اتاں کو دیکھتی کبھی فرمان کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ قدم بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ اعراج سراج۔ میلان کے آگے آگے تو فرمان کو ہوش آیا۔ وہ جیسے کسی طاقت کے زور پر اڑنا ہوا سا آیا۔ دوپٹا پتھوں کو اپنے بازوؤں میں دلچسپے انہیں بے ساختہ چومتا چلا گیا۔ پھر وہ انہیں گود میں اٹھانے کرے کی طرف بڑھا۔ لحظہ بھر کے لیے اس کی نظریں لڑکی کی سمت اٹھیں لیکن اس نے صاف آواز میں کہا۔

آؤ۔ میلان! گھڑی کیوں ہو؟ اور میلان بھی اماں سے نظر چمرا کر اس کے پیچھے کمرے کے اندر داخل ہو گئی لیکن وہ دروازے پر جمی رہ گئی۔ اندر کا نظارہ۔ حیرت انگیز تھا۔ وہ پیچھے کسی تجدد عروسی کا سہا پہن کر رہا تھا۔ دیوار پر رنگین جینڈیاں۔ کمر کی ہر نقلی موتیوں کی لڑیاں اور جا بجا گل سب کے ہار لٹکے ہوئے تھے۔ کمرادہن کی مخصوص مہک سے رجا ہوا تھا۔

آؤ۔ گھڑی کیوں رہ گئی ہو؟ وہ بچوں کو پلنگ پر لگائے ان کو گد گداتا تھا۔

”یہ۔ یہ کیا ہے۔ یہ سب ہر اس کے منہ سے نکلا۔“

اندراؤ تو تاتا ہوں؟ فرمان کا ہجر مانہ سا اوجہ اس کی سماعت پر کورٹے کی طرح لگا تھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم پہلے۔ کچھ بتاؤ کہ یہ۔“

اماں باہر سے اسے دھکیلتی ہوئی اندر گئیں۔ یہ کیا بتانے گا۔ مجھ سے پوچھو۔ میں بتاتی ہوں۔“

میلان کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجی۔ فرمان۔ اماں۔ اور۔ وہ لڑکی۔

آج دس دن ہوئے۔ میں نے اپنے بیٹے کی شاوی لپٹی پسند اور مہنی سے کر دی ہے۔“

گھر۔ دروازہ۔ دیواریں گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔



زمین کا اپنی مٹی۔ چھت اس کے سر پر آگری۔ زمین  
تقدموں تلے اکھڑنے لگی۔ اور ہر سمت اندھیرا چھا  
گیا۔ تو اس نے اندھوں کی طرح ہاتھ بڑھایا۔ چوکھٹ  
تھام کر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ یہ کیا کہا تھا  
اتما نے۔

• اتما۔ اتماں! اب کیا کہہ رہی ہیں؟

یہ ظالمانہ الفاظ اس کا گلہ گھونٹے دے رہے تھے  
شادی۔ مرضی۔ پسند۔

• فرمان۔ کچھ آپ بھی تو بولیں! اسے لگ رہا  
تھا۔ فوری جواب نہ ملا تو دل بند ہو جائے گا۔  
اس کے جبرٹے کی رگیں کھینچنے لگیں۔ اور گردن اکڑ  
رہی تھی۔ حلق یکدم شدید درد سے خشک ہو گیا اسے  
کھانسی آگئی۔

• میری کیا خطا ہے۔ کوئی قصور۔ کوئی گستاخی؟  
آنکھوں کے آگے پردے تن گئے۔ وہ کسی کا چہرہ دیکھ  
رہی تھی نہ کسی کی حرکت۔

• میں نے پوچھا تھا تم سے کچھ؟ اتماں تیز آواز میں  
بولی یقیناً غمخیز میں میرے بیٹے نے تم سے شادی کر  
لی۔ میں نے کچھ پوچھا تم سے؟ ماں کے بغیر بارات  
گئی تھی۔ تمہارے ماں باپ نے قبول کر لی کسی نے  
بھی نہ کہا کہ ماں کو بلاؤ۔ ارے۔ میں تو چار سال سینے  
پر بھاری بھل لیے صبر سے بیٹھی رہی۔ تمہاری زندگی  
میں دخل نہ دیا۔ تمہارے گھر میں قدم نہ دھرے۔ تم نے  
تب بھی نہ پوچھا کہ آخر ماں زندہ ہے۔ تو کہاں ہے  
کبھی اس گھر میں آنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اب دل  
میں آگ کی تو کیسے دوڑ کر آئی ہو۔ نہیں ہے  
تمہیں کوئی حق سوال کرنے کا۔ بہت عیش کر لیے  
ہیں تم نے میرے بیٹے کے ساتھ بہت دن رہ  
لیں۔ جاؤ بابا۔ اب ہمارا بچھا چھوڑ دو۔ بہت کچھ  
صے دیاتے تمہیں میرے بیٹے نے۔ اپنی قیمت تم  
وصول کر چکی ہو۔ دولت۔ گھر۔ عزت۔ کیا نہیں  
دیا اس نے تمہیں۔ اولاد بھی دے دی۔ بہت ہے  
تمہاری زندگی بھر کے لیے۔ اب اپنا راستہ نالوہ  
کون مٹی وہ عورت؟ کس بچے میں بول رہی تھی  
کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بیٹھا لہجہ۔ وہ شیریں بیانی سوہ  
حلاوت اور نرمی کہاں مٹی سبزبان مٹی کرانگارے۔

الفاظ سے کہ زہر میں بچھے تیرے۔ جو سیدھے دل میں  
چھوٹ ہو گئے۔ یکلیج میں آگ سی دھک رہی  
تھی۔ پیٹ میں لوبے کا گولہ گھوم رہا تھا۔ بھوک  
تھکن۔ لاچارگی۔ منزل پر پہنچ جانے کی خوشی میں  
دور ہو گئی تھی۔ لیکن یہ کیا۔

غلاف نوبت۔ جس صورت حال کا سامنا تھا۔  
اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ زور سے آنکھیں ہاتھ  
سے مل کر کھولیں۔ بدن تشنج کی زد میں تھا۔ وانت  
بھی بچنے لگے۔ سیلاب غم کے زور سے اکھڑتا ہوا  
وہ درخت۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہری  
تھیں۔ طوفان بلاخیز کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

لیکن نہیں۔ ابھی زبیر قائم ہے۔ ابھی امید باقی  
ہے۔ ہمت حوصلہ۔ اور انگلیں بلند ہیں۔ ابھی پتے  
بہرے ہیں۔ اور شاخیں موجود۔ ہاں۔ زمین میں جڑیں  
گہری ہیں۔ لیکن ذلت و حقیرنا قابل قبول ہے۔  
بہت صبر تھا اس میں۔ برداشت کی طاقت بے مثل  
سچ کو جھٹلانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ  
بہت کچھ دیا تھا اسے فرمان نے۔ گھر۔ اشیاء۔ محبت  
بھروسا۔ اولاد۔ گھر اسی طرح کھڑا تھا۔ جہیز۔ سب  
موجود تھیں۔ ایک بھروسا ہی تو لگتا تھا۔ محبت کا  
ٹپٹہ چکنا چور ہوا تھا۔ پھر بھی۔ اولاد کی طاقت  
تو تھی۔

جسم میں جتا ہوا لہو پھر سے شرر شرر دوڑنے  
لگا۔ پھر جسم میں ناقابل بیان حرارت پھیلنے لگی  
وہ کھڑی ہو گئی۔ فرمان کوٹے میں سر جھکانے و منہ  
موڑے کھڑا تھا۔ بیلانے تیزی سے آگے بڑھ کر  
دونوں بچوں کو گود میں اٹھایا۔ اور مڑ کر ماس کو  
دیکھے بغیر جیسے اڑتی ہوئی صحن اور صحن سے دوڑنے  
تک پہنچی۔ ایک ہی راستہ تھا۔ اسی سے گزر کر آئی  
تھی۔ اور اسی سے واپس جانا تھا۔

زبیر نے راستہ روکا نہ گندگ نے ہنر ڈالنے  
دو ٹالنگ رہا تھا۔ شلوار پر گندی چھینیں بھی  
پڑتی رہیں۔ پوری لگی مکمل بے خوفی سے اس طرح  
بار کی جیسے وہ اڑن کھولے پر بیٹھی ہو۔ اور گلی کے  
سرے پر وہ تانکے ابھی تک اسی طرح موجود تھا۔  
کوچوان سر میں لنگھا کر رہا تھا اسے دیکھ کر سیدھا

ہو گیا۔ بچوں کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر مر کر بیلا کو دیکھا۔

اپنی چہرہ پر  
بیلا نے آنکھیں بند کر لیں۔ "ہاں بابا۔ جانا تو ہے۔"  
واپسی کا سفر قدرے آسانی اور تیزی سے طے  
ہوا۔ بابا کی زبان بھی بند تھی۔ بس کبھی کبھی وہ کوئی  
تانا اڑاتا۔ اور پھر گھوڑے سے پیار کے لفظوں میں  
مخاطب ہو جاتا۔

اسٹیشن پر گاڑی بھی موجود تھی۔ یوں لگتا تھا  
کہ ہادو کے اثر سے ہو رہا ہے۔ بس گاڑی کے اجنبی  
نارنج بدل گیا تھا۔ مغرب سے مشرق کے رخ۔  
مدھرا سے جاتا تھا۔ اور مدھرا سے وہ آئی تھی۔ ٹکٹ  
کی گفٹ کی پر وہ سوتے جاگے انداز میں کھڑی تھی۔  
شاہد کسی نے اس کے پرس سے رقم نکال کر ٹکٹ  
لکھ کر دی تھی۔ اور ٹکٹ اس کے پرس میں عھونس  
دیسے تھے۔ وہ پکار کر گرنے لگی۔ تو کسی نے مہاراجے  
کرشن میں سوار کیا۔

شاہد اسی بڑھے باتونی کو جوان نے۔ یا کسی فرشتے  
نے۔ وہ ایک حیران کن طلسم کے اثر میں تھی۔ خواہ  
اب کچھ کم ہونے لگے تھے۔ ہادو کی کامنظاہرہ خاما ہنگ  
بڑا تھا۔ حضور حضور فریادی تھا۔ تن میں بھوک۔ من میں  
ہیاس۔ اور آنکھوں میں سیلاب اندھ پڑنے کو پہنچیں  
اور جیسے کسی فرشتے نے ہی اس کے منہ سے کوئی گلاں  
اگادیا تھا۔ ٹھنڈا پھر ہادو وہ۔ اب حیات کی مانند  
رگن میں دوڑتا چلا گیا۔ آنکھیں کھلتی گئیں۔ خواہ  
واپس آتے گئے۔

آج کئی برس گزرنے پر بھی بیلا اس وقت کو یاد  
کر کے اداس ہو جاتی ہے۔ آج سب کچھ حاصل ہے  
اسے۔ دولت۔ محبت۔ اولاد۔ دو بیٹے۔ ایک  
بیاری بیٹی۔ زمان آج بھی اس کی محبت میں ڈوبا  
ہلا ہے۔ وہ اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔

اور اس دن۔ جب بیلا اپنے خیال میں اپنا  
سب کچھ ہار کر واپس جا رہی تھی۔ زمان۔ ماں کے  
سم سے آزاد ہو گیا۔ اسے بیلا کے وجود نے سہارا  
دیا۔ طاقت دی۔ اسے وہ محبت یاد آئی۔ بیلا کی  
لہ میٹیں۔ اس کی معصومیت۔ اندھا اعتماد۔ اور  
امان پرائوٹ بھروسا۔ اگر ماں ضدی ہو تو بیلا

بھی کم ضدی نہیں۔ ذرا سی بات کا امان نے پہاڑ بنا  
لیا۔ اس پہاڑ کو سر کرنا ناممکن نہ تھا۔ مشکل نہ تھا۔  
اس دن تو بیلا کو ہر جگہ ہادو کے کرشمے نظر آ  
سہے تھے۔ جب اسے اپنے ساتھ بالکل جز کر بیلا  
زمان نظر آیا تھا۔ وہ اسے اپنا وہم۔ اپنا خیال بھی  
تھی۔ اسے بتا ہی نہیں چلا کہ وہ تو اول وقت سے  
اس کے ساتھ تھا۔ اسی بلنگے کی اگلی سیٹ پر اپنے  
بچوں کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اور ساتھ ہی اسٹیشن  
پہنچا تھا۔ اسی نے بیلا کے پرس سے رقم نکال کر ٹکٹ  
لیے تھے۔ کیونکہ وہ تو خالی ہاتھ تھا۔ ہمدرد لایا تھا وہ  
کھاپی کر برابر کر دی تھی۔ ماں کی کمائی کو وہ اپنے لیے  
ناجاننا بچاتا تھا۔ اس لیے گاڈ اگلا ہی کمائی سے  
ڈکان بچا کر کھاتا تھا۔

شادی۔ یہ مذاق نہیں تو اور کیا تھا۔ مگر اماں  
اس مذاق پر مصر تھیں۔ ماں کے حقوق۔ ماں کے  
ارمان۔ ماں کے پرورش کرنے کا صلہ۔ ایک  
شادی۔ ماں کی پسند۔ ماں کی خوشی کے لیے۔  
اور وہ جنت کے احترام میں ماں کی ضد پر وہ  
جوا کھیل گیا۔ اگر بیلا بھی ضدی۔ ہٹ دھرم ہوتی  
تو آج وہ قسمت کو گستاہا اس ماں کی پسند  
کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا۔

یہ تو بعد میں بیلا کو اس نے بتایا تھا کہ شہر آکر  
رہنے کی شرط ماں نے بھی رکھی تھی کہ اگر اسے شہری  
ہو پسند نہ آئی تو اسے ماں کی پسند پر گاؤں میں شادی  
کرینی پڑے گی۔ اور وہ قسموں۔ اہتجاجوں۔ خوشامد  
دھیکوں کے زور پر آخر کامیاب ہو گئیں۔  
اس دن زین میں اسے ساتھ بیٹھے دیکھ کر بیلا  
نے بے ساختہ کہا تھا۔

تم۔ تم۔ تم۔ کیوں آگے ہے۔  
تو کڑی لڑکوں؟ بھوکا مروں؟ اس نے چہرہ  
جواب دیا تھا۔ اس نے کسی طرح بھی بیلا کی محبت  
یا اس کی قربانیوں کا یا اس سے اپنی بے پایاں  
محبت کو واپسی کا جواز بنانے کی کوشش نہیں کی۔  
اور اسی لیے بیلا بچل بھی تھی۔  
ہنسی ڈہن کو چھوڑ کر آگے بڑھتی تھی بات ہے۔

READING  
Section

اور وہ اس کے لیے افسردہ ہو گئی تھی۔ اس کا کیا تصور تھا بھلا۔

مگر فرمان نے تو شادی کی ہی اس شرط پر تھی کہ وہ خیر اپنے گھر رہے گا۔ اور اماں کے پاس ان کی پسند کر وہ بہو۔ شاید بیلا، فرمان کو واپس بھیج ہی دیتی۔ اپنی جیسی ایک بے خطا لڑکی کے لیے اس کی آنکھوں میں بسنے والے خوابوں کی تعبیر کی خاطر۔ مگر۔ اعراج۔ سراج اور آئندہ آنے والی روح کو۔ ایک مضبوط سا تہان کون فراہم کرتا۔ بیلا کو۔ بچوں کو۔ فرمان کے سوا اور کچھ درکار نہ تھا۔ اسے اپنی سوکن پر ترس آ رہا تھا۔ اسے کیا ملا۔ ایک مدد ساس۔ صرف ساس۔ پیرانی حضرت بیگم۔

بیلا کبھی اپنی ساس پیرانی حضرت بیگم کو باور نہ کر سکی۔ کہ اسے اپنی سوکن سے کوئی لغزت ہے نہ اس پر غفہ۔ بلکہ صرف ہمدردی ہے۔ کہ وہ بھی ایک عودت ہے۔ مگر پیرانی حضرت بیگم اب عودت نہیں رہی تھیں کہ ان معصوم کو مکمل ہڈیوں کا ادراک کر لیں۔ جو ایک عودت۔ بیوی۔ محبوبہ۔ کے سینے میں طوفان کی طرح اٹھتے ہیں۔ لہر دل کی طرح رقص کرتے ہیں۔

وہ واقعی عودت نہیں۔ صرف پیرانی حضرت بیگم رہ گئی تھیں۔

شما ملنے سن کر کہا۔

اب تمہاری ساس کو جانشین بھی مل گئی۔ تم تو ان کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکی تھیں۔

اس کے بیٹے میں کسی نے بھی فرمان سے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ یہ کافی تھا۔

اور اب سے کئی سال پہلے۔ پیرانی بیگم کے انتقال کی خبر آتے ہی وہ کس قدر مضطرب ہوئی تھی۔

یکسی کے وہ دونوں گاؤں پہنچتے تھے۔ جہاں پیرانی کے آخری دیدار کے لیے ان کا جنازہ کھلے صحن میں رکھا تھا۔ راستے میں ساس نے بڑے درد سے فرمان کو مخاطب کیا۔

”فرمان۔ اب تو اماں بھی نہیں رہیں۔ پلیز تم اس لڑکی کو تنہا نہ چھوڑ دینا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے

آئیں گے۔ اپنے گھر پر۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ میں۔ اس کے ساتھ۔ بہنوں کی طرح رہ لوں گی۔“

فرمان کو بیلا سے یہی توقع تھی۔ وہ فرمان کے ہر مسئلے کو حل کرنے اور اس کے جذبات کو سرسبز کرنے کے لیے ہمہ تن حاضر رہتی۔ بیلا کو اس لڑکی اپنی سوکن پر بڑا ترس آیا۔ وورڈ وورڈ کر لوگوں کو پانی پلاتی ہوئی۔ مریضوں کو دانا دیتی۔ بکریوں اور گلے کا دودھ نکالتی ہوئی۔ وہ کس قدر ذمے دار لگ رہی تھی۔ اماں کے سوئم دلے دن۔ دعا وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ واپس کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اور اپنی سوکن سے روانگی کی تیاری کا کہنے کے لیے اماں کے کمرے میں گئی۔ تو اس نے دیکھا۔

کمرے عورتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی سوکن بڑے اعتماد سے ان کے سلنے کھڑی تھی۔ اس کے گلے میں مختلف منکوں والی رنگ برنگی مالا میں تھیں۔ ہاتھ میں ہزاروں والی تسبیح۔ پھر ایک عورت نے اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ دوسری نے تعلقہ کی۔ پھر تیسری عورت آئی۔ اس نے آٹھ کر منکوں کی مالاؤں کو جوڑا۔ پھر مالاؤں والی لڑکی کے ہاتھوں کو لوسہ دیا۔ پھر سب عورتیں اس نو جوان سنجیدگی سے کمری ساڑھی لڑکی کے ہاتھ جوڑنے کو ایک دوسرے سے بوقت لینے میں گتھم گتھا ہونے لگیں۔

”پیرانی تھوئی بی بی، کسی نے یہ آواز بلند اعلان کیا۔“

ایک لمبا سانس لے کر بیلا واماں سے پلٹ آئی اماں کی جانشین۔

اس کا جی چاہتا تھا۔ وہ ان منکوں کی مالاؤں کو شما ملد آپا کے گلے میں ڈال کر کہے۔ پیرانی حضرت

شما ملد بیگم۔ اور تصور میں ہزاروں کی تسبیح کھاتی شما آپا کا روپ۔ خاصا دلچسپ ہوتا۔



# سینما امینہ

مٹا سخت غصے میں تھی سوار ڈروپ کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور وہ اپنی چیزیں اپنے کپڑے پیچ کر بیڈر کھلے ہوئے سوٹ کیس میں ڈال رہی تھی۔ آج وہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ وقت آگیا تھا جب اسے اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اب ایک پل بھی شہباز جیسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔

کبھی وہ دن بھی تھے جب وہ اپنی آنے والی زندگی کا ہر مل ہر لمحہ شہباز کی بانہوں میں گزارنے کی تمنا کی تھی مگر اب نہیں۔ چاند صرف دور سے ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ چاندنی ہمیشہ ہی ٹھنڈک نہیں دیتی کبھی کبھی جلانے بھی لگتی ہے اور پیار کی وہ چاندنی تباہی کے لیے بھگتی ہوئی دھوپ بن گئی تھی۔

اس کے اور شہباز کے درمیان یہ کشیدگی کوئی آج یا کل کی بات نہیں تھی۔ بحث و تکرار بک بک تو چلتی ہی رہتی تھی نہ کبھی شہباز جھکنے پر تیار ہوتا تھا نہ وہ۔ شہباز کو زعم رہتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ تباہی کو صف نازک ہونے کا مان تھا۔ دونوں ہی اپنی جگہ ڈٹے رہتے تھے۔ بحث و تکرار بڑھ جاتی تو جھگڑے کی نوبت آ جاتی تھی۔ مگر پھر بالآخر صورت حال ٹھیک بھی ہو جاتی۔ دونوں اپنی منوانے یا دوسرے کی ماننے بغیر ہی معمولات زندگی میں لگ جاتے تھے مگر آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ آج شہباز نے اس پر ہاتھ تک اٹھا دیا تھا۔ اس کے نازک سے رخساروں کو طمانچوں سے سرخ کر ڈالا تھا۔ خیر بخشا تو اسے مٹانے بھی نہیں تھا مگر شہباز مرد تھا تو اتنا تھا اس لیے غالب رہا۔ تند خو اور تیز مزاج تو وہ شروع سے

ہی تھا۔ بس شادی کا ایک مہینہ ہی سہا نے خواب کی طرح گزارا تھا۔ وہ ہنی مومن انجوائے کر کے آئے تھے پھر زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی تو شہباز کی شخصیت کھل کر سامنے آگئی۔ شہباز بے حد جذباتی پر جوش ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد غصیلابھی تھا۔

اس کی محبت ایک تند طوفان کی طرح تھی تو اس کی نفرت بے رخی اور بے گانگی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کی محبت نے دیکھتے ہی دیکھتے تباہی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ابھی ان کے درمیان جو تھی وہی ملاقات تھی کہ شہباز نے اسے شادی کی پیشکش کر ڈالی۔

تباہی تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ اس بندے کو ہمیشہ کے لیے قابو کر لے مگر اسے خوشگوار حیرت بھی ہوئی تھی۔ ان کے حلقے میں شہباز کے بارے میں کبھی کبھی مشہور تھا کہ وہ ذمہ داریوں سے دور بھاگنے والا شخص ہے۔ صنف نازک کو لفٹ تو کراتا ہے مگر شادی کی زنجیر پیر میں ڈالنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ نہ جانے کس آئیڈیل کی تلاش میں بھٹک رہا ہے جو گھر سنانے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ ایسے میں شہباز نے اسے پروپوز کیا تو تباہی کی حیرت بھاگ گئی۔ اس نے جھٹ سے ہائی بھر ڈالی اور یوں اس کے اور شہباز کے بارے میں پھیلنے والی افواہیں دم توڑ گئیں۔ یہ اندازہ تو تباہی شادی سے پہلے ہی لگا چکی تھی کہ شہباز قدرے ضدی اور سخت ہے۔ تب اس کا روکھا پن تباہی کو بہت اچھا لگا تھا۔ شاید اسے ایسے ہی کسی شخص کی تلاش تھی۔ لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرنے اور ان کی ہر بات پر آمنا صدقہا کہنے والے مرد۔ اسے سخت ناپسند تھے۔ شہباز کی



READING  
Section



میں خوش سلیقگی تھی۔ ہر کام اپنے وقت پر صحیح طریقے سے ہو رہا تھا پھر شہباز خواجہ چھوٹے موٹے بہانوں کی آڑ میں اس سے کیوں جھگڑنے پر تیار رہتا ہے۔

”میرا داغ خراب ہے اس لیے“ شہباز اپنے سوٹ کی پیچنگ شرٹ نہ ملنے پر تلملایا ہوا تھا جو کہ ثنا کے خیال میں لائڈری میں کہیں ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ ایک شرٹ نہ ملنے سے کوئی قیامت تو نہیں آگئی تھی۔ وارڈ روم میں سینکڑوں شرٹیں تنگی تھیں وہ کوئی بھی پن سکتا تھا۔ اب اس قدر ویل ڈرہ سکتا کوئی نہ ہو کہ ذرا سی بات کو اتنا کا مسئلہ بنا ڈالا تھا۔ اب وہ کوئی متوسط طبقے کی عام سی عورت تو نہیں تھی جو بیٹھ کر اپنے شوہر کے کپڑے اپنے ہاتھ سے استری کرتی اور ٹوٹے ہوئے ٹین ٹانگتی۔ دفتر سے واپسی پر اس کے جوتے اور موزے امارتی۔ اونہہ احمقانہ خواب۔ شہباز اگر اسے ایک ایسی سعادت مند خادمہ دیکھنا چاہتا تھا یہ اس کی خوش فہمی تھی۔

”اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے“ ثنا بھلا جواب دینے سے کیوں چوکتی۔

”میرا داغ خراب تھا اسی لیے تو میں نے تم جیسی جگہ الو اور بد سلیقہ عورت سے شادی کی۔“ شہباز غصے میں ایسی ہی دل جلانے والی باتوں پر اتر آتا تھا۔ ثنا کی کبھ میں نہ آتا تھا اس میں ایسی جاہلانہ عادتیں کہاں سے آئی ہیں۔

”کیوں میں نے تمہیں اس کے لیے مجبور کیا تھا؟“ رو پوزل تم نے ہی دیا تھا میں نے تم پر کوئی جادو تو نہیں کیا تھا۔“ وہ تلملایا تھی۔ شہباز جب اپنے شادی کے فیصلے کو اپنی حماقت گردانتا تو اس کے دل کو سخت چوٹ پہنچتی تھی وہ بری طرح ہنک محسوس کرنے لگتی تھی خاص طور پر اس وقت جب شہباز اس کا موازنہ اپنی سابقہ محبوبہ سے کرنے لگتا تھا۔ اڑتی اڑتی خبر تو شادی سے پہلے ثنا نے بھی سنی تھی کہ شہباز محبت میں ناکامی کی وجہ سے اتنا تنہائی پسند ہو گیا ہے اس کے اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ابھی تک اپنے

شخصیت میں بھرپور مردانگی تھی۔ وہ روٹھتا یا ناراض ہوتا تو اسے منانا سنا کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنی راہ میں دیدہ دل فرش راہ کئے ہوئے بہت دکھ لیے تھے۔ شہباز اس کی نسوانی انا کے لیے ایک چیلنج تھا۔ وہ جب اس کی بروا نہیں کرنا اس کی بات ایک دم رد کر کے اپنی منوا تا تو ثنا بجائے خفا ہونے کے اور بھی اس کی طرف کبھی چلی جاتی تھی۔ شہباز غالب ہونا جانتا تھا اور شادی سے پہلے تک تو ثنا کو بھی مغلوب رہنے میں لطف آتا تھا مگر شادی کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی تھی۔ منظر نامہ بدل رہا تھا۔ اب وہ عاشق اور محبوب نہیں بلکہ شوہر اور بیوی تھے۔ تمام عمر وہ آقا اور غلام کا کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔ آخر ثنا بھی ایک جیسی جاگتی لڑکی تھی۔ بڑھی لکھی باشعور اور آزاد خیال۔ اس کی اپنی ایک شخصیت تھی اور وہ تمام عمر شہباز کو اپنی شخصیت کی نفی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

شادی کا ڈنر شہباز کے پسندیدہ ہوٹل میں ہوا۔ لباس عروسی شہباز نے منتخب کیا۔ ہنی مون کے مقامات بھی سراسر اسی کی چوائس پر تھے۔ ثنا ہریات پر ہی بھرتی گئی لیکن آخر کب تک وہ کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتی۔ اپنی رائے درجی احتجاج کرتی تو شہباز کو شکوہ ہونے لگتا تھا کہ وہ زبان چلائی ہے۔ مگر شہباز کے یہ شکوے باقاعدہ الزامات میں تبدیل ہو گئے اور ثنا کی زبان بھی کھل گئی۔ اب وہ خم کھونک کر شہباز کے مقابلے میں آگئی تھی۔ اب وہ ہریات میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔ شہباز کی طرح اپنی رائے کھولنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ شہباز اسے ایک سنا تا تو وہ وہ سنا ڈالتی۔ شہباز چننا تو وہ اس سے بھی زیادہ قوت سے چلاتی تھی۔ پھر گھر میدان کارزار بن جاتا۔ جسے کہ آج صبح ہی صبح بنا تھا۔ شہباز خوب شور مچا رہا تھا کہ ثنا اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتی۔ اس کا خیال نہیں رکھتی جبکہ ثنا کا کہنا یہی تھا کہ گھر کے کام کرنا ملازموں کا کام ہے۔ اس کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ نگرانی کرے اور وہ یہ کام ٹھیک ٹھاک طریقے سے کر رہی تھی۔ مگر

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

دل میں اس لڑکی کا عشق بسائے ہوئے ہے جو کسی اور کا گھر بسا چکی تھی۔ بہر حال شادی سے پہلے اس موضوع پر شہباز سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ شہباز اب اسے چاہنے لگا ہے مگر شادی کے بعد جب درمیان میں کوئی تکلف کوئی پرہیز نہیں رہا شہباز نے پوری سچائی سے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں ہے وہ کسی سے عشق کرتا تھا مگر اب وہ ایک پرانی بات ہو گئی ہے اب اس کی تمام تر محبت سنا کے لیے ہے۔

اس لمحے سنا کا جی بھی چاہا تھا کہ وہ بھی اسے اس حقیقت سے آگاہ کر ڈالے کہ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نہیں ہے وہ کسی اور کے پار میں مبتلا رہ چکی ہے۔ یہ اور بات تھی کہ اسے مستقبل کے طوابع و صورت پار بھرے خواب دکھا کر اپنا وقت خوب ڈھونڈھوار گزار کر دینا ایک دن اسے اطلاع دیئے بغیر خاموشی سے اعلا تعلیم کے لیے لندن چلا گیا۔ سنا اس کی راہ دیکھتی رہ گئی پھر زندگی میں کئی موڑ آئے اور اب خراس سے شہباز آ کر آیا اور اسے لگا جیسے اس کی تلاش اب ختم ہو گئی ہے۔ نقش مانی کے رنگ اتنے مگرے تھے کہ نقش اول مدھم رہ گیا اور وہ وحید کو بھول گئی۔ بھول جانے کے علاوہ اور گرتی بھی کیا وہ بیسویں صدی کی ایک حقیقت پسند لڑکی تھی اٹھارویں صدی کی کوئی ایسی جذباتی سنی سادہ تری نہیں جو جانے والے کے غم میں خون تھوک تھوک کر سل کا شکار ہو کر مر جائے۔

زندگی بہت خوبصورت تھی اور اس میں لطف اندوز ہونے کے لیے بہت کچھ تھا۔

مگر یہ صرف اس کا خیال تھا شادی کے بعد معلوم ہوا کہ زندگی خاص کر ازواجی زندگی تو ایک نہایت اظہار امور امر ہے۔ جب فریقین کے مزاج میں اتنا تضاد اور اختلاف ہو جائے۔ کتنی ہی بار ان کی شخصیتوں کا گراؤ ہوتا تھا تو جو جیتتا وہی سکندر ہوتا اور ہارنے والا ملے مرے سے اپنی توانائیاں مجتمع کرنے میں لگ جاتا

تا کہ آئندہ لڑنے تک تازہ دم ہو سکے۔ سنا کی کمزوری اگر تھی تو وہ شہباز کے منہ سے اس کی پچھلی محبت کا ذکر تھا اس کے زخموں پر جیسے کوئی نمک چھڑک ڈالتا تھا اب تو شہباز نے بھی یہ کمزوری بھانپ لی تھی وہ خوب تاک کر نشانے لگا تا اور سنا تلملا تلملا جاتی مگر تب بھی کبھی اس کے منہ سے وحید کے بارے میں نہیں نکلا تھا وہ یہ سنگین غلطی نہیں کر سکتی تھی اس کی ماں نے سختی سے اسے منع کیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس بارے میں شہباز کے سامنے منہ سے بھاپ نہ نکالے چاہے وہ پیار و محبت سے یہ راز جانتا چاہے لاڈ سے یا غصے سے۔ مردانہ اعلا طرف کبھی نہیں ہوتا جتنا ایسے موقع پر خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے شہباز نے اگر اس کی یہ غلطی پکڑ ڈالی تو وہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا اس کی محبت پر کبھی اعتبار نہیں کرے گا۔

جب کہ وہ سری طرف سنا شہباز کے منہ سے اس کی داستان محبت سننے کے بعد بھی اسے معاف کرنے اور اس کی محبت پر اعتبار کرنے پر مجبور تھی۔

”جادو ہی تو کیا تھا اس وقت کیا کمال کی اداکاری کرتی تھیں تم ایسی بھولی بھالی سیدھی ساوی بن کر میرے سامنے آئی تھیں کہ میں سمجھتا تھا کہ تم سے زیادہ محبت کرنے والی اور پر خلوص ہستی اور کوئی ہے ہی نہیں۔“

”اور تم نے بھی تو خوں چڑھایا ہوا تھا ایک منڈب بڑھے لکھے براڈ ماسٹڈ شخص کا کہاں گئیں تمہاری وہ خوبیاں۔“ سنا نے تسخراڑا۔

”تمہاری خامیوں نے انہیں ختم کر ڈالا۔“ شہباز نے سنا کی گرہ باندھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

وہ اسی اطمینان سے طنز کے نشتر چلایا کرتا تھا اور سنا بلبلاتا تھی۔

”مجھ میں اتنی خامیاں دکھائی دیتی ہیں تو تمہیں روکا کس نے ہے! اسے لے آؤ وہ جو تمہاری من چاہی محبوبہ ہے چندے آفتاب چندے ماہتاب سکھڑ تمہارے ناز اٹھانے والی۔ تمہیں بگاڑنے والی۔“



شہباز کے ہاتھ ایک تھمے کے لیے چھہر گئے۔

”اسے کیوں ہر بار بیچ میں گھسیٹ لاتی ہو۔“

”اس لیے کہ وہ ہمارے بیچ سے نکلی ہی کب ہے وہ

شروع دلنا سے ہی تمہارے دل میں ہے اسی کی وجہ

سے میں تمہیں بری لگتی ہوں اسی کی وجہ سے تم مجھ

سے لڑتے ہو، جھگڑتے ہو اس چیل نے اب بھی

تمہارے دماغ پر قبضہ کیا ہوا ہے۔“

شہباز غصے سے سرخ ہو گیا۔ ”فضول کی بکو اس

مت کیا کرو میرے اور تمہارے جھگڑے میں کسی اور

کا کیا دخل سے خواہ مخواہ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے

غصہ دلانے کی کوشش مت کیا کرو۔“

”ضرور کروں گی میں کوئی تمہارے غصے سے ڈرتی

ہوں غصہ تو مجھے بھی آسکتا ہے پھر مت کہتے پھرنا کہ

میں تمہاری عزت نہیں کرتی اور یہ ذکر تمہیں اتنا

پریشان کیوں کر ڈالتا ہے۔ تمہارے دل میں کوئی چور

ہے جسے تو آخر تمہارا اس سے کیا تعلق ہے جو تم اس

کے خلاف کچھ سن بھی نہیں سکتے۔“

”میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے اگر چور ہوتا تو

میں تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتاتا اور شاید کسی

میری غلطی بھی میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ وہ

میرا ماضی ہے اور میں اب ماضی سے کوئی تعلق رکھنا

نہیں چاہتا اور تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ

اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی

ہے۔“

”اور تم تو بہت عذاب میں ہونا میری وجہ سے“

اونہ اتنی ہی محبت کرنے والی تھی اتنی ہی بادشاہی تو

چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔“ ثنائے جل کر کہا۔ ”مگر اس

نے بھی تم سے بیاہ کر لیا ہوتا تو آج اپنی قسمت کو رو

رہی ہوتی۔ عقل مند تھی اس لیے جان چھڑا کر ہماگ

گئی ایک میں ہی بے وقوف تھی جو تمہاری محبت کے

جال میں پھنس گئی۔“

شہباز نے برش ڈر تنگ ٹیبل پر ہنسا ڈالا۔

”تو تمہارے خیال میں میں نے تمہیں اپنی محبت

کے جال میں پھنسا تھا میں تم سے مخلص نہیں۔“

تمہیں فریب دیتا رہا ہوں۔“

”ہاں ہاں تم نے دیا تھا فریب میں نے دھوکا کھایا

ہے اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہوئی تو کیا تم ہر بات

میں یوں مجھ پر دھوکے جمانے مجھ پر حکم چلانے میں

تمہاری بیوی ہوں کوئی باندی تو نہیں۔“

”میں بھی تمہارا شوہر ہوں کوئی تمہارا غلام یا

سزا کوں پر رلنے پھرنے والا بھکاری تو نہیں جو تم میری

کوئی عزت ہی نہیں کرتیں۔“

”کب میں نے تمہاری بے عزتی کی؟“ ثنائے چلائی۔

”ہر وقت ہر لمحہ ہر گھڑی۔۔۔ اور میں یہ برداشت

نہیں کر سکتا۔“

”اور میں بھی برداشت نہیں کر سکتی تمہاری یہ

بد تمیزی اور اس لب و لہجے میں مجھ سے بات کرنا۔“ ثنائے

تن کر کھڑی ہو گئی۔

”میں کسی کرے بڑے خاندان کی نہیں ہوں جو تم

سے دب کر رہوں گی۔ تمہیں میرے وجود کو تسلیم کرنا

ہوگا۔“

”چھا وہ کس طرح سے؟ تمہاری جی حضوری کر

کے، تمہاری ہر الٹی سیدھی بات پر سر جھکا کر اور

تمہاری ہر بکو اس خاموشی سے برداشت کر کے۔“

شہباز طنز یہ ہنس پڑا۔

”میرا سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم اپنے آپ کو

سمجھتی کیا ہو۔ کس بات پر ناز ہے میرے گھر میں میری

بیوی بن کر رہنا ہے تو اپنی حد میں رہو ورنہ میں یہ اکڑ

اور غور ختم کرنا خوب جانتا ہوں۔“

بات بڑھتی چلی گئی آخر شہباز نے اس پر ہاتھ اٹھا

لیا۔ ثنا کا دماغ غم غصے سے ماؤف ہو گیا وہ بھی بے

انتظار شہباز پر پل پڑی تھی اس نے شہباز کا گریبان

نوج کھسوٹ ڈالا اس کے چہرے پر اپنے لیے کبے

ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں پھر شہباز کے دو چار

بھاری پھپھروں نے اسے شکست خوردہ ہو کر بیڈ پر

گرنے پر مجبور کر ڈالا۔ شہباز اسی طرح چہرے کی

خراشوں سے رستے خون کے ساتھ باہر چلا گیا۔

”لوگوں کو معلوم تو ہونا چاہئے کہ میری اتنی ویل

منہوڑ" ابجو کھٹلہ اور ٹھوڑی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ کس حد تک سلوک کر سکتی ہے اور ہم کس قدر قابل رشک زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ کھا جانے والی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہہ کر گیا تھا۔

نہ جانے ملازموں نے اسے اس حلیے میں دیکھ کر کیا سوچا یا پھر اس کا کس کس سے سامنا ہوا۔ شاید نہیں جانتی تھی وہ تو بیڈ پر کتنی ہی در بڑی غم و غصے کے انتقامی جذبات سے مغلوب جلتی کڑھتی رہی اسے شہباز سے نفرت ہو رہی تھی وہ اس جیسے وحشی مرد کے ساتھ اب ایک بل بھی نہیں رہ سکتی تھی آخر اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شہباز کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تو وہ یقیناً "اپنا چہرہ دکھا کر مظلوم بننا سب سے بہتر دریاں سمیٹ رہا ہو گا مگر وہ اسے یوں اپنی کردار کشی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شہباز پر کیس کر ڈالے گی قانونی جنگ لڑے گی۔ آج کے مہذب معاشرے میں کوئی مرد یوں بلاوجہ اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے مہذب پن کا پرہیز دنیا کے سامنے چاک کر کے سب کو دکھائے گی کہ وہ اندر سے کس قدر جاہل ہے۔

شہباز تو خود بھی قانون کے پٹے سے وابستہ تھا۔ یقیناً "وہ بھی اپنے داؤد و جج آزما کے گامزن بننے کا عزم کر لیا تھا کہ وہ اسے ناکوں پنے چبوا کر ہی دم لے گی۔ شہباز کو خوب اندازہ ہو جائے گا کہ ایک عورت کی انا کو زخمی کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ اسے بے دردی سے پیٹ کر کتنے آرام سے چلتا پھرتا تھا وہی تو تھی جس سے شادی سے پہلے وہ اتنی محبت جتاتا کرتا تھا اس کی می نے اس رشتے میں کچھ پس و پیش کی تو وہ کتنی بے تابی سے دن رات ان کے گھر کے چکر کاٹتا کرتا تھا آخر اس کی می کو ہاں کہتے ہی بنی اب اگر می یہ جان لیں کہ ان کی نازوں میں ملی جینی اس بد سلوکی کا شکار ہے تو وہ تو شہباز کو کبھی معاف نہ کریں۔

وہ غصے میں بڑبڑاتی کھولتی ہوئی اپنی جیب میں ملا کر پلنگ بڑھیر کرتی رہی سارے قیمتی زیورات کپڑے وغیرہ بشکل داسوٹ کیسوں میں پورے آئے پھر وہ حلق کے

بل چلاتے ہوئے ملازم کو آواز میں دینے لگی اس کے تیور دیکھ کر وہ لرزتا کانٹا اپنی پانچ سے ہی ملازموں میں سراپا سیگی دڑی ہوئی تھی بند دروازے کے پیچھے سے ساری آوازیں باہر تک پہنچ رہی تھیں یہ ڈرنا تو تقریباً "روزانہ ہی اسٹیج ہوتا تھا مگر آج لڑائی بھڑائی کے ساتھ مار کٹائی کے سین بھی تھے جو کہ کم از کم نئی بات تھی صاحب کو غصے سے پاؤں پٹختے بھنگلی سے حلیے میں زخمی چہرے کے ساتھ باہر جاتے بھی دیکھا تھا اور بھی منہ میں انگلی دبا کر رہ گئے۔

"امام بخش جاؤ جا کر میرے لئے ٹیکسی لے کر آؤ ابھی اسی وقت"۔ ٹانے حکم سنایا۔

امام بخش نے کمرے کی بہتر حالت کو دیکھا پھر سوٹ کیسوں پر استعجاب بھری نگاہ ڈالی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہو سکی مگر خود بخوار میرنی بنی ہوئی تھی وہ خاموشی سے شانے اچکا کر پلٹ گیا۔

شخصی کے عالم میں۔ ادھر ادھر شہنئے لگی نفرت سے شہباز کی ذاتی استعمال کی چیزوں کو دیکھانے وجہ اس کے سیپروں کو ایک ٹھوکر رسید کی اور دانت پیستے ہوئے سوچتی رہی۔

اونہ کیسے کنگلی سے شادی کر بیٹھی تھی اور اترا تا اس قدر تھا جیسے کہیں کا شہزادہ ہو ایک ہی گاڑی تھی گھر میں جس پر وہ اپنے زخمی چہرے کا اشتہار چھوڑنے نکل گیا تھا گھٹنا ذہن کے مخصص کی گھٹنا حرکتیں جب تک تشریح نہ کرے گا تسکین کیسے ملے گی۔ اذیت پسند نفسیاتی مریض کہیں کا۔

وہ پلٹی تو دروازے پر شہباز کو کھڑے پایا اس نے ایک اچھٹی سی نگاہ ٹانے بندھے ہوئے سامان برڈالی اور کہا "ٹیکسی منگوانے کی کوئی ضرورت نہیں گاڑی کھڑی ہے چلی جاؤ۔"

ٹانہ سر ٹپا سلگ ہی تو انھی یعنی کہ اس پر بالکل اثر نہیں ہوا یہ دیکھ کر بھی کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے۔

"ہمیں تمہارا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔" اس نے اطلاع دینی مناسب بھی شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ وہ

”نہیں۔“ ثناء نے منہ پھیر کر کہتے ہوئے دونوں سوٹ کیس اٹھائے۔

جب سارے رشتے توڑنے پر تلا تھا تو یہ تکلف کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی اور کیا امام بخش کو وہ خود آواز نہیں دے سکتا تھا۔

اس نے ابھی بوجھ سنبھالا بھی نہ تھا کہ چکر اکر وہیں بیڈ پر گر پڑی زمین و آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے تیز تیز گھومنے لگے اسے ایسا لگا جیسے ابھی اس کی انتڑیاں الٹ کر باہر آجائیں گی۔

سیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں اسے یاد آیا کہ آج صبح اس نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا لڑائی جھگڑے میں ناشتے کا ہوش کہاں رہا تھا پھر سارا وقت اعصابی جنگ لڑتی رہی تھی ایک کمزور سا انسانی ذہن تو تھا۔ کہاں تک بوجھ برداشت کرتا۔

اس نے شہباز کو اپنی طرف لپکتے دیکھا پھر کچھ دیر کے لیے اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش لوٹا تو اس نے دیکھا وہ تکیے کے سہارے سیم دراز تھی اور سامنے ملازمہ گلو کوز کا بھرا ہوا گلاس لیے کھڑی تھی۔ شہباز بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جھکا فون پر کوئی نمبر ڈال کر نے کی کوشش کر رہا تھا۔ ثنا کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”واکٹر ماہرہ سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا اور تم کسی اور کے پاس جانا پسند نہیں کرتیں میرے خیال میں ہم لوگ خود ہی ہسپتال چلے جاتے ہیں۔“

”نہیں میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ ثنا اٹھ بیٹھی مگر وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے اس پر نقاہت اور کمزوری کا غلبہ تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ شہباز کا لہجہ حتمی تھا۔ ”اپنا چہرہ دیکھو کس طرح جیلاڑ رہا ہے سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے میں نہیں چاہتا کہ تمہاری مٹی یہ سمجھیں کہ میں تمہاری صحت کا خیال نہیں رکھتا باقی جو کچھ بھی ہمارے درمیان ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔“

ثنا کو کسی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ جلد از جلد اس کھر سے جا کر یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کرنا

یونہی کچھ دنوں کے لیے اپنی ای کے پاس جا رہی ہے اس لیے مزید بولی ”ہمیشہ کے لیے۔“

”یہ تم نے ایک بہتر فیصلہ کیا۔۔۔ بلکہ بہترین فیصلہ۔“ شہباز کے تاثرات میں سر مو فرق نہیں آیا اس نے اپنے چہرے پر کوئی میڈیسن لگائی ہوئی تھی ایک آنکھ کے نیچے سو جن تھی شاید زخم کچھ گہرا لگ گیا تھا۔

”ظاہر ہے تم تو یہی چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح مجھ سے جان چھوٹ جائے۔“ ثنا طنز سے باز نہ رہ سکی۔

”کر ٹیکٹ۔“ شہباز کا یہ مختصر جواب ثنا کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ کس قدر سفاک اور بے حس مرد تھا وہ ذرا بھی تو اسے کئے پریشیمان نہیں تھا حتیٰ کہ رسا” بھی اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی وہ اتنی بے وقعت تو نہیں تھی کہ اس کے جانے سے شہباز کی زندگی میں کوئی فرق ہی نہیں پڑے وہ کبھی اس کی کمی محسوس نہ کرے۔

آثار تو یہی کہہ رہے تھے کہ وہ اس کی کمی کبھی محسوس نہیں کرے گا بلکہ شاید وہ خطر کھڑا تھا کہ وہ اس کے کھر سے جلد از جلد دفعان ہو اور وہ اپنے بیڈ پر آرام کر سکے۔ ثنا کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر ردنا شروع کر دے مگر اپنی انا اور خود داری اسے بہر حال عزیز تھی اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

”اور شہباز تم یہ مت سمجھنا کہ میں اتنی آسانی سے تمہیں معاف کر دوں گی۔ جو سلوک تم میرے ساتھ کرتے رہے اس کا تمہیں جواب دینا پڑے گا میں تم پر کیس کر دوں گی۔ تمہیں عدالت میں لاکھڑا کروں گی۔“

شہباز چونک پڑا ”ایک وکیل کے لئے عدالت میں

کھڑا ہونا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن تم یہ سب کیوں کرنا چاہتی ہو تمہیں طلاق چاہئے وہ تمہیں عدالت میں جائے بغیر مل جائے گی جب بھی تم کہو۔“

ثنا کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے یوں کھرے کھرے کر ڈالے گا اسے چکر سا آتا محسوس ہوا اپنی کمزوری اور جذباتیت پر خود کو سرزنش کرتی ہوئی وہ سوٹ کیس اٹھانے لگی۔

”امام بخش کو آواز دے دو۔“ شہباز نے سنجیدگی سے کہا۔

کی۔ انہوں نے اس کے کندھے کو تھکا۔  
 ”اب میں ذرا تمہارے ہسپینڈ کو جاگریہ خوشخبری  
 سناؤں۔“

شہباز کا کیا رد عمل ہوا یہ سنا نہیں جانتی تھی وہ خاموشی  
 سے جا کر کار میں بیٹھ گئی کچھ دیر بعد شہباز بھی آگیا۔ وہ  
 بھی چپ چپ تھا۔ چہرہ پاٹ تھا شہباز نے خاموشی  
 سے کار اشارت کر لی۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں  
 گم تھے۔

شائے وزیدہ نظموں سے شہباز کو دیکھا مگر  
 مہندی گرین کلر کے شلوار لیس میں وہ اپنے ہیٹ کے  
 ویل ڈریسڈ سراپے سے بے حد مختلف لگ رہا تھا بال  
 بھی بکھرے ہوئے تھے جب کہ اس کی شرٹ کو نوج  
 کھسوٹ کر شائے اس کے سوٹ کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا۔  
 پھر شہباز کو سامنے جو بھی شلوار سوٹ دکھائی دیا اسے  
 ہی تبدیل کر کے چلا گیا تھا۔ چہرے پر وہی بے نیازی  
 تھی جو بھی شاکو بہت اچھی لگتی تھی مگر اب شادی کے

چاہتی تھی ایسا تو بھی ہوا ہی نہ تھا کہ اس نے خود پر  
 مسلط کردہ شے قبول کی ہو پھر ایک زبردستی کی زندگی  
 کیوں گزارتی عمر کے یہ طویل لمحے محض کسی بھجوتے  
 کے تحت کیونکر کاٹی وہ فیصلہ جلد کرنے کی عادی تھی  
 اور فیصلہ وہ کر چکی تھی جس پر شہباز کو بھی کوئی  
 اعتراض نہیں تھا اب شاید وہ اچھے دوستوں کی طرح  
 اس سے علیحدہ ہونا چاہتا تھا۔

بادل نخواستہ اسے شہباز کے ساتھ چیک اپ کے  
 لیے جانا ہی پڑا۔

ڈاکٹر ماہرہ نے چیک اپ کے بعد بڑی گرجوشی سے  
 مسکراتے ہوئے اسے خوشخبری سنائی کہ وہاں منوالی  
 ہے۔ شائے جہاں کی تمہاں رہ گئی اس کے لیے یہ کوئی لوید  
 مسرت نہیں تھی جب وہ شہباز سے یہ نانا توڑ کر جانا  
 چاہ رہی تھی تو اس کی یہ نشانی اپنے ساتھ کیوں کر لے  
 جاتی۔

قسمت کی اس ستم ظریفی پر وہ حیران پریشان ہو گئی  
 تھی وہ تو ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ شہباز کے ساتھ  
 گزارے ہوئے وقت کو ایک ناخوشگوار خواب کی  
 طرح اپنی زندگی سے نوج پھینکنا چاہتی تھی مگر اس ستم  
 سے وجود کو کہاں جا پھینکتی۔ شہباز سے شادی کرنا اس  
 کی زندگی کا ایک غلط فیصلہ تھا شاید یہ بات وہ تسلیم  
 کر چکی تھی مگر یہ بچہ تو قسمت کا فیصلہ تھا۔  
 ”کیا بات ہے شائے تم خوش نہیں ہو گئیں۔“ ڈاکٹر ماہرہ  
 کے لیے اس کا رد عمل خلاف توقع تھا۔

”در اصل یہ اتنا اچانک ہے۔“ شائے زبردستی ہونٹوں  
 پر پھینکی سی مسکراہٹ لے آئی۔

”تمہاری شادی کو تو چھ مہینے ہو رہے ہیں اور لوگ تو  
 پہلے مہینے ہی ہمارے پاس چکر لگانا شروع کر دیتے  
 ہیں۔“ ڈاکٹر ماہرہ ہنس پڑیں۔ ”شروع شروع میں  
 لڑکیاں یونہی گھیراتی ہیں ماں بنانا آسان تو نہیں ویسے  
 پریشانی کی کوئی بات نہیں میں جو ہوں تمہاری دیکھ بھال  
 کے لیے تمہیں آرام کرنا چاہئے اور کوئی مینشن نہیں  
 رکھنی۔ میں تمہارے لیے ڈائنٹ چارٹ بنا دوں گی۔ سچی  
 سے اس پر عمل کرنا اوجھے۔ اور خبردار جو ڈائینٹنگ

جنہوں نے استعمال کیا وہ جانتے ہیں  
 سوہنی ہسپتال کی خوبیاں  
 • گرتے ہالوں کو روکتا ہے  
 • بال بے اور گھنے کرتا ہے  
 • ہالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے



# سوہنی ہسپتال

کیا آپ نے اسے استعمال کیا؟ نہیں  
 تو ایک دفعہ اسے استعمال کر کے دیکھیں

۳۷، اردو بازار کراچی

بعد زہر سے بھی بدتر لگنے لگی تھی وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر سونے لگی کہ جو فیصلہ وہ کر چکی ہے اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں اور شاید تب بھی گنجائش نہیں ہوتی جب شہباز اسے روکنے کے لیے اس کی منت کرتا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا مگر اس جیسا بے حس انسان ایسا کرتا ہی کیوں۔ اس نے تو اپنے باپ بننے کی خبر بھی کتنے آرام سے سن لی تھی جیسے یہ کوئی انوکھی خبر ہی نہ ہو۔ جسے باپ بننا کوئی خوشی کی پانچر کی بات ہی نہیں ہو جس شخص کو اپنی بیوی کی پروا نہیں تھی بیوی سے محبت نہیں تھی اسے اپنے ہونے والے بچے سے کیا محبت ہوگی۔ شاید شہباز کو اس خبر میں کوئی چارم ہی دکھائی نہ رہا ہو جسہی تو وہ اتنا شانت تھا اس نے ایک بار بھی جھوٹے منہ بھی نہیں کہا کہ وہ اور نہیں تو اپنے بچے کی پیدائش تک رک جائے اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کرے مگر اسے کچھ عرصے کے لیے ملتوی تو کر ڈالے۔

وہ ہونٹ چباتے ہوئے شہباز کی بے حس پر کڑھ رہی تھی اپنی ماں کا مزاج وہ اچھی طرح جانتی تھی انہوں نے اسے یہی مشورہ دینا تھا کہ وہ شہباز کے ساتھ ساتھ اس کے بچے سے بھی چھٹکارا حاصل کر لے مگر نا ایسا نہیں کر سکتی تھی اپنے وجود میں اپنے خون سے اپنی تخلیق کو سینچا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ وہ کتنی ہی دور اندیشی سے یہ فیصلہ کریں وہ اس پر رضا مند نہیں۔ وہ اپنے بچے کو مٹی اور شہباز کی سپورٹ کے بغیر بھی پال سکتی تھی اتنا تو اسے یقین تھا کہ یہی اسے سپورٹ ضرور کریں گی آخر وہ ان کی ملازلی بیٹی تھی۔

رہا شہباز تو بہت سے بچے بغیر باپ کے بھی تو ہوتے ہیں وہ بھی اپنے بچے کو بن باپ کا سمجھ کر پال لے گی اسے زندگی کی تمام خوشیاں دے گی اور کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔

کیا واقعی بن باپ کے بچوں کو کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہو سکتی؟ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا کیا دنیا بھر کی محبت باپ کی شفقت کی تلافی کر سکتی

ہے؟

شاید نہیں اس نے پوری سچائی سے اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایدر جھانکا اس کے ماں باپ میں بھی تو علیحدگی ہو چکی تھی وہ بھی بن باپ کے مٹی بڑھی تھی اور کبھی روح میں ایسا خلا نہ گیا تھا جو آج تک پر نہیں ہوتا تھا۔ شوہر سے برتاؤ کا نہ اسے اندازہ تھا نہ مشاہدہ ماں آزادی نسواں کی حامی تھی باپ نے اسے آزاد کر دیا اور خود جانے کن فضاؤں میں پرواز کر گیا۔ شاید اسی لیے وہ شہباز کو وہ کچھ نہ دے سکی جو شہباز چاہتا تھا۔ عزت محبت توجہ خدمت اور جانے کیا کچھ وہ شہباز سے برابری کا سلوک کرنا چاہتی تھی اور شہباز کی مردانہ اٹالیہ بات برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

اس کا ہونے والا بچہ بھی شاید قدم قدم پر باپ کی شفقت اس کے مضبوط سینے کی گری اور اس کے تحفظ کا اظہار رہے گا اور اگر بیٹی ہوئی تو وہ بھی اسی کا شکار رہے گی پھر اس کی آئندہ زندگی پتہ نہیں کیسی ہو۔ تاریخ آج اسے آپ کو دہرائے چلی تھی کیا ہمیشہ ایسا ہی ہو گا۔ وہ جانے کیوں دھک سے رہ گئی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہباز نے جیکے سے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ جو آج اس کی بیوی تھی مگر کل تک شاید نہ ہو اب جب وہ ایک فیصلہ کر رہی چکی تھی تو شہباز کی اتنا اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اس فیصلے کے آڑے آئے وہ خود بھی انسانی حقوق کے کار کا پر جوش حمایتی تھا۔ کسی کو اپنی خواہشوں کے خلاف زبردستی کیوں مجبور کرے۔

ٹٹا کو اس سے شکایت تھی کہ وہ ضدی ہے تند خو ہے ہمیشہ اپنی بات منواتا ہے تو وہ تو ہمیشہ سے ہی اسی طبیعت کا تھا اب اگر ٹٹا نے شادی سے پہلے اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندھ رکھی تھی تو اب وہی پٹی اتر کیوں گئی۔

اس کا مطلب تو یہی تھا کہ ٹٹا کو اب اس سے محبت نہیں رہی اور اگر ایسا تھا تو وہ بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا کہ زبردستی اسے اپنی زندگی میں شامل رکھتا اور محبت کی بھیک مانگتا یہ بات اس کے وقار کے خلاف تھی او

اور رخ ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے عورت جیسی نرم و نازک اور حساس شے سے برتاؤ کرنا نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر ماہرہ نے اسے سرزنش کی تھی کہ غالباً وہ اپنی بیوی کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھتا اسی لیے وہ اتنی ویک ہو رہی ہے۔

”اسے تمہاری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے خاص طور پر ان دنوں تو بہت زیادہ۔“ ڈاکٹر ماہرہ نے یہ بات زور دے کر کہی تھی۔

ادھر وہ تو ہمیشہ اسی پر شکوہ کناں رہا تھا کہ ثنا اس پر توجہ نہیں دیتی اس کا خیال نہیں رکھتی۔ کیا میرا بچہ بھی ماں کے سائے سے دور چل کر میری طرح جذباتی محرومیوں کا شکار بن جائے گا۔ اس سوچ نے اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار کر ڈالے۔ پاؤں پے اختیار بریک پر وہ گیا کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ثنا اپنے خیالوں سے چونک اٹھی۔

”کیا گھر آ گیا؟“

شہباز نے شرمندہ ہو کر دوبارہ گاڑی اشارت کر لی۔

”کہاں اترو گی انہی می کے گھر؟“ اس نے پوچھا

اس کا خیال تھا کہ ثنا کا جواب اثبات میں ہو گا مگر ثنائے جواب دیا۔

”نہیں۔“

شہباز کو خیال آیا کہ وہ اپنے دونوں سوٹ کیس وہیں گھر پر چھوڑ آئی تھی۔ عقل مند تھی اس لیے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہ رہی تھی۔

”سامان اٹھانا ہے؟“ وہ جانے کیوں تڑپ اٹھا۔

”نہیں۔“ ثنا کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

”سامان کھولنا ہے۔“

شہباز نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ثنا نے سر جھکا لیا۔ ایک نئے رشتے کی ڈور نے انہیں پھر سے باندھ لیا تھا اور اب اس قید سے رہائی کوئی آسان نہیں تھی۔

اپنی خودداری، سہر حال اسے سب سے زیادہ عزیز تھی ثنا کو اس سے محبت نہیں تھی تو ظاہر ہے وہ اس کے بچے سے بھی بے زار ہو گی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو ماں کی بے زاری اور نفرت کا شکار نہیں ہونے دے گا یہ اپنا بچہ اس سے لے لے گا ثنا اس امانت کی اہمیت تھی اور کچھ نہیں۔ اور اگر اس نے بچہ دینے سے انکار کیا تو وہ عدالت کے ذریعے اسے حاصل کر لے گا وہ اس میدان کا ایسا منجھا ہوا کھلاڑی تھا کہ یہ عمل تو اس کے لیے بائیس ہاتھ کا کھیل تھا۔

پھر وہ اپنے بچے کی پرورش خود کرے گا اس کے لیے گورنس رکھے گا اسے ایک بھر پور اور مکمل شخصیت بنائے گا۔

مگر کیا ایک گورنس اسے ماں کا پیار دے سکے گی؟ کیا بغیر ماں کے بچہ ایک بھر پور اور مکمل شخصیت بن سکے گا؟ شاید اس کے ضمیر نے یہ سوال کیا تھا۔

شہباز چونک سا بڑا اسے اپنی گورنس یاد آگئی جو اس کے ماں باپ کی عدم موجودگی میں اس کے گال چانٹوں سے سرخ کر ڈالتی مگر ان دنوں کے سامنے کلبے سے لگائے پھرتی تھی جوں جوں وہ بڑھتا گیا گورنس کی شکایتیں بڑھتی گئیں۔

”شہباز بابا یو آر شینی اے ناٹی بوائے“ اس کے منہ پر یہی بات رہتی تھی اور پھر اس ناٹی بوائے کو گورنس کی شکایت پر ماں سے سخت ست بھی سننی پڑتی تھی۔

شہباز کی امی ایک سوشل خاتون تھیں اس کے والد کا حلقہ احباب وسیع تھا کسی کو اتنی فرصت ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ بچوں پر توجہ دے سکے آخر اتنی مہنگی تنخواہ پر گورنس کس لیے رکھی گئی تھی۔

شہباز بے حد حساس بچے تھا ماں کی توجہ سے محرومی نے اس کے اندر ایک ایسی مہنگی سیدھا کر ڈالی جو کبھی ختم نہ ہوئی۔

وہ بھر پور محبت بھر پور توجہ کا طالب رہتا تھا اور ثنا اس کی یہ خواہش پوری نہ کر سکی تھی ماں کی محبت سے محروم پرورش پانے والے بچے شاید اسی کی طرح غصیلے



عظیم نازی

# مکمل ناول

چوہا بند کر کے اس نے ابا کے کمرے میں جھانکا۔  
وہ عشا کی نماز پڑھ رہے تھے۔ چھتری لے کر گیٹ  
کھولتے جلتے ہوئے وہ برآمدے میں ہی رگ گئی۔  
اس نے والا گیٹ کی سلاخوں سے ہاتھ اندر ڈال کر اسے  
کھولنے کی کوشش میں معروف تھا۔ بالآخر کامیاب  
ہو ہی گیا اور کچھوں میں ہی غمراہ رو جو دے دوڑتا ہوا  
برآمدے کی حدود میں آن پھرا۔ وہ ڈر سی گئی۔  
یہ عظیم صاحب کا گھر ہے ناں؟ نووار نے ہونٹوں کی  
طرح خود کو گھورتی ہوئی حرا سے پوچھا۔ اس نے تائید میں  
سر ہلایا۔

پارٹس اپنا مک ہی شروع ہو گئی۔ موسم کی  
بے اعتباری تو یوں بھی اس علاقے کی روایت تھی ہی تھی  
اور اس موسم اور پارٹس میں بھی کسی نے ان کا گیٹ  
دھڑا دھڑا بھاویا تھا اگر یا اہل خانہ استقبال میں تاخیر  
نہ کریں۔

اس وقت کون لگیا؟ اس نے جب جھانکا تو  
قبوہ تقریباً تیار ہی تھا اور وہ نقاط بھی جن پر  
جمع کر کے اپنا سناج اپنا وقت واضح کرنا تھا کہ اتنا  
بچوں سمیت اپنے بھائی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ واپسی  
ابھی تک نہیں ہو پائی تھی۔



READING  
Section



READING  
Section





کھدرا ہے، کھانا کھا کر آیا ہے۔ ایسا کرو تو ہوا ہی  
لے آؤ۔

نئے برس سے کچھ بنانے کی ضرورت ہی پیش نہیں  
آئی تھی سو وہ چند ٹخنوں میں ہی لوازمات سے سچی رشتے  
اٹھانے اندر موجود تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد  
وہ خامے معقول طیلے میں نظر آ رہا تھا۔ اور شکل و صورت  
میں بھی اپنے چھوٹے بھائی حمزہ سے مشابہ تھا۔

ہاں! مگر ایک فرق نمایاں ہے۔ مزان کا اس  
کے انداز میں تھنی سرے سے نہیں ہے۔ اندازے  
ہوئے جو اپنی تھی ہوئی نظر اس پر حیران دہی طور پر آگئی  
تھی۔ تجزیے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔

تھنے پہچانا نہیں، یہ مزمل ہے۔ احسان بھائی  
کا بیٹا، بلبل سے چھوٹا والا، آبا تھارنی مرحلے طے کرنے  
گئے۔

اور مزمل یہ حرا ہے، میری سب سے بڑی بیٹی۔

جی میں نے پہچان لیا تھا انہیں، ایک سرسری  
سی نگاہ اس پر ڈال کر وہ دوبارہ ابلے محو گفتگو  
ہو گیا۔

تم کہیں باہر کے ملک گئے ہوئے تھے۔ دل نہیں  
لگا جو اچانک چلے آئے یا واپس جانا ہے، آبا پر چھنے  
گئے۔

جی ہاں انکل، کچھ ایسی ہی بات تھی۔ گیا تو میں تعلیم  
حاصل کرنے تھا۔ پھر حجاب بھی شروع کر دی۔ مگر معلمین  
نہیں ہو سکا، اس نے ڈرائی فزٹ کی ڈس سے  
خشک میوہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اپنوں سے دور رہ کر  
آپ سائنٹس تو حاصل کر لیتے ہیں مگر ذہنی سکون نہیں  
ملتا۔

تھوڑے کی بیٹی اس کے آگے سرکاتے ہوئے حرا  
نے دل میں اس کے خیال کی تائید کی۔ اور پھر جب  
وہ آبا سے کسی کا لونی کا رشتہ پوچھنے لگا جہاں اسے کسی  
شخص سے ملنے جانا تھا۔ تو اس کا دل جا ہوا وہ پھو پھو  
نعمان اور باقی سب کے بارے میں پوچھے۔ مگر اس  
کے روٹے سے ہمت ہی نہیں ہوئی۔

ایٹلا، جی نے آپ کے لیے چکوال کی ریوڑیاں  
بھجوائی ہیں۔ غالباً بہت پسند میں آپ کو، آبا آٹھ  
کر چند ٹخنوں کے لیے باہر گئے تو اس نے بلبل پر رکھے

کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ میں گھنڈہ بھر سے دروازہ بجا  
رہا ہوں اور آپ یہاں برآمدے میں چھتری تانے کھڑی  
ہیں۔ بھگے ہوئے لباس اور پختے ہوئے بالوں کے  
ساتھ مضحکہ خیز ماحول ہے وہ اس پر یوں گرم ہو رہا  
تھا جیسے اسے بھگوانے میں تمام تر ساتھ آسی کا ہو۔  
میرے گنے تک آپ گیٹ کھول چکے تھے۔  
خوش قسمتی ہوئی ناں آپ کی۔

آپ کی تعریف، اس کے بچے پر کچھ الجھ کر بخند  
دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ صورت کچھ شناسا سی  
لگ رہی تھی۔

مسافراہ ہاتھ میں تھاما ہوا بریت کیس زمین پر  
رکھتے ہوئے وہ مکمل بے نیازی سے بولا۔ تو اس نے  
دال سے ہٹ جانا مناسب سمجھا۔ ڈرائنگ روم کا  
دروازہ کھولنے لگی۔

یادداشت خاصی کمزور ہے آپ کی۔ عظیم انکل

سے کیے مزمل احسان آیا ہے۔ پشت سے آواز آئی۔  
نام جانا پہچانا تھا اور اب شک کی کوئی گنجائش  
باقی نہیں رہی تھی۔ ایٹلا پھو پھو کے سسرالی اسی انداز  
کی خصوصیات کے حامل تھے۔ جن کا مظاہرہ وہ کر رہا  
تھا۔

آبا نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیے۔  
ڈرائنگ روم کی لائٹ جلا کر اس نے اندازے کا راستہ  
دیتے ہوئے کہا۔

شکر ہے اس ذرہ نوازی کا، رومال سے چہرہ صاف  
کرتے ہوئے وہ یوں ہنس دیا جیسے جتنا چاہ رہا ہو کہ جب  
انداز ہی گیا ہوں تو بیٹھ بھی جاؤں گا۔ اور وہ براہمان  
گئی۔ اس کے رویے کا عجیب و غریب تاثر ہوا تھا  
طویل عرصے کے بعد دیکھا تھا اسے۔ کہ اس دوران پھر پھو  
کے ہاں جانا ہوا بھی تو وہ ملک سے باہر تھا۔ پہچاننے  
میں بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ قصور اتنا بڑا نہیں تھا  
جتنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

آبا کو بتا کر وہ کچن میں چلی آئی۔ آتش دان میں زرز  
جلا کر وہ غالباً اس کے لیے آٹا سوٹ لے کر گئے تھے  
پھر وہ کچن کے دروازے تک آئے۔

چھوٹے سے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔  
 "کیسی ہیں پھوپھو؟ بہانا ماتھ آہی گیا تو وہ بھی  
 جرات کر بیٹی۔  
 "یا دریں آپ کو وہ؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا  
 ہوا غالباً پہلی بار کھل کر ہنسا۔  
 "کیوں؟"

"میں جب یہاں آ رہا تھا تو انہوں نے آپ کے  
 لیے بہت سی دعائیں دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ  
 گزشتہ دو برسوں سے آپ کی صورت نہیں دیکھی کوئی  
 رابطہ ہی نہیں ہے۔"  
 "اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں انہیں بھول  
 چکی ہوں؟"

"ہاں! مگر سوچنے کی بات ہے، اتنے قریبی رشتوں  
 کو یاد کرنے کے لیے اس قدر لاپرواہی تو وہ مہر مویں سے  
 قہورہ انڈیلتے ہوئے بولا: مجھے تو اس قہورے کی لذت  
 بھی برسوں یاد رہے گی! بستر لابی اور لیمن گراس کی  
 مہک نے سحر کن تاثیر فضا میں پھیلا دیا تھا۔  
 "انہیں کیا خبر میں نے خود کو کتنا مصروف کر لیا  
 ہے! اس کی بات پر غور کیے بغیر وہ سوچتی ہوئی باہر  
 چلی آئی۔"

بارش کچھ ہلکی ہوئی تو وہ چل دیا۔ اتنا سے ڈراب  
 کرنے گئے تھے۔ غالباً اسی لمحے کے ہاں جس کے بارے  
 میں وہ اتنا سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے رخصت ہونے کا  
 پتہ نہ چل سکا کہ وہ خشاکی نماز پڑھنے جا چکی تھی۔ اسے  
 انہوں نے اتنا اس بات کا کہ مدت بعد ابلے سے نہائی میں  
 بات کرنے کا موقع ملے یا جو ضائع ہو گیا۔

ابھی برتن سمیٹ رہی تھی کہ اماں اندھا سلی اور  
 منور بھی واپس آ گئے۔ حسب معمول ان کا بھتیجا سرفراز  
 انہیں چھوڑنے آیا تھا۔ کچھ روز سے اس کی آمد و رفت  
 بہت بڑھ گئی تھی۔

"کس خوش نصیب کی اتنی خدمت ہو رہی تھی، کبھی  
 ہمیں بھی پوچھ لیا کر دیا اسے بڑے اٹھانے دیکھ کر وہ  
 گہری نگاہ سے دیکھتا ہوا براہِ عدے میں جم گیا۔ جہاں سے  
 کہن پر نظر رکھنا بھی آسان تھا۔

اس نے بے زاری سے مہر مویں میں جھانکا۔ بچا  
 ہوا قہورہ پیالی میں ڈال کر سلی کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اور

اور پہلی آئی۔ کسی کو سر پر مسلط کرنے کا آسان طریقہ  
 یہ بھی ہے کہ اسے ہر ممکن حد تک نظر انداز کیا جائے مگر  
 اس شخص پر تو کوئی بات اثر انداز ہوتی دکھائی نہیں دیتی  
 تھی۔ چند ماہ قبل اپنی بیوی کے ساتھ جھاڑ بھینس کسی معتول  
 جوان کے طلاق سے چکا تھا۔ بچہ بھی چھین لیا تھا اور  
 اب اس کی خوشی منانے کا خیال آ گیا تھا۔  
 "پھوپھی! صاحبزادی کا مزاج تو دن بدن اگڑا  
 ہی چلا جا رہا ہے!"

"کیوں نہ ہو۔ آخر باپ کی شہ پر ہے سب کچھ!  
 حسب معمول سرفراز کا تبصرہ اور اماں کی بڑ بڑا ہٹ  
 میڑھیاں جڑھتے ہوئے اس کے کانوں تک رسائی  
 حاصل کر ہی گئی۔"

بڑی روایتی سی جنگ جاری تھی اس گھر کی فضا  
 میں انشتوں کی بناوٹ کے لحاظ سے، اماں اور اس  
 کے درمیان سو بیٹے پن کا احساس گزرتے وقت کے  
 ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھتا گیا۔ حالانکہ وہ اس کے  
 ہوش سنبھالنے سے قبل اس گھر میں موجود تھیں، پھر بھی  
 اسے ان کے طبعوں سے اختلاف رہتا اور انہیں اس  
 کے رویے سے شکایت اور پھر بھی ہزار کوفت کے  
 باوجود وہ بہت حوصلے سے اماں کے ناقابل برداشت  
 رشتے داروں کو برداشت کر لیا کرتی تھی۔

"تم کیوں نہیں آئیں پارٹی میں! اسے سونے کی جلدی  
 نہیں تھی مگر پھر بھی بستر سنبھال لیا تھا۔ نذا اس کے  
 پیچھے پیچھے چلی آئی۔ دونوں اسی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔  
 "میں نے بتایا تو تھا کہ آج میرے نفس و سے کی وجہ سے  
 اسکول میں ہی دیر ہو جائے گی!"

"ہاں مگر ماموں امانی تو نہیں جانتے تھے ان کا تو یہی  
 خیال ہے کہ تمہیں ان کے ہاں جانا اچھا نہیں لگتا۔  
 سرفراز جھانکے بھی برا مانا۔ آخر ان کے بیٹے کا مقصد  
 تھا!"

"کسی کی سوچ پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی!  
 "پھر بھی جن لوگوں کے ساتھ عمر گزارنی ہو ان کا کچھ خیال  
 تو کرنا چاہیے!"

اس نے چونک کر مذاکی طرف دیکھا۔ مگر وہ  
 ڈاش روم میں چلی گئی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی  
 اور اس کی باتیں بھی بے سرو یا اور اماں کے خیالات

کی حکاس ہوا کرتی تھیں۔ جنہیں وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتی تھی۔

کوئی مہمان آیا تھا ہمارے جانے کے بعد؟  
ہاں! اس نے بتا دیا: پھر پھونے روڑیاں بھجوائی ہیں!

تمہارے لیے ہی بھجوائی ہوں گی! وہ کمان تانتے ہوئے طنز یہ انداز میں ہنس پڑی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایٹلا پھر پھو اس سے بہت لگاؤ رکھتی تھیں مگر پھر بھی مذاکے سوچ پر اسے اکثر افسوس ہی کا سامنا رہتا تھا۔

جب مذاکے خراٹے کمرے میں گرجنے لگے اور ٹچلے پورشن سے بھی سر پٹری کی آواز میں آنا بند ہو گئیں اور اسے یقین ہو گیا کہ اتناں اور سلی سو گئی ہوں گی تو وہ دبے پاؤں پیچھے چلی آئی۔ ابا جاگ رہے تھے اور منور سوچا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم ہونے کی وجہ سے انہیں

اس کی آمد کا احساس تک نہ ہو سکا۔ کورٹ اپگری کے چکروں میں اُلجھا ہوا ذہن پُر سکون کسے ہو سکتا ہے۔ سو وہ بھی ان کی ٹھکن اور سوچوں سے مکمل طور پر آگاہ تھی۔ ابا کی زندگی میں اُلجھنوں کی کمی نہیں تھی کہ تیرہ ماہ ہی انہیں علم ہوا کہ ان کی زمین کے کچھ حصے پر چند بااثر افراد نے ناجائز قبضہ کر لیا ہے اور اس جگہ پر کنسرکشن کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب مقدمہ چل رہا تھا۔

ابا میں نے ذکر کیا تھا ٹریننگ کورس کا۔ وہ اب شروع ہوتے والا ہے۔ مجھے راولپنڈی جانا ہو گا۔ وہ بیڈ کے کنارے نکتے برسے ویسی آواز میں بولی۔  
"اسنی دور، ایسی کیا مجھوری ہے؟ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔

ضرورت مند ہی تو مجبور ہوتا ہے۔ اس نے سوچا اور پھر ایک نظر کھڑکی سے باہر برسی بارش پر ڈالی۔  
"آپ تو جانتے ہیں ٹریننگ کے بغیر ترقی کے مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گی تو کوئی اور میری جگہ سنبھال لے گا؟ اس نے وضاحت کی اور ابا کی خاموشی میں تفکر کے سائے جھلکنے لگے۔  
"تمہاری ماں کیا سوچے گی۔ پہلے ہی اس کا خیال ہے

کہ میں تمہاری ہے جا حمایت کرنا نہیں یا ان کے آگے ہونے لیجے بروہ مایوسی سے دیکھنے لگی۔

میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہونے کا سوچ رہا ہوں۔ تمہارے لیے ایسا اُلجھایا ہے کہ اس سلسلے میں تم سے بات ہی نہیں کر سکا!

ابھی تو مجھے جانا ہے، دو تین مہینے لگ جائیں گے۔ اس نے جلدی سے بات کاٹی۔

ہاں تو ٹھیک ہے، تم واپس آ جاؤ معاملات پھر طے کر لیں گے۔ میں سرفراز کے والدین سے کچھ وقت لے لیتا ہوں! وہ مطمئن انداز میں کہہ رہے تھے، اور وہ بری طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ کیا کہہ رہے تھے وہ۔ سرفراز کا اس وقت میں کیا ذکر؟

اپنے پھرانے ہی ہوتے ہیں بیٹا! وہ بھی اپنے بچے کی طرف سے فکر مند ہے۔ تمہاری توجہ اور پاراگراف سے مل جلنے تو کیا بڑا ہے۔ اور پھر تم سے زیادہ کون جان

سکتا ہے بن ماں کے بچے کی ضروریات اور جذبات کو گھبراہٹ ہے چینی اور غصے کی کیفیات ایک دم

اس پر طاری ہونے لگیں۔ ابا کے منہ میں اتناں کی زبان بولنے لگی تھی۔ جن کی تمام تر ہمدردیاں اپنے بچے کے ساتھ ہوتیں۔ اس کے لیے تو ان کے پاس۔ کبھی

تسلی کے دو بول بھی نہیں رہے تھے۔ جنہیں اب استعمال میں لا کر وہ شادی شدہ ایک بچے کے باپ کے حق میں اسے آمادہ کر سکتیں۔ مگر ان کے پاس ایک

سے ایک اعلیٰ ہتھیار موجود تھا۔ ابا پر بے جا رعب ہند سن مانی اور اس کے علاوہ اس کی بہت سی کمزوریوں سے بھی واقف تھیں۔ فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

لیپھے لوگ ہیں امالداری۔ جو آسائش میں نہیں نہیں وے سکا، وہاں باآسانی میسر ہیں۔ اس تو کڑی کے جھنجٹ سے بھی نجات مل جائے گی! وہ کہہ رہے تھے: بہت خوش رہو گی تم وہاں!

ابا پلینز اہ شدت جذبات سے اس کی آواز کا پنے لگی۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں، کسی ہینز کی خواہش نہیں رہی۔ اور نہ ہی مجھے ان کاموں میں اٹھنا اُلجھتا ہے! اس کے حلق میں پھندا سا لگنے لگا۔ تو وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاید تم نہیں جانتیں، میں پاس کا احسان مند ہوں  
ہماری زمین کے حق میں اُنھنے والے تمام تراخیاوات  
وہی برواقت کر رہے ہیں۔ میرے لیے اُسے اُکار کرنا  
اتنا آسان نہیں ہے! اُبا کی شکستہ جھکی ہوئی سی آواز  
نے اس کا تعاقب کیا۔

بے چارے اُبا بچنے تک اتناں کی اجازت  
حرکتوں کے احمقوں نقصان اٹھاتے رہیں گے، اور  
اب یہ سرفراز وہ اوپر جانے کے بجائے سیڑھیوں  
سے ملحق اسٹور نما کرنے میں جلی آئی۔ جہاں بھی ہوئی  
اکھوتی چار پائی پر غالباً فالٹو بستر پر سے ہوتے تھے۔  
اندھیرے میں صبح اندازہ نہیں ہو سکا، دروازے  
کے پاس رکھی بد رنگ سی کرسی پر بیٹھ کر دل کی بھڑک  
نکلنے لگی۔

اُبا کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرے لیے کیسا ماحول  
خوشی کا باعث بن سکتا ہے۔ سرفراز کو اس کی طرف  
بیوی سرفرازہ نہیں کر سکی تو میں کس کھار میں ہوں۔  
اور اُس شوقین مزاج بندے کی بھلائی سے کیا مطالبت؟  
مگر یہ بات اُبا کو کیسے کھائی جانے اور اگر مجھے اُس بیمار  
ذہن اور بوسیدہ خیالات کے حامل شخص کے عمل کی  
اینٹ ہی بنتا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی اس قدر مجھے  
پڑھنے کی۔ جہاں ذہنی سطح معیار کے پیمانے تیار کرنے  
لگے۔

دوپٹے کے پتوں سے سوں سوں کرتے ناک رگڑتے  
ہوتے اُس نے سورتوں کی یلغار سے بوجھل، جھکے سر کو  
اُٹھایا۔ برآمدے میں چلنے والے زیر و بالا اور بلب کی تیلی  
روشنی کے اُس پار میں برستی بوندوں اور اُس کی  
آنکھوں سے بہنے والی برسات میں کوئی خاص فرق نہیں  
تھا۔ گھر میں پھیلا سنا اُس بات کا گواہ تھا۔ اُبا کے  
کمرے کی روشنی بھی گل سمجھتی تھی۔ گویا وہ اپنی بات  
کہہ کر سو چکے تھے۔

مسترد بارش کا شور کافی نہیں تھا، جو آپ نے ہی  
سر پہلے راگ الپتے شروع کر دیے۔ سانس میں  
بہت قریب سے گونجی بولا تھا۔ وہ بول کھلا کر بے ساختہ  
نمزی تھی۔ چار پائی پر پڑے جس ڈھیر کو وہ اندھیرے  
میں فالٹو بستر بھی تھی، اُس پر موجود مزمل احسان نے  
لحاف چہرے سے ہٹا کر اُسے پل بھر کے لیے دیکھا۔

اور پھر لحاف تان لیا تھا۔ وہ حیران پریشان آنکھیں  
پھاڑے دیکھ رہی تھی۔  
"جلے، جا کر سو جائیں! یوں آدمی رات کو اُتسو  
بہانا مسائل کا حل نہیں۔ دماغ خراب کرنے کے  
مسترد ہے، لحاف کے اندر سے آواز ابھری، شرمندگی  
اور تاسف سے اس کا ڈوب مرنے کو دل چاہا۔

لحنت ہے میری بے دھیانی پر جو یہاں آئی تھی!  
وہ ایک جھکے ہوئے اُٹھی اور لمحوں میں اپنے بستر پر جا  
بٹھئی۔ اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اُبا کے ہمراہ  
ہی واپس آ گیا ہوگا۔ اور اُسے سلا یا بھی اس کمرے میں  
ہوگا۔ بے کار چیزوں کے درمیان۔

کیا ضرورت تھی بھلا مجھے یوں احمقوں کی طرح  
رونے کی اور کیا سوچ رہا ہوگا وہ۔ غصت سے سوچتے  
سوچتے بچنے کب اُسے نیندا آئی۔

رات بھر ہونے والی بارش سے بہہ کر آنے والی  
مٹی نے گزارہ لائق سڑک کو بھی اپنی تہہ تلے چھپا لیا  
تھا۔ سردی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے گرم شمال  
اور سویٹر کا استعمال بھی ناکافی معلوم ہو رہا تھا، ہر طرف  
موسم بدل چکا ہے اور ایک یہ علاقہ ہے۔ بارہ بیسے  
سردی ہی ختم نہیں ہوتی!  
بے خیالی میں کچھ نہیں جانتے والے توتے کو سڑک  
کے کنارے آگ لگی لگا اس پر صاف کرتے ہوئے اُس نے  
خاصی جھجلاہٹ سے سوچا۔

بگ میں موجود ٹیوی سکرین کا سارا سناک استعمال  
میں لانے کے باوجود اُس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی، جوتے  
کی وہ شکل کہاں نکلتی، جو کھسے چلتے وقت تھی۔  
"یہ بیسے! شاید کام چل جائے! ایک صاف سکرین  
دو سال اس کی طرف بڑھایا گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا، وہی  
سجیدہ سا چہرہ اور جھکی آنکھیں اس کے جوتے پر مرکوز  
کیے وہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

اب اس کی ضرورت نہیں رہی! وہ فورا سیدھی  
کھڑی ہو کر سانس دیکھنے لگی، اسکول دین ابھی تک  
نہیں آئی تھی اور اس کی موجودگی میں کھڑے ہونا اُس  
کے لیے دشوار ترین مرحلہ نظر آتا تھا۔

اس کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اوریشلی آپ

جیسے لوگوں کے لیے ۵

اُس نے بے اختیار اس کی طرف جھرا گھا کر دیکھا۔  
اپنی بات کے رد عمل کا بخوبی اندازہ لگاتا ہے، شاید  
اس لیے اب لا تعلقی سے ٹھنڈا ہوا سرنگ کے کنارے  
آگے درختوں کے پاس جا رہا تھا۔ حرا کو یقین تھا وہ  
ایسا محض اپنی مسکراہٹ چھیلنے کے لیے کر رہا ہے۔  
مجھے جی پی او تک جانا ہے۔ یہاں سے کونینس  
مل جائے گی، پھر اُس نے پوچھا۔  
میں روڈ تک چلے جائے، ہر قسم کی سواری مل  
جائے گی ۵

بہت بہتر۔ اوہ۔ یاد آیا۔ وہ چلتے چلتے دو بار  
پلٹ آیا، ٹمن نے خط دیا تھا، حضور می تاکید کے ساتھ  
کر آپ کے ہاتھ میں ہی دیا جائے۔ جیکٹ کی جیب سے  
ایک بند لٹافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا، رات بائیں  
تھے شور میں بالکل بھول ہی گیا۔ بائی داؤسے، آپ سائنس  
پتھر ہیں ناں، ۵

لٹافہ تمہارے ہونے اُس نے بدقت تمام سر ہلایا۔  
ذرا پتا تو کیجیے آپ کے ہاں بارشیں آتی زیادہ  
کیوں ہوتی ہیں؟ ۵

لفظ بے رحمی نام کے اُس پاس پھیل ہوئی سیاہی  
کو دیکھتے ہوئے حرا کا دل زور سے دھڑکا، عام سی  
بات تھی مگر لہجے کی شرفی نے بہت با معنی بنا دیا تھا  
رات کے قہقہے کو تازہ کرتے ہوئے وہ جی بھر کر محفوظ  
ہونا چاہ رہا تھا۔ یا پھر اسی بہانے گزشتہ دو تیسے کی  
تلافی کرنا چاہ رہا تھا۔ بہر حال دونوں ہی باتیں اس کے  
لیے پیرا ہم یقین۔

آپ اس خبہ کے مزاج سے واقف ہی کب ہیں۔  
یہاں اسی طرح بارشیں ہوا کرتی ہیں ۵  
غینمت تھا کہ وہیں آپہنسی ورنہ شاید بھینچلا ہٹ  
اور بیٹری کے بڑھتے ہوئے امکان کے تحت وہ پیدل  
ہی چل پڑتی۔

یہاں عجیب لوگوں کی کمی نہیں تھی، جواب یہ بھی چلا  
آیا، "ایسا شور لڑ رہا ہے سنبھلتے ہوئے وہ دین میں جا  
بیٹھی۔ اسکول پہنچ کر پہلی فرصت میں۔ اس نے  
ٹمن کا خط پڑھا۔ وہی شکوے شکایتیں، بے مروتی اور  
کبھی یاد نہ کرنے کا گدو وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں

ملاقات کی خواہش کہ وہ خود سینڈیل فائنل ایر کے  
ہاتھوں تنگ آتی ہوئی تھی ورنہ اُرک چلی آتی۔ لہذا  
اُسے ہی بہت کرنا چاہیے ورنہ۔ اس کے بعد وہ مکیوں  
کا نقطہ آغاز تھا۔ اُس نے خط لکھ کر دیا۔ اس میں کوئی  
شک نہیں تھا کہ ملاقات ہونا کوئی مشکل بات نہیں  
تھی۔ مگر پھر بھی خاصی تاخیر سے ہوا کرتی تھی۔

چھپڑا سنی نے بتایا کہ پرنسپل بلا رہی ہیں وہ اُسے  
کو رس اینڈ کرنے کے بارے میں رضامند کرنے کے  
علاوہ تفصیلات سے بھی آگاہ کرنا چاہ رہی تھیں۔

"دو روز تک تو لیکچر اسٹارٹ ہو جائیں گے۔  
بہتر سے کہ تم کل پریوں تک روزانہ ہرجاؤ۔ اسٹیل میں  
روم کا انتظام بھی ہو جائے گا، انہوں نے کہا، تیکھ  
یکھنے کا موقع مل رہا ہے تم کس سوچ میں ہو ۵

ہاں، بی بی الحال میرے پاس واحد مل ہی ہے کہ منٹے  
کو ٹلنے کے لیے چند ونوں کے لیے ہی سہی، منظر  
سے غائب رہا جائے ۵ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے  
خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ رات، ابلے سے ہونے والی گفتگو  
نے اُسے واقعی بے حد اُلجھا دیا تھا۔ اگر وہ اُسے کوئی  
اینڈ کرنے سے منع کر دیتے تو شاید اس کے لیے اُن  
کی یہ بات ماننا اتنا مشکل نہ ہوتا، اتنا کہ اس نے  
مشلے سے نینا۔ اب ابا کی مجبوری اور امتاں کی موقع شناسی  
نے اُسے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

یہ بھی سچ ہے کہ میں نے ابا کی پریشانوں میں لٹنے  
کا باعث بننا نہیں چاہا۔ مگر پھر بھی وقت ایسے کسی نہ  
کسی مرحلے پر لاکھڑا کرنا ہے ۵

دعا لگی کے دن ان کے پریشان چہرے پر تحریر  
سوچوں کو بڑھتے ہوئے اُس نے سوچا تھا۔ وہ سیدھی  
ٹرننگ مینٹر سے ملنے ہائل چلی آئی۔ گھر سے اور دیگر سہولتوں  
کی طرف سے اطمینان پانے کے بعد اُس نے پہلی فرصت  
میں ایٹلا پھو پھو کی طرف بھڑک لگایا۔

نوکری کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھیں۔ میں  
نے کہا بھی تھا، عظیم سے کہ تمہیں آگے بڑھنے دے۔ آج کل  
کے دور میں جتنی بھی تعلیم ہو، کم ہی ہوتی ہے۔ یو۔ نیو۔ سی  
فور تھی تو یہاں بھیج دیتا، اب بھی تو آئی ہو، پھر پھو

کو اس کی ہمیشہ سے ہی بہت فکر رہتی تھی۔  
 • ابلنے بجے مزید پڑھنے سے روکا تو نہیں۔ جاب کا فیصلہ بھی میرا اپنا ہی تھا۔ دل چاہ رہا تھا تو بڑھانا شروع کر دیا۔ اس نے رسالت سے کہا۔ تب ہی گھر میں پھیل خاموشی اور بقل اس کے بے رونقی کی فضا میں گھٹی کی صدا گونجی۔ سب لوگ کسی عزیزہ کی شادی پر گئے ہوئے تھے اور پھر پھر اس کے منگ کرنے کے باوجود جانے کے ساتھ۔ اس کے لیے سوسے بنا رہی تھیں۔

• تمہارے پھر پھر میرے منگ کرنے کے باوجود من گیت بند کر گئے ہوں گے۔ ہو گا اپنی کا کوئی دوست۔ اور بار بار نیچے جانا میرے لیے اب بہت مشکل ہو جا جا رہا ہے۔ وہ جوڑوں کے درد کے ہاتھوں پریشان رہنے لگی تھیں۔

• اب تمہیں! میں دیکھ کر آتی ہوں! وہ تیزی سے میٹر سیاں پھلانگتی نیچے جا پہنچی۔ گیت کے پاس گاڑی موجود تھی۔ اس نے ایک کر دیکھا۔ اب جان پہچان کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ یہ مرحلے ہوئے نیلہ دن نہیں گزرے تھے۔ گیت کھول کر وہ ایک سائڈ پر ہو گئی۔ اور گاڑی تیزی سے پورچ میں آن رکی۔

• واٹ اے سر براؤن! آپ مجھے مہمان یہاں بھی ہماری میٹر بانی کرنے گئے! اس نے آنکھیں پھینکا کر حیرت کا اظہار کیا۔

• میں یہاں مہمان بن کر کبھی نہیں رہی! اس نے میٹر سیاں جڑتے ہوئے یہ نہیں وضاحت کر دی۔

• کہنے اور سمجھنے میں بہت فرق ہوتا ہے، وہ تو مجھے اس کی ہر بات کا گہرا گہرا جراب تیار رکھتا تھا۔ وہ سیدھی پن میں جلی آئی۔

• تم اتنی جلدی کیسے آگے! پھر بھونے اُسکتے دیکھ کر چھا۔

• اب کے خیال سے! وہ ہنس دیا۔ میں نے سوچا چچا کے بغیر نجانے کیا حال ہو گا آپ کا۔ جافل پستی وے دوں! مگر آپ تو یہ اس نے لمحہ بھر کے لیے ٹوک کر سوسے فرانی کرتی حرا کو دیکھا۔

• نامی مصروف ہیں، خاطر داریوں میں۔ میں تاحق و پریشان رہا!

• خاطر داری تھی، مگر تو کچھ بھی بتلنے نہیں وے رہی تھی۔ اور تم کیوں خواہ مخواہ پریشان رہتے ہو۔ جن کو فکر ہوتی جاہیے کہ منے سے لکل گئے مجھے چھوڑ کر! ان کا اشارہ پھر پھر کی طرف تھا۔

• انہیں معلوم ہے چچی آپ کی فکر کرنے والے بہت سے موجود ہیں، بڑی اماں بھی سب کے ساتھ گئی ہیں! پکن سے ملحق لاڈلج میں بیٹھے ہوئے اُس نے کہا حرا نے ایک ہاتھ میں مگ اور دوسرے میں سوسے تھاما اور ٹی وی کے سکنے جا بیٹھی۔ ان دونوں کی گفتگو میں اس کے لیے دلچسپی نہیں تھی۔

• ہاں! طبیعت ان کی کچھ ٹھنک نہیں تھی۔ مگر میں نے رکنے پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔ تمہیں تو پتا ہے۔ شادی مگر کسی کی بیٹی کی ہو تو وہ ضرور شرکت کرتی ہیں!

• تم ادھر کتنے میں کیوں جا بیٹھی ہو! معاذ اللہ! خیال آیا! یہ سب کچھ میں نے کس کے لیے بنایا ہے! وہ وہ اسے چلنے کی خالی چسکیاں بھرتے دیکھ کر ناراض ہونے لگیں۔

• یقیناً آپ کے لیے۔ اور یہ جگہ بھی! وہ اُس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا کر اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ چچی آپ کی دوائی مل گئی تھی بالآخر۔ ڈاکٹر سے بھی بات ہوئی ہے ابھی ایک گولی لے لیں تو قاصدا افتادہ ہو جائے گا! وہ چلنے کا خالی مگ میٹر پر رکھتے ہوئے اندر کی طرف چل دیا۔ بہت خیال رکھنے والا ہے، اذرا کوئی مسئلہ ہو گھر میں ہر کسی کے لیے یہ نہیں پریشان ہو جا تا ہے۔ صبح گھنٹے کے دوڑنے کچھ میٹر کیا اور پہلی فرصت میں دوائی ملاز ہو گئی۔ یہی حال اس کا کینڈا میں بھی تھا۔ ایک سے ایک اچھی آفر مل رہی تھی وہاں۔ بڑی اماں کی طبیعت خرابی کا سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھا کر چلا آیا۔ خیر قسمت کا دھنی ہے۔ یہاں بھی دوائیوں کی فرم میں اچھی جاب مل گئی ہے۔ شام کا وقت اپنی کیمسٹ شاپ پر گزارتا ہے!

• اس نے نہایت عزیز دلچسپی اور بے دھیانی سے ساری تفصیل کر سنا۔

• تمہنے ہاسٹل میں کرا کیوں لیا۔ یہاں رہنے میں کیا مسئلہ تھا! انہیں پھر یاد آیا۔

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

• روز آنے جانے میں وقت ہوتی۔ میں دیکھ اینڈ پڑ

آجایا کروں گی؟

کوئی وقت نہ ہوتی۔ منزل کا آفس اسی طرف ہے  
با آسانی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اپنے آنے کی اطلاع بھی  
نہیں دی۔ عظیم نے فون ہی کر دیا ہوتا۔ ہم خود نہیں  
لینے آتے۔ مگر وہ تو کوئی رابطہ ہی نہیں رکھتا۔ برسوں گزر  
جاتے ہیں ایک دوسرے کی صورتیں دیکھے، جوئے، گھر، فون  
کو تو صفحہ راکھی بے سرو یا باتوں میں ہی کال ختم ہو جاتی  
ہے۔ خط لکھو تو نہیں ملتا نہیں۔ اور یہ تم اتنی کمزور کیوں  
ہو رہی ہو۔ سوسے بھی دیئے، ہی پڑے ہیں۔ ٹھنڈے  
ہو رہے ہیں؟

وہ مغرب کی نماز پڑھنے چل دیں۔ انہیں ہمیشہ  
ہی اس کا اس قدر ہی خیال رہتا تھا اور وہ یونہی  
ہر بار خاموشی سے ان کے شکوے اور ڈانٹ سن لیا  
کرتی تھی اور اُسے انہوں میں رہتا تھا کہ آبا اور وہ دو ہی  
بہن بھائی تھے مگر پھر بھی ان کے درمیان بہت سے

گئے شکوے رہتے تھے۔ جس کی بڑی وجہ اماں ہی تھیں  
جو آبا کا ان کی بہن سے زیادہ میل جول پسند نہیں کرتی  
تھیں، یا پھر شاید وہ پھر پھر کی سسرال سے خائف تھیں  
خصوصاً بڑی اماں اور ان کی تکلیف وہ حد تک بچ بولنے  
اور بے دھڑک مخاطب کے مزید صاف کہہ دینے کی  
عادت سے۔ مگر حلا کا خیال تھا اور حقیقت وہ اندر سے  
ان سے خوفزدہ رہتی تھیں، اسی لیے آبا کو ان سب سے  
بدظن کرنے کی کوشش میں معروف عمل رہتی تھیں  
حلا ان کے کنٹرول سے باہر تھی۔ اس پر کوئی پابندی  
لگانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اینٹلا پھوپھو جب  
چاہتیں اسے اپنے ہمراہ لے آتیں اور وہ بھی خوشی سے  
چلی آتی کہ اس کی نھیال اور دو میال بڑی اماں کا کھر  
ہی تھا کہ بڑی اماں، آبا اور اس کی مرحومہ ماں کی سگی خالہ  
ہوتی تھیں۔ بدلتے وقت نے اس کی معروفیت کو بڑھایا  
تو آمدورفت کے سلسلے میں خود بخود کمی آگئی۔  
پھوپھو کے جوڑوں کا اور دوران کے ہاں کا سرو موٹم  
انہیں وہاں نہ آنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ مگر پھر بھی اس  
کا دھیان انہیں اسی شد و مد سے رہتا تھا۔

ہر وقت سوچتے رہتا آپ کی ہالی (مشغلہ) ہے یا  
ضرورت یا لائٹ جلاتے ہوئے وہ اُسے سوچوں کی دنیا

سے باہر لے آیا۔ اور پھر اپنی دانست میں جھگڑاتے  
ہونے لگے، کچن میں گھس گیا۔ اس نے ناکواری سے اس کی  
چوڑی پشت کو دیکھا۔ پھرٹی وی پر آنے والے ناک شو  
کی طرف توجہ مبذول کر لی۔  
یہ تم ہو چرا، لٹھی بھی نہیں گزرا ہو گا کہ ٹن اور نعمان  
کرے میں چلے آئے۔

وہ امانی گاڈ بچھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میں  
کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ وہ اس سے لپٹ  
گئی۔

اپنی آنکھوں کا علاج کرادو۔ اس کے علاوہ کوئی  
آسان حل۔ نہیں ہے، نعمان نے بیٹھے ہی  
سوسے والی پلیٹ اپنی طرف کھسائی اور انصاف  
کرنا شروع کر دیا۔ اب چھوڑ بھی دو بے چاری کو  
بڑی پٹی ایک چوٹی ہوگی اس کی۔ وہ ٹن کو دیر تک  
اس سے لپٹا دیکھ کر ہوللا  
یوں اچانک کیسے آئیں تم سا وہ کتنے دنوں کے لیے

آئی ہو؟

ٹن رہے ہیں آپ منزل بھائی، مہمان سے پوچھا  
جا رہا ہے کہ تم واپس کب جاؤ گے، کیا زمانہ آ گیا ہے؟  
سب چلتا ہے میرے بھائی، آج کل کے مہمان  
بھی تو خود کو مہمان جیسے کہتے۔ پوچھنے میں کوئی حرج  
ہیں؟ وہ بے نیازی سے سکراتا ہوا گزر گیا۔

نعمان پلیٹر، تھوڑی دیر کے لیے ایسے بخش دو۔  
ٹن نے اُسے گھراؤ اتنے عرصے کے بعد ملے ہیں، بہت  
سی باتیں جمع ہیں کرنے کے لیے؟

باتیں نہیں بڑیاں کہو، کیونکہ دو خواتین جہاں  
مل بیٹھیں، وہی کار خیر انجام پاسکتا ہے؟ وہ ہنستے ہوئے  
جاتے جاتے کہہ گیا۔

تھینکس گاڈ؟ ٹن نے ٹھنڈی سانس بھری، تم نے  
اطلاع کیوں نہیں دی آنے کی۔ میں تمہارے استقبال  
کے لیے رگ جاتی۔ پھر وہ اس کی طرف پٹی۔

سر پرانزا تھا نہیں لگا؟  
بہت اچھا لگا۔ اسی لیے تو یقین نہیں آ رہا تھا۔  
حفظ مل گیا تھا میرا؟

ہاں، مگر تم نے دمکیاں کب سے وہی شروع کر

دی ہیں۔ اگر تم نہ آئیں تو یہ کروں گی۔ وہ کروں گی۔  
 بس! مجھے پتا تھا تم سیدھی طرح قابو آنے والی نہیں ہو۔ یہ میری دھمکیوں کا اثر ہے جو تم ایک ہفتے کے اندر اندر ماہ دولت کے ماسے پائی جا رہی ہو، اس نے پاؤں سینڈل سے آزاد کیے۔  
 نہیں! تمہاری دھمکیاں بے اثر ہی تھیں۔ البتہ میرا ٹریننگ کورس شروع ہو گیا تو یہاں آئے کا موقع مل گیا۔

بہت خوب! اور میں یہاں پچھلے ہندہ منٹ سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ مس خرا عظیم میرے جذبات کا خیال کرتے ہوئے صرف مجھ سے ملنے کی سزح سے دوڑی آئی ہیں! اس نے منہ بنایا۔  
 مجھ پر یہ کبھی لے جانے جس طرف چل دیتی ہوں۔ ورنہ تم تو جانتی ہونا۔ میں ایک فوٹے دار تاجر ہوں۔ بے مقصد گھومنا پھرنا انقدر نہیں کر سکتی: وہ مسکرا کر اسے چڑانے لگی۔

بس بس! زیادہ ڈائیلاگ نہ بھاڑو۔ چلے ہے۔ اب ہم سے ملنا بھی تمہارے لیے بے مقصد بات ہے۔  
 تمہاری بات کا جواب دینا ضروری تھا بے مقصد ہی ہے۔  
 اس پر بعد میں بحث ہوگی۔ یہ بتاؤ کورس کتنے دنوں کا ہے؟  
 دو ماہ۔ تقریباً۔

ریٹیل! اس نے خوشی سے کھرے ہوتے ہوئے کہا۔  
 پچھلا سی بات پر تمہاری اگلی پچھلی ساری خطائیں سناؤ۔  
 خوب انجوائے کریں گے! وہ لباس تبدیل کرنے کرنے کی طرف بڑھ گئی۔

انجوائے! ابھی زندگی کے اس رخ سے آشنائی ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ میرا یہاں ہونا ایک بہانا ہے لاؤ فرار کا! اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے عادتاً مویا۔

وہ رات کتنے کے انارو سے ہی آئی تھی۔ لاؤ فرار ہی سمجھتے ہی اس نے اپنی خیریت کی اطلاع ابا کو دے دی تھی۔ اتنی جلدی دوبارہ فون آنے کی اسے توقع

نہیں تھی۔ اور اس کے پیچھے موجود کسی بھی خاص وجہ کا تصور ہی اس کے اطمینان کو رجحست کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ پھر پھوٹنے اس کو پاس کھرے پا کر اپنی گنگر سمیٹی اور ریسیور اس کے حوالے کر دیا۔  
 سرفراز کی بہن کی شادی طے پا گئی ہے لگے ماہ کی تیس تاریخ کو! انہوں نے اس کی خیریت پوچھتے ہی اصل بات بیان کی: ان لوگوں کا خیال ہے۔ یہی تاریخ سرفراز کے لیے بھی رکھ لی جائے۔ تم کہو تو رضامندی دے دوں۔ سرفراز تیار کرنا چاہ رہے! اس نے سانس روکے ان کی تفصیل بے دلی سے سنی۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے! ابلنے کہا۔  
 یہی میں بھی کہنا چاہ رہی ہوں ابنا۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا! اس نے بیزاری سے کہا۔  
 یہ تو کوئی منطق نہ ہوتی۔ میں اپنے مسئلے کم کرنے کی کوشش میں ہوں اور تم ہو کر۔  
 یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے! اس نے کہنا چاہا مگر لائن کٹ گئی۔

بلکہ راہ چلے تعصبت گلے میں ڈالنے والی بات ہے۔ ابنا! اہمی طرح جلتے ہیں یہ بات میرے لیے قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی نجانے کیوں مہر ہیں۔ بالکل ہی کی سمت کھلنے والا دروازہ کھول کر وہ ریلنگ کے پاس کھرے ہو کر نیچے صحن میں نظر دوڑانے لگی۔ بڑی اماں کے پورشن میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اسے صحن کے کمرے کی یہ لوکیشن بہت پسند تھی۔ سردیوں میں دھوپ اور گرمیوں میں شام کے بعد ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے موزوں ترین جگہ تھی۔ ساتھ والا کمرہ پھر بھیا کا اسٹڈی روم ہوا کرتا تھا۔ مگر اب غالباً وہاں کمان میٹر تھا۔ تبھی رات گئے گھنٹے کے ویسے تر کھر کی سے باہر نک سناؤ دے بیٹھے۔

نگاہیں جو نہیں یُرم ذرا آواز دے دینا  
 عمنوں میں گھر گئے ہیں ہم  
 اس نے بغور سنتے ہوئے نسیم بیک کی آواز پہچانی اور پھر آہٹ پا کر رخ موڑا۔ جس اس کے پاس موجود تھی۔ وہ اس ٹرانس سے باہر نکل آئی جو اس کی سوجوں اور رات کی خاموشی میں سنائی دینے والے گیت کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔



• تنہا تو کیا ہوا، باب میوزک سے کھسک کر کلاسیکل  
 ٹیکہ پہنچ گیا، اس نے نیشکل مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 "تہیں یا ہوا ہے؟" وہ اس کی بات کو نظر انداز  
 کرتے ہوئے بغور دیکھنے لگی۔ "ماموں جان نے ایسا کیا کہہ  
 دیا جو تم پریشان ہو گئی ہو؟"

• ان کے پاس آج کل کہنے کے لیے ایک ہی بات  
 ہے۔ سرفراز نے شادی کر لو، ریلنگ پر قدرے جھکے  
 ہوئے اس نے اسٹگی سے کہہ

• "واٹ!؟" ثمن نے حتی الامکان حرکت اپنی آواز دہانی  
 کر بڑی اتناں کا کمر صحن کے رخ پر ہی تھا۔ اور وہ یوں  
 رات گئے ان کا وہاں کھڑے ہونا شاید پسند نہ کریں۔  
 مجھے یقین نہیں آ رہا ماموں جان بھی ایسا سوچ  
 سکتے ہیں۔ اور اس سرفراز کو دیکھو۔ دو سال پہلے جب  
 شادی رچانے جا رہا تھا۔ اس وقت اُسے تم نظر نہیں  
 آئیں۔ اور اب دوسری شادی کے لیے تم سے زیادہ  
 موزوں کوئی نہیں ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق ہو چکی ہے  
 وہ خود اچھے میں آگئی۔

• سنا تو یہی ہے؟

• تم نے عظیم ماموں کو کیا جواب دیا؟  
 "کوئی بھی نہیں! اور میں کہہ نہیں کیا سکتی ہوں؟"  
 "آف! ثمن نے جھنجھلا کر کہنیاں نکالتے ہوئے سر  
 دونوں ہاتھوں پر گرا یا ایک احمقانہ فیصلے کے خلاف  
 اس قدر بزدلی کا مظاہرہ! مجھے اندازہ ہی نہیں تھا اور  
 تم اتنے اہم مرحلے پر اتنی بے وقوف نکلو گی؟ اس کی آواز  
 سے تانسف جھکنے لگا۔  
 • میں خود کو ہر قسم کے جھگڑے سے بچانا چاہتی ہوں۔  
 تہیں تراناں کا پتا ہی ہے؟"

• سب جانتے ہیں صرف میں ہی کیا ہر طرف ان کے  
 نامناسب اور غیر مستحاذ رویے کا چرچا ہے۔ مکمل  
 ثبوت فراہم کر رہی ہیں اب بھی اپنے؟  
 • چھوڑو! کوئی اور بات کرو، وہ اس کے طنز  
 لہجے سے اکتا کر لولی۔ ہر جگہ ہر وقت اپنے ساتھ ہونے  
 والی زیادتی کا تذکرہ سنا آسان بات کہاں ہوتی ہے۔  
 خواہ وہ آپ کے بہت قریبی لوگ، آپ کے اظہار  
 محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی کیوں نہ کہہ رہے  
 ہوں۔

• تم کہو تو امی بات کریں ماموں جان سے؟  
 نہیں۔ فی الحال ابا کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں  
 ہے۔ زمین کے مقدسے نے انہیں خاصا اُلجھایا ہوا  
 ہے؟ اس نے مختصر آئٹن کو پوری صورت و حال سے  
 آگاہ کیا۔

• تو یہ بات ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ماموں  
 جان نفسیاتی دباؤ کے تحت اس رشتے کے حق میں  
 فیصلہ دینا چاہ رہے ہیں۔ اس سارے قصے میں سرفراز  
 صاحب کے اثر و رسوخ نے عظیم ماموں کو جکڑ لیا۔  
 وہ دونوں کھڑے کھڑے تھک گئیں تو بالکوٹی کے ایک  
 سرے سے دوسرے سرے تک بندنا شروع کر دیا۔  
 • یہی بات تو پریشان کن ہے؟

• پھر بھی میرا مشورہ ہے تہیں اپنا شرعی حق استعمال  
 کرنا چاہیے زندگی بھر کا معاملہ ہے تجھی۔ صاف صاف  
 اپنی رائے سے سب کو آگاہ کر دو؟

• شرعی حق؟ تنہا کے کرے سے اٹھی میوزک  
 کی صدا میں بھی خاموش ہو چکی تھیں۔ لائٹ البتہ جل  
 رہی تھی۔ پردوں سے چین کر کے والی روشنی میں اس  
 نے استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے رُک کر تن کو دیکھا۔  
 "کیسا حق ہے یہ۔ جو نکاح سے محض چند منٹ پہلے  
 دیا جاتا ہے۔ جب والدین کی عزت و حرمت کی تلوار  
 سر پر لٹک رہی ہوتی ہے۔ اور اس کے پیچھے ان کی  
 مجبور یوں کی لمبی لسٹ موجود ہوتی ہے۔ اس سے  
 پہلے کون پوچھتا ہے؟"

• چلیے امیرا وعدہ ہے کم از کم آپ دونوں سے پہلے  
 مزود پوچھا جائے گا؟

• وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔ پردہ ہٹانے تیز  
 روشنی میں انہیں جو نکلتا ہوا دیکھ کر وہ حنیف سا مسکرایا  
 اور پھر ثمن کی طرف متوجہ ہوا۔

• ایسا کون سا مزوری مسئلہ ہے جو اندر بند کرے  
 نہیں ہو سکتا۔ یا پھر بڑی اتناں کی ہدایت کا انتظار ہے؟  
 اب اس کا لاجبظنی سنجیدہ تھا۔ سرفراز نے اس سے  
 بھر پور۔

• سوری مزمل بھائی۔ بالکل خیال ہی نہیں رہا؟  
 ثمن نے معذرت کرتے ہوئے اُسے گم گم کھڑے دیکھ  
 کر اُگے کی طرف دھکیلا۔

طرح سارا ہفتہ بے کار بیٹھے نہیں گزارتے ہم لوگ، چلو  
 اُسکو فوراً، وہ نعمان کو بات کا حسبِ عادت جواب  
 دے کر اس سے کہنے لگی، جراسعارت مندی سے اس  
 کی بات مانتے ہوئے، نچلے پورشن میں چلی گئی۔ پرانی  
 طرز کے بنے اس کٹاؤہ نقیسن میں بڑی اماں اپنے تین  
 بیٹوں کی فیملیز کے ہمراہ مقیم تھیں۔ گھر کی فضا میں موجود  
 اتفاق و محبت کو برقرار رکھنے میں بڑی اماں کے مزاج  
 اور معاملہ فہمی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ذیشان انکل  
 کی تو میرج اس کا واضح ثبوت تھی۔

ذیشان انکل اور عمر انچھی کہیں گئے ہونے ہیں؟  
 ان کے پورشن کے اُگے سے گزرتے ہوئے دروازے پر  
 نکلے تھے۔ بڑا نگاہ ڈالتے ہوئے اُس نے پوچھا۔  
 وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں، اچھا، اسی  
 ظہر میں!

ویری اسٹریج، اُسے اچھنبھا ہوا بڑی اماں نے  
 جانے دیا اہیں؟  
 بڑی اماں کیا کرتیں، ان کی شرط ہی بہت کڑی  
 تھی، اور وہ بھی منزل بجائی کے لیے، عاھر کا رشتہ

یہ یہاں بیٹھے جاسوی کا فریضہ انجام دے رہے  
 تھے، کمرے میں آتے ہی اُس نے گرفت سے کہا۔  
 "جاسوی اب بے چارے منزل بجائی یہ ٹن اس کے  
 تاثرات پر کھلکا کر ہنس پڑی، اپنے کمرے میں بیٹھے  
 تھے بھی، نچلے پورشن میں گنجائش کم ہو گئی ہے۔ نچل بجائی  
 کی شادی کے بعد، اوتنے اسٹڈی روم ختم کرتے  
 ہوئے یہ کرا منزل بجائی کو روے ویلے۔ ہم اپنی باتوں  
 میں اتنے ملگن تھے، ان کی ڈسٹربنس کا ادھیان ہی نہیں  
 آیا!"

انہیں سولے ڈسٹرب ہونے اور غصہ کرنے کے  
 ادا اتا ہی کیا ہے؟  
 "اب میں اتم نے کہاں دیکھ لیا ان کا غصہ، یا ٹن بستر  
 کی ٹکئیں نکالتے ہوئے چونک کر پٹی، اتنے سوٹ  
 ہیں وہ تو، نرم دل، ہمدرد اور پر خلوص، بس ذرا  
 بیزدو رہتے ہیں!"

پھر بھی ہر معاملے میں اپنی رائے دینا ضروری  
 سمجھتے ہیں؟ اُس نے ٹن کی بات کے جواب میں بھنجلا  
 کر سوچا تھا۔ ادا پھر کروٹ بدل کر سونے کی بھر پور پیش  
 کرنے لگی کہ اس وقت طبیعت پر طاری ہر قسم کی  
 اٹھن سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہی تھا۔

بڑی اماں صبح سے کئی بار تھارا پوچھ چکی ہیں۔ جاؤ  
 ان سے مل آؤ، پھر بھونے بالا خر سارے دن کے انتظار  
 کے بعد اُسے یاد دلانا، یاد تو اُسے تھا۔ ان سے ملنا بھی  
 ضروری تھا مگر اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ خود اس کی کج  
 سے باہر تھی۔ بظاہر وہ ٹن کے پاس پڑھے فلور کٹیشنز پر  
 براجمان فیشن میگزین کے صفحات الٹ پلٹ کر رہی  
 تھی۔

کیا مطلب؟ تم بڑی اماں سے ابھی تک نہیں ملیں؟  
 ٹن نے کتاب سے نظر میں ہٹا کر حیرانگی سے اُسے دیکھا۔  
 تم چھوڑ دو گی اسے تو وہ کہیں ادا بھی جلے گی ناں۔  
 سارا بجائی آئی تھیں صبح، تم دونوں کے خراٹے کمرے سے  
 باہر تک سناٹی دے رہے تھے۔ کیا کرتیں، چلی گئیں؟  
 نعمان نے تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔

جلس، ایک اینڈیر بھی بندہ آرام زکرے اتھاری

جنہوں نے استعمال کیا وہ جانتے ہیں،  
 سوہنی میسرائل کی خوبیاں،  
 ۰ گرتے ہاوں کو روکتے ہے،  
 ۰ ہاں لہے اور گنے کرتے ہے،  
 ۰ ہاوں کو مضبوط اور پکدار بناتے ہے،



## سوہنی میسرائل

کیا آپ نے اسے استعمال کیا؟ نہیں قیمت 60 روپے  
 تو ایک دفعہ استعمال کر کے دیکھو۔

ملنے کا پتہ  
 ۳۷، اردو بازار، کراچی

دینا چاہ رہی تھیں۔

”پھر؟“ اسے اپنے سوال پر خود بھی حیرت ہوئی۔  
اتنی دلچسپی کیوں لے رہی تھی وہ۔

”پھر کیا؟ منزل بھائی کو قابو کرنا کون سا آسان کام ہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس مہلے میں کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کریں گے۔ جیکے عمر نہ چھی کا خیال یہ لگتا کہ اس قدیم طرز کے مکان میں رہتے ہوئے ان کی جیٹے لپٹے رشوں سے ہمیشہ محروم رہے گی۔ بڑی اماں نے نہ ان کی خواہش روکی اور نہ ہی منزل بھائی کو مجبور کیا۔ دراصل عامر ان کے منع کرنے کے باوجود ماڈلنگ کرنا چاہ رہی تھی۔“

”بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے اصولوں کو جذبات پر ترجیح دی۔ ان کے بورڈن میں داخل ہوتے ہوئے اس نے سوجا۔ برآمدے میں ہی جمل بھائی کی بیوی سارہ بھابی اپنے بڑے صاحبزادے کو قابو کیے ہوئے دم دکھوانے کی تنگ دوویں معروف نظروں میں اور وہ بڑا سا۔ سنہ بننے ان کی ہر بات چٹکیوں میں اڑا رہا تھا۔ آئی ایم گوٹنگ ٹو اسے پارٹی (میں ایک پارٹی میں جا رہی ہوں) انہوں نے ڈکیشن دی۔“

”تو جانیے ناں! میں نے روک لیا آپ کو! کلاس ٹری میں پڑھنے والے شریہ سے عثمان نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ دونوں ہنس دیں۔“

”آؤ حرا۔ بھلے تمہاری برادری اس قوم کو کسے قابو کر لیتی ہے! وہ ہنستے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔“

”ہوتے ہیں کچھ خفیہ گروہوں کے پاس! اور محترمہ ان ہی میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لیے آج کل یہاں پائی جا رہی ہیں! تم نے لگایا۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آج کل ہر فیڈ میں ایکسپسٹ ہونا مزدوری ہو گیا ہے۔“ وہ انہیں لیے لان میں چلی آئیں جہاں بڑی اماں کے پاس بیٹھا حرا، انہیں سب چھیل کر پیش کر رہا تھا۔ وہ سلام کر کے خانی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اوہو! آج تو بہت خدمت ہو رہی ہے بڑی

اتماں کی! تم نے چیکتے ہوئے حمزہ کو چھیڑا۔

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اکوٹی دادی ہیں ہماری انھی مہلتے سے تو رہیں۔ تمہیں تو فتنہ نہیں ہوتی۔ مجھے ہی خیال کرنا پڑتا ہے۔“

”اچھا خیال کرتے ہو میاں! پورے دو ہفتے کے بعد اس وقت تمہاری شکل دیکھ رہی ہوں۔ بھلنے کہاں غائب رہتے ہو! بڑی اماں نے شکایت کی۔“

”یہی تو حیرت ہو رہی ہے۔ اس وقت تو تمہیں فلم دیکھنے جانا تھا۔ کل نمان کے ساتھ یہی پروگرام بنا تھا ناں! وہ شرارت سے بول کھولتے ہوئے حمزہ کی گھر کیل سے بے نیاز مسکراتی ہوئی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ کس پروگرام؟ کون جا رہا ہے فلم دیکھنے؟ بڑی اماں نے جو تک کرنا دیکھا۔“

”فلم نہیں بڑی اماں! قلم کہہ رہی ہے! حمزہ نے دانت پیتے ہوئے قہر بار نظر دلوں سے اسے دیکھا۔ وہ اور سارہ بھابی بے ساختہ ہنس دیں۔“

”اچھا تو جلدی کیا ہے۔ پھر کچھ چلے جانا اور میری ٹانگ کو دباؤ! وہ جو فرار ہونا چاہ رہا تھا، ٹم کو گھورتا منہ پر ہاتھ پھیلتا دوبارہ بیٹھ کر آہستہ آہستہ ٹانگ دبانے لگا۔“

”بڑی اماں! اب کیسی طبیعت ہے! ٹم نے اُسے چمڑاتے ہوئے پوچھا۔“

”تم سب کے تجربوں سے جان چھوٹے تو بہت سکون میں رہوں۔ ہزار بار کہا ہے بے موسم زکام ہے، خود ہی ٹھیک ہو جانے کا۔ مگر تمہاری ماں جو شائدہ پلا جاتی ہے۔ تو یہ بڑی ہو چھوہ۔ اور یہ حمزہ ہے۔ اسپتال میں آنے والی ہنری دوائی پہلے عجب پر ہی آزماتا ہے! حمزہ مقامی اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔“

”بڑی اماں! یہ میرے ساتھ زیادتی ہے! حمزہ نے احتجاج کیا۔ آنا ذلیل تو نہ کریں مہمانوں کے سامنے! لوجھلا! یہاں کون مہمان بیٹھا ہے۔ جو تو ذلیل ہو گا!“

”ٹھیک لگا کر دیکھیں حرا آئی ہیں۔ وہ ان کا دھیان بنانا، تیزی سے باہر پھلانگ کر اس طرف پہنچ گیا جہاں

لہذا اس کا منتظر کھڑا سوکھ رہا تھا۔

”یہ حرا بیٹی ہے بڑی اماں! سارہ بھائی نے نہیں  
ٹینک لگا کر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو تقارن  
انداز اپنایا۔“

”ہاں، ہاں پہچان لیا ہے میں نے اسے، ہر سواری  
ماں کی تصویر نکلی ہے، ایسی ہی ڈبلی بٹلی ہوا کرتی تھی اس  
عمر میں، خوش مزاج اور منساہ آہ: نظر ہی تلک گئی اُسے  
بھی اور عظیم کے نصیب کو بھی: وہ ٹھنڈی سالن بھرتے  
ہوئے ماضی کی تکلیف وہ یادوں میں گم ہو گئیں۔ اور یہ  
موضوع جس کا تذکرہ سنا بھی اب اس کے حوصلے اور ہمت  
کا امتحان ہوا کرتا تھا۔ وہ ان کے نفلوں میں ڈوبتی اور بھرتی  
رہی، آنکھوں میں آلی مٹی پر قابو پاتے ہوئے اُس نے  
جھکا ہوا سر اٹھایا، نگاہ کے عین سامنے، گلابوں سے بھری  
کیاری کے پاس کھڑا وہ چٹوں کی کانٹ چھانٹ کا کامد کے  
اس کے تاثرات پر ٹھنڈے میں مصروف تھا، اس نے تجربہ سال  
اس پاس بڑی اماں کے علاوہ اور کوئی موجود ہی نہیں  
تھا، اُسے احساس ہی نہیں ہوا، کب مٹن اندر گئی اور کس  
وقت سارہ بھائی۔“

”بڑی اماں! اب آپ آرام کریں، زیادہ بولنے سے  
کھانسی بڑھ جاتی ہے،“ وہ اُس کی کیفیت بھانپ کر گویا  
موضوع بدلنا چاہ رہا تھا۔  
”لو اس کی بھی سنتو! بیٹا تمہارا بس چلے تیرے سانس  
لینے پر بھی پابندی لگا دو۔ بڑی اماں اپنی دوسری اس کے  
مصروف گفتگو تھیں، منزل کی مداخلت کا برا مان گئیں۔  
”اتنی دور سے آئی ہے وہ، دو گھنٹی بات بھی نہ  
کردن اس سے!“

”ضرور کریں، مگر موسم کا بھی کچھ خیال کریں۔ ایسا نہ ہو  
بارش شروع ہو جائے اور آپ کرتا ہی نہ چلے! وہ  
آستینیں فولد کرتا ہوا سامنے ہی براجمان ہو گیا۔  
”یہ میری حقارت کا بار بار احساس دلا کر گیا جتنا  
چاہتا ہے: ایک ناراضی آپٹیشن ہونے لگا، اس پر ڈالتے  
ہوئے اس نے سوچا۔“

”آسمان صاف ہے، بارش کہاں، حرائم یہاں! اگر  
بیٹھو میرے پاس! بڑی اماں نے اپنی قریب ترین  
کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بلایا، شاید عاتقی اور

احسان انکل میں آگے تھے۔

”مجھے اب خود کو بدل لینا چاہیے، یوں ہر کسی کے  
میانے ایکسپوز ہو جانا سراسر حماقت ہے اور وہ بھی ایسے  
شخص کے سامنے، جس کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم  
ہے کہ وہ مٹن کا کزن ہے اور لیس۔“

اُس نے خود کو سرزنش کی اور بڑی اماں کے پاس  
جا بیٹھی۔ سارہ بھائی اور مٹن جب چائے لائیں تو وہ  
بہت اعتماد سے بڑی اماں اور شاہدہ آئی کی باتوں کا  
جواب دے رہی تھی، شام کو وہ یوسف پور چھوڑنے کے ہزار  
ہاسٹل چلی آئی۔

دومن ہاسٹل کا ماحول اچھا تھا، شام کو اکثر ہی سب  
لان میں اکٹھی ہو کر گپ شپ لگاتیں، تعارف ہوتا، اپنے  
اپنے تجربات دہرائے جلتے، اُس کی زیادہ تر ساتھی ٹیچرز  
بہت سیر تھیں، گورنر کا باقاعدہ آغاز ہوا تو اُسے احساس  
ہوا کہ محض محدود قابلیت کے ساتھ تدریس کا آغاز کر دینا  
اسٹوڈنٹس کے ساتھ ناموافق ہے، تجربہ اور ٹریننگ  
بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں، غلطیوں کی نشاندہی ہوتی  
ہے اور اصلاح کا موقع ملتا ہے۔

”وقت کا بہترین مصرف شاید میرے لیے اور  
کہہ رہی تھی نہیں سکتا تھا، اس نے اپنی بڑھتی ہوئی  
دیکھنی کے تحت سوچا تھا۔“

اس کی روم میٹ امیر بھی آپکی تھی مگر۔ اس  
کی کم گوئی اور نرم رو تو طبیعت کے ہاتھوں جلد ہی تنگ  
آگئی، کہ ان چند روز میں ان کے درمیان گفتگو سلام دعا  
اور حال احوال پوچھنے سے آگے نہیں بڑھی تھی، حالانکہ  
وہ اُسے بظاہر خاص دلچسپ لڑکی دکھائی دیتی تھی، لیکن  
اٹھنے کرنے کے بعد، فارغ وقت میں وہ ناول پڑھتی  
میوزک سنتی اور کبھی کبھار ملنگٹ، بازوؤں کے درمیان  
پر بھی نکل جاتی، اُسے رشک آتا، کتنی بے فکر زندگی  
ہوتی ہے کچھ لوگوں کی۔ حرائے واک مین لگاتے سر  
دھنتے ہوئے دیکھ کر سوچتی رہ جاتی۔

”شام کو باہر نکلتا، ہم جیسوں کی محبت کے لیے بہت  
مضید ہے، تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ ایک روز وہ باہر سے  
گھوم کر آئی تو حرا کو کسٹنڈی کے بیٹھے کتاب پڑھتے دیکھ کر

تنگ آگئی۔

بہنیوں کو ہٹاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "تو پھر اب تو میرے پاس بہت معقول جواز ہے بیٹے کی صورت میں لکھے کوئی نیاراستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"میری کسی سے واقفیت ہی نہیں ہے۔" باہر نکل گئی، کسی سے ملو گی تب ہی تو شناساں بڑھے گی۔ وہ مسکرائی لگتا ہے تمہیں پڑھانے کا بہت شوق ہے۔"

بد نصیب ہوتے ہیں کچھ لوگ: دنیا کی سب سے قیمتی نعمتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں، وہ بھی ان میں سے ایک ہو چکا۔ "اُس نے اُس کے انوس کو کم کرنا چاہا۔"

وقت گزرا سی کے لیے یہ جواب بڑی نہیں ہے۔ وہ سیلپر پاؤں میں اڑتے اس کے ہمراہ باہر چل آئی۔

احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کی سوچ کا انداز ہی مختلف ہوتا ہے۔ آپ جتنا ان سے نگا و مگا اظہار کرتے ہیں اتنی ہی ان کی یہ غرومی ابھرنے لگتی ہے وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ جیسے میں ہر وقت اپنی قابلیت اور زیادہ بڑھے لکھے ہونے کا اہل در عیب جاتا ہوں۔ اُس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

ابھی میرے بیٹے کا فون آیا تھا۔ کبیرا تھا کہ اب تک تو آپ کی بہت سی ہیلیاں بن چکی ہوں گی بشریر کہیں کا میرے بولنے کی عادت سے واقف ہے نا۔ اُسے کیا پتا کہ میری روم میٹ کس درجہ سنجیدہ خاتون ہیں۔ وہ ہنسنے ہوئے کبیرا ہی تھی۔

میرے معقول مشورے پر بھی وہ اپنے نقصان کو ترجیح دیتا تھا۔ ہر بات محض اس لیے رد کر دیتا کہ کہیں میں رتے میں اس سے بڑھ کر جاذب۔ عمر ماحول اللہ مزاج کا تعارف، ایسے کھیلوں کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔"

آریو میری بیٹی، دیکھا تم شادی شدہ ہو؟ اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا، دیکھنے میں وہ اس سے بھی کم عمر محسوس ہوتی تھی۔

اُس کی داستان سننے ہوئے حرا کو لگا کہ آبا جو تعلق سرفراز اور اس کے درمیان تمام کرنا چاہ رہے ہیں اس کا انجام بھی بالکل ایسا ہی ہوگا۔

کبھی تھی سب تو طلاق یافتہ ہوں۔" "ویری سیڈ۔"

"تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی ہو؟ اچانک وہ تاثرات بدلتے ہوئے اس کی طرف پلٹ گئی۔

زندگی میں کتنے لوگ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے ہیں۔ حرا نے شدید دکھ سے سوچا۔

"اچھا! مگر اب لگتا ہے کہ تمہاری موجودگی میں یہ عادت خراب ہو جائے گی۔" وہ مسکرائی۔

حقیر سے عمر میں سارے تجربے کر کے دیکھ لے۔ ایک یہ ٹریننگ رہ گئی تھی سو وہ بھی کرنے چلی آئی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

"خواب نہیں کہہ سکتے ہو، لائف انجوائے کرو، آنے والا وقت نجانے کیسا آئے۔"

اور بیٹا! وہ تو بہت بس کرتا ہوگا تمہیں آجکل؟ کس حد تک؟" اس نے ہاتھ میں پکڑا چیونٹم کا پیک اس کی طرف بڑھایا، مگر وہ اپنا نانا نانا سے بہت اچھوٹے اردن کا خیال ہے کہ وہ جتنا ان کے قریب رہے گا۔ اتنا ہی مجھے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔"

وہ دونوں ہی ہنستے ہوئے سنجیدہ ہونگئیں، اُس روز حرا کو احساس ہوا کہ وہ ایک اچھی دوست کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ راہ چلتے ہی بعض اوقات آپ کو اچھے لوگ مل جاتے ہیں جن کی سنگت میں وقت اچھا گزر سکتا ہے۔

ایک لحاظ سے ان کی سوچ غلط بھی نہیں ہے۔ "ہاں! مگر اب میرا ایسا کون ارادہ نہیں ہے ایک وقت تھا جب میں نے اس شخص کے نامناسب رویے کے باوجود دل کو عمر بھر کے بھوتے پر راضی کر ہی لیا تھا۔"

"اٹھو حرا! آج کہیں باہر چلتے ہیں۔ تو ایسے سمنہ پونجی ہوں وہاں سے کہنے لگی۔

کوئی بھی عورت طلاق کا ٹائٹیل خوشی سے قبول نہیں کرتی اگر اس مرحلے پر مجھے بھی پوائس کا حق دیا جاتا تو شاید میرا جواب۔ نفعی میں ہوتا۔ اُس نے درخوشی کی جھلکی

READING Section

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہم تو میں جانے والے ہیں!

آج وہاں جانا بیکار ہے۔ باختر ذرا بے علم ہوا ہے کہ آج کی ڈش میں آلو پالک کے علاوہ کون دوسری روٹیاں موجود نہیں ہے! اس نے منہ بنایا۔  
"تو چلو رہی کھا لیتے ہیں۔ وہ کسی قدر اطمینان سے بولی۔

کیوں کھائیں بھی۔ اس سے تو ہر تھکا گھریا رہ جاتے۔ روز ٹیڈے آلو، پالک، کریمے وغیرہ وغیرہ کھا کر منہ کا منہ خراب ہو گیا ہے۔  
"باہر جا کر کیا کریں گے، کریم بخش کو بیچ کر بیٹنگوانا ہے سگوانا۔"

"کیوں ہماری ٹانگیں موجود ہیں، ہم کسی کو کہیں نہیں اور تم ڈرو مت ہمارے ساتھ سامنے والی ٹیکٹ باجی اور ان کی کرسیاں بھی جا رہی ہیں۔ اس کی شانساں کا سلسلہ سارے ہاسٹل تک پھیلا ہوا تھا۔ عجوبنا وہاں تینوں کے ہمراہ نکل گھری ہوئی، قریبی مارکیٹ کی چاٹ اور وہی بڑے گول گئے وغیرہ کھانے میں مزہ تو بہت آیا مگر یہ عاصی اسے خامی پہنک رہی اور کئی چیزیں کھانے سے اس کا گلابری طرح خراب ہو گیا۔

تہیں تو آلو پالک ہی سوٹ کرتی ہے۔ یہ چکے تمہارے تہیں کی بات نہیں ہے! اگلے روز امیر اس کی سوسلی آواز سن کر ہنسنے لگی، اس روز دوپہر کا کھانا دل نہ چاہنے کے باعث گول ہو گیا اور اس نے صرف چائے بسکٹس پر ہی گزارہ کر لیا۔ لائبریری سے لال ہوئی کتاب سے نوٹس تیار کرتے ہوئے اسے پشت پر کر کے کا دروازہ آہستہ سے کھلنے کی آواز آئی۔ اندر پھر کسی نے اس کی آنکھوں پر آہستگی سے ہاتھ دکھ دیے۔ وہ مسکرا دی۔

نیم حکیم خطرہ جاں! یعنی کرشن! اس کے پروفیشن پر چوٹ کرتے ہوئے وہ بولی۔  
"ٹینکس فار وی کیلینٹ لیکن میری جہدائی کے چند ہی دنوں میں تمہارا یہ کیا حال ہو گیا۔ بخار کس خوشی میں چکھا لیا بیٹی!"  
"تمہاری خوشی منہ ہی کا کیا علاج! اس نے کتاب بند کی اور ٹیبل سے ہٹ گئی: تمہارے شہر کی چٹ پٹی چیزیں کھالیں اور یہ حال ہو گیا!"

اٹھو فوراً! میرے ساتھ گھر چلو!

میں بالکل ٹھیک ہوں، معمولی سا بخار ہے ٹھیک ہو جائے گا!"  
"مگر یہی سکتا ہے، تمہیں اپنا خیال رکھنے کی بالکل عادت نہیں ہے۔ دو الٹی تم نے!"

کیا ہے کریم بخش سے، لاڈ سے کاٹھوڑی دیر میں۔ اچھا یہ بتاؤ تم اس وقت یہاں کیسے؟ اس نے دھیان ہٹایا۔

فائل ایئر کس فذاب سے کم تو نہیں ہے۔ ہاسٹل اور کالج کے چکروں میں انتقال گمن چکر بن جاتا ہے تم اچھی ہو جو اس فیلڈ میں آگئیں۔ میڈیکل پروٹیشن تو نرا۔ در دوسرے بن گیا ہے۔ منہ نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ سیدھے سیدھے ایم ایس سی کر لیں، مگر اس وقت مجھ پر بھی تو تم کی خدمت کا بھوت سوار تھا۔ وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ یہاں سے گزرتے ہوئے تم سے ملنے کا سوچ لیا۔

پیلو ہاتھی نکل گیا ہے دم پھنسی ہونے ہے، فکر کی کیا بات ہے! اس نے تسلی دی۔  
"جی نہیں، غلط کہہ رہی ہیں آپ۔ دم نکل گئی ہے اور ہاتھی ابھی چھٹا ہوا ہے۔ فائل ایئر اور اس کے بعد کے سلسلوں کے لیے اس مثال کا الٹا ہونا زیادہ موزوں لگتا ہے: وہ ہنس پڑ گیا۔

"اوہ، مارے گئے باہر گاڑی میں ندرت میرا انتظار کرتے ہوئے سوکھ گئی ہوگی، میں چلتی ہوں، کچھ چلے یہ تو نہیں! وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔  
"اٹھ ہوں! اس نے نغمہ میں سر ہلا دیا: آبا کا فون تو نہیں آیا۔"

یہ نہیں! وہ چپ ہو گئی: شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں وہ! اس نے مایوسی سے سوچا تھا۔  
"دیکھو! اینڈ پیر آؤگی تو خود بات کر لینا خیال رکھنا اپنا۔"

پھر پھر کو میری طبیعت، بخار وغیرہ کا مدت بتانا۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی! اس نے جاتے جاتے کہا۔  
"سوچوں گی! من اسے تنگ کرنے کے انداز میں مسکرائی اور فوراً باہر نکل گئی۔  
"اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ بے صبر! من کی طبیعت

میں حمل سے زیادہ شامل ہے۔ سو وہی ہوا، شام کے بعد جب زیادہ تر کو لیگز کا من روم میں بیٹھی وی دیکھتے ہوئے گپ شپ لگانے میں مصروف تھیں، وہ کریم بخش سے منگوائی ہوئی پین کھاکر تقریباً سونے ہی والی تھی کہ ماسی مختار نے دروازہ بجاتے ہوئے ملاقات ہے۔

نعمان ہوگا! اس نے سوچا اور سیلر پاؤں میں اڑسی، دوپٹہ اور مٹی ہونے وزینگ روم میں چلی آئی۔ بخار کی حدت سے چہرہ لال ہو رہا تھا، دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی منرمل کو سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رگ گئی بسر جھانڈ منہ پیار کے سے انداز میں وہ اٹھ کر چل آئی تھی۔ نے ساتھ ساتھ سر پھر پھرتے ہوئے اس نے بانوں کی بگھری ٹیوں کو سنوارنے کی کوشش کی۔

کیسی تیں آپ؟ وہ اسے دیکھتے ہی گویا ہوا۔ ٹھٹھک ہوں، بڑا میزار کون جو اب تھا۔ ٹمن نے بتایا تھا آپ کی طبیعت حزال کے بارے میں اور یہ کچھ میڈیسن بھی آپ تک پہنچانے کی تاکید کی تھی۔ اس نے براؤن کاغذی لفافہ اس کی سمت بڑھایا۔ جو اس نے تمام لیا۔

نام تو تکلیف دی ٹمن نے آپ کو معمولی سا بخار ہی لگو تھا۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ شاید نیند ٹوٹنے کا اثر تھا یا پھر اس کی بے وقت آمد پر میزاری، جو لہجہ اس قدر ناگواری لیے ہوئے تھا۔ وہ اکیدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آپ شاید لوگوں کے خلوص کو پرکھتے میں بہت دانت صرف کرتی ہیں۔ مالا نکلیات صرف اتنی ہے کہ آپ چارے شہر میں مہمان ہیں۔ کچھ فرس ہمارا بھی بنتا ہے۔ اودا اگر اس بات کی بھی اہمیت نہیں تو پھر اتنا توجان لیں، جہاں کون خیال رکھنے والا نہ ہو، رہاں اپنا خیال خود کر لینے میں کوئی مصالحت نہیں ہوتا۔

صرا کا سو یا ہوا دماغ پوری طرح بدمار ہو گیا۔ پٹنا مگر اس کی طرف دیکھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی وہ اپنی بات کہہ کر جا چکا تھا، مگر سے میں پھیلا پٹنا اس کے احساس ذہنت میں اضافہ کرنے لگا۔ وہ اپنا فرس بھانے آیا تھا۔ اور اس کی بات پر بڑا ملنے کا پورا حق رکھتا تھا۔

واپس آجاؤ مہی: وہ تمہارا مہمان تو جا چکا ہے۔ امبر اسے ڈھونڈتی ہوئی اسی لمحے اندر آئی تھی۔ اتنا بڑا سٹ ڈراما کہہ رہے تھی وی پر جلو تم بھی آجاؤ۔

میری طبیعت کچھ ٹھٹھک نہیں ہے۔ طبیعت کی ایسی کی تھی۔ تم چلو تو سہی۔ کسے اکیدم مہلے گ: وہ اسے دیکھتی ہوں کامن روم میں آئی۔ فی وی پر آنے والے خصوص کیل کو وہاں موجود خواتین بہت انجھاک سے دیکھ رہی تھیں۔

کیا سوچ رہا ہوگا؟ دل نے پھر اسی ایک بات کی گردن شروع کر دی، مگر تمہیں اس کی سوچ کی اتنی پرواہ کب سے ہونے لگی۔ دماغ کی سرزنش نے پھان بٹایا۔

کیا بہت ناراض ہو کر گیا ہے؟ اس کی توجہ اسکرین سے ہٹ کر دیکھ کر امبر نے سر کوئی کی: ڈونٹ وری! اتنے اچھے خیالات کے مالک لوگ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتے!

اب مجھے لگ رہا ہے کہ میرا بھارتیہ دماغ کو چڑھ گیا ہے، عجیب و غریب باتیں کر رہی ہو، وہ اسے گھورنے لگی۔

جلو تم کہہ رہی ہو تو میں مان لیتی ہوں، اسی! ادھر دیکھو۔ عقیدہ اودھو کس قدر ڈب کر اکیٹنگ کر رہی ہے، وہ سکر تے ہوئے اسے مزید کہنے سے روک کر فی وی کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

کتی تیز نظر میں ہیں اس کی، اس نے بڑھ کر سوچا۔ اور بخانے کیا کہہ رہی ہے؟ وہ دل میں کڑھی خود سے بخانے کون کون سے عہد باندھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

آنے والے دن بہت مصروفیت لیے ہوئے تھے۔ کورس پائینڈ کرنے کے بعد دن کا بقیہ صحتہ لائبریری میں پلاننگ کرنے اور اسائنمنٹ تیار کرنے میں گزار جانا۔ ویک اینڈ پر نعمان لینے آیا تو اسے وقت گزارنے کا احساس ہوا۔

تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ وہ گاڑی کاتا ہوا لایا تھا اس نے بالائز پوچھ ہی لیا۔ ہے نا مہی! کریم کی ذبردست بازی چل رہی تھی۔ تجمل جانی کو اپنی جگہ بٹھا کر آیا ہوں، جنرہ سر پیٹ رہا ہوگا

ان کی پارٹنرشپ میں۔ گاڑی کے دروازے لاک کرتے ہوئے وہ عجلت میں بولا۔

اُدھر جانا بیکار ہے۔ سب لوگ بڑی اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہاں سے بیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر بولا اور پھر سوچنے کی مہلت دیے بغیر برآمد کر اس کر گیا۔ وہ سست روی سے چلتے ہوئے مجبوراً اُدھر ہی چلی آئی۔ خود سے ہانڈھا ہوا عہد پہلے مرحلے پر ہی ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر موجود صوفے پر وہ اخبار چلائے بیٹھا تھا۔ وہ بے نیازی سے سلام کرتے ہوئے ایتلا چھوڑا اور شاہدہ آشی کے پاس جا بیٹھی۔ کیرم کی بازیابی ہونے لگی۔ اور وسیع لاؤنج کے دوسرے سرے پر اک لوفٹان بدتریزی برپا تھا۔ نعمان کا خدشہ بالکل درست تھا۔ تجمل بھائی کے کھیل پر مزہ کا جھنڈا ہٹ کے بارے بڑا حال تھا۔ ثمن اور سارہ بھائی کی منشی آڈٹ آف کنٹرول ہو رہی تھی۔

”آجاؤ مہرا! تم میری جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ میں یہاں نے فریڈ لانا آفر کی۔“  
”نہیں بھائی! مجھے کہاں آنا ہے کیلنا! اس نے معذرت چاہی۔“

”تو تمہیں کون سے ماہر بیٹھے ہیں؟ تجمل بھائی کہنے لگے۔  
”اٹھیے تجمل بھائی! بس اسی سیری جگہ خالی کر دیں۔“  
نعمان اُن کے سر پہ جا پہنچا۔

”یار! کھیلنے کا مزہ تو اب آنا شروع ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو میدان چھوڑ دوں۔ اسپا بیل! تھوڑی دیر صبر کرو۔“

”آپ تو ساری بازی الٹ کر رکھ دیں گے۔ اور جرمانہ بہت بھاری ہے، آپ کی جیب ساتھ نہیں دے سکتے گی۔“

”یار اچھے بھائی ہو تم! میری بیوی کے سامنے ذلیل کر رہے ہو، وہ احتیاجاً بولے۔ تو بہت زور دار ہوتے بلند ہونے، چرا کو بھی نہیں آگئی۔“

”شاید وہ تم تو بالکل ہی ذہین کو فارغ کیے بیٹھی ہو، اور منزل کو بھی آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کچھ ہاتھ پاؤں پلاؤ گی تب ہی تو بت سنے گی۔“

بڑی اماں کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”کیا کروں بڑی اماں! پتا نہیں کیسی لڑکی چاہیے اُسے، پچھلے مہینے جیمیو نے جو لڑکی ہمیں دکھائی تھی اُس کی تصویر تک نہیں دیکھی اس نے، اکتاہٹ ہے فکر کرنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔“

”بیوقوف ہے وہ تو، وقت گزرنا جا رہا ہے۔ ہمارے انتظار میں رُکے عا تھوڑی منزل میں آؤں! انہوں نے سنا اپنی بات پوری کرتے ہی اسے پکارا۔“  
”جی بڑی اماں! کسے یاد فرمایا! وہ ان کے قریب ہی فلور گش پر بیٹھ گیا۔“

”یہ تم کیا ہر روز ایک نیا شوٹہ چھوڑ دیتے ہو، ایک بار ہی تفصیل سے بتا دو، کیسی لڑکی پسند ہے تمہیں؟“  
”کیا کہوں بڑی اماں آپ سے! پہلے آپ کی دود کی نظر لکر درجہ کرتی تھی اور اب نزدیک کی بھی ہو گئی ہے۔“ وہ غوفی سے گویا ہوا۔

”ہائیں! تم پر بھی حمزہ کا اثر ہو گیا ہے، اُلٹی سیدی ہانکنے لگے ہو، صاف بات کرو۔“

”سات سات ہو تو کچھ کہوں جی، ابھی تو یہ وہ کہتے کہتے رکنا: اب سب کے سامنے کیا وضاحت کروں مجھے کچھ مہلت چاہیے، جلد ہی مجھ کو دکھائیں گا۔“

”یقیناً سب سے اس کی مراد وہی تھی، اُسے اپنا آپ اچانک اُس ماحول میں اجنبی سا لگنے لگا۔ کوئی مہلت نہیں ملے گی اب جیمیو جو لڑکیاں دکھا رہی ہے، ان میں سے مجھے جو بھی پسند آگئی بات ملے سمجھو!“

”کمال کرتی ہیں آپ جی۔ یہ کون سا ٹان پن تو ہے نہیں جو آپ لائیں گی میں سجا لوں گا۔“ وہ ہنسنے لگی تھیں۔

”فون کی گھنٹی بجی تو وہ ریسپونڈ کرنے چل دیا۔“  
”مہرا! آپ کا فون ہے، لاؤنج کے دوسرے سرے پر اعلان ہوا، اُس نے چونک کر دیکھا۔ شور میں گھنٹی کی آواز اُسے تو سنانی نہیں آسکتی تھی۔ تیزی سے فون کے ریکنگ پہنچی۔“

”ہیلو ہیلو۔“ آواز صاف نہیں آرہی تھی۔ اس پر پی ڈی کا شور۔

”ہیلو! ذرا پی ڈی کا ویڈیو تو کم کر دیں پلیٹ کر اُسے مخالف کرنا پڑ رہی گیا۔ اداس کی درخواست پر



درا عمل بھی ہو گیا۔

”جی ہاں! حرا بول رہی ہوں۔ آپ کون؟ سماعت تک پہنچنے والے آواز آنا کی ہرگز نہیں تھی۔“

”سرفراز عمر میں کر رہا ہوں، کیسی ہو؟“ وہ ہنسنے سے اس کی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”بہت دنوں سے تمہاری کوئی خبر نہیں ملی تھی، افسوس ہو رہی تھی، وہ ہنسنا۔“ میں نے سوچا خود ہی بات کر لیتے ہیں، اس کا پارہ ہانی ہو گیا۔

”آپ کو یہ نمبر کہاں سے ملا؟“ غصے میں اوٹ پٹانگ سوال جڑوایا۔

”لو بھلا نمبر کتنا کون سا مشکل کام ہے۔ سچی بات یہ تو ہے کہ آپ کو تمہاری آئی لکھ نہیں ہوگی جتنی مجھے ہوتا ہے۔ سناؤ مجھے تو یہ تک پتا ہے کہ تم کھڑی کہاں ہو، یہ تو کس نے اٹھایا تھا۔ کون ہے یہ لڑکا؟“

”ان باتوں سے آپ کا مطلب؟ میری جاسوسی کرنے

کامیابی آپ کو کس نے دیا ہے۔ رہی بات آنا کے فکر

کرنے کی تو وہ جانتے ہیں میں کہاں اور کون تو لوگوں کے

دو درمیان ہوں، غصے کی شدت کو دہلتے ہوئے بھی اس

کا بوجھ کسی حد تک تلخ اور بلند ہو رہی گیا تھا۔ ریسورس

ہنے جہاں اس کی جرأت — پر حیرت ہو رہی تھی۔

وہاں خود پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس کی فنیول گفتگو کو سننے

کے پہلے ہی ذوق بند کیوں نہیں کر دیا۔ کھولتے ہر شے

لوٹا بڑھیں لاتے اور خود کو سمجھاتے ہوئے چند پل ہی

سرکے ہوں گے کہ دعا خیال آیا وہ کہاں کھڑی ہے، اگرچہ

بال سب اپنی اپنی باتوں میں گن مٹے ہنگر وہ تو سامنے

ہی بیٹھا تھا اپنے غصے کی تصدیق کی خاطر — اس

نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ اخبار کے اوپر سے لبوز

جھانکی آنکھوں میں کسی سوال قبل رہے تھے۔

”دنیا میں کسے کیسے طلب لوگ پائے جاتے ہیں۔“

مال، لوگ جان سکتیں کہ ان کی چھوٹی سی تفریح دوسروں

کے لیے کتنی اذیت کا باعث بنتی ہے۔ اپنی ہی نظروں

میں پوری بن گئی تھی وہ۔

نامعلوم آوازیں اس کے اندر اترنے لگی، واپس

اپنی نگاہ بے سنج گئی۔ بڑی آساں اور انیلا بھو بھو آیا کمال

کے ہنسنے، ہوں یہاں میں بوب دے کر وہ سن وغیرہ

اپنے متوجہ ہو گئی۔ پارٹنر بدل چکے تھے، حمزہ کا ساتھ

اب نعمان دسے رہا تھا۔ جیتی ہوں بازی ہارتے دیکھ کر

حمزہ نے بورڈ ڈالٹ دیا۔ گیم ادھوری رہ گئی تھی، اور

اب متن اور سارہ بھائی کے ہمراہ۔ تحمل بھائی بھی۔

”بے ایمان ہے، اور نبرمانہ آڈا کروہ کے نعرے لگا

رہے تھے، ان کا اصرار تھا آٹس کریم کھلائی چلے۔“

”کتنے خوش اور مطمئن رہتے ہیں یہ لوگ؟ اس

خوشگوار سی نعمان میں اپنے اندر بڑھتی ہوں کششگی کو اس

نے شدت سے محسوس کیا۔

”جاؤ بٹیا! سے جاؤ، جو کہہ رہی ہیں کھلا دو! بڑی

ہماں کہہ رہی تھیں۔“

”بڑی اتنا یہ نا انصافی ہے! ہلکے سے بے وقت

باہر چلنے پر بے جا پابندیاں اور ان لاڈلیوں کا اتنا

خیال؟ حمزہ نے صلے سے احتجاج بلند کیا۔

”کیوں نہ ہو چار دن کی چاندنی ہے اور پھر؟“

”پھر ٹیوب لائٹس سے آئیں گے آپ قطعاً فکر

کریں۔“ نعمان نے بڑی اتناں کی بات اچھک لی سب

ہنس پڑے، اسے بھی بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”حرا تم ہی بچھاؤ انہیں، موسم بدل رہا ہے کھلا خوب

ہو جائے گا۔ آٹس کریم کھانے سے؟ نعمان اس کی طرف

پلٹا۔

”اور کچھ نہیں تو ہم غریبوں کی جیب کا ہی کچھ خیال

کریں۔“ حمزہ نے فریاد کی۔

”یہ سب تو پہلے سوچنا چاہیے تھا، اب کچھ نہیں ہو

سکتا۔“ وہ بھی پوری طرح اٹوٹ ہو گئی۔ متن نے تالی بجا

کر داد دی۔

”یعنی کہ آپ بھی؟“ حمزہ پورے کالجور اس کی طرف

گھوم گیا۔ اچھا! چلیں کیا یاد کریں گی؟ وہ اٹھا اور نوڈا

ہما منزل کے سر پہ جا کھڑا ہوا۔

”منزل بھائی! ذرا جیب دھیلی کریں، حرا سزا دے رہی

ہیں آٹس کریم کھانے کی۔“ اس کے سنجیدہ مقصوم سے انداز

پر بڑی اتناں سمیت سب ہی کھیل کھلا کر ہنس دیے، حرا

نے سٹپا کر اُسے دیکھا۔

”چلو، میں بھی چلتا ہوں، منزل مسکراتا ہوا اُٹھ

کھڑا ہوا۔

”یہ ہونی نا بات، چلو بھی لڑکیوں! جلدی سے

کھاڑی میں لہ جاؤ،“ حمزہ کی آواز میں شرارت کا رنگ

READING  
Section

نمایاں تھا۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ انکار کی گنجائش قطعا نہیں تھی، وہ سب ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پر جھپٹے۔  
 "تم نے میرا نام کیوں لیا؟" باہر آتے ہی اس نے البتہ مزہ سے شکل کا اظہار کیا۔

"نواب کیا ہے خراجی، ان بچیوں کی دعا میں مل ہیں، کسی اور کے نام پر یہ عنایت کب ہوتی تھی؟" وہ شرارت سے کہتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا، کسی خوش فہم سی سوچ نے اس کے قلب و ذہن کو بل بھر کے لیے جکڑ لیا۔ مگر دوسرے لمحے وہ اُسے جھکتی ہوئی لٹن کی طرف بڑھ گئی جو اُسے بلا رہی تھی۔

"اور ان لوگوں کی مسرت کا مارا ہی یہ ہے کہ یہ سب خوش رہنا جانتے ہیں؟" وہی 36 کے فنک ماحول میں ان سب کے ہنستے مسکراتے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے خود کو ان کے درمیان بہت ان لرزی محسوس کیا۔

"غور و فکر کرنا اچھی بات ہے۔ اگر اُس کریم کا شویا نہ بن جاتے، وہ غالباً اُس سے کہہ رہا تھا۔ مگر اُس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے نگاہ نہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہاں کی رونقیں مجھے حقیقت سے دور لے جاتی ہیں۔ اور سب کے پیچھے جاگنا عمر بھر کے لیے عذاب خریدنے کے مترادف ہے، ہاسٹل پہنچ کر اُس نے بڑی دیر تک سوچتے ہوئے تجزیہ کیا تھا اور پھر اپنے دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کے ہاتھوں تنگ آکر بالآخر تہمت کیا کہ آئندہ دیکھ آئندہ ہاسٹل میں ہی گزارے گا، اگلے چھ روز مصروفیت کے باعث بڑھنگا کر اٹھے۔ دیکھ آئندہ قریب آیا تو اس نے سوچی بھی پلاننگ کے تحت ایک روز قبل ہی پھوپھو سے فون پر ضروری کام کا اندازہ تراخی لیا۔ ان کی سمجھ میں اس کی بات آجھی گئی تھی۔ اور وہ بھی یہ سوچ کر پڑ سکون ہو گئی تھی کہ اطمینان سے اپنا کام مکمل کرے گی اور فرصت کے لمحات کے لیے امیر کی کہنی ہی کا کافی تھی، مگر یہ سب سوچتے ہوئے وہ بھول گئی تھی کہ چھوپو کو سہانا آسان تھا اور ٹین کو قائل کرنا مشکل، سوچیں اسے دن اس کا فون آگیا۔

کون سے ایسے اہم کام لاحق ہیں تمہیں جو اس بلڈ-شرف ملاقات نہیں بخشا، وہ سخت ناراض تھی۔

"تم بھول رہی ہو، میں یہاں کورس کے لیے آئی ہوں، اتنے ڈھیر سارے نوٹس جمع ہو جائے ہیں۔ اسائنمنٹس وقت پر مکمل ہی نہیں ہو پاتے؟" زیادہ رعب مت بھاڑو اپنی پڑھان کا میرا میں ٹیٹ ہے کل۔ مگر میں نے سارا دن تمہارے انتظار میں گزار دیا ہے، اس نے غصے سے بات کاٹی، اچھا منو، شام کو آ جاؤ، مقوڑی دیر کے لیے یہی ہے۔ مشکل ہے اگلی بار بھی، اس نے منس کرنا لیا۔ خیر، میں بھی دیکھتی ہوں یہ مشکل کیسے آسان ہوتی ہے، اس نے مہم سا جواب دے کر فون بند کر دیا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس کا غور کرنے کا ارادہ تھا۔ شام کو وہ امیر کی منتظر تھی جو دو گھنٹے کا کہہ کر کسی رشتے دار کے ہاں گئی تھی، مگر کبھی تک واپس نہیں آئی تھی کہ دوبارہ اس کا فون آگیا۔ دوسری طرف قبل بھائی کا ہاتھان تھا۔

"آئی، آج میرا برتھ ڈے ہے۔ اور آپ آلو ایڈ ہیں۔ اگر نہیں آئیں گی تو میں بھی سیلبرٹ نہیں کروں گا۔"

"ارے؟ وہ نہیں؟ مجھے پتا ہے آپ یہ سب گفت لینے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ چلیں آپ کا تحفہ آدھا لے جی نہیں، مجھے گفت نہیں چاہیے، یہ وہ ضدی لہجے میں بولا، بس آپ تیار ہیں۔ حمزہ چاچو آپ کو لینے کے لیے آ رہے ہیں؟"

"عشمان منو، تو؟" اس نے کہنا چاہا مگر۔ لائن بے جان ہو چکی تھی۔ خاب اس کو روایات جاری کرنے کے لیے اس باس سب ہو جوتھے، اس کے لیے اچھی خاص مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ سوچنے کی بھی مہلت نہیں تھی، پیریل کلر کے سادہ سے ماربل شیٹون کے کڑیاؤ پر سوٹ میں بلبوس اس کی شخصیت کو کھری کھری اور منفرد می لگ رہی تھی یہ کون اُس سے پوچھتا جو اس وقت گاڑی سے ٹیک لگائے اسے فرماں خزاں اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اُسے شاید اپنی شخصیت کے اس اہم اور طاقتور پہلو کا احساس نہیں تھا۔ وگرنہ گردن میں لگی سی اکر اہٹ کا اجانا بڑا فطری ساعمل ہوتا ہے۔

جس سے وہ قطعاً متراش۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کی تعریف کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ مگر حسن و خوبی صورتی

کے معاملے میں اس کا فلسفہ ہی مختلف تھا۔ جس میں انسان کا اختیار ہی نہیں اس پر اثرنا کیسا۔ یہ بات کچھ دیر پہلے اس نے امیر کے سانس کی کلمات کے جواب میں کہی تھی۔

”مگر تم جا کہاں رہی ہو؟“ پھر اس نے پوچھا تھا۔  
”چھوڑو کے ہاں! بھل جھان کے بیٹے کا برقعہ ڈسے ہے۔“

”تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے؟ وہ ہنس پڑی، ”جادو بچوائے کرو۔ یوں ہی سارا دن اس کرے میں بیٹھ کر تم نے سنوایا ہی کیا ہے۔ سولے یہ چار پانچ صفحے کلمے کرنے کے! اس کی فائل اشکار و کھت پڑنے دو بول تھی۔“

”میں گھر سے اتنی دور اسی مقصد کے لیے آئی ہوں“  
”لاہر ہے میری اولین ترجیح بھی یہی ہونی چاہیے۔ وہ اپنے پلان کے بڑی طرح ذیل ہو جانے پر یوں بھی۔“

”یوں آراشت! اور غالباً اس شخص کی اولین ترجیح بھی اس وقت تمہارا انتظار ہے۔“

”جرات سے سینڈل کا اسٹریپ باندھتے ہوئے چونک کر میرا تھا۔ امیر نے نیازی سے کھڑکی سے باہر لپکتا۔ ڈرائیو کے طرف متوجہ تھی۔ وہ خاموشی سے غولڈر بیگ لٹکانے نیچے چل آئی تھی اس کی توقع کے عین مطابق فوڈ کے بجائے منزل اس کا منتظر تھا۔ نشست سنبھالتے ہی اس نے بے اختیار ہاسٹل کی بالان منزل کی طرف دیکھا امیر اپنی جگہ پر موجود ارکے کا اشارہ دیتے ہوئے ہنس رہی تھی۔“

”کیس عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔ زندگی کو کس کس انداز سے بچوائے کرنے کے ڈھنگ جانتی ہے۔ اسے اب

امیر سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔  
”گاڑی یہاں روکیں پلیز۔ مجھے عثمان کے لیے گفٹ لینا ہے۔“ گفٹ شاپ کے آگے سے گزرتے ہوئے اس نے جھٹ کہا۔

”چھوڑیے آپ کوں سادل سے شریک ہو رہی ہیں۔“ اس کے جواب اسی قسم کے ہوتے تھے پھر بھی

مارکو فریتر توقع سی بات محسوس ہوتی اس نے جھلا کر

کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔  
”نی الحال مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”مجھے آپ کی کسی ضروری بات کو نہیں سُننا ہے۔“  
اس نے بھی رکھائی سے جواب دے دیا۔

”چلیے یونہی ہی۔ مگر اتنا تو بتا دیں کہ آخر سر فریتر صاحب کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“

”بے اختیار اس کا چہرہ گھوما اور وہ اسے متفہم سے نظروں سے دیکھنے لگی۔ دل میں عجیب سے خدشات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ وہ پورے انہماک سے ڈرائیونگ میں مگن تھا۔“

”گزشتہ کئی روز سے سو سو مسلسل فون پر آپ سے بات چیت کے خواہاں ہیں۔ کون عام فہم زبان ان کی کجھ میں آتی ہی نہیں ہے۔“

اس نے تاتف سے بوجھل، گہرا سانس آزاد کیا اور دوبارہ رُخ موڑ لیا۔

”حیرت کی بات ہے کہ تمام تر کالز ہمارے ہی نمبر پر آتی ہیں۔ اور یہ بھی محض اتفاق ہے کہ وہ سب

میں نے ہی ریسپونڈ کی ہیں، اور اس کی فہم کو بھی کافی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ کیونکہ آپ کے ساتھ اس کی گفتگو

کارنگ دکھا ہے، مگر باقی لوگ کیا رائے قائم کریں گے۔ ایسی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خصوصاً بڑی اماں! اس نے

ایک نظر گم مسم بھی حرا پر ڈالی؛ شاید آپ نہ جانتی ہوں کہ اگر انہیں اس قسم کی بھنگ بھی پڑی تو پہلی

فرمت میں اس کو بلا کر! اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور پھر فوراً ہی بولا: اور غالباً وہ چاہتا بھی ہے۔“

”اس کے چاہنے یا نہ چاہنے پر بات ختم نہیں کی جاسکتی! اس نے کلکتی سے کہہ کر گویا اپنی برداشت کے

خاتمے کا اعلان کیا۔  
”تو پھر آپ کی زندگی میں اس کا رول کیا ہے؟“

وہ ششدر رہ گئی۔  
”کوئی رول نہیں ہے، سولے اس کے کہ وہ

اماں کا جیتیا ہے۔“  
”آر یو شیور؛ کہ کوئی اور وجہ نہیں ہے جو۔“

کیا سنا چاہتے ہیں آپ! وہ اس کے تفتیشی انداز پر جتنا گئی: میں اس قسم کی لڑکی ہوں جو ایک میسٹری کے باپ میں انٹر سٹڈ ہو جائے، آپ کے خیال میں میری چوائس آتی ہے۔“

آپ غلط سمجھیں میرا یہ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے دھیرے سے ہنس دیا، کسی کی مجبوری ہی اس کی کمزوری بن جاتی ہے، دوسرے فائدہ اٹھاتے ہوئے ناسحق، حق جتنا شروع کر دیتے ہیں کسی حوالے سے مضبوط پشت پناہی اُسے بھی حاصل ہوگی جو وہ اتنی بڑی جرئت کر رہا ہے۔

ہاں، یہ اندازہ تو کوئی بھی لگا سکتا ہے: اُس نے گویا جتنا یا کر تمہاری بات نے مجھے اتنا متاثر نہیں کیا۔ اور نجانے کب تک یہ مضبوط لوگ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اور ان کی حرکتیں مجھے کہاں اور کس کس کے سامنے شرمندہ کرتی رہیں گی۔“

وڈا سکرین کے پار ٹریفک کے ہنگامہ کو دیکھتے ہوئے اُس نے گہرے دُکھ سے سوچا۔ اُس کے ذہن میں تھا کہ وہ سرفراز کو سمٹی سے ٹٹ پکلی سپر ہیڈ و بار ایسی حرکت کی جرئت نہیں کر سکے گا اور یہی اس کی غلط فہمی تھی جو اب حقیقتاً پریشان کن صورتحال سے دوچار کر گئی تھی۔ منزل سے گاڑی ایک گھنٹہ شاپ پر روکی، اُسے سوچوں میں گم لا تعلق سے بیٹھا دیکھ کر ڈسٹرب کیے بغیر خود ہی گھنٹہ مزید لایا گاڑی دوبارہ چل پڑی وہ ہنوز اسی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔

مسائل کا بہتر حل تب ہی نکل سکتا ہے جب کسی پر اعتماد کرتے ہوئے اُسے اپنی پلاننگ میں شریک کیا جائے۔

میں اس مسئلے کو خود ہی ہینڈل کروں گی: اس نے اس موضوع پر مزید بحث ختم کرنا چاہی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بروقت امداد کے لیے آپ کے ٹیس پاس اور جس قابل اعتبار لوگ موجود ہیں: ایک لمحے کے لیے حرا کو تمام تر پریشانی کے باوجود اپنا وجود ہوا میں اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ جن کے خلوص کو آپ وقت بے وقت آزما

سکتی ہیں۔ بغیر افسوس پائے:“

اور دوسرے ہی لمحے وہ پھر زمین پر لا پٹی گئی تھی۔ اب اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے جلتی ہوئی گاڑی سے اُٹھا کر باہر چنک دے۔ اس کی مسکراہٹ جلتی پرتیل کا کام دے رہی تھی۔

سب لوگ برا رہیں ہوتے، بدلتے حالات نے اُسے یہ سبق سکھایا ضرور تھا۔ مگر پھر بھی کہیں کبھی ہمارا اندازہ ٹھکانے میں گرڈ پڑ ہو رہی جاتی تھی۔ یہ یہ کیجیے عثمان کے لیے آپ کا گھنٹہ: گاڑی رکی تو اُسے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔

میرا نہیں ہے یہ: آپ نے مزید ہے اس لیے آپ ہی دے دیجیے گا: وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بولی تھی۔ بہت بہتر بات بھی صحیح ہے: اُس نے نہایت تابعداری سے جواب دیا۔ جو اس نے اترتے اترتے سن لیا۔

دل تو چاہتا ہے کہ تم سے ناراض ہی رہوں، مگر تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ خواہ مخواہ ہی معاف کرنے کو دل چاہ رہا ہے: تم رازداری میں ہی مل گئی۔ اندر اک ہنگامہ برپا تھا۔ سارے اپنے ہی ٹیلی ممبر تھے۔ باہر کے لوگ بہت کم تھے، مگر پھر بھی کان پڑی آواز سنال نہ دینے والا معاملہ تھا۔ اس کے دل و دماغ پارل میں کم اور تازہ ترین پریشانی میں زیادہ اُلجھے ہوئے تھے۔ دیکھا ہر ایک اینڈ پر ایک نئی خبر میری منتظر ہوا کرے گی۔

کک کھٹے ہی مشن اپنی دوستوں اور سارے بھائی کی بیٹوں کے ساتھ کپ شپ میں مصروف ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ان کے درمیان بیٹھی رہی۔ پھر شاید اس کی بے چین طبیعت نے تنگ کیا جو وہ ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹیل پر رکھ کر دوبارہ وہاں جانے کے بجائے عمرانہ جی کے برابر آ بیٹھی، وہ بہت دیر سے ان کی نظروں کے حصار میں تھی قریب آئی تو انہیں بھی بات چیت کا موقع مل گیا۔

اکیل آئی ہو:“ احوال پوچھنے کے بعد انہوں نے کہا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جانے کیسے عظیم بھائی تمہیں یہاں وہاں تنہا بھیج دیتے ہیں، میری عامرہ تو ہمسائے میں جاتے ہوئے

بھی گھبراتی ہے۔ ان کا انداز گفتگو شروع سے ہی ایسا تھا، پھر بھی اس سے حیرت تھی، وہ بڑی اماں کے ہاں اتنا عرصہ کیسے گزار پائی تھیں، شاید کسی مصدقہ کے تحت یا پھر کسی غرض کے پورا ہونے کے امکان کے ہاتھوں، وہی غرض جو عثمان نے بتائی تھی، وہ ان کے لفظوں پر غور کرنے کے بجائے اعداد باتوں پر سوچتی رہی۔

”سنا ہے عظیم بھائی تمہارا شہ سرفراز کو دینا چاہ رہے ہیں، وہ ایک دم سناٹے میں آگئی، اس بات کی شہرت کہاں تک جملہ نہیں ہے، اس رخ پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتی، وہ عقب سے چائے کی دو پیالیاں تھامے برآمد ہوا۔

”بیجیہ چچی، چائے اور چرا آب کی چائے ٹیبل پر رکھی ہے، اس نے ایک کپ عمرانہ چچی کو تھمتے ہوئے کہا، اس نے بھی فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی، دوسرا کپ وہ غالباً اپنے لیے لایا تھا، اور اب اس کی مثال کر وہ جگہ پر بیٹھ گیا تھا۔

”میری زندگی میں سرفراز کا رول اور نام نہاد تعلق اس اس کی سمجھ میں آگیا ہوگا، اسے یقین تھا وہ عمرانہ چچی کی بات سن کر ہی ان کی طرف آیا تھا، اس نے اپنی لوجہ حمزہ کی طرف کی، جو سارہ بھائی کی مدد کرواتے ہوئے چائے پیئیں کر رہا تھا، ایک کپ اسے بھی پیش کرنے لگا۔

”شاباش، سارہ بھائی کو تمہاری موجودگی میں زندگی کسی محسوس ہو ہی نہیں سکتی، تمہان نے اس کا شانہ تھمتیایا۔

”ابا، کچھ خیال کرو، کیوں دو شیزازوں کے درمیان میری پوزیشن خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو؟“ کوئی پوزیشن خراب نہیں ہوگی، تمہاری جاؤ ذرا اسانگارا لاؤ، اچھا سا کانا شنتے ہیں تم سے، عثمان نے کہا۔

”سوچ لو، پہلے ہی تمہاری گرین سوٹ والی دوست نے بہت عرصے دیکھ رہی ہے، کہیں ایسا نہ پھیرا گانا سن کر، وہ شرمائے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے دکا، بے ہوش ہو جائے، عثمان نے جل کر بکرا لگایا۔

”چاو حمزہ، آج تمہارا مظاہرہ دیکھ ہی لیتے ہیں، حزانے اسباب اور وہ گنار اٹھا لایا۔ کمال ہے بڑی اماں نے اسے کانے کی اجازت دے دی، عمرانہ چچی نے حیرت سے شاہدہ آئی سے پوچھا۔

”جو شوق حد میں رہ کر پورے کیے جائیں، خامے بے ضرر ہوتے ہیں عمرانہ، شکر ہے خدا کا میرے بچے چچی اماں کی بات کچھ لیتے ہیں، انہوں نے رسائی سے کہا اور عمرانہ چچی خاموش ہو گئیں، ان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھر آیا تھا، حرا کو وہ اس لمحے قابلِ رحم محسوس ہوئیں، ایسی کیفیتیں اور روئقیں تو قسمت والوں کو ہی ملا کرتی ہیں، وہ آج ان سب سے کس قدر فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔

”شام سے پہلے آنا

دھوپ ساری دھل رہی ہو

پھول سارے کھل رہے ہوں

موسم ساد سے لے آنا

حمزہ بڑے جذب سے گار رہا تھا۔

”تم تو چھپے رستم نکلے، بیت اچھا لیتے ہو، اس نے پاس سے گزرتے ہوئے روک کر کہہ دیا۔

”آپ کی فدیہ نوازی ہے حراجی، ورنہ منہ کس قابل؟“ وہ نہایت عاجزی سے گویا ہوا، حالانکہ جب میں میڈیکل کالج میں تھا تو باقاعدہ ایک میوزیکل گروپ جو اٹن کر لیا تھا، مگر پھر بڑی اماں کا نقل سائز سلیپر کھا کر پوری طرح دل بھر گیا، اس نے منہ بنایا اور وہ ہنس پڑی۔

”عمرانہ چچی اور ذیشان انکل کھانا کھاتے ہی روانہ ہو گئے، دیگر لوگ بھی باری باری چلے گئے، تو حمزہ اور عثمان گفتگو کرنے لگے، ڈھیروں کھلنے اور اپنی دلچسپی کی چیزیں پا کر عثمان انہیں الٹ پلٹ کرنے میں ملگن ہو گیا۔

”ارے! یہ گفت کس کی طرف سے ہے، رائیٹنگ تو منزل بھائی کی ہے مگر اس کے ہاتھ میں اب وہی پکیٹ تھا جو منزل اس کی طرف سے خرید لایا تھا، اور اب وہ پڑھتے پڑھتے رُک کر مسکرتے ہوئے حرا کو دیکھ رہا تھا۔

حاجی! غالباً پین کے ساتھ ساتھ آپ نے رائیٹنگ بھی اُدھار مانگ لی! وہ شوخی سے بولا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ اس کے منع کرنے کے باوجود منزل نے گفٹ اس کی طرف سے ہی پیش کر دیا ہے۔

تہیں اعتراض کس بات پر ہے، قلم اُدھار لینے پر یا پختہ منزل نے سنجیدگی سے جواب پیش کیا۔ اہم! کسی پر نہیں ہم جہلاً اعتراض کر سکتے ہیں؟ اس نے سوئبہ بننے کا ناکام مظاہرہ کیا۔

اور یہ گفٹ تو عثمان کے لیے بھی سب سے زیادہ اہم ہو گا پیکٹ سے برآمد ہونے والی ویڈیو گیم دیکھ کر وہ بولا۔

یار عثمان! کتنے فائدے میں رہتے ہو مگر چند گھنٹوں میں کتنا مال جمع کر لیا!

وہ اس ساری گفتگو سے بے نیاز متن کے ساتھ بکھری چیزیں ہمیشہ ہی تھی وقت گزرنے کا احساس بھی یکدم آ جا کر ہونے لگا تھا اسے واپس میں جلدی پہنچنا تھا۔ چھو بھوکو خدا حافظ کہنے کے لیے وہ ان کے پورشن میں چلی آئی۔

جا رہی ہے بیٹھو! زیادہ وقت نہیں لوں گی! وہ اسے غلٹ میں دیکھ کر ہاتھ میں پکڑی چیزیں ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔

آج صبح عظیم کا فون آیا تھا بہت پریشان تھا۔ ان کے تاثرات بڑھتے ہوئے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اب چھو بھوکو اسے ہی تامل کرنے کی بات کریں گی سب راستے بند نظر آنے لگے تھے۔

معاملہ میں تاثر ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ جائیداد کے جھگڑے تو یونہی جکڑ لیتے ہیں۔ اتنوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ نہ ہی تم نے کوئی ذکر کیا نہ عظیم نے! وہ فکروہ کتاں نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں۔

مجھے اصل معاملے کا علم ہی نہیں تھا میں آپ کو کیا بتاؤں!

احسان بھائی کے ڈھیروں وکیل دوست ہیں۔ بروقت پتا چلتا تو معاملہ نسبتاً بہتر طریقے سے حل ہو جاتا۔ انہوں نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں، اپنی ہی کہتی رہیں۔

چلو اگر مسئلہ آن ہی پڑتا تھا تو اس قدر لاپٹی لوگوں

کا احسان لینے کی ضرورت ہی کیا تھی جو فوراً ہی بدے میں اتنا منہنگا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سو اُن کے جتنے کی ڈانٹ اور شکوے وہ چُپ چاپ وصول کرتی رہی۔

میں نے عظیم سے صاف کہہ دیا ہے، جس بات پر خود میرا دل راضی نہیں ہے۔ اس پر تمہیں کیسے آمادہ کر سکتی ہوں، بہر حال تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا! وہ اس کے کندھے تھامتے ہوئے بولیں۔ اور مرزا کو محسوس ہوا جیسا سارا بوجھ اس کے شانے سے ان تک منتقل ہو گیا ہو۔ سکون بھرا گہرا

مانس آزاد کر کے اُس کا دل خوشی کے احساس سے بوجھل ہونے لگا کہ اگر وہ انہیں اپنا بڑا حمایتی تصور کرتی ہے تو یہ کون کونسی غلط بات نہیں تھی، وقت نے مختلف مرحلوں پر اس کا ثبوت پیش کیا تھا۔

تھینک یو چھو بیٹھو! وہ مسنونیت سے انہیں دیکھتی الوداع کہہ کر نیچے چلی آئی۔

چلو نعمان! مجھے اسٹل چھوڑ آؤ! یہ نیچے غفلت کی طرح جھی ہوئی تھی۔

تمہیں اتنی جلدی کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں بیٹھو چھوڑیں گے! متن توڑا بولی۔

نو بیچے کا کہہ کر آئی تھی وارڈن سے، دعوہ خلتانی بڑی بات ہے، چلو اٹھو بھی! وضاحت کرتے ہوئے اُس نے باری باری ان دونوں کو گھورا جوئی وی ڈرائے میں منہک تھے۔

ہم دونوں پر شام سات بجے کے بعد ڈرائیونگ پر پابندی عائد ہے جن کے ساتھ آئی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ جانا پڑے گا! حنزہ کا انداز معنی خیزی لیے ہوتا تھا۔

کیا مطلب؟

تھینک کہہ رہے ہیں۔ بیچارے بڑی اماں نے ان کی رش ڈرائیونگ کے پیش نظر یہ پابندی لگانے سے۔ تمہیں منزل بھائی ہی چھوڑیں گے۔ بلکہ چلو میں بھی ساتھ چلتی ہوں! متن جلدی جلدی جوتے سینے لگی اور وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر اُس کے ساتھ باہر آ گئی۔

دو روز کے لیے آپ کے شہر جا رہا ہوں، عظیم انکل کو کوئی مسیج دینا چاہیں تو دے دیں، براستادہ

سے زیادہ کٹ گیا تو وہ ان دونوں کی گفتگو میں غل  
ہوا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی، جی میں آیا کرتا کہ زمین  
کے جھگڑے سے اُسے آگاہ کرے شاید یہ ان کی کوئی  
مدد کر سکے مگر پھر خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی۔

”پھر چند کہ یہ پہلے دن کے تاثر کی نسبت بہت  
مختلف نظر آنے لگا ہے، پھر بھی یہ ضروری تو نہیں  
کہ میرے ہر مسئلے کا حل بھی اسی کے پاس ہو۔“

”کوئی مشکل بات ہے تو لکھ کر دے دیں۔“  
ہاشل کے باہر گاڑی روکتے ہوئے وہ اُسے شش و پنج  
میں مبتلا دیکھ کر مسکرایا۔

”غلط آئیڈیا ہے، تمہیں ہنسی۔“  
”ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جو فوری طور  
پر ان تک پہنچانا ضروری ہو۔“ اُس نے ہاتھ ہلایا اور  
بیگ سنبھال کر گلیٹ عبور کر گئی۔

رات بہت دیر تک وہ دن بھر کے حالات کا تجزیہ  
کرتی رہی۔ اور پھر اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ سرفراز کی  
حکمتیں برداشت ناقابل ہی سہی، مگر وہ فی الحال اتنا کو  
مزید ڈسٹرب نہیں کرے گی، اُس کی سوچ میں یہ تبدیلی  
پھو پھوسے آج ہونے والی گفتگو کے بعد رونما ہوئی تھی۔

”واقعی میرے اس پاس بہت سے لوگ موجود ہیں۔  
جن کے خلوص کو آزمایا جاسکتا ہے، بغیر ان سوبہائے  
اپنی سوچ پر وہ خود ہی بے اختیار ہنس پڑی۔“

”اردو بازار تک جا رہی ہوں، چلو گی؟“  
امبر نے آفر کی تو وہ بھی تیار ہو گئی، اگر شیشیری کی  
چند چیزیں چاہیے تھیں۔

”تمہیں یہاں کے سب راستوں سے واقفیت ہے؟“  
اُس نے راستے میں امبر سے پوچھا۔

”ہائیں مگر بے فکر ہو تم، ہم گم نہیں ہو سکتے توہ ہنسی۔“  
”تمہیں اپنی بہت سی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وقت  
آنے پر نمایاں ہوتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں وہی  
لڑکی ہوں جو کبھی تنہا گھر سے نہیں نکلی تھی۔ اور جس نے  
یہ شہر پہلی بار دیکھا ہے؟“ پھر وہ سہیدگی سے بولی۔

”ان پارسلوں نے مجھے ہی سکھایا ہے کہ کامیاب  
ہونے کے لیے اعتماد شرط ہے۔ اپنی ذات پر  
اعتماد۔ پھر آپ دنیا بھی فتح کر سکتے ہیں؟“  
اُجاسی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی پڑھنم بات جبراکے  
دل کو چھو گئی۔

”ہر شخص اپنی ذات میں کوئی نہ کوئی خلا لیے پھرتا ہے۔  
محرومی کی نوعیت بدل جاتی ہے۔“ اُس نے دین کی کھڑکی  
سے باہر تیزی سے پچھے رہ جانے والے مناظر پر نگاہ  
ڈالتے ہوئے یاسیت سے سوچا۔ اور اچانک اُسے  
شبہ سا ہوا کہ ابھی گزرنے والے اشاپ پر جس شخص  
کی جھلک نظر آتی ہے وہ سرفراز سے کافی مدد تک ملتا  
جتنا نظر آ رہا تھا۔ مگر پھر اُس نے سوچا کہ یہ اس کا وہم بھی  
ہو سکتا ہے کہ آج کل دماغ پر اس کا بصورت سوار ہے  
کورس کا اختتام تھا۔ سمعی و بصری معلومات کے  
تمام تر لوازمات کے ساتھ لیکچر تیار کیے جاتے، جو  
اپنی باری آنے پر ماہرین تعلیم کے سامنے ڈس پلے کیے  
جاتے، اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی، پڑھاتے

ہر سے کن کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، آواز  
کس حد تک بلند ہو، اور کیسا لہجہ اختیار کیا جائے۔  
”اسٹوڈنٹس کی ذہنی سطح کا خیال رکھنا پھر ٹیچر کی  
اولین ذمہ داری ہے، اس انداز میں پڑھائیں کہ ان کی  
دیکھی برقرار رہے، آپ خود کو ایک ماڈل کی حیثیت  
سے ان کے سامنے لائیں۔“ سر امین نے حسب معمول  
ہدایات جاری کرنا شروع کیں۔

”چچ، چچ، امر جائے گی بے چاری، سچر ملول بنتے بنتے  
آج کل کے اسٹوڈنٹس کسی سے متاثر ہونے والے نہیں  
ہیں۔“ امبر نے توقع کے عین مطابق اس کے کان میں  
ہولے سے تبصرہ پیش کیا۔  
”چیے کہ تم۔ اور اب خاموشی سے سنو، وہ آتے  
ہو بہی ڈپٹ دی تھی۔“  
اُس روز حرا کو اپنا بیکر ڈپلے کرنا تھا پہلے سے  
تیار شدہ چارٹس اور ماڈلز کی مدد سے اُس نے متعلقہ  
ٹاپک نہایت خوش اسلوبی سے سمجھانا شروع کیا۔ اس کا  
متاثر کن انداز اور پُر اعتماد لب و لہجہ سامعین کی سوجھ بوجھ  
کے علاوہ کچھل نشستوں پر موجود متعلمین نے بھی لے لے  
سرایا۔

شمن سربر دست ہے، اس نے مجھے بہنوں سے بھی  
بڑھ کر چاہا ہے اور اصل انیلا بھوپھو کی فیملی سے مجھے  
شروع سے ہی بہت لگاؤ رہا ہے۔ شاید اسی لیے انہیں  
مجھے میرا بہت خیال۔ دستا ہے۔

”اور اس شخص کو بھی جو تمہیں اکثر لینے آتا ہے“  
کتی عجیب بات کہہ دی تھی امبر نے۔ وہ بڑی طرح  
چونک کر اُسے دیکھنے لگی، جو اس کی کیفیت سے محفوظ  
ہو رہی تھی۔

جراتے پھر وہی بے تاثر سا خول چہرے پر چڑھا لیا۔  
لا تعلق کا مظاہرہ کرنے میں تو وہ یوں بھی ماہر ہو چکی  
تھی۔

”شاید تم نے غور نہ کیا ہو، مگر یہ سچائی اُس کے چہرے  
سے بھلکتی ہے، کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟“

”تمہارا صبر!“ وہ جھلا کر بولی۔ ”مقول باتیں کرنے میں  
تمہارا مقابلہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔“

”سچ سچ! سرامین اگر اس وقت تمہاری گنگوٹوں سے

کا ٹکڑا بھولیشنز بس جراتا! آپ کی کھائی بہت اچھی  
ہے، اور بیک بورڈ کا استعمال کرتے ہوئے الفاظ  
بہت خوبصورتی سے ترتیب دیے ہیں، اپنی پروگریس  
کو آپ مزید بہتر بنا سکتی ہیں۔“ سرامین نے فرائڈنی  
سے اس کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ مگر وہ  
جانتی تھی یہ بھی ان کا ایک انداز ہے، دوسروں تک  
اپنی بات پہنچانے کا، ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا۔

”یاد رکھیے اسٹوڈنٹس! اس پروفیشن میں آتے  
ہی آپ کے کانڈھوں پر بیماری ڈمہ واری آجاتی ہے،  
آپ کی توجہ اور لگن اس کام کو آسان بنا سکتا ہے۔“ انہوں  
نے ہر روز کی طرح کلاس کے اختتام پر نصیحت کی۔

”یہ تم نے سرامین کو رشوت دے رکھی تھی، عزت  
سے کچھ زیادہ ہی تعریف کر گئے آج تو؟“ امبر نے ہل  
کی طرف جاتے ہوئے اُس کے پُرمسرت چہرے پر نگاہ  
ڈالتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”کیوں نہ کرتے! حقدار تھی آخر! محنت کا صلہ مل  
جاتا ہے۔“

”اور میرا حصہ۔“

چلو کیشن کی طرف! وہ اُس کی بات سمجھ کر ہنس  
پڑی۔

”تم بھی کیا یاد کرو گی، اچھی سی چائے پلاتی ہوں۔“

”یاد تو مجھے بہت کچھ آئے گا۔ یہاں گزرا ہوا وقت  
مصروفیت، خوشگوار ماحول اور سب سے بڑھ کر تم۔“

”اسج لان میں لگے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے  
امبر نے اُداسی سے کہا۔ اس پاس بہت رونق تھی۔

”مگر کتنی عجیب بات ہے، ہمیں تمہارے بارے میں  
اس سے زیادہ نہیں جان سکی کہ تمہارا تعلق شمالی علاقہ جاتا  
تھا ہے، اور یہ اندازہ بھی میں نے تمہارے رنگ و روپ  
کو دیکھ کر لگا یا تھا۔ جو بعد میں ٹھیک نکلا۔“

”اچھا! وہ ہنسی۔ سیرے پاس بلکنے کے لیے کچھ  
بچہ ہی نہیں، سوائے اس کے کہ میری دو بہنیں اور ایک  
ہالی ہے، جو اب میں خوب انجوائے کرتے ہیں۔“ وہ

ساتے ساتے رکی کہ کینٹین والوں کا ان کے لیے کوئی  
لوہر گرے آیا تھا۔ امبر نے فرمائش میں چوائس بھی شامل  
کر لی تھی۔ چائے رد ہو گئی۔

”میں بقول تمہارے خاصوش طبع جو ٹھہری، پھر  
مل میری بہت سی فریڈز ہیں۔ جن میں میری گزرتی

## بین الاقوامی معیار کا منفرد شو بزنس بلیک

# موسی اسٹارز

پھر امتیاز، رکھنا افسیر ایک بار پھر زندہ ہو گیا،  
سنی دیول نے روینہ کو اکٹھے سے چھین لیا،  
پروڈیس کی ماہما اور ڈائریکٹر ٹھنسی کا ہاٹ افسیر  
مہمبھی میں تنہا لڑکیوں پر کیا گزرتی ہے،  
سری دیوی، بونی جھگڑے کی تازہ ترین صورتوں  
نصرت فتح علی خان کی مو اور انڈسٹری  
کی منافقت،

اور ساٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات

## تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

راہلے کا پتا: 37، اردو بازار کراچی



ہوتے تو سارے سائنسی کلمات واپس لے لیتے۔ اس سے اپنی ہنسی دینا مشکل ہو رہا تھا۔  
 کوئی فرق نہیں پڑتا، میں جو ہوں، سو ہوں۔ وہ لا پرواہی سے بولی۔

ہاں! یہ کہہ دینا آسان ہے، مگر برداشت کرنا اتنا ہی مشکل اور دوسروں کی رائے ہماری زندگی پر بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس نے بوتل سے آخری سبب لیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

کچھ لوگوں سے اپنے بارے میں صرف اچھا مننے کی آرزو رہتی ہے، ان کی موجودگی لاشعوری طرز پر سکون کا باعث ہوتی ہے، میں نے محسوس کیا ہے، تمہارے اندر کوئی خوف یا ڈر جانتے بیٹھا ہے، جو اس شخص کی موجودگی میں بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔

ابہر پڑی بے رحمی سے اس کے بارے میں اپنے کئی روز کا مشاہدہ پیش کرنے میں مصروف عمل تھی۔  
 "تعارف شناسی - ہوتی ہے کچھ لوگوں کو اس میں بہت اپنے اندر پھیلی اتھوٹا کھیرت کو کم کرتے ہوئے اس نے سوچا۔"

اس حقیقت کا ادراک تو اسے بہت پہلے ہو چکا تھا، مگر وہ خوش فہم دل کی ہر بات جھٹلانے پر عمل پیرا تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ "سراسر انسان کے اندر بندیرے اور کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ وقت، ماحول اور آگاہی کے مرحلے طے ہوتے ہی ان بند کھڑکیوں پر دستک ہونے لگتی ہے۔"

وہ بھی بڑی شدید و مہم سے اپنے اندر کھلنے والے بند دیرے کو بند کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ یہ انکشاف اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کہ وہ اپنی کوشش میں بڑی طرح ناکام رہی ہے اور یہ بات تو اس کے چہرے پر صاف دکھی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔

جب کبھی موقع آئے تو دل کی بات ضرور سننا، ساری عمر خود کو آزمائش میں ڈالنے سے بہتر ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔  
 "مجھے وقت اتنی مہلت شاید ہی دے۔ اس نے تھک کر سوچا۔"

میں بہت حقیقت پسند لڑکی ہوں امیر۔ اخوالوں کی دنیا میں رہنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس نے گویا

آہستگی سے اعتراف شکست کر لیا۔  
 "لیکن کبھی کبھی منہ کا ڈالنا بد لگنے کے لیے جواب دہی میں کوئی حرج نہیں، بعض اوقات جوں کی توں بتیہ مل جاتی ہے، ہو سکتا ہے، مذاقم پر بھی مہربان ہو جائے جہاں سچائیاں اسے تمام تر بیانیہ کم روپ کے ساتھ ہریل آنکھوں میں گھسی رہتی ہوں۔ ان آنکھوں میں کوئی حین، خوش آمد خواب کیسے اتر سکتا ہے اسے حیرت ہوتی تھی، اتنے لمخ تجربے کے باوجود امیر اتنی پُر امید باتیں کیسے کر لیتی تھی، وہ الفاظ تھے یا انکار کے جو آج بھی اس کی سماعت کو سداگتے رہتے تھے، جو اسان نے اپنی بوجابی کو اس کا عندیہ بتاتے ہوئے کیسے تھے۔"

"چار فیصد زیادہ پڑھ لکھ جانے سے حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں، عظیم کم صاحبزادی کو کون کھلے کر اس کے نامزد اٹھانے کے لیے یہاں کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔" سلمیٰ سوز کے حامل لوگ، ایک مفلس دل کی خوشی کا انداز جان ہی نہیں سکتے۔ میرے لیے اس سے پرمسترت بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں خود کو نامناسب ماحول میں ضائع ہونے سے بچاؤں۔ جو سوچا یہ تو طے ہے کہ سرفراز۔ کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے، شاید امیر ٹھیک کہتی ہے، ساری عمر خود کو آزمائش میں ڈالنے سے کہیں بہتر ہے کہ بروقت صحیح فیصلے تک پہنچا جائے۔ کئی راتوں سے سوز کا وارنر سلسلہ بالآخر اسی نتیجے پر آکر ڈک گیا تھا۔

حقیقت کو امیر! اس نے دوسرے بڈ پر بے خبر سوئی امیر کو مشکور نظروں سے دیکھا اور صراحتاً نیل لمپ کی مدغم روشنی میں آنکھوں سے بہت ہلکا ہلکا نیند کو واپس لانے کے لیے کتاب تمام لی۔

وہ اپنی کئی روز سے بکھری چیزیں سمیٹ کر بیگ اور سوٹ کیس میں جمع کر رہی تھی، جب ڈزیزیز روم سے اس کا بلاوا آ گیا۔ وہ کام اچھورا چھوڑ کر مہلت میں چلی آئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ گمان تک نہیں تھا کہ اس کا منتظر شخص وہ ہی تھا، جس کا نام سننا ہی اس کی برداشت کا امتحان تھا سرفراز کی شکل دیکھتے ہی اعصاب تن گئے، وہ علمائیت کا



” اور آپ انہیں مزید غلط مشورے دے آئے۔“

” مثلاً۔۔۔“ وہ چونکا۔

” مثلاً۔۔۔ یہ کہ مخالف پارٹی سے مل کر مقدمے کو اور بڑھایا جائے، ان لوگوں سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ بہت خطرناک لوگ ہیں وہ۔“ اس نے خالی دیوار کو گھومتے ہوئے کہا۔

” بہت انفارمیشن ہیں آپ کو۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ ” پھر تو بتائے والے نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ میں نے یہ مشورہ انہیں کیوں دیا ہے۔“

” میں اتنا کہ معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی۔ مگر پھر بھی چاہوں گی کہ انہیں مزید پریشانی نہ ہو۔“

” جن مسائل سے آپ کا تعلق ہی نہیں ہے، ان کے لیے آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟“

” تعلق بنتا ہے! اتنا جتنا اس ذیل شخص کے احسانات کے بوجھ سے دیتے چلے جائیں گے، وہ اتنا ہی سریر فریقا جلتے گا۔“ اسے غصہ بہت کم آتا تھا مگر اب بات بے بات آنے لگا تھا۔ بے ساختہ اسے گھومنے لگی۔

” تو چڑھ جائے۔ ہم بھی اتارنا جانتے ہیں۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے بولا۔

” یہ ضروری ہے کہ آپ خواجواہ کے اندیشوں میں ڈوبی ہوئی رہیں۔ باقی وی دے! یہ اطلاعات آپ کو کس نے دی ہیں؟“

” آپ کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ رکھائی سے اٹھ بیٹھا جواب دے کر باہر آگئی۔

” تعلق تو بتاتا ہے، مگر آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ وہ با آواز بلند بولا تھا۔

” خیر دیکھ لیں گے اس رقیب رویہ کو۔“ چائے لاکپ ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے وہ دل ہی دل میں ہنسا تھا۔ وہ سیدھی ٹمن کے پاس چلی آئی۔ بے چاری نائل ایس اور ہاسپٹل ڈیوٹی کے چکروں میں الجھی رہتی تھی۔ اور اکثر ہی معذرت کرتی کہ وہ اسے اتنی توجہ اور کہنی نہیں دے

پارٹی جس کی وہ حق دار ہے، اس وقت بھی وہ اپنے شوق شطرت کی تیاری کی غرض سے کچھ دیر قبل ہی انارڈی کی کتاب لے کر بیٹھی تھی کہ نمان اور حمزہ تھکے بازے ان کے پاس آ بیٹھے۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کوئی بورا

پر وگرام چل رہا تھا۔

” یہ تم لوگ آج سارا دن کہہ رہے آؤ اور گروہی کرتے رہے ہو۔“ اس نے باری باری ان دونوں کو گھورا۔

” چھوڑو مت پوچھو! تم جل کر کیاب ہو جاؤ گی، نغانا نے پھیڑا۔“ تشنگ کرنے لگے تھے نمنی ڈیم پر۔ حمزہ نے لائٹس بڑھایا تھا۔ سوچا بیویہ کام بھی کر دیکھتے ہیں۔

” بڑا تیر مارا ہے جراتنا! تیرا ہے ہو اور ذرا خیال نہیں آیا ہے بھی لے چلتے؟“ وہ چپکے بولی۔

” بڑی بات ہے، پڑھنے والے سچے ان باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔“ حمزہ نے اٹکل سے نہیں کا اشارہ کرتے ہوئے اسے تاؤ دلانا چاہا۔

” تو اور کس طرف دھیان دوں؟“ جیسے نائل ایگزائم قریب آ رہے ہیں، پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔

” اس لیے تو کہتا ہوں، اس بار تمہارا پاس ہونا مشکل ہے۔“

” منہ اچھا نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیا کرو تمہیں الہام ہوا ہے؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

” یہی سمجھ لو۔ توجہ چاہیے ہوتی ہے ہر کام کے لیے۔“ مثال کے طور پر اوھر دیکھو۔ کس قدر توجہ سے قوالی سننی جا رہی ہے۔ نغانا نے اٹکل کر حیران کی طرف اشارہ کیا جو اسکرین پر نظر نہیں آتے بلکہ اس کی گھنگوڑے سے لگا

تھی۔ مگر سن سب رہی تھی۔

” کیوں! کیا کہنا ہے تم کو مجھ سے کہیں باہرے چاہیے ہو؟“ نغانا کو کمرے سے جاتے دیکھ کر اس نے کہا۔

” لو اور سنو! ایک نہ شدہ دوشدہ۔“ حمزہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

” ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے وہ!۔“ ٹمن نے پراشتاقی لہجے میں کہا۔ جب سے آئی ہے بے چاری، ہم کہیں آؤ تشنگ پد نکل ہی نہیں سکے۔ چلو کہیں بھی چلتے ہیں۔ واپسی پر

اس کو کمرے میں کھلا دوں گی۔

” معاف رکھو تم مجھے اپنی عنایت خاص سے ماگھلے روز ہی ڈوبی ہر جازہ وصول کر لیتی ہو۔ یوں بھی ہم لوگ تھکے ہوئے آئے ہیں، اور کل تک کہیں جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے۔“

” پھر یہاں کیوں آ بیٹھے ہو اس وقت تو تمہیں بید تو چاہیے تھا۔“ وہ جل کر بولی۔

READING Section

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اطلاعا عرض ہے کہ کچھ ہی دیر میں بڑی اماں یہاں آنے والی ہیں، کھانا سب اکٹھے تاول فرمائیں گے۔ آج کی خاص الخاص ڈش 'فرائڈ فیش' کے اعزاز میں۔ اور جاؤ کچن میں، انیلا چھی شان میں قصدے پڑھ رہی ہوں گی۔ طاقتور بننے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خواتین چولہا چوکا کرنا ہی بھول جائیں۔

چولہا چوکا کرتے ہیں میرے دشمن! وہ کتاب سنبھالتے بھٹا کر کمرے سے نکل گئی۔ جہزہ کے قبضے نے اس کا پیچھا کیا۔

کیوں تنگ کرتے ہو اے اتنا۔ آج کل وہ یوں بھی پڑھائی کی وجہ سے بہت ڈیر لیس ہے۔ جرنلے من سے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اسی ڈیریشن سے تو میں نے اسے بچانا چاہا تھا۔ مگر اس وقت میری قوم کی خدمت کا بھوت سوار تھا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ایک خالی فولی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈگری کی ویڈیو کی کیا ہے۔ اتنا پڑھ کر بھی جب آپ عمل زندگی میں قدم رکھتے ہیں، تو مولے فرسٹریشن کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

پھر تو تمہیں اس کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ وہ باآسانی اسپیشلائز کر سکے۔ اس نے رسائییت سے کہا۔

جراحی! آپ کے خیال میں وہ پڑھ پڑھ کر خرچ ہو جائے، پھر میرا دھیان کون رکھے گا! اس نے پینترا بدلا اور اسی شوخی سے گویا ہوا، جو اس کے مزاج کا حقہ تھی۔

اوہ! آئی سی۔ جرنلے حیرانگی سے ہونٹ سکیڑے۔ گویا خطر خوب گزرے گی جو مل بھیضیں گے دیوانے دو۔ من کو خبر ہے اس سادے قصے کی۔

نہیں! اتنی کچھ دار ہے نہیں جتنی نظر آنے کی کوشش کرتی ہے! اس نے سر کھچایا۔

اور اگر اس کی کچھ داری میں غور اسیا امانہ میں کر دوں تو؟ وہ شرارت سے اسے چھیڑنے لگی۔

بے کار ہے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ویسے جراحی! دھیان رکھنے کے معاملے میں آپ بھی اتنی کچھ دار نہیں نکلیں۔ وہ سناٹے میں آگئی۔

کیسا دھیان اور کس کا دھیان؟ یہ ہر وقت بچے کیا

بگھانا چاہتا ہے، یہی کہ میں بے جس ہوں، بہت مضبوط اعصاب کی مالک جس پر کوئی جذبہ کوئی رنگ اثر ہی نہیں کرتا؟ وحشت ایک دم اس کے ادریہ سوار ہو گئی۔ بلاشبہ وہ بہت بہادر بھی نہیں تھی۔ مگر اس قسم کا مظاہرہ تو کر سکتی تھی، مگر اس مرحلے پر بھی ناکام رہی تھی۔

من کی ٹیکار یہ وہ بادل بخو استہ اٹھی اور کھانے کی میز تک جا پہنچی۔ اس گھر میں روز ہی دعوت کا سماں دکھائی دیتا تھا۔ چار بندے بچر کر بیٹھ جاتے تو محفل جم جاتی۔ آج تو سب جمع تھے آوازیں ہی آوازیں تھیں، شور تو اس کے گھر میں بھی اکثر برپا رہتا تھا۔ مگر اس کا انداز بدل ہوا کرتا تھا۔

کھانے کے بعد سب ادھر ادھر ہو گئے تو وہ کچن میں بکھری چیزیں سمیٹنے میں پھو پھو کی مدد کرنے لگی۔

جاؤ تم، حقوڑی دیر کے لیے بڑی اماں کے پاس پھو پھو بھرا جانا! انہوں نے زبردستی اسے بھیجا۔ اور وہ۔

سعادت مندی سے چلی آئی۔ بڑی اماں تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں۔ وہ قرعہ صوفے پر بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے تھی۔

مہمان! منتر مل بھائی کے ساتھ کوئی آرہے! بالکل میں شلے نعمان نے سرا اندر نکالنے جوئے نعرہ دگایا۔

وقت بے وقت مہمان آنا اس گھر کا معمول تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ مہمان اوپر آ رہا تھا۔ یقیناً اس کا کچھ تعلق براہ راست انیلا پھو پھو سے بنتا ہوگا۔ وہ کمرے کے

نیم تارک گرتے ہیں سعادت مندی کا مظاہرہ کرنے آبیھی تھی۔ اگر مہمان پر نگاہ پڑتے ہا بدعاسی طاری نہ ہوتی تو شاید وہ اس کمرے سے جاگتے ہیں کوحی نہ رنگائی۔

مگر اس سے صرف اتنا سو سکا کہ پاس پڑا ہزار بار کا دیکھا ہوا میگزین چہرے کے سامنے پھیلا یا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

سلام اماں جی! وہ دوارے کے پاس وائے صوفے پر پھیر جوتے ہوئے بولا تھا۔

جیتے ہو! مگر! میں نے تمہیں بھیانا نہیں۔

نیں! ہمارا تعارف ہی نہیں کروایا کسی نے اب تک! وہ یوں کہہ رہا تھا، جیسے اہل خانہ سے زبردست فطری سرزد ہوئی ہو۔ عظیم صاحب میرے بچو بچا ہوتے ہیں جی۔

سرفراز نام ہے میرا۔

• اچھا اچھا - خیریت ہے کسی کام سے آئے ہو۔  
 • جی! شہر تو میں کام سے آیا تھا واپس جا رہا تھا، سوچا! حرا نے جانا ہو گا لیتا جاؤں۔  
 حرا کے ساکت وجود نے بے چینی سے پہلو دلا۔  
 اور اُسے اب انوس ہو رہا تھا کہ وہ اب تک اس کی تمام تر فضول حرکتوں کی پر وہ پوشی کیوں کرتی چلی آئی ہے۔ یہ ڈھیٹ شخص جتانے کیا کیا فضول باتیں کہے گا، اب بڑی اماں سے۔

• دیکھو میاں! حرا جیسے آئی ہے، ویسے ہی چلی بھی جائے گی، یوں بھی ابھی اُسے یہاں رہنا ہے۔  
 • وہ تو ٹھیک ہے اماں جی! مگر میں کچھ چیزیں لینا چاہ رہا تھا۔ سرفراز صبح بھلا گیا۔ دیکھیں ناں! جس نے استعمال کرنے ہیں، پہننی ہیں، اس کی مرضی ہونی چاہیے۔  
 • ہاں! تو میاں تم اپنی بیوی کو ساتھ لے کر آئے ہوئے حرا کا کیا کام یہاں!۔

• اُسے تو میں پھوڑ چکا ہوں، حیرت کی بات ہے اماں جی! آپ کو خبر ہی نہیں ہے کہ اب تو میری شادی حرا سے۔  
 • یہ میگزین اس وقت پڑھنا بہت مزہ دیا ہے کیا؟  
 اُس کے ہرے پر سے نقاب چھین لیا گیا، اُس کی تمام تر توجہ بڑی اماں اور سرفراز کے درمیان ہونے والے مکالموں کی طرف تھی۔ منزل کی آمد کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا، وہ بھونچے کا سی رہ گئی۔ اُسے کیا ہوا؟

• کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلا ٹل جاتی ہے؟  
 ایسے، ایسا بھی کو بلا ہے۔  
 وہ حیرانی سے اُس کے درشت لہجے پر غور کرتی، جھل سی ہو کر سیدھی کچن کی طرف بھاگی۔ سرفراز نے توری پیر پیر سے خاصی ناگواری سے باری باری دونوں کو گھورا، اُس نے پھر پھر کو باہر بیجا اور خود دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔

• میاں! اتنے بے خیر نہیں ہم، جتنا تم سمجھ رہے ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ جب دوسری شادی ہی کرنی تھی، تو پہلی والی کو کیوں چھوڑا۔ اور عظیم نے کون سا رشتہ تمہیں دے دیا ہے، حرا کو تو شائنگ کے لیے لے جانا چاہ رہے ہو۔ بڑی اماں کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔  
 • اماں جی! حرا کو میرے ساتھ بھیجئے، عظیم بھی بیجا بھی منع نہیں کر سکتے۔ وہ جھنکا گیا۔ یہاں پر بھی تو ان

طرکوں کے ساتھ پھرتی ہے وہ، پھر میرے ساتھ کیوں نہیں لاٹری اماں کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس درجہ گھٹیا پن پر اتر آئے گا، حرا المرز کر رہ گئی۔  
 "میں عظیم کی بھی ماں جیسی ہوں، میں حرا کو منع کر سکتی ہوں، اور یہ جو تم نے کہا کہ ان بچوں کے ساتھ آتی جاتی ہے، تو اس لیے کہ ان پر مجھے اعتماد ہے، انہی کے درمیان اس کا بچپن گزرا ہے اور ان سب کی پرورش میرے سامنے ہوئی ہے، جس کام سے آئے ہو، اس طرف حیاں دو، ادھر ادھر کے انڈیشوں میں ڈبے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، وقت آئے گا تو اس کے لیے شائنگ بھی ہو جائے گی۔" انہوں نے حتیٰ انداز میں موضوع ختم کر لیا۔  
 "چلیں! جیسے آپ کی مرضی، مقصد تو چیزیں خریدنا ہے۔ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔ یہ پچاس ہزار رکھ لیں۔ باتی۔"

• سرفراز! بڑی اماں اشتعال میں آگئیں! بہت پیسہ ہے تمہارے پاس؟ نوٹ دکھا کر تمہیں اُس کے باپ کو پھینا چاہتے ہو، اور کبھی پتی کو، جاؤ میاں! کام کرو اپنا۔ عظیم نہ تو خود اکیلا ہے، اور نہ ہی اس کی سچی بے سزا ہے۔ ابھی میں موجود ہوں، اس کے مستقبل کا نیکو کرنے کا حق رکھتی ہوں۔ تم ناحق اپنا وقت اور پیسہ ضائع نہ کرو۔ بڑی اماں کی صاف گوئی برداشت کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی، سرفراز تک غالباً اُن کی۔  
 شخصیت کا صحیح شہرہ رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا، اُس کی پختے خانی کی یہاں دال گلنے نہیں دی تھی۔ وہ چلا گیا تو کمرے میں سکوت چھا گیا۔ جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو پھر بڑی اماں کی ہی آواز ابھری۔

• حرا کہاں ہے۔ بلاؤ اُسے! انہوں نے کسی کو اس کی طرف بھیجا تھا۔ وہ ملدی سے انگل کے پوروں سے نناک آنکھیں صاف کرتی اُسی کمرے کی طرف چلی آئی۔  
 مٹن اُسے آتا دیکھ کر دوبارہ پلٹ گئی۔ ایسا پھوپھو چھوٹا جھڑو، نعمان اور منزل سب ہی اپنی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔

• تم کیوں پریشان ہوتی ہو، میں خود عظیم سے بات کروں گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں! وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر بڑی اماں کے پہلو میں بیٹھی تو انہوں نے دلا سا دیتے ہوئے کہا۔  
 • مجھے سارے تھے کا ڈر اور میرے پاپا کی

ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ عظیم بے چارا اپنی ساؤگی سے مار کھا جاتا ہے، کیا میں نہیں جانتی یہ سرفراز اور اس کا باپ کس طبیعت کے لوگ ہیں۔ اور جہاں معاملہ عمر عمر کا ہو بیٹا! تو بڑوں سے دل کی بات صاف کہہ دینی چاہیے۔ نا انصافی نہیں ہوتی، وہ اُس کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

چلو ایٹھا! عظیم کا منبر ملاؤ۔ اس فتنے کا ابھی فیصلہ ہو جائے تو بہتر ہے، وہ انہیں ایسے قورن والے کرے کی طرف بڑھ گئیں۔ شاید وہ اس سے سلتے یہ ساری گفتگو کرنا نہیں چاہ رہی تھیں۔

اصل خرابی یہی ہے کہ کوئی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہتا، بڑی آساں کے جاتے ہی عمرہ کی زبان حرکت میں آگئی، اور اب اس کے با معنی انداز سے اسے گرفت ہونے لگتی تھی،

”یہ کوئی“ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے جبرج کی۔ عقل مند کے لیے اشارا کافی ہوتا ہے، لیکن یہ بڑوں کی باتیں ہیں، تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، اسے تنگ کرنے کے معاملے میں نعمان بھی حمزہ کا ساتھ دینے لگتا تھا۔

بس یار! بے اعتباری بڑھ گئی ہے، اور سمجھواری گھٹ گئی ہے، حمزہ نے گہرا سانس لے کر آہستگی سے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں کے ساتھ ساتھ اُسے بھی ہنسی آگئی۔

”وہیے حراجی!“ اُسے مسکراتا ہوا دیکھ کر اُس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ”سرفراز صاحب کا موقعہ پاک ہوا، آپ اس خوشی میں بھی شریک کرتے ہوئے کچھ خیال نہیں کریں گی۔ مثلاً کوئی ضیافت، کوئی دعوت وغیرہ؟“ وہ مزمل کوئی وی پر آتے کرٹ افیسر کے پردگرم میں منہمک دیکھ کر بنا بیت دھیمی آواز میں بولا۔

شرم کر دو تم! حکومت نے بھی فضول خرچی پر مبنی دعوتوں پر پابندی لگا دی ہے، تم کوئی موقعہ ملنے سے جلنے مت دینا، یا تم نے سہ آنکھیں نہ لائیں۔ موقعہ ہی بہت خاص، ان خاص ہے، لیکن بات وہی سمجھ کی ہے، جو تمہارے پاس ہی نہیں۔ وہ مسکرایا۔ تمہیں ادھار جو دے رکھی ہے۔ بڑی آساں کے

بٹانے پر وہ اندر جلتے جلتے بواب دینا نہیں بھولی۔ اُس کے جاتے ہی محفل برقا صحت ہو گئی۔ ٹی وی کا شور اور ناظر مانتی تھا۔ اُس نے بھی گفتگوں پر سر جھکائے، لمحہ بھر کے لیے آنکھیں موندتے ہوئے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تب ہی ٹی وی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

”آپ فائناٹ جگناٹے کے موڈ میں ہیں۔ اُس شخص سے اٹھارہ سہارے کی خاطر، وہ گزرتے ہوئے اُس کے قریب ٹھہرا حسب عادت بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔

یہ تو میرا مسئلہ ہونا! آپ کو ٹکڑے کرنے کی کھڑکت ہے۔“ ادھار رکھنے کا وہ بھی قابل نہیں تھی۔ جل کر جھکے سر کو ذرا سا اٹھایا اور جملہ داغ کر پھر گرایا۔

”درست فرمایا آپ نے، لوریوں بھی میری ساری فکر میں تو خود بخود ہی دودھ ہو گئی ہیں، وہ معنی خیر سی ہنسی بکھیرتا ہوا اسے جھونکے کی مانند گزریا۔ بے زاری کے شدید حملے کے زیر اثر اُس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ اُسے روک کر پوچھے، آخر وہ کس حیثیت سے اُسے تنگ کرتا ہے، اور کیوں؟ کہ اس کا دل کئی روز سے خوش فہمیوں میں مبتلا رہے اور نہ رہنے کے چکر میں ہرگز رتا رہتا تھا۔

زندگی پہلے بھی اس قدر ساکت و جامد نہیں تھی۔ مگر جو شور ان چند ہیبتوں سے برپا ہو گیا تھا، وہ اسے ایک صبر آزما مرحلے سے آزاد کرانے کی نئی کش مکش کا شکار کر گیا تھا۔ وہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے خواب دیکھنے والوں میں سے بھی نہیں تھی۔ اور اس نے اپنے دل کی آواز کو بھی نہیں سنا تھا۔ ان سب حدود کا تقابلی ہو جانے کے باوجود یہ بے سکونی کیا معنی رکھتی ہے۔

سے جانے اس حسن لقوڑ کی حقیقت کیا ہے جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں جانے وہ کون ہے میں نے اُسے کجا کہا ہے جانے اس کو بھی میرے دل کی خبر ہے کہ نہیں اُس نے تھکے تھکے انداز میں لفظوں کی بازگشت سنتے ہوئے قدم ٹھن کے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔

انگلے ایک دودھ ز یونی تمام ہوئے، آبانے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، بٹانے ادھر کے حالت کیا تھے، اور ادھر

بھی اب بوریات اس پر سوار ہمد ہی تھی کہ شمن کے پاس  
 بالکل فرصت نہیں تھی۔ وہ رات دیر تک پڑھتی اور ادھا  
 دن کالج اور اسپتال ڈلوٹی کی نذر ہو جاتا۔ وہ بچو بچو اور  
 بچو بچا سے کتنی باتیں کرتی۔ شمن کے انتکاب میں موجود  
 ہر قسم کے نکالنا اور مختلف نوعیت کی کتابیں بھی چاٹ  
 چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی بچو بچا اسے بازارے علی گئے  
 ضروری چیزیں خریدنے کے بیانے وہ اسے لمبے روٹ  
 سے گھر واپس لیتے ہوئے، اپنی دلچسپ گفتگو سے اس  
 کے چہرے کی رونق کافی حد تک بحال کر چکے تھے۔ بچو بچو  
 چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہو گئیں۔ شمن نے کدھر غائب  
 تھی، رات گھاننے کے لیے پلاؤ بنتا تھا، جس کی ذمہ داری  
 اس نے سنبھال لی۔ تب ہی وہ ہانپتی ہوئی چلی آئی۔ حدیث  
 کی طرح وہ، دو سیڑھیاں پھٹا گئے کے منظر ہر سے کے  
 نتیجے میں آتے ہی وہ دھچک سے کچن اسٹول پر لہجوان  
 ہو گئی۔

”کہاں غائب تھیں تم اتنی دیر سے؟ اس نے پیاز کاٹتے  
 ہوئے اسے گھورا۔“

”پہلے تم بتاؤ تم کہاں گئی ہوئی تھیں۔ عبادت نہیں بلانے  
 آئی تھی، مگر تم ہر بار غائب۔“

”بچو بچا مجھے دھونڈنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“  
 اور

”عجزہ تیار کیا تھا۔ منزل بھائی کے لیے کوئی دوشیزہ  
 پسند آگئی ہے۔ سارہ بھائی کے جاننے والے ہیں، وہ تقویہ  
 لائی تھیں۔ میں نے سوچا ہم بھی دیکھ لیں۔ اٹ جڑا! اتنی باریک  
 لڑکی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔“

شمن کی پرجوش آواز اسے بہت دور سے آتی سنائی دی۔  
 چند روزہ خوش فہمی میں مبتلا دل سا بوسہ کی استھا گہرا ہیرا  
 میں ڈوبنے لگا۔

”پہلی نظر میں ہی سب کو جھی لگی ہے۔ شاہدہ اتنی کہہ  
 رہی تھیں کہ بس چند دنوں میں ہی سارے معاملات طے  
 کر لیں گی۔ کل اتنی اور سارہ بھائی ان لوگوں کے ہاں جا رہے  
 ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے جانے کے لیے۔ مگر چھٹی  
 کمرنا مشکل ہے۔ اور یہ تم اتنی ڈھیر ساری پیاز کس لیے کاٹ  
 رہی ہو؟“

وہ سنہ بناتی۔ آنکھیں مسلتی ہوئی پوچھنے لگی۔  
 ”اوہ! خیال ہی نہیں رہا! وہ چونکی۔ آنکھوں سے

سلسل جیتے پانی نے ہر منظر و صند لا دیا تھا۔ اور ساتھ  
 ہی ساتھ یکدم ہیکے پڑتے چہرے پر بکھرے اداسی کے  
 تاثرات کو بھی چھپایا تھا۔

”اوہ! میں بھول گئی، جانے آتے ہوئے پانی لانے کو کہا  
 تھا۔ شمن ماسٹا پیٹے، پانی کا گلاس لیے باہر بھاگی۔ اور اس  
 کا دل بھی شدت سے جابا کہ وہ بھی سب کچھ چھوڑ کر یہاں  
 سے جاگ جائے۔ اس کے قدم بوجھل ہو گئے تھے۔ اور اسے  
 محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے  
 انکار کرتا ہے۔“

حالا نکہ ان آنکھوں سے جھانکتے رنگوں کو بار بار دیکھ  
 کر بھی اس نے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔  
 پھر یہ احتجاج کس لیے۔ اس نے فرصت پاتے ہی بڑے  
 دھیان سے سوچا۔

”اچھی چیز بیت سے لوگوں کو بیک وقت پسند آسکتی  
 ہے، مگر یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آپ کو حاصل بھی ضرور ہو  
 جائے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بڑی اماں ہر بار میرے  
 دل کی بات جان لیں۔ میری بیت سی حالتوں میں سے  
 ایک طاقت یہ بھی سہی!۔ بھانے کس کس انداز سے اس نے  
 دل کو سنبھالا۔ اور اگلی صبح جب کہ سب اپنے اپنے فریض  
 کی بجا آوری کے سلسلے میں گھر۔ سے روانہ ہو گئے تو اس  
 نے بھی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوچ کس  
 لاؤنج میں کھڑا کرتے ہوئے واپسی کا اعلان کر دیا۔  
 ایسا بچو بچو اور کچھ بھانے اپنے اپنے ہاتھوں میں بھانے  
 چائے کے ٹگ میز پر مدھرتے ہوئے خامی حیرت سے  
 اس کے چہرے کو دیکھا۔“

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

”جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے  
 ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھی ختم ہی  
 سمجھیں؟ اس نے سلائس پر جمے لگاتے ہوئے بہت اطمینان  
 سے کہا۔“

بچو بچو پھر بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ مگر اس کے  
 پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے تھی تو وہ آرام  
 کر رہی تھیں۔ سارہ بھائی اور شاہدہ اتنی سے ہی مل کر وہ  
 واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ اصرار کو نڈا اگلی کا مدد سے منور تھا

سلسل جیتے پانی نے ہر منظر و صند لا دیا تھا۔ اور ساتھ  
 ہی ساتھ یکدم ہیکے پڑتے چہرے پر بکھرے اداسی کے  
 تاثرات کو بھی چھپایا تھا۔

”اوہ! میں بھول گئی، جانے آتے ہوئے پانی لانے کو کہا  
 تھا۔ شمن ماسٹا پیٹے، پانی کا گلاس لیے باہر بھاگی۔ اور اس  
 کا دل بھی شدت سے جابا کہ وہ بھی سب کچھ چھوڑ کر یہاں  
 سے جاگ جائے۔ اس کے قدم بوجھل ہو گئے تھے۔ اور اسے  
 محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا دل اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے  
 انکار کرتا ہے۔“

حالا نکہ ان آنکھوں سے جھانکتے رنگوں کو بار بار دیکھ  
 کر بھی اس نے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔  
 پھر یہ احتجاج کس لیے۔ اس نے فرصت پاتے ہی بڑے  
 دھیان سے سوچا۔

”اچھی چیز بیت سے لوگوں کو بیک وقت پسند آسکتی  
 ہے، مگر یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آپ کو حاصل بھی ضرور ہو  
 جائے، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ بڑی اماں ہر بار میرے  
 دل کی بات جان لیں۔ میری بیت سی حالتوں میں سے  
 ایک طاقت یہ بھی سہی!۔ بھانے کس کس انداز سے اس نے  
 دل کو سنبھالا۔ اور اگلی صبح جب کہ سب اپنے اپنے فریض  
 کی بجا آوری کے سلسلے میں گھر۔ سے روانہ ہو گئے تو اس  
 نے بھی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سوچ کس  
 لاؤنج میں کھڑا کرتے ہوئے واپسی کا اعلان کر دیا۔  
 ایسا بچو بچو اور کچھ بھانے اپنے اپنے ہاتھوں میں بھانے  
 چائے کے ٹگ میز پر مدھرتے ہوئے خامی حیرت سے  
 اس کے چہرے کو دیکھا۔“

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

”جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے  
 ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھی ختم ہی  
 سمجھیں؟ اس نے سلائس پر جمے لگاتے ہوئے بہت اطمینان  
 سے کہا۔“

بچو بچو پھر بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ مگر اس کے  
 پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے تھی تو وہ آرام  
 کر رہی تھیں۔ سارہ بھائی اور شاہدہ اتنی سے ہی مل کر وہ  
 واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ اصرار کو نڈا اگلی کا مدد سے منور تھا

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

”جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے  
 ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھی ختم ہی  
 سمجھیں؟ اس نے سلائس پر جمے لگاتے ہوئے بہت اطمینان  
 سے کہا۔“

بچو بچو پھر بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ مگر اس کے  
 پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے تھی تو وہ آرام  
 کر رہی تھیں۔ سارہ بھائی اور شاہدہ اتنی سے ہی مل کر وہ  
 واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ اصرار کو نڈا اگلی کا مدد سے منور تھا

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

”جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے  
 ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھی ختم ہی  
 سمجھیں؟ اس نے سلائس پر جمے لگاتے ہوئے بہت اطمینان  
 سے کہا۔“

بچو بچو پھر بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ مگر اس کے  
 پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے تھی تو وہ آرام  
 کر رہی تھیں۔ سارہ بھائی اور شاہدہ اتنی سے ہی مل کر وہ  
 واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ اصرار کو نڈا اگلی کا مدد سے منور تھا

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

”جیسے آئی تھی، اور آپ لوگ تو یوں حیران ہو رہے  
 ہیں جیسے مجھے واپس جانا ہی نہیں ہے، چھی ختم ہی  
 سمجھیں؟ اس نے سلائس پر جمے لگاتے ہوئے بہت اطمینان  
 سے کہا۔“

بچو بچو پھر بھی رکنے پر اصرار کر رہی تھیں۔ مگر اس کے  
 پاس سو بہانے تھے۔ بڑی اماں سے ملنے تھی تو وہ آرام  
 کر رہی تھیں۔ سارہ بھائی اور شاہدہ اتنی سے ہی مل کر وہ  
 واپس چلی آئی۔ باقی ماندہ اصرار کو نڈا اگلی کا مدد سے منور تھا

”ہائیں! یوں اچانک؟“  
 ”مگر اکیسے جاؤ گی بھئی!۔ وہ سنس پڑی یہ سوال تو  
 آتے ہوئے کسی نے اس سے نہیں پوچھا تھا۔“

مگر اُسے علوت تھی، ایسے گلے شکوے سُنے کی جس میں  
 شمن بیش پیش ہوتی تھی۔ راستے بھرا آیا کا پُر لنگر چہرا اور  
 اتناں کے غصے کا تصور اُسے واہیوں کا شکار کرتا رہا۔ سفر  
 تمام ہوا تو لباس کے استقبال کے لیے موجود تھے، انہیں  
 بروقت اطلاع مل چکی تھی۔ خلافتِ توقع ان کے چہرے پر  
 پھیلے الطیمان اور مہربان مسکراہٹ نے اس کی شہری  
 تھکان اتار دی۔ وہ ان کی آنکھوں پر باوجود خواہش  
 کے گفتگو نہ چھیڑ سکا۔ اتناں البتہ توقعات سے بڑھ کر  
 خاموش گئیں۔ اُسے حیرت ہوئی، دو تین دن گزار جانے کے  
 باوجود انہوں نے کوئی ذومعنی بات، کسی طنزیہ جملے سے  
 اس کی تواضع نہیں کی۔ حالانکہ بڑی اتناں نے مداخلت  
 کرتے ہوئے ان کے بےتعمیر کو بڑی طرح رد کر دیا تھا۔  
 "جانے میری غیر موجودگی میں یہاں کیسے کیسے معرکے سزد  
 ہوتے رہے ہیں۔" اُس نے مائل پہ جھانکے سناٹے کو  
 غموں کرتے ہوئے سو باہر زور تھا مگر کڑیدنے کی نہ تو اُسے  
 علوت تھی، اور نہ کوئی از خود اُسے کسی بات سے آگاہ  
 کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

اور اُس کے اپنے سائل بھی کم نہ تھے، ایسے میں ایک  
 ایجابی سی کسک کا اضافہ، کسی شخصے کے کھوجانے کا احساس  
 بار بار اس کا وھیان اُڑا لے جاتا۔ پھر اس کے آس پاس  
 آوازیں اور سرگوشیاں گونجنے لگتیں۔ راتوں کی ٹینڈیں  
 اُڑنے لگتیں۔ تب وہ اپنی سماعتوں پر خود کو خوب کڑھتی۔  
 "اُس کی کہانی تو عوام آسا انجام اُسے کر وہ اپنی دنیا میں سگن  
 ہو گا اور تم؟" وہ سوچتی رہ جاتی۔  
 "تم اتنی پریشان کیوں ہو، اب تمہارے مسئلے حل ہو  
 گئے ہیں،" نڈانے اُسے گہری سوچوں میں ڈوبے دیکھ  
 کر بالآخر ایک رات پوچھی سی لیا۔  
 "کیسے مسئلے؟" وہ چونکی اور پھر حیرت سے نڈا کو لہتر  
 بٹھالتے ہوئے دیکھا۔ آج تو تم لوگوں کو فرزاز کی ہنڈی  
 پر جانا تھا۔" صبح ہی تو کارڈ اس کی نظروں سے گزرا  
 تھا، جس کے مطابق فرزاز کی بہن کی شادی کا آغاز ہو  
 چکا تھا۔  
 "نہیں جا رہے؟" وہ جاہد تان کر مختصر لہولی۔  
 "آبانے منع کر دیا ہو گا۔"  
 "آبانے چارے کیوں منع کرنے لگے، اتناں کی آنکھیں  
 ہی اب کھلی ہیں؟ جہاں کالجیہ افسردہ تھا۔ وہ پوری طرح

چمکتی ہو گئی۔

سفر فرزاز بھائی نے ہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ یعنی کرو  
 جہاں! اتناں کو بھی اب پتا چلا ہے کہ انہوں نے؟ وہ ڈر کی۔  
 "شکیلہ بھائی کو بغیر طلاق ویسے بیگے بٹھانے رکھا تھا۔ آبا  
 کو بھی باقاعدہ بلاننگ کے تحت جعلی مقدمے میں الجھایا  
 گیا۔ یہ سارا پکڑ تو دراصل سفر فرزاز بھائی کا چلایا ہوا تھا۔  
 ساما، ماما ہی ساتھ مل گئے۔" جہاں ڈنگ رہ گئی۔  
 "تم تو سب کچھ جان چکی ہو گی؟"  
 "نہیں، مجھے کچھ علم نہیں ہے، یہ جعلی مقدمے کا کیا پکر  
 ہے؟"

ہماری زمین کا وہ حقہ انہوں نے بذاتِ خود مخالف  
 پارٹی کے ہاتھ بیچ ڈالا، اپنے ہی آدمیوں کو آبا کے سلنے  
 مخالفت پارٹی ظاہر کرتے ہوئے مقدمہ بنوا ڈالا۔ رقم اپنی  
 جیب میں ڈالتے ہوئے لٹا ہوا آبا کی پناہ مقروض بھی بنا  
 ڈالا۔ خدا کا شکر ہے، منزل بھائی کی بروقت مداخلت  
 نے ساری حقیقت واضح کر دی۔ وہ دم بخود سن رہی تھی۔  
 اس کے ذکر پر چونک گئی۔

"منزل نے اس نے کیسے حل کر دیا یہ سارا معاملہ بہت  
 سے سوالات دل میں پھل گئے، مگر وہ خاموشی سے سُنتی  
 رہی۔"

"اتناں نے ان سب کی خوب خبر لی ہے، اس ہڈارے  
 تو کوئی غیروں کو بھی نہیں ٹوٹتا۔ بڑی اتناں اور پھوپھو  
 ہم سے خوب ناراض ہوں گی۔" وہ اُسے دیکھنے لگی۔  
 "نہیں، وہ سب لوگ بہت اچھے ہیں، بہت چاہتے  
 ہیں ہمیں۔ خصوصاً بڑی اتناں کو ہمارا بہت خیال رہتا  
 ہے۔" وہ رسائیت سے بولی۔

"تم کتنی خوش قسمت ہو جہاں! اتنے بہت سے لوگ  
 تمہیں چاہتے ہیں، تمہارے مستقبل کے لیے فکر مند ہوتے  
 ہیں، سو جہاں! وہ جو منزل بھائی ہیں۔"

"لگتا ہے،" کیسے کوئی مہمان آیا ہے؟" نچلے پورشن  
 اٹھتی رنگ برنگی آوازوں پر اُس نے نڈا کی بات کلاں۔  
 وہ اب اس کے قصیدوں کی منتہل نہیں ہو سکتی تھی۔

"آیا ہو گا کوئی اتناں کے بیگے سے؟" مگر اب وہ ان  
 کی باتوں میں آنے والی نہیں ہیں، اُس نے منہ نہانے سے  
 کروٹ بدل کر نہایت لائق کا مظاہرہ کیا۔ جہاں کو تو تنگوار  
 حیرت نے آن یلہ یہ وہی ندا تھی جو اپنی لوگوں کی خاطر



اس پر تنقید کرنے کے معاملے میں اماں کے ساتھ مل جایا کرتی تھی۔ اس کا ایلاپٹ پر اُسے دلی خوشی کا احساس ہوا۔ حقیقی معنوں میں اب ان کی زندگی میں اب خوشگوار تبدیلی آئے گی۔ اُس نے سچے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پیر سکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

اُس کی آنکھ معمول سے کچھ ہی تاخیر سے کھلی تھی، گھڑی پر دنگا ہ پڑتے ہی وہ ہڑ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بشم پتہ تیار ہو کر باہر نکلائی۔ ناشتا تیار تھا، اماں آواز سے ہی دتی رہ گئیں۔ مگر اس کے پاس وقت کم تھا، حد شائق تھا، وہین نہ نکل سکی ہو کہ آج اسے اسکول وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچنا تھا۔ جہاں ہونے والے ورائٹی شو کے منتظین کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ محفوض جگہ تک کا فاصلہ اُس نے بڑی تیزی سے طے کیا۔ گز بھر کے فاصلے پر درخت سے ٹیک لگا کے کوئی کھڑا تھا۔ عین اُسی وقت اُس نے رخ موڑا۔ چراگ کی نگاہ گویا جم کر رہ گئی، اُسے اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہونے لگا تھا کہ وہ مسکراتا ہوا دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آ رہا ہے۔

کیوں یقین نہیں آ رہا، حالانکہ یہ سچ ہے۔ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ چراگ نے تھینپ کر نگاہیں جھکا لیں۔  
 "میں پچھلے بیس منٹ سے آپ کے اعزاز میں یہاں کھڑا ہوں۔ مبارک ہو!" وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔  
 "عظیم انکل ایک فضول مقدمے سے فارغ ہو گئے۔ غلطی ان کی بھی ہے، اس حد تک کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کہ بے خبری میں کوئی ٹوٹ کر چلا جائے۔"  
 "ہم آپ کے مشکور ہیں۔ آپ نے ہم سب پر رہنے دیکھے یہ تکلفات، کیوں خود کو مشکل میں ڈالتی ہیں؟ وہ ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

"سچ بولنے کی عادت ڈالیں۔ میں تو آپ کو بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ مگر آپ تو ساوگی میں عظیم انکل سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئیں اور لڑکی سب کیسے پسند کر سکتے تھے۔ مشن اور عجزہ کی ملی جلتی کو سچ جان کر لیا۔ فرار نہیں کر بڑی اماں تک کو خیر ہو سکی۔ چرا ہوتوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"فرار سے کیا مطلب، مجھے واپس آنا ہی تھا اور میں گئی تھی بڑی اماں سے ملنے۔ مگر وہ..."  
 "یہ ساری دھماکیں تو آپ بڑی اماں کو ہی دیکھیے گا۔ ان کی طبیعت کے پیش نظر اتنے دنوں کی تاخیر ہوئی وگرنہ آپ کی آمد کے اگلے روز ہی وہ یہاں ہوتیں۔"  
 "بڑی اماں یہاں آئی ہوئی ہیں۔ میں نے طلبہ ہی آتے ہوئے غور ہی نہیں کیا۔ وہ حیرت و مسترت سے ملے جلے تاثرات لیے بے ساختہ بولی۔ اُسے افسوس ہوا وہ رات کو ہی ان سے کیوں نہیں ملی۔

"غور نہ کرنا آپ کی پرانی عادت ہے۔" وہ ہنسنا۔  
 "میں ان مرحلوں سے بہت پہلے فارغ ہو چکا ہوں۔ آپ کے پاس وقت کم ہے۔ گھر پر بڑی اماں اہم اہم کی صدارت کر رہی ہوں گی۔ ساری کارروائی فی الحال ہم دونوں کے بغیر مکمل ہو ہی جائے گی، مگر میں یہاں اتنی دیر سے صرف اس مہم کو نبھانے کے لیے سوکھ رہا تھا جو مذاق میں باندھا تھا۔ کہ آپ سے پہلے ضرور پوچھا جائے گا۔ تو پھر آپ کا کیا خیال ہے اس ناچیز کے بارے میں؟ وہ لاپرواہی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بے اختیار ہنس دیا۔ اس کے شروع انداز پر اُس نے اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے، جب وہ اوڈنٹ باکونی میں بیٹھے ہوتے شرعی حق یہ ثابت کر رہی تھیں، چراگ کے چہرے پر شرمیلیں مسکراہٹ پھینکنے لگی۔ جسے چھپانے کے لیے اُس نے چہرا موڑ لیا۔

وقت تو کھیل ہی سہی، مگر اُسے اپنی خوش بختی پر واقعی یقین آ گیا تھا۔ بڑی اماں کی محبتوں پر وہ ہمیشہ سے ہی تہ دل سے مشکور تھی، اب مفروض بھی ہو چکی تھی۔

"اوہ! آج وہین نہیں آئی۔" وہ جیسے تصور سے حقیقت میں پلٹ آئی۔

"وہ تو کب کی گزر چکی ہے، اچھے میں روڈ سے ٹکسی پکڑتے ہیں۔" وہ مسکرایا تو اُس نے بھی خود اعتمادی سے اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے منزل کی جانب سفر کا آغاز کر دیا۔ واہوں سے بے نیاز، پُر یقین وضع طلوع ہو چکی تھی۔

” لینڈ کروزر ہوا رختہ سڑک پر ہوا کے دوش پر گویا تیرتی چلی جا رہی تھی۔ نارنجی کر نہیں بکھیرتا سورج سڑک سے پرے ریت کے اونچے ٹیلوں میں یوں چھب رہا تھا جیسے کوئی گوری ساجن کی شوخ ننگا ہوں سے مجھ ہو کر اپنا گلزار کھڑا اسی کے سینے میں پھیلے۔ سڑک کے دونوں جانب ایک مخصوص فاصلے پر موجود شیشم کے درخت ہمیں ہونے سر جھکائے کھڑے تھے۔

کہیں کہیں کیکر کے درخت بھی تھے جو آبی علاقوں میں گرمی کے موسم میں دن بھر غصب ناک و صوب کی شدت برداشت کرنے کے بعد شام کو سپیڑوں پر دووں میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ ہوا کی نرم

دیکھا۔ اور گرمی سانس لیتے ہوئے بولی: ” اچھا سائیں! آپ خوش رہیں، آپ کی خوشی کی خاطر ہمیں مونجھ بونجھاری راداسی ابھی قبول ہے۔“

” اتنا چاہتی ہو مجھے؟ میں نے دیکھے لیجے میں پوچھا۔ ہاں۔ لیکن سوچتی ہوں آپ کا اور میرا کیا جوڑ کمال میں ریت کے سینے پر آگنے والی چھوٹی سی کھمبی اور کہاں آپ جیسا کھجور کے درخت کی طرح اونچی شان والا آدمی۔“

” واہ! بڑی بڑی مثالیں دینے لگی ہو۔ کھمبی اور کھجور کا درخت، واہ! میں سرشاری کے ساتھ ہنس دیا تھا۔“

سغلیہ بول گودمانی



سڑکیوں کے جواب میں ہولے سے ہنس سکیں۔ بس ایک اداس مسکراہٹ نمودار ہو جاتی ہے قدرت سے کھلائی ہوئی ان پٹیوں پر۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مسکراہٹ وہی دل کو چھوٹی ہے جس میں اداسی کی آمیزش ہو۔ پری سے ایک دن میں نے یہی کہا تھا۔

” سنو پری! جب تم اداس ہوتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ دیکھی دیکھی اداس مسکان جب تمہارے لبوں پر آتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پیاسے صحرا پر سے ٹکڑے جانے والے بادلوں کو دیکھ کر ہوا دھیرے سے مسکرانے یا جیسے تیکھی دھوپ کے سامنے کوئی بکلی سی بدلی جا جائے اور قدرے سکون کا احساس دے۔“

” اچھا تو اسی لیے مجھے اداس رکھتے ہیں تاکہ میں آپ کو اچھی لگتی رہوں! اس نے مجھے شکوہ کناں نظروں سے

کھجور کا درخت! میں نے زیر لب دہرایا۔ واقعی ادبنا ہو کر دنیا کو دیکھنے میں لذت ہے عزت ہے اور سر خوشی بھی۔ بلندی پر ہونے اور نمبروں بننے کا نطف ہی اور ہے، جو غموس تو کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے کبھی کھجور کا درخت دیکھا ہے؟ اپنی بلندی قاسمی پرنازاں و فرماں کس قدر دعوت و کتب سے آسمان کو گھورتا ہے، شان و کترو فرسے جیتا ہے موسم کی قدرت انکیز بے مہری بھی اس کے پھیلے ہوئے سر سبز شاواہ بازوؤں کو سمٹنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اس دراز قامت درخت کے حوالے سے جواں مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ یہ کہ اس میں اگر انا و خود داری ہے، بلندی کا نشہ ہے تو وہ اس نشے کے سرور میں امانت کے لیے اپنے ارد گرد لوگوں کا ہجوم رکھنے کا ہنر بھی جانتا ہے، حاجت مندوں



READING  
Section

Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint.com

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

کی پھیلی ہوئی مچھلی میں اپنا پکا ہوا بچل گراوٹیا ہے اور پھر ان کی مضمون نگاروں کے جواب میں بے نیازی سے مسکرا کر دوبارہ آسمان کی دستوں میں اپنی نظریں گھاڑ دیتا ہے۔

شیریں دین کر دینے کی صلاحیت لوگوں کو کیسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اس کو میرے بوا اور کون بہتر جانتا ہے۔ سراسیکی وسیب کی ایک مثال ہے، گڑ نہ ڈے، گڑ نہ جاسی، مہٹھی کال تال تکر، گڑ نہیں دے سکے نہ سہی، گڑ جیسی مہٹھی بات ہی کر لو۔ آج دوپہر کو میرا دوست علاقے کا ڈی۔ سی احسان گورجانی بھی یہی بات کر رہا تھا۔

یار گھٹا پھرا کے اور اتنے میٹھے لہجے میں بات کرتے ہو کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا، تمہارے ذہن میں کیا بے تعلقوں کو چھپانے میں ماہر ہو۔ دراصل گورجانی بھی میرے ساتھ اس مذاکرے میں شریک تھا اور یہ لو پاکستان ملتان نے معاشرتی عدم مساوات اور حصول انصاف کی ضرورت کے موضوع پر دیکھا ڈکڑا دیا تھا۔ اسد خاکوانی نے بھی

گورجانی کی بات دہرائی۔

”یار شمان! یہ ہاؤ کہاں سے سیکھا ہے تم نے۔ عام سی بات کو بھی اتنے خوبصورت ریپر میں لپیٹ کر کرتے ہو کہ وہ سننے والے کے سیدھے دل میں جا پیوست ہوتی ہے، ہمارے پارٹی میں آجاؤ۔ ایمان سے جس پر انگلی رکھو گے، وہی وزارت دلوادوں گا۔ گورنمنٹ کی پالیسیوں کی جتنی موثر وضاحت تم کرو گے کوئی اور کر ہی نہیں پائے گا۔ تو پھر لو کیا خیال ہے؟ یہ بھی تعریف کا ایک انداز تھا۔ میں اس کے سائنسی نکلمات پر ہنس پڑا۔ میں نے کہا۔

اسد یار! سیاست کی منڈی میں وفا کے سکے کھولے کھلاتے ہیں۔ اس شہرے وفا میں نہ دوستی کا قیام ہے، نہ دشمنی کو دوام۔ کھل کے دشمن آج کے دوست بن جاتے ہیں، اور آج کے دوست کھل کے دشمن خود غرضیوں کی رسم بدلنے کب لور کیوں چلی کہ اب یہی چلن عام ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نا انصافیوں کے اس سنگتے ہوئے صحرا سے پہلے ہی بے زار ہوں۔ میں ذالی لڑ

پر سیاست کے اکھاڑے میں خود آترنا کبھی بھی پسند نہیں کروں گا۔“

اسد خاکوانی ذاتی طور پر میرا حریف نہیں تھا۔ لیکن ان دنوں میں جس سیاسی پارٹی کا دفا دار تھا وہ اس کا مخالف ضرور تھا۔ دراصل میں باقاعدہ طور پر کسی بھی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کرتا۔ میرا دفا داریاں عوام کے ساتھ ہیں۔ لوگ جسے اپنا رہبر بنا نا پسند کرتے ہیں، میں اس کو سپورٹ کرتا ہوں۔ مورل سپورٹ کے ساتھ ساتھ مالی تحفظ بھی فراہم کرتا ہوں میں وہ ہاتھ بنا زیادہ پسند کرتا ہوں، جو خود تارکی میں رہ کر دوسروں کو روشنی کی سمت چلیکتا ہے۔

سیاست کی دنیا میں بالکل فزٹ پہ آجانے میں بہت سی تباہیتیں ہیں۔ جو لوگ طاقت میں آتے ہیں ان کی پشت پر بھی تو ہمارے ہی بازوؤں کی تو اتائی ہوتی ہے۔ پھر کسیوں خواجواہ خود آگے آکر در دسری مول لی جائے۔

میں نے بڑھ کر گاڑی میں نصب ریڈیو آن کر دیا۔ غالباً اسی وقت مذاکرہ نشر ہونا تھا۔ لیکن

ابھی سراسیکی گانے براؤ کا سٹ کیے جا رہے تھے، عہ ۶ درج روہی وے رامندیاں نازک نازک جٹیاں، ”معنی اپنی بھر ملی آواز کا جاو و بگا رہا تھا۔“ نازک نازک جٹی، ”زیر لب میں نے کہا اور ریڈیو بند کر دیا۔ میرے تخیل کی اسکرین پر نازک نازک کومل کو مل پر کی تصویریں چلنے پھرنے لگیں۔

میں نے گاڑی بچوڑے سڑک سے نیچے کچے میں اتار دی۔ اونچے نیچے راستے پر گاڑی مسلسل چٹکے کھا رہی تھی۔

• سائیں بیس مجھے اتار دو، مجھے نہیں کھالے تمہاری گاڑی میں چھوڑے۔ اتنے ہچکولے کھا رہی ہے، اس سے تو اچھی ہمارے اونٹوں کی سواری ہے، ہچکولے آتے ہیں تو اس میں بھی مزا آتا ہے اور حریت سے آتے ہیں۔ تمہاری گاڑی تو یوں باز بار چٹکے کھاتی ہے جیسے مرنے سے پہلے کوئی آخری

ہچکلی لے! پرمی منہ بسورے کہہ رہی تھی، اُسے میں لہند اصرار اپنی گاڑی میں سیر کروانے لایا تھا۔ لیکن شہر تارا جان بوجھ کر ناچھوڑنے کے راستے پر لے آیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ بہت جلدان ہچکلوں سے پریشان ہوا تھی۔

تم تو کہتی تھیں سستی کی طرح اپنے خان کے لیے تم تپتے نعل میں ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ لیکن ذرا سے ہچکلوں کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ بعضی کیسی سستی ہو تم؟ میں نے مسکراہٹ دیا کر کہا۔

سو بنا سائیں! بے شک سستی ہوں، لیکن اتنی سستی نہیں۔ تم اس طرح مجھے ساؤ، اور میں شکایت بھی نہ کروں۔ سستی کی طرح محبت کی راہ میں گرم ریت پر توجیل سکتی ہوں، شرط یہ ہے کہ تم بھی نیوں کی طرح سستی کی خاطر گھبرا، قبیلہ، عیش و آرام چھوڑنے کا حوصلہ رکھو، یوں بغیر کسی وجہ کے گاڑی میں بیٹھ کے جھسکے کھانا تو محبت نہیں۔ بس اتار دو مجھے، روکو گاڑی۔ میرا تو کھانا یا چلق سے نکلنے والا ہے۔

وہ حقیقتاً بدمزہ ہو رہی تھی، مجھے اس کی شکل دیکھ کر منہ ہی آگئی، وہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ لیکن باتیں دلچسپ کرتی تھی۔ اسی لیے تو مجھے اچھی لگتی تھی۔

کچی سڑک اب ریلے علاقوں میں مدغم ہو چکی تھی۔ کچھ دور جانے کے بعد گاڑی کے پیٹوں نے ریت میں پھنس کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ یہی میری منشا تھی۔ میں نے انجن بند کیا، چابی انکیشن میں ہی رہنے دی۔ اور خود مجھے آتر آیا۔

شام کے سائے پھیل چکے تھے آسمان پر سرسٹی بادل سجلائے گئے تھے، ریت کے سینے میں بھر پور جوار بھاٹا اب ہولے ہولے سرو ہو رہا تھا۔ میں ریگستان کی اس نرم گرم آغوش میں قدم۔ قدم آگے بڑھنے لگا۔ میرے پاؤں ریت پر اپنا نقش چھوڑتے جا رہے تھے۔ سامنے بڑے ریت کے ٹیلے کے پاس غور و جال کا درخت زنگارنگ، پیلو سے لہلا قدرے

حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا، لیکن اس حیرت میں بھی محبت تھی۔ حیرت شاید اس لیے کہ میں اس کی مہربان دوست کی طرح پھیلی ہوئی شاخوں پر دیکھنے رنگ برنگے پیلو چھنے کے بجائے ادھر ادھر بغیر کسی وجہ کے نظریں بھٹکا رہا تھا۔ میں جب بھی بہت خوش ہوتا ہوں، یا ادا اس تو اسی طرح باڈی گارڈز کے بغیر تنہا لانگ ڈرا شو کرتا ہوں، فطرت کے اس دلغریب حسن سے آنکھوں کو سیراب کرتا ہوں۔

اس وقت بھی میں یہی کچھ کر رہا تھا۔ لیکن مجھ پر یہ واضح نہیں ہو پایا تھا کہ میں موشخار آگاس ہوں یا خوش۔ بس ایک اضطرابی سی کیفیت تھی۔ میں نے بڑھ کر ہنسی سے پیلو توڑ کر درخت کی حیرت دور کر دی۔

پیلو کوئی شیریں ذائقہ پھل نہیں ہے ہنجر بھرائی لوگوں کے پیاس سے بے تاب خشک حلق تر کر کے کچھ تسکین ضرور پہنچاتا ہے۔

پھلی بار میں نے تمہیں ڈیرے میں آنے کو کہا تھا۔ معلوم ہے تمہیں کتنے اہم کام چھوڑ کر تمہارا انتظار کرتا رہا۔ کچھ احساس ہے تمہیں۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو دبا کر شکایتی انداز میں بات کی تھی۔ جو لوگ بے حد قریب آجائیں۔ بہت عزیز ہو جائیں، ان کی ناراضگی کا خیال کیسے روح تک کو سہما دیتا ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں۔ جو کسی سے محبت کرتے ہیں۔ میں اسی ڈر سے کہہ رہی تھی کہ ناراض نہ ہو جائے۔ اس سے بہت سنبھل کر اور لہجے کو کٹر طول کر کے گفتگو کیا کرتا تھا۔ حالانکہ یہ ہمارے تانڈان کی روایات کے بالکل خلاف ہے کہ عورتوں سے اس طرح بغیر رعب و دبدبے کے اکھڑ پلن سے ہٹ کر خوشامدانہ انداز میں بات کی جائے۔ اسے سردانگی کی توہین سمجھا جاتا ہے۔

پرمی نے جب مجھے یعنی قبیلے کے سردار خان اللہ پٹوآن گورجانی کے اکلوتے فرزند خان شہماز گورجانی کو اپنی خاطر، ایک عاکسی لڑکی کے لیے یوں بے بس، مجبور لہجے میں شکوہ کناں دیکھا تو سر خوشی سے، فخر سے، اترنے

میں کو شمش کے باوجود نظر میں اس کے چہرے پر  
سے ہٹا نہیں پایا تھا۔  
• سو ہٹا سائیں، خوبصورت تو آپ کی حویلی کی  
خان زادیاں ہیں۔ ہر ایک اتنی سوسنی، جیسے دودھ بھرا  
کٹورا۔ اور میں سادہ مایوس کن لہجے میں بولی۔ میں  
تو عزیز کی جھکی سے نکلنا ہوا دھواں ہوں، جو لہجے کا  
راکھ۔ کالی کوچ۔“

• رنگی: ”پرری کا چہرہ میرے تصور میں روشن ہوا“  
اور میرے لب خود بخود مسکرا دیے۔ اسے کیا معلوم  
کہ وہ کتنی حسین ہے۔ میں نے سوچا اور ریت میں  
و معنی کاڑھی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔  
پرری کی طرح ساتویں سلونی حسین شام صحرا میں  
اترائی تھی۔ میں گہری نظر سے بہت دلچسپی کے ساتھ  
منظر کی دکھائی میں کھو گیا۔ جانے کیسے لوگ ہوتے ہیں  
جو ریگستان کو محض دیرانیوں کا ڈیرہ قرار دیتے  
ہیں، انہیں کیا معلوم کہ قدرت نے ان دیرانیوں میں  
بھی حسن کے کیسے کیسے خزانے پوشیدہ کر رکھے ہیں۔  
نق و وق صحرا میں اکاد کا نظر آنے والے رخت  
حسن۔  
سبزے کے نام بہ آگنے والے جھاڑ جھنکار میں  
حسن۔

زمین کے سینے پر نشان ثبت کرتے اونٹوں کی  
قطار۔ حسن۔  
جرس کار واں حسن۔  
ڈار سے پھیری کوچ کی گرلاہٹ، صبح سویرے  
سکارا کر پھی اور گھنٹھوٹوں و پندوں کے نام آگے  
بولنے کی صدا۔ حسن۔  
ہلیو چنتی روہی کی جٹیاں۔ حسن۔  
ریت کے سمندر پر اترائی اداس شام۔ حسن۔  
یہاں کی عزت، پیاس اور دھوپ کی شدت  
تکلیف دہ مہی۔ لیکن اس تکلیف میں بھی ایک اطمینان  
ہے اور یہ اطمینان ہی حسن۔  
کس کس خوبصورتی کا ذکر کر دوں یہ محض رعنائی خیال  
نہیں، حقیقت ہے اسے تو بس محسوس کیا جاسکتا  
ہے۔

ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔  
”او سیڈا سائیں آ۔ بے شک آپ قبیلے کے نئے  
نئے سردار بنے ہیں۔ بہت اہم ہیں۔ لیکن عزیز اہم ہم بھی  
نہیں۔ ہمیں بھی کوئی کام پڑ سکتا ہے۔“  
”وہی تو پوجہ رہا ہوں۔ کیا کام پڑ گیا تھا۔ میں  
نے اس کے سلونے مٹیچ چہرے پر نظریں رکھتے  
ہوئے نرمی سے پوچھا۔

• ہلیو چنتی گئی تھی اپنی ہیلیوں کے ساتھ۔ پتا  
ہے ہم سب نے خواجہ فرید مسائیں کی کافی بھی مل کر  
گائی تھی۔ آج سڑوں زلی پار۔ ہلیو پکیاں نی۔“  
راؤ میرے دوست مل کر ہلیو چنتے ہیں۔ اس لیے  
کہ ہلیو کا بچل اب بک چکا ہے۔  
”اچھا تو تمہیں گانا بھی آتا ہے ہڈ میں نے حیرت  
کا اظہار کیا۔  
”اور نہیں تو کیا“ وہ فخر سے بولی۔ ”زرت کہہ  
رہی تھی تمہاری آواز باسکل ریڈو (ریڈیو) میں گانے  
والی عورت کی طرح ہے، بہت خوبصورت۔“  
”تو اسے ہریان پرری! ہمارے کانوں میں بھی تو  
اپنی سسرہلی آواز کار میں گھولونا۔“  
”ہائے سائیں، آپ کے سامنے کیسے کاسکتی ہوں۔“  
وہ تو میری ہیلیاں تھیں۔“

وہ کچھ شرمنا کر بولی۔ ساتویں سلونی جگہ گائی اٹھو  
والی ڈبلی پٹی لڑکی ہے، ہی اتنی دلنواز اور معصوم ادا کہ  
بندہ اپنا آپ ہارنے پر مجبور ہو جاتے۔ دیکھتا ہی رہ  
جاتے اس کے مٹیچ چہرے سے وکٹش خدو خال کو نوع  
پر نوع عادتوں اور دل نشین اداؤں کو۔ پرری بر ملاقات  
میں مجھے نئی اور پہلے سے مختلف محسوس ہوتی تھی اسے  
اپنے سامنے پا کر میں بخالے کیوں اپنا اختیار کھونے  
لگتا ہوں۔

اس وقت بھی میری والہانہ نظروں سے بھا کر  
سمٹ گئی۔ اس کے سلونے عارض حدت حیا سے دیک  
سے گئے۔ ”میکوں ایوں نہ ڈیٹھا کر۔ میکوں شرم  
آندی اسے“ ”مجھے ایسے نہ دیکھا کریں، مجھے شرم  
آتی ہے۔“  
”کیسے نہ دیکھا کر دوں، تم اتنی خوبصورت جو ہو۔“

یہ سب خوبورتیاں اس وجہ سے ہیں کہ قدرت نے ان سب کو ایک خاص میزان سے بنایا ہے ایک نامعلوم سا توازن ہے۔

جو شے جس جگہ ہے، جیسی ہے، جہاں ہے، سب ہے، اپنے مقام پر ہے، کسی کے مقام کو اس کی حقیقت کو اس کی قدرتی تیز تیز و تر تیز کو تبدیل کرنا اور حقیقت توازن کو بگاڑنے کے مترادف ہے اور اس کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا، اس لیے کہ مجھے حسن سے بے پناہ نجات ہے، میں نہیں چاہتا کہ یہاں کی سحر انگیز خوبورتیاں ماند پڑیں۔ اچھا خاصا نام فطرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھتے ہوئے گزر چکا تھا۔ اور اب میں حسب توقع خود کو بلاش، تازہ دم اور آسودہ محسوس کر رہا تھا۔ طبیعت کا وہ نامعلوم سا اضطراب، وہ بے چینی اور شاید ہلکی سی اداسی اب دور ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ سرسبز شام گہری تاریکی کی ماہر اور تھک کر رات میں تبدیل ہوتی، میں نے دلہنسی کے لیے گاڑی ریورس کی اور چل پڑا۔ ابھی میں اپنے علاقے "حقوک نواز" سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک کوئی شخص کھجوروں کے بھند میں سے نکلا اور اچھل کر میری گاڑی کے سامنے آ گیا۔

اگر میرا پاؤں ایک سیلیٹر پر نہ پڑ گیا ہوتا تو وہ شخص عین اب تک کچلا جا چکا ہوتا۔ میں برقی رفتار سے اہل نکلا اور سڑک پہ گزرتے اس شخص کو کھڑے ہونے میں مدد دی۔

• دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تمہارا کیا خود کشی کرنے نکلے تھے؟ میں نے برہمی سے کہا۔  
"خان میں میگوں بجا گھینو۔ اللہ وا واسلہ سوے میگوں بجا گھینو۔ میں بے تصور آں۔ میں کچھ نہ کھینا۔" وہ میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگا۔  
• اسے ارے۔ کیا ہو گیا۔ اٹھو یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے اسے اٹھانا چاہا۔ لیکن وہ میری ٹانگوں پہ ہنسا رہا۔

• سائیں! میں بڑی امید لے کر آیا ہوں۔ اللہ

کے واسطے میرا فیصلہ انصاف سے کریں۔  
"مگر جو اتنا ہے؟ کچھ تاؤ۔ آؤ تفصیل سے بات کرتے ہیں، میں نے نرمی سے کہا، اور بڑی مشکلوں سے اٹھا کر اسے گاڑی میں لایا۔  
وہ لانا، پتلا، گہرے سا لوزے رنگ کا نوجوان محنت عم زدہ و وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ آنسو بار بار اس کے گالوں پر لڑھک آتے تھے۔ جنہیں وہ اپنی بگڑی کے پلو سے صاف کر رہا تھا۔ عام حالات میں تھکے نقوش کا وہ نوجوان شاید پرکشش دکھائی دیتا ہو، لیکن اس وقت دکھ اور خوف کے تاثرات نے اس کے نقوش بگاڑ کے رکھ دیے تھے۔

"اب تاؤ۔ کیا مسئلہ ہے؟ چند لمحوں کے بعد میں نے پوچھا۔ اس نے جو تفصیل بتائی اس کے مطابق راول نام کا یہ نوجوان تین چناب کار ہالستی تھا۔ اس کا باپ ایک ملّا ج تھا، جو میرے علاقے کے ایک جت وال (اونٹ بان) کا رشتہ دار تھا۔ مستونام کے اس جت وال کو میں جانتا تھا، اس کی بیوی سر چکی تھی، اور وہ اپنے اونٹ پر بھوسہ لکڑیاں اور دیگر ساز و سامان شہر لے جاتا تھا۔ بقول راول کے تقریباً پندرہ دن پہلے وہ اپنے باپ کے کہنے پر اپنے ماموں کے گھر قیام کرنے آیا، تاکہ اپنی ماموں زاد کو دیکھ سکیں اور

**کیا آپ کے بال گر رہے ہیں؟**

بیونہ بکسکی کا تیلڈ کنڈرہ،

**سوہنی بیئر اٹل**

سوہنی بیئر اٹل تیار ہو کر آگیا ہے،

بیٹھ کر تھوڑے عرصہ میں ہے، دس دن میں کھینے

۱۰۳۶ انڈیا بازار، کلکتہ

• ہر کے لوگ دی ہی سے بھی منگول سکتے ہیں

اس سے شادی کرے۔

آج سہ پہر کو اس کی ماموں زاد گھر سے نکلے۔  
اسے کچھ شک سا تھا۔ یہ اس کے پیچھے گیا۔ بقول اس  
کے وہ اسے چمکے دے گئی تھی، اس لیے یہ فوراً ہی  
اس کے پیچھے نہیں جاسکتا۔ کچھ دیر بعد یہ اس تک  
پہنچا تو دیکھا لڑکی قتل ہو چکی ہے۔ اب قتل کا شبہ  
راول پر کیا جا رہا تھا، اسی لیے یہ اس قدر خوف زدہ  
تھا۔ قتل، جھوک نواز میں ہوا تھا اور یہ بڑی نشوونما  
کی بات تھی۔

میں نے متاسف انداز میں کہا: "انسانی جان  
اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے یوں بے دردی سے  
ضائع کر دیا جائے۔ جس کسی نے بھی یہ جرم کیا ہے۔  
اُسے عسیرت ناک سزا ملنی چاہیے۔"  
"خان! اللہ پاک کی قسم۔ میں نے اپنی مُلیر رملوں  
کو نہیں مارا۔ وہ تو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں  
اُسے مار کیسے سکتا ہوں بڑا راول دلگرمی سے  
بولتا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں کی نمی خشک ہونے  
میں ہی نہیں آ رہی تھی۔  
میں نے پوچھا: یہ بتاؤ تمہیں معلوم کیسے ہوا کہ  
لڑکی مر چکی ہے؟"

وہ صحت رکھو روں کے جھنڈے کے پاس آ رہی  
ترھی بڑی تھی۔ میں نے پریشان ہو کر لڑکیوں کو  
آواز میں دینا شروع کر دیں۔ پھر سب اکٹھے ہو گئے۔  
تو انہوں نے مجھے ہی قائل سمجھا شروع کر دیا۔ انہوں  
نے مجھے پکڑ بھی لیا تھا اور شاید پولیس کے حوالے  
کرنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے خود کو چھڑا کے  
بھاگا۔ ابھی بھی وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ  
سمجھ رہے ہوں گے، میں "جھوک نواز" سے نکل  
بھاگا ہوں گا، مگر میں۔ یہیں آپ کا انتظار کرتا  
رہا۔ آپ سردار ہیں، آپ کے انصاف کی ہر کوئی  
گواہی دیتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے انصاف دلا دو۔  
"آرہ قتل کیا تھا؟ کیا تم نے اُسے چھو ا تھا؟"  
"اُسے اُس کے دوپٹے سے کلا گھونٹ کر ہلاک  
کیا گیا تھا۔ میں دوپٹے کو چھوٹوں یا نہ چھوٹوں۔  
اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہوں!" میں پھر سوچ انداز میں اسے دیکھنے

لگا۔ وہ قائل ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ  
گفتگو کے آغاز میں اُس نے کہا تھا کہ لڑکی پر شک  
کر کے وہ اس کے تعاقب میں گیا تھا، ہو سکتا ہے وہاں  
اُس نے لڑکی کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر عزت  
میں آ کر اُس کو ہلاک کر دیا ہو۔ اسی خیال کے تحت  
میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے وہاں کسی اور کو بھی دیکھا؟ میرا مطلب  
بے لڑکی کے ساتھ۔"

بالکل نہیں۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں  
تھا۔ یا تم از کم مجھے نظر نہیں آیا۔"

"تمہیں اپنی ماموں زاد پر شک کیوں ہوا تھا،  
بلکہ کیا شک ہوا تھا۔ اس کی نوعیت بتاؤ۔"

میرے اس سوال پر وہ کسمسا کر پہلو بدل کر  
رہ گیا۔

"وہ جی اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ  
مجھ سے شادی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ اُسے کوئی اور  
پسند کرتا ہے۔"

کون پسند کرتا تھا؟

یہ تو مجھے پتا نہیں۔ میں یہی دیکھنے تو اس کے  
پیچھے گیا تھا کہ وہ کس سے ملنے جا رہی ہے۔ وہ  
تجوتی تھی، معصوم تھی۔ اُسے کسی نے پھینسا لیا تھا۔  
کاش وہ میری بات سمجھ جاتی۔"

"کیا سمجھا یا تمہا تم نے اُسے؟"

"میں نے کہا تھا تم جسے پسند کرتی ہو۔ بے شک  
اسی کا گھر لیاؤ۔ میں اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گا  
لیکن یوں کسی کے ہاتھ کھلونا ست بنو۔ عزت کے  
ساتھ اس کے گھر میں رہو۔ پردین بھی یہی چاہتی  
تھی۔ مگر مجبور تھی۔"

"کیا مجبوری تھی اُسے؟ میں نے گہری نظر سے  
اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔"

وہ کہتی تھی وہ مجھے نہ اپنا تا ہے اور نہ چاہتا  
ہے، کہا ہے اگر کسی اور سے شادی کا ارادہ ہو  
کیا تو مجھے مار ڈالے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، ایک بار  
وہ آبدیدہ ہو گیا۔"

"یعنی وہ تم سے شادی کی خواہشمند تھی، مگر وہ  
کی وجہ سے راضی نہیں ہو رہی تھی؟"



”ہاں جی۔ یہی بات ہے۔ دل بول رہی ہیں نے  
 اُس سے کہا تھا۔ میں سہرا میں تمہارا ساتھ خوشی  
 سے دوں گا۔ لیکن جو شخص نقاب چڑھا کر تمہیں دھوکا  
 دیتا رہا ہے، پہلے اس کے چہرے سے نقاب اترنا  
 چاہیے۔ لوگوں کو اس کا اصلی چہرہ دکھانا چاہیے۔ میں  
 نے اُسے کھایا تھا کہ کسی غلطی کے نتیجے میں ہمیشہ عورت  
 ہی لعن طعن کا نشانہ کیوں بنے۔ اصل مجرم تو مرد  
 ہوتا ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے۔“

میں نے کہا: ”تم نے اس آدمی کا نام تو پوچھا ہو  
 گا، جس سے وہ اس قدر ڈرتی تھی؟“  
 ”پوچھا تھا، لیکن وہ کہتی تھی اُس نے کسی کو اپنا  
 نام بتانے سے بہت سختی سے منع کیا ہے۔ لیکن  
 ایک دن باتوں باتوں میں اس کے منہ سے اچانک  
 اس شخص کا نام نکل گیا تھا۔“

”کیا نام تھا اس کا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا  
 تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

کافی دیر تک ذہن پر زور دینے کے بعد وہ  
 مایوسی سے بولا۔ ”سرکار! نام بھلے بھول گیا ہے؟“  
 ”نہیں، یاد کرو نام۔ شاباش۔ ذہن پر زور  
 دو۔ ہو سکتا ہے یاد آجائے۔“ میں نے بے معنی  
 سے کہا۔ اُسے اگر نام یاد آجاتا تو ساری آنکھیں  
 ہی رفع ہو جاتی۔ مسئلہ سمجھانا آسان ہو جاتا۔ مگر  
 اُسے نام یاد نہیں آیا۔ بہت سوچنے کے بعد بالآخر  
 وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

”خان عین! بھئی اس آدمی کا نام یاد نہیں  
 آیا، اور ویسے بھی میری ملیئر نے اس کا وہ نام لیا  
 تھا۔ جو اس کے گھر والے پیار سے لیکارتے ہیں۔  
 بس اتنا یاد ہے، اس کے نام کے ساتھ ”خان“  
 لگا ہوا تھا۔“

”کیا بات ہوئی۔“ میں نے کہا۔ ”اس علاقے  
 میں بلوچ قبائل آباد ہیں۔ بلوچ عموماً ”خان“  
 کہلائے جاتے ہیں۔ ”جھوک نواز“ میں جانے کتنے  
 نام ہوں گے۔ اب کیا معلوم اصل مجرم کون سا مان  
 ہے۔ خیر تم اطمینان رکھو۔ اگر تم گناہ گار نہیں ہو  
 تو تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ میں انصاف کی  
 تہائی پر یقین رکھتا ہوں، اور اس کی سر بلندی

کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔ فی الحال تم میرے  
 ڈیرے پر چلو۔ وہاں تم بالکل محفوظ رہو گے۔“  
 رات کو ڈیرے پر میں نے لوگوں کا عمومی تاثر  
 معلوم کیا۔ اکثریت راول کو قاتل سمجھ رہی تھی۔  
 کیونکہ وہ بہت جلد مشعل ہو جانے والا نوجوان تھا۔  
 غالب گمان یہی تھا کہ شدت غیض و غضب میں اس  
 سے قتل جیسا فعل سرزد ہو گیا، اور اب وہ پختہ دار  
 تھا۔ اپنے جرم پر پروہ ڈال کر انصاف کی بجیک  
 مانگ رہا تھا۔

لیکن خیر میں اتنی جلدی کسی کے بارے میں کوئی  
 رائے قائم نہیں کرتا۔ جب تک معصوم شہادتیں نہ  
 مہیا ہوں، راول کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا  
 جا سکتا تھا۔

اگلے دن میں قبیلے کے سرکردہ افراد کے ساتھ  
 مستوحت وال کے گھر گیا۔ جس کے ساتھ یہ سانحہ  
 ہوا تھا۔ مستوحی اکلوتی، لاڈلی بیٹی ہمیشہ کے لیے اس  
 کی نظروں سے دور کر دی گئی تھی۔ اس کے کرب  
 اذیت، غم و اندوہ کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا  
 تھا۔ اس کی گریہ و زاری اور اشکوں کا سیل رواں  
 دیکھ کر ہم سب بھی اپنی آنکھوں کو نم ہونے سے  
 منہ روک سکے۔ وہ مسلسل مجھ سے انصاف کا تقاضا  
 کرتا رہا۔ اُس نے بتایا راول اس کی سر جو رہ بہن کا بیٹا  
 ہے، اُس نے تو یہ سوچ کر اُسے گھر میں مہمان رکھا  
 تھا کہ لڑکی لڑکا دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں  
 بعد میں وہ ان دونوں کی شادی کر دے گا۔ اُسے  
 کیا معلوم تھا۔ وہ ظالم اس کی بیٹی کی جان ہانپنے  
 لگا۔

”لیکن آپ کو یہ اندازہ کیونکر ہوا کہ آپ کی بیٹی  
 کو راول ہی نے ہلاک کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ مگر  
 وہ جو کچھ بتانا چاہ رہا تھا وہ عزیب، غم زدہ مظلوم  
 جنت وال نبوں سے ادا نہ کر سکتا۔ میں سمجھ گیا وہ کیا  
 کہنا چاہ رہا ہے۔

میرے دن پرتاہ (جرگہ، پنجپت، کھٹہ)  
 بھائی گئی قبیلے کے تمام اہم افراد اس میں شریک تھے  
 گو کہ قبیلے کا سردار میں خود ہوں اور صحتی فیصلہ میرا ہی  
 سمجھا جاتا ہے، لیکن میں نوجوان ہونے کے نئے جرگہ

کے بزدگ افراد کا بے مدد لحاظ کرتا ہوں۔ انہی کی آراد کو  
 اہمیت دیتا ہوں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ فیصلہ دراصل  
 جرگہ کے بزرگ افراد کا ہوتا ہے۔ میں صرف اس کی تائید  
 کرتا ہوں اس کی توثیق کرو دیتا ہوں۔  
 اہم سوال یہ تھا کہ راول کو یہی قاتل کیوں سمجھا گیا،  
 اور وہ کیا شواہد تھے جن کی وجہ سے اس خیال کی تصدیق  
 ہوئی۔

سب سے پہلے علی بخش خان کو کھڑا کیا گیا۔ وہ اس  
 واقعے کا مبینی شاہد تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اور عمران  
 بلوچ دونوں پارمی جنرل سے کھجوروں کی بوڑیاں  
 اونٹ پر لا کر شہر پہنچانے کا معاوضہ ملے کر رہے  
 تھے کیونکہ مستو جنرل صاحب سویرے ہی جو سالے کر  
 شہر جا چکا تھا اور شام سے پہلے اس کی واپسی ممکن  
 نہیں تھی۔

بقول علی بخش کے ورنہ وہ مستو سے معاملہ ملے  
 کرتے۔ پارمی اور مستو کی جھگیاں برابر میں ہیں۔ اس  
 وقت وہ پارمی کی جھگی کے سامنے کھڑے تھے جب  
 راول غصے میں مستو کے گھر سے نکلا۔ راول سے  
 تقریباً پانچ منٹ پہلے مستو کی لڑکی پروین بھی گھر  
 سے باہر نکلی، ان دونوں نے کوئی توجہ نہ دی کہ  
 یہ ایسی اہم بات تھی ہی نہیں۔ پھر اس کے تقریباً آدھے  
 گھنٹے بعد اتفاقاً ہی ان کا گزر کھجور کے باغ میں  
 سے ہوا۔ یہ بھی محض اتفاق تھا کہ ان دونوں کی  
 نظر راول پر پڑ گئی۔ وہ کھجوروں کے جھنڈے اونٹ  
 میں تھا اور پروین پر جھکا ہوا تھا۔ یہ اس کے قریب  
 پہنچے تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا کہ پروین  
 کو گھسی نے قتل کر دیا۔ حالانکہ اس وقت دور دور  
 تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بقول علی بخش خان  
 کے راول اس وقت جھک کر پروین کے ٹھلے کے گرد  
 دوڑ پڑا کس رہا تھا۔

”نہیں۔ میں دوپٹے کے بل کھول رہا تھا۔ راول  
 بے اختیار چپٹا۔ وہ سخت وحشت زدہ تھا۔ درجہ  
 خائف میں نے جب پروین کو اوندھے منہ کر کے  
 ہونٹے پایا تو اس خیال سے شاید کہ کسی کیڑے مکڑے  
 یا سانپ کے ڈسنے سے بے ہوش ہوئی۔ ہے،  
 سیدھا گیا۔ ابھی میں پروین کے گلے کے گرد گئے

دوپٹے کی گرہ کھول رہا تھا، جب یہ دونوں اصحاب  
 میرے سر پر آ پہنچے۔ ان کے آنے سے پہلے تو مجھے یہ  
 احساس ہی نہیں تھا کہ پروین سرکل ہے یا زندہ ہے  
 میں بدحواس ہو گیا تھا۔ پریشان تھا۔ میں نے پروین کو  
 نہیں مارا۔ نہیں غلط نہیں ہوئی ہے۔ میں نے گناہ نہیں کیا۔  
 میں نے قتل نہیں کیا۔ قتل اسی نے کیا ہے جو پروین کو  
 دھکیا دیتا تھا۔“

اس کی آواز زندہ گئی اور انکھیں آنسوؤں سے لبریز  
 ہو گئیں۔ اس نے پھر وہی کہانی سنائی جو مجھے سنا چکا تھا۔  
 لیکن اس کی تردید یا تصدیق ممکن نہیں تھی۔ راول کو اس  
 کا نام ہی یاد نہیں آیا جو اس کے خیال میں پروین کا قاتل  
 ہو سکتا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے اپنے  
 آپ کو بچانے کے لیے فرضی قتلہ گھڑا ہے، کیونکہ لڑکی  
 کے بارے میں جھوک کے اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ وہ  
 ایک شریف لڑکی تھی، وہ کسی کے ساتھ راہ و رسم نہیں  
 بڑھاتی تھی۔

راول اپنی بے گناہی پر مصر تھا، لیکن علی بخش خان  
 عمر بلوچ اور چیخ و پکار پر پہنچنے والے دو تین اور لوگوں  
 کے بیانات اس کی تردید کر رہے تھے۔

علی بخش اور عمران کی گواہی پر تو نہ صرف میں بلکہ  
 قبیلے کے باقی افراد بھی یقین کر لے پر مجبور تھے، دونوں  
 با اعتماد تھے۔ شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ خاص طور پر  
 لڑکی کی لاش کی حالت، چہرے پر خراش، زخم اور  
 پھٹا لباس کچھ اور ہی کہانی کہہ رہے تھے، لاش کے  
 پوسٹ مارٹم کا مشورہ میں نے دیا مگر لیکن میری طرح  
 اکثریت کی رائے یہ تھی کہ اب لاش کی مزید بے عزتی  
 مناسب نہیں۔ یہ قبیلے کی عزت کا سوال ہے۔

بات روز بروز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی۔ لڑکی  
 زمین پر گری کھجوریں چیننے باغ میں گئی ہوگی۔ ایسا ہوتا  
 رہتا ہے۔ عزیز لوگ ہیں اور بچے پیچھے گری ہوئی  
 کھجوریں اٹھا لیتے ہیں۔ انہیں جیتے ہیں۔ ان کے عوض  
 انہیں چند سیکے روپے مل جاتے ہیں۔ مقولہ پروین  
 راول ہی سے بچنے کے لیے گھر سے نکلی ہوگی، کیونکہ  
 باپ کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے وہ راول کی طرف  
 سے خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہوگی۔

راول لڑکی کے پیچھے گیا اور باغ میں اسے تنہا دیکھ

کر اس پر مجرمانہ حملہ کیا ہوگا۔ مثنوی کی مدافعت پر طیش میں آکر اس کا گلا گھونٹ دیا ہوگا۔ راول کے بہت جلد غصے میں آنے اور غصے کی حالت میں ہوش نہ ہو اس کا ساتھ چھوڑ دینے کی عادت کے بہت سے لوگ گواہ تھے۔ اپنے علاقے میں بھی کسی معمولی سی بات پر اس نے بہت دوستوں سے شدید جھگڑا کیا۔

یہاں تک کہ نوبت مارکٹاں تک پہنچ گئی۔ اسی لیے اس کے باپ نے شاید ماحول تبدیل کرنے یا پھر اس کے متعلق دوستوں سے بیٹے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی نظروں سے دور یہاں بھیجا تھا۔ راول پر قتل کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ اور اس کی سزا فیصلہ بھی ہو گیا۔

قبائلی رسم و رواج کے مطابق جرگے کے فیصلے پر فوراً عمل درآمد ہو سکتا تھا۔ حکومت پاکستان جرگہ کے فیصلہ پر مداخلت بھی نہ کرتی۔ لیکن سیرانچال سے کہ اب ہم ایک آزاد وطن کے شہری ہیں اور پاکستان کے قانون کے پابند ہیں۔ اب ہمیں اپنے طور پر قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔

یہ جس کی ذمہ داری ہے وہی پوری کرے۔ چنانچہ میرے مشورے پر راول کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

کتنا عرصہ ہو گیا تھا پری سے ملنا تو دور کنار اس کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں مل سکا تھا، گو کہ میں پہلے بھی اس سے روز روز ملنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ ہماری ملاقاتیں کئی کئی دنوں کے فاصلے پر محیط ہوتی تھیں۔ ابتدا میں تو تعلیم کے سلسلے میں اپنے علاقے سے دور رہا۔ لیکن بابا سائیں کی وفات سے چھ مہینے پہلے تعلیم مکمل کر کے جب آیا تو یہاں کے رسم و رواج، عادات و خصائل اور لوگوں کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں تو پری سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں ہمارا ہمارے تھے، ان کے حکم پر میں اپنی زمینوں کے معائنے پر نکلا تھا۔

ہمارا زیادہ تر رقبہ ریتی زمین پر مشتمل تھا، جو چھوٹی بہت زمین زرخیر تھی، اسے بھی سیم چاٹ

رہی تھی، ناخدا نظر سفید سفید پاؤں میں زمین کی خالی رنگت جھپٹی نظر آتی تھی۔ کچھ قطعاً زرخیر زمین کے بھی تھے۔ میں ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے کھجوروں کے اس باغ میں جا کر جہاں پری بھلتے سورج کی سنہری کرنوں میں نہانی اجاگم سیر کی نظروں کے سامنے آئی۔

اس نے اپنے دوپٹے کا ایک پتو اپنے سر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے پتو کو ایک خاص انداز میں کمر کے گرد باندھ کر اسے بھٹلے یا ٹوکری کی سی شکل دے دی تھی۔ اس میں وہ بڑی پھرتی سے نیچے گری ہوئی راکا دکا کھجوریں ڈالتی جا رہی تھی۔

”کون ہو تم؟ اور یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں نے کھجور لہجے میں رعب سے پوچھا۔

”پہنڈر کھجوریں اچن رہی ہوں، وہ سہمی ہوئی بولی۔ یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، مگر کس کی اجازت سے۔“

”کسی کی بھی نہیں۔ سائیں، آپ کہیں تو میں آپ کو واپس کر دیتی ہوں۔“

اس کی معصوم سی پیش کش پر میرے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کسی حد تک نرمی سے کہا۔

”نہیں، اس کی مزودت نہیں۔ ابھی میں نے تم سے پوچھا تھا کون ہو تم؟“

”جی میں پری ہوں۔ میرا مطلب ہے پر۔“

”ہاں۔ ہو تو واقعی ایک پری“ میں نے اس کی بات سکاٹ کر کہا۔ وہ اس وقت میرے سامنے ایسے رخ پر کھڑی تھی کہ سورج کی گدنی کر نہیں اس کی سانولی رنگت کا درد مکاریاں تھیں، شوح رنگوں کے بڑے بڑے پھولوں والے شلوار سوٹ میں ملبوس، کمانوں میں جھولتے آدینے، سیدھی مانگ نکال کر کس کے چوٹی کی ہوتی تھی۔ ماتھے کے اوپر بالوں کی میڈھیال جو اس کی دویشیزئی کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس کی غزال آکھوں میں جھنجھلاہٹ اور پیریشانی کا تاثر بہت واضح اور بہت دل فریب لگ رہا تھا۔

”میں نے پوچھا، کس کی بیٹی ہو؟“

”آپ بابا سے سیری شکایت لگائیں گے؟“

رو ہانسی ہو کر بولی۔

”تم کس کے بابا سے خوف زدہ ہو؟ میرے یا اپنے بابا سے؟“ میں نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔  
”ڈرتی میں کسی سے نہیں ہوں۔ وہ ایک دم اگڑ کر بولی۔ اس کے چہرے کے تاثرات فوراً ہی بدل گئے تھے۔“ جو میرے دل میں آتا ہے کہ گزرتی ہوں۔ میں تو ذرا اپنے بابا کی ناراضگی کے خیال سے پریشان ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے باہر زیادہ گھومنے سے منع کیا تھا نا۔“

”تو پھر کیوں اس طرح گھومتی پھرتی ہو؟“

مجھے اس مقامی لڑکی سے گفتگو کرنے میں خلاف توقع مزا آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لیل تاثر بدلتا تھا، اور ہر تاثر اتنا واضح اور بھرتور ہوتا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار اپنی پوری دلچسپی اور توجہ اس کی طرف مبذول کر لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میرے پوچھنے پر وہ سادگی سے بولی۔

”کیا کروں، اپنے گھر میں میرا دل ہی نہیں لگتا؟“  
”کیوں کیا کہیں اور لگ گیا؟“ میری اس بات پر اس کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لڑکی ذہین تھی۔ فوراً بات سمجھ گئی تھی۔ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

”میں اپنے گھر میں اکیلی ہوتی ہوں اس لیے بابا کتاب سے زیادہ باہر نکلنا کروں۔ گھر میں بیٹھ کر کام کروں۔ مگر میں بابا کے کام پر جانے کے بعد سیکھتے، رقیقہ یا چاچی جندن کے گھر چلی جاتی ہوں، کبھی کبھی وہ بھی میرے پاس آ جاتی ہیں۔ محل کے بیٹھے ہیں تو باتوں میں وقت اچھا لگ جاتا ہے اساتھ ہی ہم سب کھجور کے پتوں سے اپنی اپنی چٹائیاں بھی بنتی جاتی ہیں۔“

”اچھا تو تم چٹائیاں بھی بن لیتی ہو؟ میں نے حیرت سے کہا۔

”اور نہیں تو کیا۔ چاچی جندن کہتی ہے چٹائی بننے میں میرے ہاتھ ساری مرگئیں سے زیادہ تیز چلتے ہیں۔ مجھے تو کبھی کے پتوں سے چارپائی کا بان، ٹوکریاں اور چنگیس بنانا بھی آتی ہیں۔ میں ان پر بڑے خوبصورت ڈیزائن ڈال لیتی ہوں۔“  
اس کا لہجہ بے حد مغز یہ تھا۔ وہ اس طرح دلو

نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، جیسے کھجور کے پتوں کو مختلف کارآمد شکلوں میں ڈھال لینا صرف اسی کا کمال فن ہو۔ یہ ہنر تو یہاں کی ہر لڑکی اور عورت کے پاس ہوتا ہے۔ اسی ہنر کو کام میں لانا کہ وہ مشقت کے اس کھٹن سفر میں مردوں کے شانہ بشانہ قدم ٹرھلتے ہوئے بھوک اور عزت کے عنصریت کے خوفناکی کو قدم سے کم کر لیتی ہیں۔ پھر کلاس سے میری دوسری ملاقات بابا کی وفات کے بعد ہوئی، جب سرداری کی دستاویز سے سر پر رکھی جا چکی تھی۔

وہ بھوک سے باہر رود ایک کھلے میدان میں اپنے اونٹ کو چارہ ہی تھی، کبھی ہش ہش کر کے اونٹ کا رخ کسی سبز کانٹے دار جھاڑی کی طرف کر دیتی۔ کبھی خود پتے توڑ کر کھلاتی اور کبھی اس کی پشت اور گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگتی۔

میں گاڑی روک کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا، حیرت انگیز بات یہ تھی کہ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود میری یادداشت میں نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ نام تک محفوظ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھی میری طرف آئی، اور مویوب ہو کر سلام کیا۔ میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور مسکرا کر کہا۔

”اونٹ کی سیوا پور ہی ہے مہربان پری!“  
”ہاں جی۔ بابا کہتا ہے جو روزی کا وسیلہ ہو، اس کی خدمت کرنی چاہیے، اور عزت بھی!“  
”بس یہ ایک ہی اونٹ ہے تمہارے باپ کا، یا اور بھی ہیں؟“

”پہلے ہمارے تین اونٹ (اونٹ) تھے، ایک تو بیمار ہو کر مر گیا۔ دوسرے کو اماں کی بیماری کی وجہ سے بیچنا پڑا۔ اب صرف ہی ایک ہے۔ مگر چاری گزر بسر کو یہ ایک بھی کافی ہے۔“

”تم تو کہتی تھیں کہ تمہارا بابا تمہیں گھر سے نکلنے نہیں دیتا۔ اب بستی سے باہر اتنی دور ویرانے میں یہاں اکیلی ہو۔ آج تمہارے باپ نے منع نہیں کیا؟“  
”کمال ہے آپ کو اس دن کی ہر بات یاد ہے؟“  
وہ تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔

”ویسے بابا نے مجھے اونٹ چرانے کو نہیں کہا۔ وہ

تو شہر گیا ہوا ہے، پاری چاچا کے ساتھ۔ میرا پناہ دل  
سیر کرنے کو چاہ رہا تھا، اس لیے ارنٹ کے ساتھ چلی  
آئی۔

”ڈر نہیں لگا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں۔ اپنے علاقے میں ڈر کیسا۔“

”مجھ سے بھی نہیں ڈرتیں؟“

”نہیں۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

”ڈرتی نہیں ہو تو آؤ میرے ساتھ بیٹھو۔ اس طرح

دھوپ میں کھڑی ہو کر باتیں کرتی رہیں، تو اور بھی  
کالی ہو جاؤ گی!“ میں نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے

کہا۔

”میں بیٹھوں؟“ اس نے حیرت سے کہتے ہوئے

قد سے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

”نہیں جی، مہربانی آپ کی۔ یہ دھوپ ہمیں کالی نہیں

مضبوط اور بہادر کرتی ہے۔“

سخت موسموں سے مقابلہ کرنا سکھتی ہے، دھوپ

تو ہماری گہری پہلی کی طرح ہے۔“

”تو کیا مجھے بھی اپنا گہرا دوست بننے دو گی؟“

”یعنی آپ ہمارے لیے تیکھی دھوپ بنا چاہتے

ہیں، جو مجلسا کے رکھو دے؟“

وہ مدبرانہ لہجے میں بولی۔ اپنے پچھلے جلے کا

لسلسل برقرار رکھتے ہوئے اس نے خاصی گہری بات

کی تھی۔ بہت خوبصورت انداز میں اس نے مجھ پر

مرد و عورت کی اس بلا جواز دوستی پر اپنی ناپسندیدگی

ظاہر کر دی۔ یہ جتنا یا کہ ایسی دوستیاں کسی لڑکی کے

لیے آفات کا دروازہ کھول سکتی ہیں۔ معصومیت

میں چھپی اس کی ذہانت نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

وہ واقعی سوچنے والی لڑکی تھی، مجھ وار تھی، مجھے

بے حد پسند آئی۔

مجھ میں آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں اُسے

اپنے ڈھب پہ لے ہی آیا۔ اس کے لیے مجھے کچھ

روایتی اور کچھ غیر روایتی طریقے بھی اپنانے پڑے،

لیکن بالآخر مجھ کو گھار کے پہلا پھسل کے، جتنا جتنا کے

میں اُسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ وہ

میری محبت کی پناہوں میں آچکی ہے، جی ہاں کچھ عرصے

کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ محض وقتی اُبال نہیں ہے

میں اسے کچھ زیادہ ہی پسند کرنے لگا ہوں۔

پری کے مزاج کے مطابق چلنے کے لیے اس سے

میلے ہوئے کبھی میں نے حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش

نہیں کی۔ وہ جو شروع میں کچھ ہی سہمی سی دکھائی دیتی

تھی، اب مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی۔

عربی میں تقرب تھی، میرے چچا زاد کی سنگتی

تھی۔ میں باہر کی جھوٹے بھانڈے سے چمکے سے نکل

آیا تھا، اور اپنے کمرے میں لیٹا تھا، خوابیں جب رگ

کرتے لڑکی والوں کے ہاں چلی گئیں تو کنگنیوں کی

کھنکھ کے ساتھ مجھے پری کی کھنکھی آواز سنائی دیا۔

”اٹھیں خان بیٹی! چائے کے ساتھ سردو

کی گولی لے آئی ہوں!“

”پری تم!؟“ میں اٹھ بیٹھا۔ وہ اس وقت ہاتھوں

میں چاندی کے کنگن، کانوں میں چاندی کے اوریبلے

اور شاید پاؤں میں پازیل کے ساتھ خاصی ہی سنوئی

نظر آ رہی تھی۔ لباس میں نسبتاً قیمتی تھا، عام دنوں

سے زیادہ پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

”تم بیان کیسے؟“ میں نے چلنے کا کپ اٹھایا۔

”آپ کو معلوم تو ہے۔ وڈی خانم نے بلوایا

تھا۔ میرے ساتھ اور بھی لڑکیاں آئی ہیں، شادی کا

گھر سے ناں۔ کام بڑھ گیا ہے، حویلی کی نوکرائیوں کا

کا ہاتھ بٹانے کے لیے وڈی خانم نے بابا سے کہہ کر

بلوایا تھا۔ کام تو کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن مزاج بھی آرا

ہے حویلی کی چہل پہل میں۔“

اُس کے چہرے پر بچوں جیسی معصوم خوشی تھی،

میں نے دلچسپی سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے

ہوئے کہا۔

”تمہیں مزہ آ رہا تھا، تو رسم کے لیے خواتین کے ساتھ

چل کیوں نہیں گئیں؟“

وہ حیرت سے بولی، ”کمال ہے خود ہی تو نواز

سے کہہ کر مجھے رکنے کی ہدایت کی تھی۔ اُسی نے جکے

سے مجھے آپ کا پیغام دیا کہ سنگتی کی رسم کے لیے

سب کے ساتھ نہ جاؤں۔ حالانکہ کہہ تو سب رہی تھیں

کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔“

اصل میں سکینہ، رقیہ اور شبنون نے ساروں

کو بتا دیا کہ مجھے لگانا بھی آتا ہے۔ سب چمچے پڑ گئے۔

تو مجھے مجبوراً گھوٹ، کنوارا رولہا، ولہن کے پیسے سہرے گا نا پڑے۔ آپ کی اماں جان اور بہنوں کو میری آواز بہت پسند آئی۔ انہوں نے بھی کہا کہ لڑکی والوں کے گھر چلوں۔ میں وہاں جا کر گھاتی، تو مدین اور بھی زیادہ ہوتی۔“

”لیکن تم نے یہاں کی رونق بڑھانے کا فیصلہ کیا۔“ میں کھل کر مسکرایا۔ وہ بھی خوشدلی سے ہنس پڑی۔

”میں نے یہاں بنا دیا کہ بہت تھک چکی ہوں یا کسی اور سانی کے ساتھ آرام کروں گی، اور بوا سا بے بھی نہیں گئی۔ دونوں بوڑھی ہیں نا، اس لیے رُک گئیں۔ وہ دونوں اپنی اپنی گھوٹری میں آرام کر رہی ہیں۔“

”بڑی مہربانی سرکار! تم نے میری خاطر تقرب کر چھوڑا؟“ میں نے کہا اور نیم دراز ہو کر گہری نظر سے اس کے سر ایسے کو دیکھنا رہا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دیکھنے لہجے میں پوچھا۔

”میری کیا واقعی تمہیں میرا بہت خیال ہے؟“ وہ شرمائی۔ ”کیا نہیں ہونا چاہیے؟“

”کیوں نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہے تو میں نے اسے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔“

”یہ کیا ہو گیا تھا مجھے لیکن میں سمجھتا ہوں اس میں غیر کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ اتنی اچھی جوگدی تھی اور میں سمجھا۔ وہ بھی آمادہ ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہر حال اس کی حالت دیکھ کر دن ضرور ہوا۔“

چمکتی کوئل تیری اس سانچے کے بعد غم دانہ وہ گانٹھویر بن گئی تھی۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا اس پر اسے افسوس سے اور کیا کیا جاسکتا تھا۔ ازلے سے جو میرے نزدیک معقول صورتیں تھیں۔ وہ سانسے پیچ کر دیں۔ لیکن ان میں سے وہ کسی پر راضی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک اس مسئلے کا کوئی حل تھا۔ پھر جانے مجھ سے کہا تھا۔

”سائیں! عزت سب کی برابر ہوتی ہے، امیر اور غریب۔ بہتر یہی ہے کہ جلد از جلد مجھے عزت

سے اپنے گھر لے جاؤ۔ ورنہ تمہارا مکروہ چہرہ دنیا کو دکھاتے ہوئے میں ذرا نہیں بچکچاؤں گی، تمہارا پول کھول دوں گی۔ تم جو آج کل کسی بڑے وزیر کی بیٹی سے شادی کے ارادے باز رہے ہو، تمہاری اصل بد صورتی دیکھنے کے بعد وہ وزیر اپنی بیٹی، چالیس مربع زمین اور فیکٹریاں وغیرہ، نہیں دینے سے پہلے سو مرتبہ سوئے گا۔ دیکھو خان! مجھے تم اپنا لوہے شک پھر اپنی نوکرانیوں میں ہی شامل کروانا پھر چاہے امیر کبیر لوگوں میں ایک نہیں، دو دو ٹاپاں کر لینا۔ مجھے انتظار نہیں ہوگا۔ مانا کہ میں بہت عزیز، بہت حقیر رہی، ہو سکتا ہے میری سچی بات پر زیادہ ٹوک لیتیں نہ کریں۔ لیکن پھر بھی سب کو ضرور بتاؤں گی۔ لیکن بہتر یہی ہے اپنی اس محنت کا ثبوت دو جو تم ہر ملاقات میں مجھ سے جتانے لگتے ہیں ابھی تم سے اتنی مایوس نہیں ہوتی۔ لیکن ہے تمہارے اندر ذرہ برابر انسانیت کی رشت باقی ہو۔“

”یار میری! کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ سب کچھ تو میں اچانک ہو گیا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے سنا کر دو، میں واقعی تم سے محنت کرتا ہوں اور تم سے ہی شادی کروں گا۔ لیکن ذرا صبر تو کرو۔“

”نہیں۔ اب اور انتظار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

”تم نے جو میرے کردار پر واضح لگایا ہے، تقرب پھیل کر وہ لوگوں کی نگاہوں میں آجائے گا۔ اگر

**بیوٹی بکس کا تیار کردہ**

# سوہنی میرائل

قیمت: 60 روپے

مکتبہ عمران ایٹھسٹ 37، آرڈر بازار کراچی

واقعی مجھ سے مخلص ہو تو پھر طلبہ کی آمد۔ ورنہ یاد رکھو۔ اب مجھے اپنی رسوائی کی بھی فکر نہیں رہی۔ راول نے کہا ہے۔ سوہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گا۔ راول کو تم نے میرے متعلق بتا دیا؟ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”نہیں ابھی نہیں بتایا۔ وہ اتنا ذہین ہے کہ میری حالت دیکھ کر اُسے میرے اوپر غور کرنے والی قیامت کا خود بخود علم ہو گیا۔ وہ اس آدمی کا نام جاننا چاہتا ہے جس نے مجھے تنہا عذوں کے بیٹے تھل میں پھنکے پیر و حکیل دیا ہے۔ مگر میں نے ابھی اُسے کچھ نہیں بتایا۔ یہ فیصلہ اب تم کو کرنا ہے کہ تمہیں اپنی اور میری عزت کا بھرم قائم رکھنا ہے یا اپنی خباثتوں کی شہرت کروانا منظور ہے۔“

میں پرہیزگاری کا یہ انداز دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک عزیز اور کمزور لڑکی کی طرف سے ایسا رد عمل میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ بھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ اُس کے غضب ناک لہجے میں ارادوں کا استوکار جھلک رہا تھا۔ وہ غصے اور نفرت کی انتہا میں ساری حدوں کو چھلانگنے کے لیے تیار تھی۔

بالآخر میں نے گہری سانس لیتے ہوئے ہار مان لی۔ ”اچھا ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔ میں تم سے نکاح کر لیتا ہوں، ارادہ تو میرا پہلے بھی یہی تھا۔ مگر میں کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جب تک میں خود تمہارے بابا سے بات نہ کروں، تم میرے متعلق کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ راول کو بھی نہیں۔ اور ہاں کل کچھ روں کے اُس جھنڈ میں آنا جہاں ہم پہلی بار ملے تھے مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”کیا بات کرنی ہے؟ ابھی کر لو۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ مجھے ابھی اس حوالے سے کچھ معلوم کرنا ہے۔ تمہارے لیے وہ بات بہت اہم ہے ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گا۔“

لیکن کچھ روں کے اسی جھنڈ میں ہی کیوں کہیں اور کیوں نہیں؟

”آؤ سوکھی بخت کرتی ہو۔“ میں ہنساتی ہوں اپنی محبت کو آخری مرتبہ وہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں

جہاں پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ تم جواب میرے لیے ایک محبوب ترین ہستی ہو، شادی کے بعد صرف ایک بیوی بن جاؤ گی۔ ظالم اور ماکم بیوی، جس کے آگے تمہارا یہ عزیز خادم بھی دم نہیں مار سکے گا۔

میں پاپتا ہوں تمہارے بیوی بننے سے پہلے اپنی پرہیزگاری کا معصوم جہرا اور خوبصورت باتوں کو ہمیشہ کے لیے دل میں قید کر لوں۔ کیا اپنے مستقبل کے شوخ کی یہ چھوٹی سی درخواست بھی نہیں مانو گی؟ میں نے مسکین صورت بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرائی۔

”اچھا آجاؤ گی۔ لیکن راول کو کیا بتاؤ گی کہ کہاں جا رہی ہوں۔ وہ یہاں نے پہلے سے مجھ سے تمہارا نام پوچھتا ہے۔ میں نے اُسے بتائے بغیر گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو وہ چھپ کر ہم دونوں کو دیکھ لے گا۔“

”دیکھ لینے دو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن کوشش کرنا وہ یہاں تک نہ آئے۔ صرف پانچ منٹ کے لیے ہی آ جانا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ رضامند ہو گئی۔ میں واقعی پرہیزگاری سے محبت کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کے جھکا دے میں اگر جیسے تھی ایسی باتیں کرے جس سے میرے دل سے اس کی محبت ختم ہو جائے، میں اس سے ہمیشہ محبت کرتا رہتا تھا۔ اس محبت کو اس کرنے کے لیے مجھے نہ چاہئے ہوئے بھی وہ فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نے علی بخش خان اور عرفان بوجج سے کہہ دیا تھا کہ وہ بس راول لگا ہوں سے ادھیل نہ ہونے دیں اور بروقت ہونے پر سہی ہیں۔ باقی کام میرا آدمی خود سنبھال لے گا۔

راول کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد ڈیوٹی پولیس کو میں نے فون کر کے تمام حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ تفتیش کے لیے پولیس کا اپنا کون سا سائٹیفک طریقہ کار ہوتا ہے۔ وہی گواہ، سواہد اور شواہد پیش کیے گئے جو جرم کے سامنے کیے تھے۔

شاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت۔

دی ہی نہیں تھی۔ پولیس کو قبیلے خصوصاً میر سے تعاون کی وجہ سے راول کو سزا دلوانے کے لیے زیادہ تر وہ نہیں کرتا پڑا تھا۔ اس پر وہ میرے شکر گزار تھے۔ لیکن یہ تو میرا فرض تھا۔ میں انصاف کی سر بلندی پر یقین رکھتا ہوں۔ انصاف نہ ہو تو ہر شے کا توازن بگڑ کر رہ جائے۔

جس دن راول کی سزائے موت پر عمل درآمد ہوا، اس دن میں نے سکون کا سانس لیا۔

گو کہ راول کو اس شخص کا نام یاد نہیں آیا تھا۔ جو اس کی ماموں زاد کو دھمکاتا تھا۔ لیکن کسی بھی وقت یاد آسکتا تھا۔ تب یقیناً معاملہ سنگین ہو جاتا۔ پری یعنی پروین کے باپ کی زندگی کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی تھی۔ میں تو اس کا بندوبست کروانے کا موشگرم رہا تھا۔ میں چاہتا تھا۔ پری کی شادی خود

اپنی سرپرستی میں کسی کئی کہیں کے ساتھ کرادوں۔

اس طرح وہ حویلی میں رہ سکتی تھی اور میری دسترس سے دور بھی نہ ہوتی۔ لیکن یہ سب کچھ پری کے باپ

کے مرنے کے بعد ممکن ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا۔ راول نے آکر گڑبڑ

مچا دی۔ ہو سکتا ہے اپنی حیثیت اور حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے وہ کسی گھومتے پر راضی ہو جاتی۔

مگر راول کے ہلکانے پر وہ میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ مجھ سے ٹکرانے پر تل گئی۔ راول نے ہی حقیقت

کچھ سے پری چھینی۔ میرا پسندیدہ چہرہ مجھ سے دور کر دیا۔ وہ میری خوشیوں کا قاتل تھا۔ اور قتل کی سزا بے

موت۔ یہی انصاف ہے۔ آپ جانتے ہیں انصاف کہتے ہیں وزن کے برابر

ہونے کو۔ اعتدال و توازن۔ زندگی اور حسن کو۔ پری نے یہ انصاف ختم کر کے اور توازن کو بگاڑنے کی شعور کی

کوشش کی تھی۔

یہاں جو ایک معزز، شریف اور منصف مزاج،

نویان سرور کے طور پر متعارف ہوں، انہیں چاہتا کہ میرے کردار کے خلاف کوئی ایک حرف بھی کہنے کی جسارت کرے اور میری جو قوفی کی مدد تک جڑاؤں اور جسارتوں کا مظاہرہ کرنے پر تل گئی تھی، اس کی یہ

خواہش کہ اسے حویلی میں لایا جائے پوری کی جاسکتی تھی لیکن جس حیثیت سے وہ آنا چاہتی تھی وہ ممکن ہی نہیں تھا، اس صورت میں حویلی کے وقار و عظمت میں اضافہ نہیں کی جاتی۔

بے حد کمی، کہاں دو دھڑ اور نور میں نہائی ہوئی حویلی کی شان و شوکت دالی خان زواہاں۔ کہاں وہ

ساتوئی اور اس شام جیسی پروین۔ حویلی کا سارا حسن عارت ہو جاتا۔

وہ بھگی کی زمین تھی اُسے وہیں رہنا چاہیے تھا۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا جائے، ہیروں کے

درمیان کوئلہ اور سٹے موتیوں کے ہار کے بیچ بڑنگ بے قیمت پتھر گھوٹا جائے تو کیا دلکشی باقی رہے گی؟

حالانکہ ٹاٹ ہو، کوئلہ یا پتھر۔ ان سب کی اپنی جگہ اہمیت بھی ہے اور خوبصورتی بھی، لیکن یہ اپنے

سے زیادہ قیمتی چیزوں کے درمیان آکر بدنامی کا سبب بن جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا ناں۔ میں بہت حسن پرست ہوں، زندگی میں ہر جگہ، حسن و توازن کو بڑی اہمیت

دیتا ہوں۔ میرے نزدیک جو شے جہاں ہے، جیسی ہے مناسب ہے کسی کی حیثیت بدل دینا، اسے

اس کے اصل مقام سے ہٹا دینا توازن بگاڑ دینے کے مترادف ہے۔ اور توازن میں بگاڑ پیدا کرنے

والوں کو میں کسی صورت۔ برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک یہ ایک سنگین ترین ناقابل معافی

جرم ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ مجرموں کو ان کے جرم کی سزا ملنی چاہیے ناں۔؟





# عجیبے کا

عجیبے پاگل لڑکی ہے، خواہ مخواہ ایک اجنبی سے آنکھنے کھڑی ہو گئی ہے۔ جبکہ غلطی ہی سراسر جاری تھی کس اطمینان سے بیچ سڑک پر یوں چل رہی تھی جیسے ہمارے باب کی جائیز ہو۔ اب اس طرف سے آئے والے کو کیا پتا پھر بیچارے نے موڑ کاٹنے سے پہلے مارن بھی بجایا تھا۔

یہ الگ بات کہ ہم نے اپنی باتوں میں دھیان نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی کی ٹکر کم اپنے حواس کھونے سے زیادہ شائلڈ دور جا گری۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ گاڑی جھکائے جاتا۔ شامت اعمال اثر کر رہی ہو تھینے لگا۔

”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟“ اور شائلڈ اُنہی بجے جھاڑ کر اس کے پیچھے بڑھ گئی۔  
”گاڑی پھلانے کی تمیز نہیں ہے تو چلاتے کیوں ہیں۔ اور یہ آپ جیسے اندھوں کو لائسنس دیتا کون ہے؟“

”دیکھیں میں آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ غلطی سراسر آپ کی ہے۔ شائلڈ کے تیز بولنے کے باوجود اس نے نرمی سے ٹوکا جس پر شائلڈ اور شیر ہو گئی۔  
”میری کیا غلطی ہے، کیا میں جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آئی تھی۔“

”آپ بیچ سڑک پر چل رہی تھیں۔“ اس نے جاری غلطی کی نشاندہی کی جسے تسلیم کرتے ہوئے شائلڈ دھٹائی سے بولی۔

”ہاں چل رہی تھی بیچ سڑک پر لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ ہمیں ٹکر مار کر ہٹائیں۔ مارن بجاسکتے تھے۔“

”میں نے مارن دیا تھا؟“ وہ زور دے کر بولا۔  
”اور میں بہری ہوں کیا جو مجھے سنا ہی نہیں دیا؟“ اور مجھے اس اجنبی پر رحم آنے لگا جو شائلڈ کی اتنی بد تمیزی کے باوجود اتنی عاجزی دکھا رہا تھا۔  
میں نے وہیں سے اشارا کر کے شائلڈ کو اپنی طرف بلا یا لیکن اس نے کوئی ٹولش نہیں لیا۔ تب مجبوراً مجھے آگے آنا پڑا۔ اور اس کا بازو تھام کر میں نے قدرے سختی سے ٹوکا۔

”بس ختم کر شائلڈ۔“ اور اس عرصے میں پہلی بار اجنبی کی نظر مجھ پر پڑی۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔  
”آپ ان کے ساتھ ہیں؟“ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور شائلڈ کے بازو میں چنگلی کاٹ کر سرگوشی میں بولی۔

”کیوں خود کو تنہا بنا رہی ہو۔ چلو“ اور غالباً شائلڈ کو احساس ہو گیا پھر بھی اسے جتا کر بولیں۔  
”اس کے کہتے پر معاف کر رہی ہوں؟“

”ٹھنکس گاڈ۔“ وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔  
”کسی کی بات تو آپ کی کچھ میں آئی ہے۔“  
”کیا مطلب؟“ شائلڈ پھر تیز ہوئی تو وہ فوراً بولا۔

”کوئی مطلب نہیں۔“ پھر ایک دم سیری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ ”شکر یہ، آپ کا احسان یاد رکھوں گا۔“  
”بڑے آئے احسان یاد رکھنے والے ہونہ؟“ شائلڈ نے اسے دیکھ کر سر جھٹکتا تو میں جلدی سے اس کا بازو کھینچ کر کنارے لے آئی۔

”بس اب چپ چاپ چلو، خبردار ایک لفظ بھی کہنا تو۔“

میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی ہمارے قریب  
لا کر بولے۔  
"او کے پھر ملاقات ہوگی! اس کے ساتھ ہی  
گاڑی بھگالے گیا مجھے ہنسی آگئی۔ جبکہ شاملہ جواب دینے  
کا موقع نہ ملنے پر تملانے لگی بگھرا کر بھی وہ اسی بات  
کر بیٹ رہی تھی۔  
"ذرا دیر تک جانا۔ ایمان سے وہ مزہ چکھائی کہ  
زندگی بھر یاد رکھتا۔"

"اچھا میرا بازو تو چھوڑو اور دیکھو میری چیزیں  
سلامت ہیں کہ نہیں! شاملہ میری گرفت سے اپنا  
بازو چھڑا کر شاہرہ میں جھانکتا چاہتی تھی کہ میں نے  
اسے آگے دھکیل دیا۔ کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اس کی  
کسی ایک چیز کو بھی نقصان پہنچا ہوگا۔ تو وہ پھر اس  
سے لڑنے کھڑی ہو جائے گی۔  
"تمہیں جلدی کس بات کی ہے" میرے دھکیلنے  
اور تیز قدم اٹھانے پر وہ جھنجھلا کر بولی اور میں جواب



READING  
Section

میرا خیال ہے جو کچھ تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے اُسے وہ بھی نہیں بھولے گا۔ میں نے کہا تو وہ خوش سے بولی۔

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایسے لوگوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ہوں۔“

”مجھے پتا ہے لیکن اس بیچارے کو تم نے ناحق لتاڑا کیونکہ غلطی ہماری تھی۔“ میں نے بالکل غیر جانبداری سے کہا۔

”اوہو بیچارہ۔ ذرا ادھر دیکھو میری طرف۔“ غلط مطلب نہیں لو، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اور بس اب یہ موضوع ختم۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید بولنے سے باز رکھا تو وہ میرے ہی انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

”ہاں خیر دار۔ اب کون اُس بیچارے کا نام نہیں لے گا۔“ اور میں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پائی تھی۔

شائلہ اور میری دوستی کی عمر بھی اتنی ہی تھی جتنی ہم دونوں کی۔ ساتھ ساتھ گھر ہونے کے باعث چار شروع ہی سے ہم وقت کا ساتھ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کون بھائی بھی نہیں تھا۔ اس لیے اُس کا زیادہ وقت ہمارے گھر گزارنا اور جب اُس کی امی اُسے بلائیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔

اسکول میں بھی ہم ساتھ داخل ہوئیں اور کالج میں بھی۔ ہمارا خیال تھا ہم انٹر کے بعد یونیورسٹی جوائن کریں گے۔ لیکن اُس سے پہلے ہی شائلہ کے ابو کا میا لکھنؤ ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ ایک سی سی گورنمنٹ ادارے میں ملازم تھے۔ میں نے اور شائلہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی۔ اُس وقت ہم دونوں کا ہی ردرو کر بُرا حال تھا۔ اس کی امی اُسے بہلا بہلا کر تھک گئیں کہ وہ ہر سال چھٹیوں میں اُسے کراچی لے آتا کریں گی، اور میرے گھر میں امی آپلی اور بڑے بھیا بھی مجھے ایسے ہی بہلا رہتے۔

”بھئی میا لکھنؤ کون سا دور ہے۔ تم جب کہو

گی میں تمہیں لے جاؤں گا۔ بڑے بھیا نے مجھے بہت یقین دلایا تھا۔

بہر حال یہ سب بہلاؤ سے تھے۔ دو سال ہو گئے تھے شائلہ کو میا لکھنؤ گئے ہوئے نہ تو اُس کی امی پھیلوں میں اُسے لے کر آئیں نہ بڑے بھیا مجھے میا لکھنؤ لے کر گئے۔

گزشتہ سال آپلی کی شادی پر مجھے یقین تھا کہ شائلہ ضرور آئے گی اور وہ آنا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق سے انہی دنوں اُس کی امی بیمار ہو گئی۔ ہمیں بہر حال ہمارے درمیان خط و کتابت باقاعدگی سے جاری تھی، جس سے ہماری دوستی اب بھی اسی طرح قائم تھی۔

اور جب میں بی اے کے امتحانوں سے فارغ ہوں تو شائلہ اچانک اپنے امی ابو کے ساتھ آگئی۔ اور میں جو فراغت کے تصور سے ہی پریشان ہو رہی تھی۔ اُس کی آمد پر بے انتہا خوش ہو گئی۔ اصل میں اُس کے امی ابو عمر کرنے جا رہے تھے اور وہ صند کر کے اُن کے ساتھ آئی تھی کہ اتنے دن وہ میرے ساتھ رہے گی، سچ میری تو عید ہو گئی تھی۔ پوری رات ہماری باتیں کرتے گزر جاتی اور دن میں کسی پرانی دوست سے ملنے کا پروگرام بنتا۔ یا سائل پر جانے کا یا پھر شاپنگ۔ آج بھی ہم شاپنگ کر کے آرہے تھے کہ راستے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اوس اُس وقت سے تو شائلہ مان نہیں رہی تھی۔ رات میں اچانک جلنے کیا خیال آیا کہنے لگی۔

”سنو، غلطی واقعی ہماری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ اُسے اتنا بُرا بہلا کہہ دیا۔“

”کسے؟“ میں فوری طور پر سمجھی نہیں اور وہ شہزاد سے آنکھیں نیچا کر بولی۔

”اُس بیچارے کا ڈی والے کو با۔“ اور پھر پتھارا۔ ذرا میری طرف دیکھو۔ میں نے اسی کی بات دہرائی لیکن پھر خود ہی سٹپٹا گئی۔ کیونکہ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اور وہ بھی معنی خیز مسکراہٹ اور نظروں سے۔

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“ مجھے غصہ آ گیا۔

”لو میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔“

ایسے دیکھو بھی مدت ورنہ یا میں نے تیکہ اٹھا کر اس کے متر پردے مارا۔ پھر کتنی دیر تک ہمارے درمیان ٹیکوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

ان دنوں امی، بڑے بھیا کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔ یوں تو آئی کی شادی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن درمیان میں وقفہ آجاتا کیونکہ بڑے بھیا ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے جس سے امی کا جو خوش سر و پڑ جانا اور تنگ آکر وہ بڑے بھیا پر چوڑ دیتیں کہ وہ خود ہی جب کسی لڑکی کو پسند کریں گے تب امی بات آگے چلائی گی۔ اور بڑے بھیا پتا نہیں کیا سوچے ہوئے تھے۔

نہ خود پسند کرتے، اور ہماری پسند کو بھی ریجکٹ کر دیتے۔ بہر حال ان دنوں امی کو پھر سے بھیا کی شادی کے لیے فکر مند دیکھ کر مجھے شائلڈ کا خیال آیا۔ اگر بھیا راضی ہو جائیں تو شائلڈ ہمیشہ اس گھر میں رہ سکتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اسی وقت بھیا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ یقیناً اس وقت میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ جیسے بھیا مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”لگتا ہے، تمہارے باندے پر انعام نکل آیا ہے۔ کتنے لاکھ کا ہے؟“

بشٹ آپ، جاؤ اپنا کام کرو۔ بھیا کے ڈانٹنے پر میں کچھ ڈر کر اٹھ کھڑی ہوں اور جاتے لگی کہ بھیا میرا ہاتھ پکڑ کر پھر اپنے پاس بٹاتے ہوئے کہنے لگے۔

بہت غلط بات کہیں تم نے سمیڈہ شائلڈ تمہاری دوست ہے اور میں نے اسے ہمیشہ تمہاری طرح ہی سمجھا۔ تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔

اس میں کوئی برا تو نہیں ہے۔ میں نے منہ پھلا کر کہا۔

”پھر بھی میں مناسب نہیں سمجھتا اور دیکھنا لازم ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوڈ ٹینک کرو اور جاؤ کھیلو۔ بھیا نے یوں کہا جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔ میں ہنستی ہوں ان کے کمرے سے نکل کر آئی تو شائلڈ پر نظر پڑی۔ وہ ریٹنگ پر ہیکل نیچے دیکھ رہی تھی۔

کیا دیکھ رہی ہو؟ میں نے اس کے قریب آکر کہا تو وہ چونکتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”کہیں نہیں، بھیا کے کمرے میں تھی۔ چلو نیچے چلتے ہیں؟“

”صرف نیچے نہیں کہیں باہر چلو۔ میں لور ہور ہی ہوں۔“ وہ ریٹنگ چھوڑ کر میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولی۔

”امی سے تم اجازت لو۔ مجھے تو ڈانٹیں گی۔ میں نے اس کے ساتھ مجھے آتے ہوئے کہا تو وہ فوراً مجھے چھوڑ کر امی کے پاس چلی گئی اور ان سے آپ کے گھر جانے کی اجازت لے کر آئی تھی۔

پھر آپ کے گھر ہم صرف پندرہ منٹ بیٹھیں۔ وہ بیجاری روکتی رہ گئیں کہ رات کے کھانے تک رگ جاؤ۔ اس کے بعد وہ اور دو لہا بھائی خود ہمیں گھر چھوڑ آئیں گے اور میں بھی رکتا چاہتی تھی لیکن شائلڈ جانے کیا سوچ کر آئی تھی۔ آپ کے اتنے اصرار پر ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر لجاجت سے بولی۔

”پلیز آئی، مائند نہیں کریں۔ ہم پھر آئیں گے۔“

”اس وقت کہیں اور جانا ہے کیا؟“ بالائے آں گمہ گیس۔ اور میں منع کرنا چاہتی تھی لیکن شائلڈ فوراً بول پڑی۔

”کوئی باندے واڈ نہیں نکلا۔ بس ابھی ابھی لکھے ایک خیال آیا ہے۔ اگر آپ میرے خیال سے متفق ہو جائیں تو میں نے تجسّس پیدا کرنے کی خاطر بات ادھوری چھوڑ دی۔ تو بھیا اونچے ہو کر بیڈ کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔

”گو ما تمہاری خوشی کا دار و مدار میرے متفق ہونے پر ہے اور اگر میں متفق نہ ہوں تو؟“

”نہیں بھائی ایسی بات نہیں کریں۔ میں نے پہلے ہی سے خوشامد شروع کر دی تو وہ ہنس کر بولے۔

”اپنا خیال تو بتاؤ۔“

”وہ آپ کے لیے شائلڈ کسی رہے گی، میرا مطلب ہے ہمیں شوق سے اپنا مطلب واضح کرنے لگی تھی کہ بھیا نے سختی سے لوگ دیا۔

”سمیڈہ!“

”آپ میری پوری بات تو سنیں!“

• بی آپی! وہ ہماری دوست سیو ہے ناں اس سے ملنے جانا ہے۔ لیکن آپ خالہ جان کو نہیں بتائیے گا۔ کیونکہ آپہوں نے صرف آپ کے ہاں آنے کی اجازت دی ہے۔

• ہاں مجھے پتا چلا ہے کہ تم دونوں بہت آوارہ گردی کرنے لگی ہو۔ آپی نے کہا تو میں بیخ پڑی۔ آف آوارہ گردی۔ کوئی اچھا لفظ استعمال کروں آپی!۔

• اس کا متبادل اچھا لفظ تم ہی بتادو۔  
• وہ کیا کہتے ہیں؟ میں نے شمالیہ کو دیکھا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہوئے بولے۔  
• راستے میں موقع لینا۔ اچھا آپی ہم چلتے ہیں۔ وہ آپی کو خدا حافظ کہہ کر مجھے اسی طرح کہتے ہوئے باہر نکلے آئی۔

• یہ صبیحہ کون ہے؟ بس اسٹاپ برا کر میں نے اچانک یاد آنے پر اس سے پوچھا۔ جیسی دین آکر لگی تو وہ میری بات نظر انداز کر کے دین میں سوار ہو گئی اور مجھے بھی جلدی چڑھنے کا اشارہ کیا۔ دین کچھ بھری ہوئی تھی، جیسی راستے میں مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ساحل کے قریب اترتے ہی میں اس پر چڑھ دوڑی۔

• ابھی برسوں ہی تو ہم سیاں آئے تھے۔ تمہارا دل نہیں بھرا۔ اگر امی کو معلوم ہوگا تو!۔  
• میں تو نہیں بتاؤں گی۔ میرے بگڑنے کا نوٹس لینے بغیر وہ لہروں کی شوخیاں دیکھتی ہوئی لا پرواہی سے بولی تو میں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اس پر کچھ اثر نہیں ہونا تھا۔

• چند دنوں کی بات ہے، پھر تو میں چلی جاؤں گی بدھیری خاموشی محسوس کر کے وہ کہتے لگی، اور تپا ہے سمیٹے! مجھے تمہارے ساتھ گزرتے یہ سارے لمحات بہت شدت سے یاد آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں رو پڑتی ہوں اور کبھی ابو سے بہت مند کرتی ہوں کہ دوبارہ کراچی ٹرانسفر کروالیں۔ لیکن اب امی نہیں مانتیں کیونکہ وہاں میری خالہ اور ماموں وغیرہ ہیں۔  
• ظاہر ہے اب وہ اپنے بہن بھائیوں کے قریب رہنا چاہتی ہوں گی!

• ہاں لیکن مجھے وہاں بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتی کہ میرے دن کتنے بورد گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے اڑ کر تمہارے پاس آجاؤں۔ اس کی اتنی محبت پر میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

• مجھے پتا ہے شمالیہ کیونکہ میں خود تمہاری دوری کو شدت سے محسوس کرتی ہوں۔ میری آواز کے بوجھل بہن نے اسے چونکا دیا پھر میری لہریز آنکھیں دیکھ کر وہ ایک دم میرے گلے لگ گئی۔

• خبردار رونانا نہیں! اس کی پیار بھری وارننگ بدم میں ہنس پڑی۔  
• میں رو نہیں رہی افسوس پلینز مجھے چھوڑو اسب لوگ متوجہ ہو رہے ہیں!

• ہونے دو! اس نے پہلے زور سے مجھے ہینچا پھر الگ ہوئی۔  
• تو بہ۔ تم نے تو میری بڑیاں چٹخا دیں! میں نے گہری سانس لینے کے اندر اتار تے ہوئے کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کیبل ریت پر چلنے لگی، باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر پہلے مجھے ہی احساس ہوا شام اتر رہی تھی اور ہم دونوں اکیلے تھے جب میں نے اسے احساس دلایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔

• بس اب فوراً چلو اور دعا کرو۔ ہمیں سے دین مل جائے ورنہ اتنی دور چلنا پڑے گا۔ کچھ دیر پہلے جتنا اچھا لگ رہا تھا اب اتنا ہی ڈر لگنے لگا تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے میں نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور دور تک دین کا نام و نشان نہیں تھا۔

• پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قسمت میں ڈانٹ لکھی جا چکی ہے لہذا اب آرام سے چلو! اس نے کہا تو مجھے غصہ آگیا۔  
• تمہیں کیا لگتا ہے تم تو صاف بیچ جاؤ گی!  
• نہیں تمہارے حصے کی مار میں کھالوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ اب خدا کے لیے ذرا دم لو، میرا سانس پھول گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تبھی ایک گاڑی ہمارے بالکل قریب سے گزری، ہم دونوں اچھل کر پیچھے ہٹیں اور ابھی سینل بھی نہیں تھیں کہ وہی

گھاڑی رپورس ہو کر پھر ہمارے قریب آن رکی اور اس میں بیٹھا اس روز والا شخص بیٹھے میں سے سرنکال کر بولا۔

”اے آپ دونوں وہی میں ناں! آفت میری لوجان نکل گئی جبکہ شمالی اُسے دیکھتے ہی تیز ہو کر بولی۔  
”ابھی تک آپ کو گاڑی چلان نہیں آئی۔“  
”سیکھ رہا ہوں۔“ وہ دھڑائی سے کہہ کر ہنسنا اور  
میں نے شمالی کے بازو میں چٹکی کاٹ کر سرگوشی میں  
اُسے چلنے کو کہا تو وہ سمجھ کر فوراً کہنے لگا۔  
”آئیے میں آپ کو وہاں کر دوں گا۔“

”نی الحال ہمارا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ شمالی  
اُسے جواب دے کر میرے ساتھ چل پڑی تو وہ  
بھی گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ چلانے کے ساتھ  
مسلل اصرار کرنے لگا کہ وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔  
”کیا حرج ہے بلکہ اچھا ہے جلدی پہنچ جائیں  
گئے۔“ شمالی نے قدم روک کر مجھ سے کہا تو میں نے  
لفی میں سر ہلا دیا۔

”ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ شکل سے شریف  
آدمی نظر آ رہا ہے۔“ اور ہمارے رکنے پر ہی وہ سمجھ  
گیا تھا جبھی فوراً قرنٹ ڈور کھول دیا۔  
”فکر مت کرو۔ میں سنبھال لوں گی سب۔“ شمالی  
نے مجھے اطمینان دلانے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا  
تو میں آہستہ سے بول۔  
”میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گی۔“  
”اچھا بیٹھے مرد۔“ وہ مجھے دیکھ کر خود اس کے  
برابر بیٹھ گیا۔

”شکر یہ!۔“ وہ گاڑی اشارت کرتا ہوا بولا۔  
”جی نہیں، شکر یہ ہمیں آپ کا ادا کرنا ہے اگر  
زندہ سلامت منزل مقصود پہنچ گئے تب۔“  
شمالی ذرا بھی زروں نہیں تھی۔

”خیر اب اتنا اناڑی بھی نہیں ہوں میں، خصوصاً  
خواتین کی موجودگی میں تو بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوں۔“  
”اچھی بات ہے۔ اب ذرا اسپید بڑھادیں تاکہ  
ہم آج کی تاریخ میں گھر پہنچ سکیں۔“ شمالی نے بڑی  
غور سے بورتی سے اُسے احساس دلایا جس پر وہ غفلت ہو  
کر ذرا سا ہنسنا پھر اسپید بڑھاتا ہوا پوچھنے لگا۔

”کس طرف جانا ہے آپ کو؟“  
”نی الحال سیدھے چلتے جاؤں آگے میں راستہ بتا  
دوں گی۔“

”چلیے راستہ تو بتائیں گی۔ اب نام بھی بتا دیجیے  
اللہ یہ کہ کیا کرتی ہیں آپ،“ اُس نے شمالی سے  
پوچھتے ہوئے ویو مرر میں ایک اچھی نظر لکھ پر ڈالی  
تو میں اپنی جگہ کھ اور سمٹ گئی، جو کہ میں کوئی دلچسپ  
کی لڑکی نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں کسی بھی غیر مرد سے  
بات کرتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں پھول جلتے  
تھے۔ ابھی میں ہی سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ  
کہیں وہ مجھے مخاطب نہ کرے۔

”نام بتانا ضروری ہے کیا؟“ شمالی نے اُلٹا  
اُس سے پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔  
”کوئی ضروری نہیں۔“ پھر قدیم سے توقف سے  
کہنے لگا۔

”ولیسے مجھے ابراہیم احمد کہتے ہیں۔ عزم روزگار کے  
سلسلے میں کویت میں مقیم ہوں آجکل چھٹی پر آیا ہوا  
ہوں۔“

”تھنا شادی کرنے آئے ہوں گے؟“ جواب  
نہیں تھا اس لڑکی کا، اُس نے بھی بے ساختہ ہرانا۔

”بہت ذہین ہیں آپ؟“  
”شکر یہ!۔“ شمالی نے گردن اگڑانے کے ساتھ  
پلٹ کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں لو اور اُس  
کے پلٹ کر دیکھنے پر ہی غالباً اُسے میری موجودگی کا  
احساس ہوا تو اُس سے پوچھنے لگا۔  
”یہ آپ کی کس شہر ہیں؟“

”آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“  
”اعتراض کیوں ہوگا البتہ حیرت ہو رہی ہے کہ آپ  
سے بہت مختلف ہیں، یعنی بہت کم گولنگ رہی ہیں۔“  
میرے بارے میں اللہ بار خال کرتے ہوئے اس نے  
مرر میں پھر ایک نظر مجھے دیکھا تو یکبارگی میرا دل  
بڑی زور سے دھڑکا۔ بیشی شمالی مجھے آنکھ مارنے  
ہوئے کہنے لگی۔

”پہلے یہ ایسی کم گو نہیں تھی۔ اصل میں اس کے  
ساتھ بڑی بڑی بڑی ہو گئی ہے۔ بہت دکھی ہے  
بیچاری۔“

کیا ہوا ہے؟ اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر ہڈی کا لیتین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں ملیں گی۔  
 "میرے خدا، میں اپنی جگہ گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔"

شمالہ کے امی ابو عمرہ سے واپس آئے تو ہمارے بہت اصرار پر صرف دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اس کے بعد شمالہ کو لے کر سیالکوٹ چلے گئے اور ظاہر ہے شمالہ کو جانا ہی تھا، میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی بلکہ اب تو اپنا گھر ہی سونا لگنے لگا تھا، کیونکہ اتنے دن وہ یہیں میرے ساتھ رہی تھی۔ حقیقتاً اس کے دم سے بڑی رونق تھی، اب تو امی بھی اس کے جانے کو غصوں کر رہی تھیں، اچھتے بیٹھے اسی کی باتیں کرتیں، اس روز وہ اُسے یاد کر رہی تھیں تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"بھیا مان جاتے تو شمالہ ہمیشہ یہیں رہ سکتی تھی۔"

کیا مطلب؟ "امی نے چونک کر مجھ سے پوچھا تب میں نے انہیں ساری بات بتادی کہ میں نے بھیا سے شمالہ سے شادی کرنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔"

تمہارے بھیا کا تو دماغ خراب ہے، اب تاؤ بھلا شمالہ میں کیا کمی ہے، میری پوری بات سن کر امی بھیا پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگیں، ہمیں اتفاق سے بھیا آگے، صورت حال سے بے خبر امی ہی سے پوچھنے لگے۔

کیا ہوا امی، کیوں خفا ہو رہی ہیں؟ "امی بس انہیں دیکھ کر اور پٹر پڑا کر رہ گئیں تب انہوں نے اشارے سے مجھ سے پوچھا تو میں نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"امی آپ پر خفا ہو رہی ہیں، یعنی آپ کے شادی نہ کرنے پر؟"

"اس کا مطلب ہے پھر کوئی لڑکی امی کو پسند آگئی ہے، بھیا نے سن کیوں سے امی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔"

"بہت افسوس ہوا، کون تھا میرا مطلب ہے آپ لوگوں نے دیکھ بھال کر شادی نہیں کی تھی؟" "ہیجے، آجکل کسی کا پتا چلتا ہے، دیکھنے میں اتنا شریف اور ایماندار لگتا تھا، آپ سے بھی زیادہ وہ اتنی معصوم بن کر بولی کہ مجھے اپنی بے ساختہ مہنی روکنی مشکل ہو گئی، اور یہاں وہ سمجھا نہیں پا۔" قصداً نظر انداز کر گیا، مگر سے توقف سے پوچھنے لگا۔

"اب یہ کیا کر رہی ہیں؟" "کچھ کرنے کے قابل ہو کر رہے، ہر وقت تو روٹی ریتی ہے، ابھی بھی میں اسے بھلانے کی خاطر یہاں لے کر آئی تھی۔"

"آپ ان سے چھوٹی ہیں؟" "بڑی لگتی ہوں کیا؟" شاید وہ اُسے عاجز کرنے کا نتیجہ کر چکی تھی، وہ سچ سچ سٹپا کر بولا۔

"نہیں؟" "پھر پوچھا کیوں؟" "غفلتی ہو گئی۔"

"چلیے معاف کیا اور دیکھیں، ہاں سے بائیں جانب موڑ دیں، وہ احتیاط سے موڑ کھانے کے بعد بار بار مر رہیں مجھے دیکھنے لگا، میں مجھ کی میرے ساتھ ہونے والی تڑپ بھڑکی پر اُسے افسوس ہو رہا تھا، جبکہ مجھے ہنسی آرہی تھی جسے اُس سے چھپانے کی خاطر میں شہتے سے باہر دیکھنے لگی، اور جسے ہی شمالہ نے گھر کے سامنے گاڑی رکوائی، میں جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر بیچے آ کر گئی، اُس نے شمالہ سے جانے کیا کہا پھر ایک دم میری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

"سنیں، آپ کے ساتھ جو ہوا اُسے بھلانا آسان تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات

شاملہ: پھر نور اہی میں نے چلا ہونٹ  
 دانتوں میں دبا لیا اور خائف سی ہو کر بیٹا کو دیکھنے لگی  
 کہ ابھی وہ ڈانٹیں گے لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ بیٹا ایک دم  
 خاموش ہو گئے اور رُکے بھی نہیں نور اہی اپنے کمرے  
 میں چلے گئے۔ تو میں اندہ ہی اندہ سہم کر رہ گئی۔ یقیناً  
 اب وہ میری ٹھیک ٹھاک کلاس لیں گے۔ اسی خیال  
 کے تحت میں ان سے چھٹی پھری۔

صبح جب تک وہ آفس نہ چلے جاتے میں خود  
 کو کچن میں ہی مصروف رکھتی۔ اور شام میں ان کی آمد  
 پر بھی رادھرا دھر ہر جاتی۔ لیکن آخر تک اس  
 رات کھانے کے بعد میں ابھی اپنے کمرے میں آئی  
 ہی تھی کہ بیٹا بھی میرے پیچھے چلے آئے۔ اور اس  
 سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں بول پڑی۔  
 "بیٹا! ایمان سے میں نے امی سے کچھ نہیں  
 کہا تھا۔ وہ خود ہی"

"کیا نہیں کہا تھا تم نے؟" بیٹا کے انجان ہنسنے  
 پر میں ششپا گئی۔  
 "وہ میرا مطلب ہے شاملہ کی بات میں نے  
 نہیں چھپی تھی"

"لیکن تم سے تو پہلے تم نے کہا تھا" بیٹا میرے  
 میڈ پر بیٹھے ہی سرسری انداز میں بولے تو مجھ سے کچھ  
 جواب نہیں بن پڑا۔ لیکن میں قدر سے اطمینان سے  
 ہو گئی کیونکہ بیٹا کے کسی انداز سے غصہ ظاہر نہیں ہو  
 رہا تھا۔ بلکہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی پھر بیٹھنے  
 کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"تو تم شاملہ کو اس گھر میں لانا چاہتی ہو، لیکن  
 اس سے بھی تم نے پوچھا ہے کہ آیا وہ آنا چاہتی  
 ہے کہ نہیں؟"

ہائیں یہ بیٹا کیا کہہ رہے تھے مجھ پر کبھی  
 حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فوری طور پر کچھ بولا  
 ہی نہیں گیا۔ تب بیٹا اٹھ کر میرے قریب آئے  
 اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔  
 "سنو، پہلے اس سے معلوم کرو اگر وہ خوشی سے  
 راضی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا پھر جاتے  
 جلتے رک کر بولے۔

"اور سنو! ابھی امی کو بلکہ کسی کو کچھ مت بتانا۔"

اوکے: میرا دل اچانک خوشی سے بے قابو ہو گیا  
 تھا اور کوئی نعرہ ہونٹوں تک آیا چاہتا تھا کہ بیٹیا کی  
 بات پر مجھے منبسط کا دامن تمام کراہیات میں سر ملانا  
 پڑا۔ بیٹا مطلق ہو کر کمرے سے نکل گئے۔ تب میں  
 ہلانک لگا کر اپنے بیڈ پر چڑھ گئی۔ میرا دل ناپائے  
 گمانے کو جا رہا تھا۔ ظاہر ہے دوہری خوشی ملی تھی۔  
 ایک تو بیٹا کا شادی کے لیے ہا می بھرنا۔ دوسرے  
 شاملہ ہمیشہ کے لیے ہمیں آجانے کی کتنی دیر تک  
 میں اس وقت کا تصور کر کے خوش ہوتی رہی پھر  
 شاملہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کاش شاملہ کی سہاں موجودگی  
 میں ہی بیٹا میرے خیال سے متفق ہو جاتے تو مجھے  
 اُسے چھپانے میں کتنا مزہ آتا۔

اگلے دن شام میں میں آپنی کے گھر جانے کے لیے  
 تیار ہو رہی تھی کہ اسی وقت کچھ مہمان آگئے۔ جب امی  
 نے آکر مجھے جانے سے منع کیا اور باٹھے نمانے کے  
 لیے کہا تو میں سخت جھنجھلائی۔ کیونکہ بیٹا امی مشکل  
 سے جانے پر تیار ہوئے تھے۔

"مہانوں کو بھی اسی وقت آنا تھا۔ میں بڑ بڑائی  
 ہوئی کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ کچھ دیر بعد امی  
 آئیں اور جب انہوں نے مجھے ڈھنگ سے چائے  
 بنانے اور ٹرائل میں لوازمات سنبھالنے کو کہا تب میں  
 کچھ ٹھٹھک گئی۔ یعنی یہ کوئی عام مہمان نہیں تھے۔  
 پھر امی کی بوکھلاہٹ نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا۔  
 اس کے بعد جہاں میرا نظری تپشس جاگ اٹھا  
 وہاں گھبراہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بیٹا کی موجودگی  
 میں مہانوں کے سامنے جانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔  
 لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ امی خود ہی آکر چائے  
 وغیرہ لے گئیں تب میں چپ چاپ اپنے کمرے  
 میں چلی آئی۔

کافی دیر بعد غالباً رخصت ہوتے وقت دو  
 خواتین امی کے ساتھ میرے کمرے میں آئیں تو انہیں  
 دیکھ کر میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے بھی  
 بس کھڑے کھڑے میرا نام پوچھا اور یہ کہ میں کیا  
 کرتی ہوں پھر کچھ تقریریں چلے ساتھ ہی خوشی کا اظہار  
 بھی تھا۔ میں کیونکہ سر جھکائے کھڑی تھی اس لیے ان  
 کے تاثرات نہیں دیکھ سکی۔ پھر جیسے ہی وہ امی کے



ساتھ کرے سے نکل کر گیتیں میں کھڑکی کے پاس  
آکھڑی ہوں۔ یہاں سے میں ان خواتین کو جاتے ہوئے  
دیکھنا چاہتی تھی لیکن ان سے پہلے ڈرائیونگ روم سے  
نکل کر بیٹا کے ساتھ جو شخص نظر آیا اسے دیکھ کر میں  
اچھل پڑی۔

ابراہیم احمد: میرے ہونٹوں تک یہ نام آیا  
تھا کہ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا۔  
اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے قریب کہیں اس کی  
سرگوشی سنا دی۔

بہنیں: آپ کے ساتھ جو ہوائے سے بھلانا آسان  
تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات کا  
یقین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں  
ملیں گی۔

اور شاید میرے ساتھ ہونے والی نام نہاد ٹریڈی  
نے اُسے متاثر کیا تھا جو آپ خود ہی خوشیوں کا  
پیامبر بن کر چلا آیا تھا۔ اور میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ وہ  
مجھے اول روز ہی اچھا لگا تھا البتہ اس وقت اسے  
دیکھ کر میرے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔  
اگلے روز امی نے آپ کو بلوا بھیجا اور جو کچھ ان  
سے کہا وہ اگر مجھ سے کہتے لگیں۔

سنو، کل تمہارے لیے جو پریورل آیا تھا تمہارا  
اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں خاموشی سے  
آپ کو دیکھنے لگی۔ تو وہ میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔

اصل میں لڑکا کیت سے آیا ہوا ہے۔ اور اس  
کی چھٹی بھی بس ایک مہینے کی رہ گئی ہے اس لیے انہوں  
نے فوراً جواب مانگا ہے۔ امی اور بیٹا دونوں کو  
لڑکا پسند آیا ہے اب تم جلدی سے اپنا خیال بتاؤ  
تاکہ 4 آل نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارت سے  
میری کمر میں چپکی کاٹی تو میرے ہونٹ آپ ہی آپ  
شرنگیں مسکراہٹ کی گرنٹ میں آگئے۔ اس کے بعد  
ظاہر ہے آپ کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی اور  
جانے کیا کیا سوچتی رہی، خصوصاً یہ تصور بڑا دلکش  
تھا کہ ابراہیم احمد کو جب معلوم ہوگا کہ میرے ساتھ  
کوئی ٹریڈی نہیں ہوں وہ شخص شاملہ کا مذاق تھا۔

اور ظاہر ہے یہ سب میں ہی اُسے بتاؤں گی۔ شاملہ  
تو یہاں تھی نہیں اور اتنی جلدی اس کی آمد ممکن  
بھی نہیں تھی۔ پھر اب تو امی کو جانا تھا ہسپتال پر لوزل  
لے کر تھیوٹرک میں اسے خط لکھ چکی تھی اور مجھے یقین  
تھا کہ وہ بیٹا کو ناپسند نہیں کرتی۔ بہر حال مجھے افسوس

اس بات کا تھا کہ وہ میری شادی میں شرکت نہیں  
کر سکتی تھی۔ کیونکہ سب کچھ آنا فانا طے ہو گیا تھا۔ اتنی  
بیٹا اور امی کو تو ایک لمحے کی فرصت نہیں تھی، ظاہر  
ہے اتنے کم وقت میں تیاری آسان نہیں تھی پھر بھی  
اپنے طور پر بیٹا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کا کہنا  
تھا کہ میری کون سی اور بہنیں بیٹھی ہیں۔ یوں تیاری میں  
وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور میں سہرے سے پہلے  
خوابوں کو بلکوں کی اوٹ میں چھپائے ابراہیم احمد

کی سچ بڑا بیٹھی۔ یہاں بہت ہنگامہ تھا۔ ابراہیم  
بہنیں اور کزنز ان سے ننگ و صول کرنے میں بہت  
شور مچا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میری ساس نے  
آکر سب کو خاموش کر دیا پھر انہیں اپنے ساتھ لے  
گئیں تو ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ لیکن مجھے بالکل  
احساس نہیں ہوا کیونکہ میں اپنی دھڑکنیں شمار کرنے  
میں لگی ہوئی تھی۔

جناب: کچھ دیر بعد ان کی شوخی سے بھر پور  
آواز سنا دی تو میرا جھکا ہوا سر مزید جھک کر گھٹکوں  
سے جا سکا۔

ارے۔ وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔  
یہ سب نہیں چلے گا۔ داد دینی پڑے گی کہ آپ نے  
تو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ البتہ گھر دکھانے کی  
غلطی کر گئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے ہر عقلمند شخص  
متوڑا، بیوقوف ضرور ہوتا ہے۔ اب بتائیے پہلے  
آپ کی عقلمندی کو سلام کروں یا؟

بے وقوفی کو؟ میں دھیرے سے بولی تو  
انہوں نے دلکش ہنس کے ساتھ میرا چہرہ اونچا کیا۔  
اور جہنے کیا ہوا کہ فوراً ہی وہ ایک جھٹکے سے  
پہچھے بیٹ گئے۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں  
اور ابھی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ سناٹے کے عالم میں بولے۔  
آپ۔ اور وہ کون تھی؟

# پہلے پڑھیں پھر لکھیں

’بلکہ گروے پھینچڑے‘ کلی ہر جگہ ہے۔ یہ بڑھ حرام  
یونہی جان بچاتے ہیں، کام سے ڈانٹوں نہ تو کبھی بھی کام  
نہ کریں اب وہ کھو گئے آرڈر لارہا ہے۔“  
اس نے ٹرے اٹھائے باہر کو آئے دیکھ کر کہا۔ اور  
اس کے خاصے بلند لہجے میں کہے گئے الفاظ باہر نے  
بخولی سن لیے تھے ’جی چاہا ٹرے اس خوب صورت  
مغزور لڑکی کے سر پر انڈیل دے‘ یہ امیر زادی خود کو نہ

جانے کیا سمجھتی تھی ہر شخص کو اپنا غلام سمجھتی ہے۔  
”شکر ہے میں تو اب دوسرے ہوٹل میں جانے کا  
سوچ رہی تھی۔“ اس نے جان بوجھ کر سیلیوں کو  
سناتے ہوئے اسے حثایا۔

”پلو چھوڑو شروع ہو جاؤ، تمہیں بہت بھوک لگی  
ہے نا۔“ ایک اور دوست نے اس کا دھیان کھانے کی  
طرف دلایا تو وہ پلیٹ اٹھا کر ڈونٹے سے سالن نکالنے  
لگی۔

اور پھر وہ جتنی دیر تک کھانے میں مصروف رہیں  
اسے دھڑکا ہی لگا رہا کہ وہ کہیں کوئی بات نہ کہہ دے  
کوئی ایسی بات جس سے اس پر یا اس کی نوکری پر حرف  
آئے مگر خدا کا شکر ہوا کہ وہ خیریت چلی گئی اور جاتے  
جاتے سوکانوٹ اسے شب کے طور پر سمادیا۔

ایسے گا کہوں سے وہ تخت الرجک تھا۔ بلاوجہ شور  
ہنگامہ گر کے خود کو برتر کرنا اور ویٹر کو ادنیٰ درجے کی  
خلق سمجھنا لیکن مجبوری تھی اسے ایسے گا کہوں کے  
سامنے ڈنٹوں کا اشتہار بن کر سروس کرنا پڑتا تھا  
کیونکہ یہی لوگ تھے جن سے اس کا روٹی رزق وابستہ  
تھا۔

”ویٹر!“  
”ویٹر!“ کارنروالی ٹیبل سے غصیلی آواز سنائی دی تو  
وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا۔  
”ہمس میڈم!“ اس نے مودبانہ ہاتھ باندھ کر  
پوچھا۔

”کیا بات ہے تم ہمارا آرڈر کیوں نہیں لارہے ہو  
اور کتنا انتظار کریں یہ سروس ہے یہاں کی۔ اور جی  
دوکان کے پھلکے پکوان۔“

وہ بہت بد تمیزی سے ڈانٹ رہی تھی۔ جیسے وہ اس  
کے باپ کا ذاتی ملازم تھا، بمشکل غصہ ضبط کرتے  
ہوئے اس نے محل سے جواب دیا۔  
”میڈم! تھوڑا انتظار ابھی آپ کو سروس فراہم کر  
دیتے ہیں۔“

”پہلی ابھی میں آواٹھنڈہ گزر گیا ہے۔ عجیب ٹ  
یونجھا ہوٹل ہے۔“ اس کی آواز خاصی بلند تھی ارد  
گرد کے لوگ بھی متوجہ ہونے لگے اور یہ اس کے  
لیے کافی ہولناک صورت حال تھی، بمشکل یہ نوکری  
ہلی تھی۔ سالک بھی انتہائی بد مزاج تھا اس کے گھبرائے  
گھبرائے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی سہیلی  
نے نرمی سے اس سے کہا۔

”اوکے تم جاؤ، کوشش کرو جلدی سے آرڈر لے  
آؤ۔“ اور وہ تشکر سے اس خوب صورت نرم دل نرم  
مزاج حسینہ کو دیکھتا تیزی سے سروس روم کی طرف  
چل دیا۔

”یار! عجیب ہو تم بے چارے کو خواجواہ اتنا ڈانٹ  
دیا کتنا خوفزدہ ہو رہا تھا۔“ تمہا انا شیعہ کی طرف دیکھ کر  
خفگی سے بولی۔

”ایک تو سارے جمان کا ورد تمہارے جگر میں ہے

ہیں۔ ”راجو نے اس کے زہریلے لہجے پر چونک کر  
اسے دیکھا۔

”چھوڑو یاران باتوں کو، ویسے لڑکیاں بہت اونچی  
تھیں۔ کتنی ٹپ ملی اس نے بد معاشی سے آنکھ مار کر  
پوچھا۔

”سورہ پیہ۔“

”واہ، چل یار سورہے میں تو گالیاں بھی کڑوی  
نہیں میٹھی لگتی ہیں آج مجھے بھی اس عاشق نے

وہ سوچتے ہوئے دوسری میز کی طرف چل دیا۔  
”یار برابر! آج وہ لال کپڑوں والی حسینہ بچا غصہ دکھا  
رہی تھی کیا بات تھی؟“ رات کو جب ہوٹل سے وہ  
اپنے دوست راجو کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو راجو نے  
دوبارہ اسے دوپہروالی صورت حال یاد دلا دی اس نے  
برا سامنے بنا کر اسے دیکھا۔

”جیسے والے لوگ ایسے نخرے نہیں دکھائیں گے  
تو کون دکھائے گا، ہم غریب ان کا حکم ہی بجالا سکتے



READING  
Section

زبردست شہدی ہے مشترک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے راجو نے بتایا۔

”کون عاشق! اس نے بستر کی چادر درست کرتے کرتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”ارے وہی لمبے بالوں والا لڑکا جس کے ساتھ اس کی محبوبہ بھی ہوئی ہے۔ تو بے یار! کیا بے حیائی کا زمانہ آگیا ہے، سرعام ایک بوتل میں اسٹرا ڈال کر پیتے ہیں۔ اور لڑکی کے ہاتھ میں گلاب کا پھول جو وہ مجھے ہونٹوں کو لگاتی ہے، کبھی گالوں کو کھینچے کیا موجھیں ہیں اس بکرے کی۔ راجو کے کھلے کھلے تبصرے اور انداز پر اس نے اسے گھورا۔

”شرم کرو۔ دوسروں کے بارے میں یوں گھشیا باتیں کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔“

”ارے مولانا صاحب، گھشیا باتیں ہم نہیں کرتے، جو ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہی زبان پر آجاتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے سرعام ایسی عامیانہ حرکتیں کرتے جب انہیں شرم نہیں تو ہم کیوں آنکھیں بند کریں۔ اس ٹیبل پر سروس دینے کے لیے تو سارے ویٹریوں بھاتے ہیں۔ جیسے کوئی انعامی مقابلہ ہو۔“

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”دئے چغند سمجھا کر۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے“

شب بھی اچھی اور... اس نے انتہائی معنی خیزی سے ہونٹ کا کوننا دکھا کر آنکھ ماری، باہر بری طرح چٹکایا گیا۔

”انتہائی فضول ہو تم بلکہ بد معاش۔ اپنے کام میں بددیانتی کرتے ہو۔“

اس کی یہ عادت تھی اور باہر کو سخت چڑھتی اس گھشیا، عامیانہ عادت اور گفتگو سے مگر مجبور تھا کہ راجو اس کا دوست اور محسن تھا، وہ بے روزگاری کے عذاب میں مبتلا تھا، قاقوں کا زہر لیس لیس میں اتر چکا تھا، ماں کے ہاتھوں میں لوگوں کے کپڑے دھو دھو کر سوراخ ہونے لگے تھے۔ اور معصوم بیس سالہ بہن تیس سال کی لگتی تھی اور وہ خود!

خود بھی تو پریشان حال تھا، مروانہ وجاہت کا نمونہ ہے، انتہا رکشش اور حسین نقش بابا سے وراثت میں ملے تھے، مگر غربت، قاقوں اور پریشانیوں کے سبب وہ

خود کو بھی بھلائے مارا مارا نوکری تلاش کر رہا تھا، وہ صرف انٹریاس تھا، آگے بڑھنے کی نہ ہمت تھی نہ استطاعت، اور اسے بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس کی تعلیم دیوبند سے نہیں بلکہ امنگلوں آنسوؤں اور حسرتوں سے کی گئی ہے۔ وہ بہت ذہین اور محنتی طالب علم تھا، انٹرنیک بہترین نمبروں سے کامیابی حاصل کرتا رہا تھا۔ اسے تو بہت آگے بڑھنے کی خواہش تھی۔ کچھ بننے کر کے دکھانے کی خواہش تھی۔ مگر ساری صلاحیتیں خواہشیں اور حسین بننے غربت کے اثر سے نکل لپے تھیں۔

گزشتہ ایک سال سے وہ اپنی اسناد سینے سے لگا کر صبح گھر سے نکلتا تھا، اور رات کو تھکا ہارا ناکام و نامراد واپس آجاتا تھا، ماں کی آنکھوں میں جلتا آس کا دریا جو سارا دن ٹھٹھاتا رہتا تھا، رات کو اسے صابون دیکھ کر خود بخود ہی بچھ جاتا تھا، اور اگلے دن ماں اپنے آنسوؤں کا تیل ڈال کر دوبارہ اسے جلا دیتی تھی، وہ بے انتہا صابر عورت تھی، ابا کے مرنے کے بعد اس نے کبھی گل شکوہ نہیں کیا کسی سے، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے، خاندان کے بہت سے مرد آگے بڑھے، اسے سہارا دینے کو، مگر وہ خود سہارا یا کر بچوں کو بے سہارا کرنے کی ہمت نہ کر سکی، اور اس کی ماں نے اس کی زندگی کو اور مشکل کر دیا تھا۔

طرح طرح کے الزامات، گھشیا باتیں، روپے میسے کی تنگی، غرض زندگی تو آسان پہلے ہی نہ تھی اور مشکل ہو گئی۔ مگر باعزم اور باہمت عورت نے حوصلہ نہ ہارا، باہر اس کی امیدوں کا مرکز و محور تھا، دن رات محنت کر کے اس نے اسے انٹرنیک بڑھایا تھا، اگرچہ وہ جانتی تھی کہ آج کے دور میں اسے کوئی اعلا افسرانہ نوکری نہیں ملے گی، مگر اتنے برے حالات کا اندازہ نہ تھا، اسے تو بغیر سفارش اور رشوت کوئی چیز اسی تک بھری کرنے کو تیار نہ تھا، گورنمنٹ کی ملازمت تو دیوالیے اور خواب بن گئی تھی، پرائیویٹ جاب بھی نہیں مل رہی تھی۔

اور جب اس دن وہ بے انتہا تھک کر بھوکے ہاتھوں مجبور اس عالی شان ہوٹل کے باہر بیٹھا ہوا تھا

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

راجو اسے ملی گیا، میٹرک میں وہ اس کا کلاس فیلو تھا،  
تالاق شرارتی سالز کا تھا، وہ مانیٹر تھا۔ اس لیے اکثر  
اسے اسکول ورک کے کام وغیرہ کی ضرورت پڑتی تو بابر  
سے ہی مانگ لیتا، اور ساتھ ہی اس سے سمجھتا تھا۔ تو  
یہ حالات ہیں۔ داستان سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”حسن یار! اگر تو برانہ مانے تو میں تیری توکری کا  
بندوبست کر سکتا ہوں۔“  
”جج، بتا یا رکھ دیا۔“  
پلیٹ میں رکھ دیا۔

”توکری تو تمہارے معیار کی نہیں، مگر جو حالات  
تمہارے جا رہے ہیں فی الحال مجھے یہ سب سے  
مناسب راستہ لگا ہے۔“ راجو نے تمہید باندھی۔  
”تو جتنا تو سہی کیا کام ہے۔ اور کہاں؟“ بابر نے بے  
چینی سے پوچھا۔

”کام میرے والا اور میرے ہی ہونگے میں۔“ اس  
نے چونک کر راجو کو دیکھا۔ وہ ایک اچھے اور بڑے  
ہونٹل میں بیرا تھا۔

”جانتا ہوں۔ کام تمہارے معیار کا نہیں، مگر  
فاقوں مرنے سے بہت بہتر ہے، تنخواہ اگرچہ کم ہے، مگر  
روزانہ ملنے والی ٹپ ملا کر ٹھیک ٹھاک گزارا ہو جاتا  
ہے اور کھانا ہر روز نیا مزیدار، مفت۔“ اس کی  
نگاہوں میں وہ کئی راتیں گھوم گئیں جو انہوں نے بنا  
کھائے گزاری تھیں۔ اور وال روٹی کا حصول بھی  
ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے کندھا ہلایا تو وہ  
چونک کر اسے دیکھنے لگا۔  
”آں۔۔۔ کچھ نہیں۔“

”دیکھو بابر! جتنا سوچو گے۔ اتنا ہی فیصلہ مشکل ہو  
جائے گا، ہاں یا ناں۔ فوراً جواب چاہیے مجھے میں  
ہونٹل جا رہا ہوں، ایک میٹرک کی جگہ خالی ہوتی ہے، مالک  
میری مانتا ہے۔ موقع ہاتھ سے مت کھو، خصوصاً  
ان حالات میں جو تم نے بتائے ہیں۔“

راجو نے سب کچھ بہت اچھی طرح عیاں کر دیا تھا،  
اور پھر اس نے بھی فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔  
جب سے یہ ملازمت ملی تھی گھر کے حالات کچھ

بلکہ کافی بہتر ہو گئے تھے۔ ماں کو اس نے کام کرنے سے  
روک دیا تھا، اور روزانہ ملنے والی ٹپ سے گھر کا خرچ  
بخوبی چل رہا تھا۔ اس لیے ماں نے اس کی تنخواہ سے  
بشری کا جینز پانا شروع کر دیا تھا۔ خود اس کی صحت بہت  
اچھی ہو گئی تھی، کم از کم بے روزگاری کا خوف، فاقوں  
کا ڈر تو نہیں رہا تھا، ماں وہ پوری مدد سے اپنا کام کر رہا  
تھا، مالک بہت سخت اور ٹھکی تھا، اور اب تک اسے  
اس کی طرف سے کوئی شکوہ شکایت نہیں ہوئی تھی۔  
لیکن ایک مشکل تھی، ہونٹل سے گھر بہت دور تھا،  
اور اسے روزانہ صبح سویرے گھر سے وقت پر پہنچنا اور  
رات کو گھر واپسی خاصی دشوار لگتی تھی۔ گراہیہ بھی  
روزانہ کا کافی بن جاتا تھا، اس کا حل راجو نے یہ نکالا کہ  
اسے اپنے کمرے میں رہنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا گھر  
دوسرے شہر میں تھا، اور وہ ایک کمرہ کرائے پر لے کر  
رہتا تھا، بابر کو بھی اس نے وہیں رکھ لیا تھا، یوں آنے  
جانے کا خرچا بھی بچ گیا تھا۔

اگلے دن راجو نے جان بوجھ کر اپنی ڈیوٹی ہال میں  
لگوالی اور بابر کی ٹیبلٹی کیمینز پر وہ ایک نمبر شرارتی اور  
چکر باز تھا، بابر اسے مالک جھانک کرنے اور گاہکوں کے  
متعلق ویسے مجھے رہا، کس پر خوب ڈانٹتا تھا، بلکہ اکثر  
سمجھانا بھی تھا کہ کسی کی ذات بریوں کھلم کھلا تنقید  
اخلاقی جرم ہے، مگر وہ اسے رخصا کو اور مولانا کہہ کر  
بذاق اڑاتا تھا، باقی تمام ویٹرز بھی جب اکٹھے ہوتے تو  
گاہکوں خصوصاً لڑکیوں کے متعلق بہت عجیب گھنیا  
باتیں کرتے تھے۔ خصوصاً جو لڑکیاں اپنے پوائے  
فرینڈز کے ساتھ آتی تھیں۔

اور اب! اب اسے جان بوجھ کر ایسے ہی خاص  
کیبن کے لیے یا مزو کر دیا تھا۔ اس سازش میں اس  
کے دوسرے ساتھی بھی ملوث تھے۔  
”ویٹرز۔“ وہ تیزی سے اندر لگا۔

”ہیس میڈم!“ اس لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس نے  
نظریں جھکا کر کہا، ایک نگاہ ہی کافی تھی، اس کا لباس  
انداز اور پھر جس بے تکلفی سے وہ اپنے پوائے فرینڈ  
جس کا نام تو اسے معلوم نہ تھا، البتہ سب سے بکراکتے  
تھے کے ساتھ بیٹھی تھی، تو فوراً ہی باہر نکل آیا،

چائے پی کر پانچ سو روپیہ سپردے جاتے ہیں۔

\*~\*~\*

”یار! تیرے تو دارے نیارے ہو گئے اس لڑکی کا فون آیا ہے سب صاحب کو کہ باہر مجھے سروس دے گا جب بھی میں آؤں گی نیارے یہ تیری شکل نے کمال کر دیا۔“ راجو، بشیر، واجد، سبھی اسے تنگ کر رہے تھے، چیخ رہے تھے اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی پھندے میں پھنسا دیا گیا ہو، وہ بے حد شریف اور نیک خیالات والا نوجوان تھا، اسے نہ تو اس حسینہ کی خوب صورتی سے کوئی غرض تھی، اور نہ ہی اس کی بے باکی سے لگاؤ، ایسی بے شرم اور سرعام دعوتِ نظارہ دیتی لڑکیاں تو ویسے بھی نہ ہر لگتی تھیں۔

انگلا دن بہت ٹھن تھا اس کے لیے سو کم از کم اپنی نوکری میں بددیانتی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا، اور وہ لڑکی متواتر اسے اپنی طرف سائل کرنے کی کوشش میں تھی، آج تو اس کے ساتھ بکرا بھی نہیں تھا۔

”سنو تم یہاں خود کو ضائع کر رہے ہو، تمہیں تو بہت اچھی جگہ ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے اک ادا سے جو اس کا سب لیتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔

”شکر یہ میڈم میں ٹھیک ہوں، یہاں بہت مطمئن

”یہ وہ شرفنا تمہارا شوق ہے کیا؟“ اس نے مذاق اڑایا۔

”جی ہاں، اس کے اماں مرحوم کی آخری خواہش تھی کہ بیٹا و بیٹی بننا۔ اب اگر اس نے یہ نوکری چھوڑ دی تو ان کی روح بے چین دے بے قرار ہو جائے گی۔“ اندر آتے راجو نے اس کی بات من کر جواب دیا۔

”وہ تم بہت نالی ہو۔“ وہ ادا سے مسکرائی۔ سبار نے اس کی آمد کو غنیمت جان کر کچھ کھسکنا چاہا۔

”میں چلتا ہوں راجو تم یہاں ٹھہرو گے۔“

”ارے ارے رکو، میں تو میڈم کو یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ یہ باتوں میں اتنی مصروف ہیں کہ موبائل اینڈ نہیں کر رہی ہیں، کاؤنٹر پر کسی جانی صاحب کا فون آیا ہے کہ ان سے بات کر لیں۔“

”وہ جانی کا فون آیا ہے، اوکے ٹھیک یو میں کر

چلا، تکہ اس لڑکی نے بہت دلچسپی سے گہری نگاہ ڈالی تھی اس پر سنو، کیا نام ہے تمہارا؟“ چائے کے کپ رکھ رہا تھا، جب اس نے پوچھا۔

”وہی باہر۔“

”باہر۔ گڈ تمہیں نہیں لگتے ہو، سنو! اس کے سوالات اور دلچسپی سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

”جی! کافی عرصے سے یہاں ہوں، پہلے ہال میں ڈیوٹی تھی۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں جاؤں گی۔“ اس نے ایک نظر بکریے پر ڈالی، قطعی اچھی اور لاہرواہ بنا، مزے لے لے کر روٹ سے انصاف کر رہا تھا۔

”کم بخت بھوکا، بے غیرت۔“ اس نے دل میں اس کی بے حسی پر اسے گالی دی۔

”ارے! تم کہاں جا رہے ہو، میں نے تمہیں جانے کو نہیں کہا۔“ اس نے اسے یوں جاتے دیکھ کر پکارا، باہر کے تو آگ لگ گئی، بمشکل خود کو کنٹرول کر سکا، ہال میں تو وہ لاکھ ورجے اچھا تھا، یہاں راجو نے اسے پھنسا یا تھا، اور سے اس کا حکم۔

”میڈم! مجھے دوسرے کسٹرز کو بھی دیکھنا ہے، ان کی سروس۔“

”ان کی سروس مجھ سے اہم نہیں۔ سنو، مجھے جاننے نہیں ہو، جان جاؤ گے بل لاؤ۔“ وہ اس کی بات کٹ کر عجیب سے لہجے میں بولی۔

وہ تیزی سے باہر نکلا، جیسے موت کے منہ سے واپس آیا ہو۔ دھڑکتے دل، اور فاق چہرے کے ساتھ، جی چاہا ہل کسی اور کے ہاتھ بھجوا دے۔ گہری بھوری، جو اتنا رعب ڈال سکتی تھی، یقیناً طاقت بھی رکھتی تھی، کہیں اس کی نوکری کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔

اس نے پانچ سو روپے سپردی تھی، اور وہ حیرت زدہ روئے ہاتھ میں لیے کھڑا رہ گیا۔

”خدا یا، بعض لوگوں کو تو روٹی کے لیے روپیہ تک میسر نہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں، جو محض دو کپ

لتی ہوں۔" پتا نہیں جانی صاحب کون تھا کہ وہ دونوں کو نظر انداز کر کے اسی وقت بیگ سے موبائل نکال کر فون کرنے لگی۔ اور باہر موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔

"یار! میں اب وہاں نہیں جاؤں گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے۔" سخت غضب لایا ہوا وہ کہہ رہا تھا اور راجو اس کی کیفیت سے خط اٹھا رہا تھا۔

"میں تمہارا سر بھاڑ دوں گا۔" اس نے غصے سے کہہ کر منہ موڑ لیا۔

"چھا! چھا! مجھ سے کیوں ناراض ہو رہا ہے، میں تو نہیں کہتا کہ تو وہاں جا، وہ تو خود بلاتی ہے مجھے، بڑی مہمان سے تجھ پر جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھالے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں فائدے پر اور ایسی کمائی پر، دیکھو راجو! مجھے اچھی شریف لڑکی نہیں لگتی، اور میں اس کی وجہ سے نوکری چھوڑ دوں گا۔ خوب صورتی کو اس طرح کیش کرانا مجھے زیب نہیں دیتا۔ اور نہ ہی میں بے غیرت ہوں۔" وہ حد سے زیادہ سنجیدہ تھا، راجو کو بھی سیریس ہونا پڑا۔

"ٹھیک ہے۔ اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، صبح کچھ نہ کچھ خل سوچیں گے اس کا بھی اب تو آرام کر، اور ہاں وہ اہل اور بشری بہن سب ٹھیک تھے نا۔" اس نے اس کا دھیان بٹایا۔

"ہاں سب ٹھیک تھا، گتے۔ اللہ کا شکر ہے۔ میری ماں کو بھی اب سکون ملا ہے بشری کا رشتہ دیکھا ہے، اچھا لڑکا ہے، اگلی دفعہ جاؤں گا تو ہاں کر آؤں گا۔" وہ بھی سب کچھ بھلا کر معصومیت سے ماں بہن کی باتیں کرنے لگا۔

اگرچہ وہ لڑکی بیٹا اس کی طرف مائل یہ کرم تھی۔ مگر مقابل بھی باہر تھا، اگلے ہی دن اس نے اپنی بیوی تہیل کرالی اور راجو بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ واقعی نوکری پھوڑ دے گا۔ مگر ان خرافات میں پڑنا اس کی سرشت میں نہیں۔

آج دنوں بعد وہ خود کو بہت آزاد سا محسوس کر رہا تھا، جیسے کوئی دیران ناپسندیدہ جگہ سے ایک دم پر رونق جگہ

آجائے، ہال میں ڈھیر سارے بندوں کے درمیان رننگ کی خاطر بھاگ بھاگ کر کام کرنا اسے ڈھیروں اطمینان بخش رہا تھا، کچھ دنوں سے بیٹا نہیں آرہی تھی، ذاتی مصروفیت تھی یا پھر اس کی وجہ سے وہ ہوٹل نہیں آرہی تھی۔ اس نے تو توجہ نہیں دی تھی، مگر دوسرے دینے جب اکٹھے ہو کر اسے اس کے حوالے سے چھیڑتے تو اسے غصہ آجاتا، کتنی بے باک گفتگو کرتے تھے۔ اس کے منع کرنے پر رواجو نے کہا۔

"یار! ہم نے کبھی کسی شریف کسی اچھی عورت کے متعلق ایک لفظ بھی کہا ہے، ہرگز نہیں، عزت دار کی ہم بھی عزت کرتے ہیں، مگر جو خود موقع دے۔"

"کچھ بھی ہو، ان کے فعل ان کے ساتھ برائی کو دیکھ کر خود بھی برائی کرنا، کہاں کی دانشمندی ہے۔" باہر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"یار! تم سا ہر کوئی تو نہیں ہو سکتا، مردوں کو الزام دینے والی یہ عورتیں خود کو نہیں دیکھتیں کہ جس حالت میں جو انداز دکھا کر گھروں سے باہر آتی ہیں، اس کے بعد یہ بیٹا صاحبہ عورت کے حقوق پر دعوں و حمار تقریر کر کے تالیاں بجاتی ہیں اور دوسری طرف خود ہر روز کسی نہ کسی نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ عیش ازارہی ہوتی ہیں، ابھی اور حقوق چاہیں، اور آزادی چاہیے، پتا نہیں کونسی آزادی، کون سے وہ حقوق انہیں چاہیں، ہم مردوں کو خراب کرنے والی ماں کی ہی عورتیں ہیں۔"

جواد اس قدر گہری اور تلخ بات بھی کر سکتا تھا، باہر کو پسینہ آگیا واقعی وہ درست کہہ رہا تھا، عورت کو شرم و حیا کی دیوی کا وجود دے کر گھر کی چار دیواری کے اندر بہت سے حقوق دے دیئے گئے تھے۔ وہ باہر نکلے بھی تو باہر وہ ہو کر نکلے، نہ کہ دعوت و نظارہ دے، اور ایسی لڑکیاں جو ماڈرن ازم کے نام پر خود کو ہر حد ہر قید سے آزاد سمجھ کر حقوق نسواں کی آڑ میں بے حیائی، فحاشی کی مرتکب ہوتی ہیں، عورت ذات کے نام پر دھبہ ہیں اور پوری برادری کی تذلیل کا سبب۔

\*-\*-\*

آج بہت دنوں بعد وہ اسے دوبارہ نظر آئی تھی۔ نرم



دل بزم مزاج حسینہ وہ بے حد معصوم، سلجھی ہوئی با  
دقار لگتی تھی اس دن اس نے باپ کی حمایت کی تھی  
اور لاشعوری طور پر ہی وہ اس کی شکل ذہن سے محو  
نہیں کر سکا تھا۔ آج بھی وہ اپنی دوست کے ساتھ تھی  
۔ دونوں باتیں کر رہی تھیں وہ تیزی سے ان کی طرف  
لپکا۔

”تمہارا جھانگیر ایسا نہیں ہے تم اسے پرکھو تو!“ وہ  
جب قریب کھڑا ہوا تو اس کی دوست اس سے کہہ رہی  
تھی ”اور وہ خود گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کا دل چاہا  
اس کا جواب سننے۔“

”ہیں میڈم۔“ وہ متوجہ نہ ہوئیں تو بالآخر بولنا ہی  
پڑا۔  
”ہاں تم دو کب چائے اور سینڈویچ لے آؤ۔“ وہ سر  
جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی سہیلی ہی بول رہی  
تھی۔

بہت دیر تک وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔ پتا نہیں  
کیا مسئلہ تھا، وہ جب بھی سنجیدہ سی سا بہال میں آتے  
جاتے قریب سے گزرتے اسے ضرور ایک نظر غیر  
ارادی طور پر دیکھ لیتا تھا۔

میل بے کرتے ہوئے اس نے زائد بیس روپے  
انہیں واپس لا کر دیے تو دونوں نے چونک کر دیکھا۔  
”ارے بھئی یہ رکھ لو تمہارے ہیں۔“ نہ ہانے  
روئے اسے واپس کیے۔

”شکریہ میڈم!“ وہ روپے تھامے بنا ہی واپس مڑ گیا  
۔ دونوں نے حیرت سے کندھے اچکا کر اسے دیکھا اور  
باہر نکل گئیں۔

پتا نہیں کیوں اسے آج اس کے ہاتھ سے بخشش  
لینا اچھا نہیں لگا، حالانکہ وہ ایسا بھی نہ تھا کہ کوئی ٹپ  
دیتا اور وہ انکار کر دیتا، مگر بعض اوقات دل کسی ایک  
شخص کے سامنے معتبر ہونے کو چل جاتا ہے۔ وہ اجنبی  
لڑکی جس کا نام معلوم تھا، دل کے خود ساختہ ایک طرفہ  
قائم کیے گئے تعلق کے حوالے سے خاصی عزیز ہو گئی  
تھی۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جو عزت کرتے  
ہیں اور کرواتے ہیں۔ وہ بھی بہت احترام سے نرمی  
سے گفتگو کرتی تھی، جب ہی وہ اس کا احترام اس قدر

کرتا تھا کہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی  
مخصوص نشست خالی کر دیتا تھا۔  
وہ بہت زیادہ نہیں آتی تھی، کبھی کبھار بلکہ زیادہ تر  
تو اپنی سہیلی اناشید کے ساتھ ہی آتی تھی۔ لاشعوری  
طور پر وہ اس کا شکر رہنے لگا تھا۔

\*-\*-\*

آج وہ بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ اور اکیلی نہیں  
تھی اس کے ساتھ ایک نوجوان اسماٹ سا بندہ بھی  
تھا، جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ دونوں اپنی  
مخصوص میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے انداز سے یوں  
لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت عرصے  
سے جانتے ہوں۔ بہت بے تکلفی اور رازداری سے  
گفتگو جاری تھی، وہ چاہتے ہوئے بھی آج ان کی  
طرف نہیں جاسکا، دل عجیب طرح پھوٹتا سا گیا۔

’بہشت بے وقوف، خود کو سنبھالو، کسی کے احترام  
اور اچھی عادت سے اتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا نہیں  
ہوتے، پاگل تو فرش پر اور وہ عرش پر ہے، کیا سوچے  
بیٹھا ہے۔“

اپنی بے چین طبیعت سے گھبرا کر وہ خود کو سرزنش  
کرتا ہوا تیزی سے گزرنے لگا تو ہاتھ قریب ہی ٹیبل پر  
دھرے گلاس سے جا لگا، اور شیشے کا ٹازک گلاس جو  
جوس سے بھرا ہوا تھا، لڑھکتا ہوا میز کرسی پر بیٹھے سفید  
پوش کے کپڑوں کو رگڑتیں، بتانا فرش پر گر کر چکنا چور،  
کیا ایک نذر دار چھنا کا ہوا اور بھونچال سا آگیا۔

جس امیر زادے کے کپڑوں پر جوس گرا تھا، وہ اپنے  
لباس کی حالت دیکھ کر غصے سے بھر کر اس کی طرف  
جھپٹا، اور اسے گریبان سے تھام کر دو تین نذر دار  
کے رسید کر دیے، گالیوں کا ایک طوفان اس کے منہ  
سے اٹل پڑا تھا، سارے لوگ ان کی طرف متوجہ  
تھے۔

”دیکھیں سر! ہم معافی چاہتے ہیں، آپ پلیز  
ہمارے ساتھ آئیں، ہم ابھی آپ کا لباس صاف کرنا  
دیتے ہیں۔ پلیز سراسے معاف کر دیں۔“  
نیچر شاہد صاحب فوراً ہی بول کے جن کی طرح  
دفتر سے یہاں حاضر ہو گئے تھے۔

قیود کو کہاں ماننے والی ہے، محبت تقاضوں اور نسبتوں سے ماورا ہوتی ہے۔ دل کے کواڑ تو کسی کے لیے بھی کھل سکتے ہیں۔ اٹوار کو وہ گھر گیا تو ماں نے ایک اور ہی فرمائش کر دی۔

”بیٹا! اب تم خیر سے برس روزگار ہو گئے ہو بشری کی بھی ممکن ہو گئی ہے، جینز بھی اپنی حیثیت کے مطابق بنا رہی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ بشری اس گھر سے جائے تو کوئی اور یہاں میری بیٹی بن کر بھی آئے۔“

”تمہاری بیٹی؟ ماں کیا کہہ رہی ہو!“ وہ کچھ سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔

”بیٹا! میں تیرے سر پر سراؤں کھنا چاہتی ہوں۔“

آدھی پرانا روایتی ماڈل والا جملہ۔

”کیا سوچ رہا ہے میرے بچے اگر تو راضی ہو تو میں سیکھنے کے لیے فٹنگ سے بات کروں۔“ اس نے اپنی چھپری بھائی کی بیٹی سیکھنے کا ذکر کیا۔

”نہیں ماں! ابھی نہیں... ابھی نہیں۔“ وہ ایک دم بے چین و مضطرب ہو کر چیخ اٹھا، ماں حیرانی اور پریشانی سے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ جبکہ وہ اپنی کیفیت سے بے خبر ماں کو اسی کیفیت میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

”بہت مشکل ہے، دل کو سمجھانا، اس دل کو کیوں نہیں سمجھتا یہ۔ کیوں نہیں۔“ وہ دل پر کے برساتا وحشت زدہ سا ہو رہا تھا، دونوں ٹھہریاں تختی سے بچ کر

اس نے خود کو انتہائی ضبط سے سنبھالا۔ اور وہ کیفیت اب تک درست نہیں ہوئی تھی، دن بدن اس وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا، اس کی دیوانوں کی کیفیت

راجو کی عقابلی نگاہوں سے چھپی نہ گئی، سو وہ سب کچھ اگلا کر ہی چین سے بیٹھا۔

”یار! عجیب ہے تو بھی یہ کہاں دل لگا لیا۔ جانتا ہے وہ سینٹہ ہاشم کی اکلوتی بیٹی نہ ہا ہاشم ہے، ہاشم انگلش اور

سب سے بڑی بات وہ جس لڑکے کے ساتھ آج کل ہوٹل آرہی ہے، وہ اس کا منگیتر ہے۔ بہت بڑی

فیکٹری کا مالک۔“ باہر حیرت زدہ تھا۔

”جیسے یہ سب کس نے بتایا؟“

”چلیں چھوڑیں جناب! کوئی بات نہیں اسے اس کی غلطی کی سزا مل گئی ہے۔ آپ بھی غصہ ٹھنڈا کر لیں۔“ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی انہیں ٹھنڈا کیا، وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”شکر کرو۔ تمہیں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ ایسی بد تمیزی اور لا روایتی میں برداشت نہیں کرتا، میرا ایک

ایک منٹ قیمتی ہے، اور اب اس وقت کے ضیاع کے ذمہ دار تم ہو، جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اس نے انتہائی بد تمیزی سے اسے دھکادے کر مٹایا اور وہ خود بھیگی ملی، ہنا شاہد کے ساتھ آفس کی طرف چل

دیا، وہ تو جیسے زمین میں گڑ گیا تھا، اتنی تیز لپٹ، اتنی حقارت، اتنی شرمندگی، سارے ہال کے سامنے، اور

سب سے بڑھ کر اس کے سامنے، آج تک بھی اس سے معمولی سی بھی غلطی نہیں ہوئی تھی، اور راجو جو جو

اسی بات سے پریشان تھے، اس نے ایک سنگتی، شکوہ بھری نگاہ نہہار ڈالی۔ اور تمیزی سے باہر نکل گیا، خود کو

سنبھالنے میں اسے کافی دقت ہوئی تھی۔ وہ بہت برداشت والا، صابر اور بلند حوصلہ بندہ تھا، یوں تو کبھی

ذلت نہیں ہوئی تھی جیسے آج ہوئی تھی۔

محبت انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ کھوکھلا کر دیتی ہے، وہ خود سے لڑ رہا تھا، اس امیر زاوے نے بھری محفل

میں اسے یوں حقارت سے بے عزت کیا تھا کہ وہ خود اپنی نظروں میں گر گیا تھا، عزت نفس بری طرح مجروح

ہوئی تھی۔

”دیکھو بابر! یہ پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں، اگرچہ یہ قابل معافی نہیں، مگر پھر بھی راجو کے دوست

ہونے اور پہلی غلطی کرنے کی وجہ سے تمہیں چھوڑ رہا ہوں، یہ ہوٹل ہے۔ یہاں معمولی سی غلطی بھی برسوں

کی ساکھ خراب کر دیتی ہے۔ آئندہ خود کو سنبھال کر رکھنا۔“ منیجر نے کہا۔

اسے تو شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ وہ اتنی آسانی سے معاف کر دیا گیا تھا۔ سب ہی دوست اسے اہمیت، حوصلہ اور مبارکباد دے رہے تھے مگر اس کا دل جیسے

بچھ گیا تھا، خود کو سمجھا سمجھا کر ٹھک گیا تھا، بہت بڑی بڑی دیواریں تھیں راہ میں حائل، مگر محبت ان حدود

”تو جب پھیلی دفعہ گھر گیا تھا اتوار کو اس دن اس کی منگنی تھی اپنے ہی ہونے میں۔ اس کے ڈرائیور سے معلوم ہوا تھا۔“

اے تو وہ وحشت وہ بے چینی یونہی نہیں تھی۔ اس دن گھر پر ماں نے جب اس سے بات کی تو وہ کتنا تڑپ کر بے قرار سا گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ کسی اور کی امانت تھی اس کی سنگت کے خواب خواب ہی رہتے تھے۔

”دیکھ یار خود کو سنبھال تیری یہ حالت مجھے بہت دکھ دیتی ہے کوئی اور کام ہوتا تو میں جان خطرے میں ڈال کر تیری خاطر وہ بھی کر کرتا مگر یہ بہت مشکل ہے دل کو تو خود سمجھا سکتا ہے بہت برا روگ ہے یہ جل جل کے تن کو نلہ ہو جائے گا پر اسے آج تک نہیں پہنچے گی۔“ وہ حد درجے سنجیدہ تھا۔

”ہاں کوشش کروں گا اب تو دل کو سمجھانا ہی ہو گا۔“ اس کا لہجہ بھرا ہوا تھا۔ اتنا دگر فرتہ انداز تھا کہ راجو نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا کندھا بھیک رہا تھا، منع نہیں کیا کہ وہ دل کھول کر دے تو غبار بھی چھٹ جائے گا۔

”میرے یار! یہ غربت بھی بہت ظالم ہے اور غریب کی محبت تو بہت ہی ظالم تو بادشاہ ہے۔ تیرے لیے بہت سوہنی رانی کا انتخاب کروں گا۔“ وہ بھلا رہا تھا، بار نے بھی خود کو سنبھال لیا، یوں اشتہار عم بن کر کچھ بھی حاصل نہیں تھا، اس کا تو کام بھی ایسا تھا، ہر روز بھی اس سے سامنا ہو سکتا تھا اور یوں بے حجاب ہو کر تو وہ اپنی نوکری بھی گنوا سکتا تھا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ اگلا پورا ہفتہ آئی ہی نہیں اسے بھی خود کو سنبھالنے کا وقت مل گیا اسے دیکھ کر تو وحشتیں اور برہہ جاتی تھیں۔

\*\_\*\_\*

”یار تو گھر چلا جا ہفتہ اتوار چھٹی کر لے۔“ راجو نے جانے کیوں اسے گھر بھیجے پر سلا تھا، حالانکہ وہ ابھی پھیلے ہفتے ہی تو ہو کر آیا تھا، یہ الگ بات کہ اس نے کبھی چھٹی نہیں کی رات کو پہنچا اور صبح صبح واپس ہو کر۔

”نہیں یار! میں اب ٹھیک ہوں، بس اگلے ہفتے

جاؤں گا کچھ کپڑے بھی لینے ہیں، بشری کے لیے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لاچار ہو گیا۔

اور یہ تو یار کو اگلے دن ہوا جد سے معلوم ہوا کہ اتوار کو نہ ہاکی جہا تکیر خان سے شادی ہے۔

”تو یہ وجہ تھی راجو مجھے یہاں سے نکل کر نکالنا چاہتا تھا۔“ وہ راجو کی محبت پر آئید ہو گیا۔

”تو تمہیں معلوم ہو گیا ہے! راجو نے اس کی بات سن کر کہا۔

”ہاں اور تم فکر نہ کرو۔ میں اتنا بھی کمزور اعصاب نہیں ہوں۔“

وہ کافی بہادر اور حوصلہ مند لگ رہا تھا، راجو کو بھی تسلی ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ ہر آنے والا دن اس کے لیے بہت دشمن ثابت ہو رہا تھا، ہفتے کی رات کو مندی تھی۔ اور دونوں طرف سے مندی کے انتظامات ہوئے، میں ہی اس پر کیے گئے تھے، زبردست آتش بازی اور ہلا گلا تھا، وہ پیلے سوٹ میں پھولوں کے زیورات سے لدی ہوئی نظروں کے سامنے تھی اور دل بے قابو کی وحشتیں عروج پر تھیں۔

”خود کو سنبھال لے یار! یہ چہرہ دوبارہ نہیں دیکھ سکے گا۔ اس روپ کو جی بھر کر نگاہوں میں بسالے۔ یہ تیری قسمت میں نہیں تھی، ناکام مسرتوں پر ماتم کناں ہونے کو تو عمر بڑی ہے۔“ اور کسی بات خود کو سمجھا کر وہ پیش پیش تھا۔

”اے ویٹر! ایک شوخ سی جی سنوری لڑکی نے اسے بلایا، وہ نہ ہاکی کے نزدیک تھی تھی۔

”میں میڈم! بس ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، وہ گہرے درست کر رہی تھی۔

”سنو جلدی سے لھنڈا جوس لے آؤ۔“ اسے عجلت میں حکم دے کر وہ نہ ہاکی طرف متوجہ ہوئی۔

”پلیزیار خود کو سنبھال لو اب فنکشن تک تو بیٹھنا ہی ہو گا، جوس منگوا یا ہے میں نے، پی کر دل سنبھل جائے گا، آج گرمی بھی تو بہت ہے۔“

”میڈم جوس۔“ اس نے اہل جوس کا لھنڈا گلاس نہ ہاکی کے آگے کیا۔ وہ گلاس دیکھ کر ایک دم

چوکی اس کا پسندیدہ جوس، حالانکہ اس نے بتایا نہیں

تھا اور بس ایک لمحے کو دونوں کی نگاہیں ملیں، نہہانے گھبرا کر سر جھٹکا، باہر فوراً پلٹ گیا تھا، وہ بہت عجیب سی کیفیت کا شکار ہوئی تھی، سمجھ میں نہیں آیا، یہ نگاہوں میں کیا دکھاتا تھا، احساس لے کر اس نے دیکھا تھا، حسرتیں، ناتمام آرزوؤں کے فوجے، کیا کچھ درج نہیں تھا ان آنکھوں میں، اسے ایک دم وہ واقعہ یاد آیا۔ جس دن اسے مارا گیا تھا۔ اور بے عزتی ہوئی تھی۔ اس نے بہت شاک کی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا، ایسی ہی عجیب کیفیت کا شکار وہ تب بھی ہوئی تھی، اس نے دوبارہ سر جھٹک کر جوس کا گلاس منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں سارا گلاس چڑھائی۔

مندری کا فنکشن رات کے ایک بجے تک جاری رہا تھا، اور خوب خوب بلہ گلہ ہوا تھا، مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاگیر کا نہ ہونا بھی نہہا کے گھر والوں اور مہمانوں کے لیے تشویش کا باعث تھا، اگرچہ اس کی مصروفیت کا عذر گھر والوں نے بنا دیا تھا، مگر اتنے اہم فنکشن میں اس کی غیر حاضری کبھی کو کھٹک رہی تھی۔

وہ بھی ڈیوٹی دیتے دیتے تھک چکا تھا، مگر نیند ہنوز آنکھوں سے گوسوں دور تھی کہ آج رات کے بعد وہ شام دل و جان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہو جائے گی۔ شام سے ہزاروں بار مختلف طرح کے سوالات، خیالات اور تصورات ذہن میں آچکے تھے، کبھی وہ خود کو جہاگیر کی جگہ دیکھتا تو کبھی نہہا کے ساتھ، مگر اب جبکہ رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی تو مایوسی پوری طرح غلبہ پا چکی تھی، اس نے کھلی آنکھوں وہاں بکھرے ہزاروں پھولوں اور گلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھا۔ ہال میں صوفہ پر جہاں اس مندی لگائی گئی تھی۔ وہاں اس کے کچیرے بھی دھرے تھے۔ اسے بہت گرمی لگ رہی تھی۔ اسی لیے وہ فنکشن ختم ہونے سے پہلے ہی میوزک شوٹنے بغیر چلی گئی تھی، مگر اس نے بہت احتیاط سے کوچ کرنا مارے کچیرے اٹھا کر سمیٹ لیے۔

اس کے لیے تو یہ محبت کی انمول نشانی اور یادگار تھے کہ اس کے ہاتھوں اور جسم کی خوشبو، ان میں

موجود تھی۔ صبح ۱۰ بجے کر کاؤنٹر پر آیا تو راجو نے اسے اماں اور بشری کی آمد کے متعلق بتا کر حیران کر دیا، وہ رات زیاں ہونے کی وجہ سے واجد کے پاس یہاں ہی ٹھہر گیا تھا۔ ۳ ماں بشری کیوں آئی ہیں! خیر تو ہے! عجیب سے وہم ذہن میں آگئے۔ پہلی بار وہ یہاں شہر اس کے پاس آئی تھیں۔

”خیر ہی ہے، ماں جی بتا رہی تھیں کہ انہوں نے خواب میں تمہیں پریشان اور بیمار دیکھا تھا، سوچا کرتے چلی آئیں، بچے وہ ماں ہے، دل کا براہ راست رابطہ اسی ہستی کے ساتھ ہوتا ہے۔“ راجو نے اسے سمجھایا۔

”چھا تو وہ گھر رہی ہیں نا!“  
 ”ہاں فی الحال تو کمرے میں ہیں انہیں ناشتہ وغیرہ دے کر آیا ہوں، شام کے بعد شاید یہاں آجائیں۔“  
 ”اوہو! یہاں اتنے رش میں وہ کہاں بیٹھیں گی، بے وقوف یہاں کیوں بلایا۔“ وہ پریشانی سے بولا، واقعی اتنے بڑے ہوٹل میں تو ان کی آمد قطعی نامناسب تھی، ہال اور کمرے بک تھے، اور ان کے حلے بھی تو اس شان کے نہیں تھے کہ وہ شادی میں شرکت کر سکتیں۔  
 ”تو فکر نہ کر، تیری شان میں کمی آتی ہوگی، میری نہیں، میں اپنے مہمان بنا کر کہیں نہ کہیں بٹھا لوں گا، بس تو مل لینا، ماں جی بہت فکر مند ہیں اور ان کا رونا تو مجھ سے دیکھا ہی نہیں گیا۔“ راجو کے کہنے سے وہ بھی بے تاب ہو گیا۔ ماں کو اس سے بہت محبت تھی، بے تحاشا۔ اور ہمیشہ ہی جب بھی وہ فکر مند پریشان ہوتا تھا تو ماں کو خواب نظر آتا تھا، اور اب بھی اس نے ہانکل صحیح خواب دیکھا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا، بیمار بھی تھا۔ اسے اماں برڈھیروں بیمار آیا۔ جی جاہا اڑ کر پہنچ جائے اور مل آئے، مگر ابھی جانا بہت مشکل تھا، تمام انتظامات مکمل کروانے تھے، رات آنے والی تھی، دلہن والے پہنچ چکے تھے۔ اور دلہن بیوی پار لگائی ہوئی تھی۔ اس وقت!

اسے شدت سے احساس ہوا کہ واقعی دل نے بہت اونچی جگہ واروا ت کی تھی، وہ تو اس قابل ہی نہ تھا، حیثیت، رتبہ، تعلیم سب کچھ ہی کم تھا اس کے

وقت سب لوگ بھوک اور نیند سے اتنے بے حال تھے کہ چوں چراں کیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ وہ بھاگ بھاگ کر کھانا اور ڈشیں لا رہا تھا۔  
 ”ویشروٹ لاؤ۔“ اور وہ روٹ لینے بھاگا مگر راستے میں ہی راجو نے پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہا ہے چھوڑ سب کچھ ادھر آ۔“ وہ بے انتہا خوش اور نہایت پر جوش ہو رہا تھا۔  
 ”کیا کیا ہوا ہے! یار مجھے آرڈر۔“

”آرڈر کی ایسی کی تیسی۔ دفع کر ادھر آ۔“ راجو نے اس کی بات کاٹ کر اس کے ہاتھ سے ڈش چھین کر میز پر رکھی اور اسے گھسیٹا ہوا کرے میں لے گیا۔  
 ”کیا ہے۔ کیا ہوا! یار کچھ بتاؤ سہی راجو مجھے۔“ وہ چیخا رہا گیا تھا مگر اس نے اسے نہ کچھ جواب دیا اور نہ ہی کچھ اور کہنے دیا سیدھا غسل خانے میں دھکیل دیا۔

”چل یہ کپڑے پہن لے جلدی سے تیرے دروی اتار ویشروالی! چھی طرح نہانا تاکہ بدبو نکل جائے کھانوں کی چل جلدی۔“ اس نے نیا خوب صورت سوٹ اس کے حوالے کیا اور خود ہی دروازہ بند کر کے کچھ بھی کہے اور سنے بغیر نکل گیا۔

”یا اللہ یہ کیا عذاب ہے! کیا چکر ہے! کیا کروں! یہ سوٹ تمنا مانا گواہ راجو کے کپڑے مجھے بتاؤ سہی کچھ۔“  
 وہ دوبارہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

”اے گدھے! الو کے دفع ہو، تو ابھی تک نہایا نہیں، جلدی کر ورنہ میں خود تجھے نہلا دوں گا۔ یہ آخری وارننگ ہے جلدی کر۔ کوئی سوال نہیں۔ کوئی جواب نہیں، بس سمجھ لے تیری قسمت کھل گئی۔ لائری نکل آئی ہے، جاننا کر آئے گا تو تاؤں گا۔“

اور وہ اس کے خطرناک توروں سے گھبرا کر اندر گھس گیا، ذہن بری طرح الجھ گیا تھا، چکر سا چکر تھا۔ لائری قسمت، راجو بتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ ”وہ نما کر باہر آیا آئینے میں خود کو دیکھ کر لہجہ بھر کو تو چکر اسرا گیا تھا، ڈارک براؤن سٹکی سوٹ میں وہ گھرا گھرا بہت زبردست لگ رہا تھا۔

”نہالیا، چل اب جلدی سے نکلتی کر، ماشاء اللہ

مقابلے میں۔ دس ہزار میں وہ راستہ بیوٹی پارکر سے تیار ہو کر آئی تھی اور اب پھر گئی ہوئی تھی۔ ان کے ہاں کی طرح تو نہ تھا کہ محلے کی ذرا سمجھ بوجھ رکھنے والی لڑکی نے مشق ستم دلہن کو پکڑ کر اپنی ناکافی مہارت کی بدولت جیسا بھی بنا دیا، قبول کیا گیا۔ بارات ابھی تک نہیں پہنچی تھی، بہت رات ہو گئی تھی۔ سینٹ صاحب خاصے فکر مند موبائل ہاتھ میں لیے چکر پر چکر گیٹ کے لگا رہے تھے، خاندان اور دوست احباب بھوک اور نیند کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے تھے، نیچے بھی رو رو کر سو چکے تھے۔ اور بونٹلیس دے دے کر ان کو بسلا یا گیا تھا، کھانا تیار تھا۔ وہ خود انتظار میں بھوکے ہی تھے۔ صبح سے اتنا وقت بھی نہیں ملا تھا کہ وہ اماں اور بشری سے مل آتا، شام کو اسے بازار سامان لانے بھیج دیا گیا، اور اس نے رات کو جلدی جانے کا پروگرام بنایا تو بارات ہی لیٹ تھی۔ راجو الگ غائب تھا، ورنہ اسی سے کچھ پوچھتا۔

”سنو ڈیٹر پانی لاؤ۔“ وہ سنسان گیلری سے گزر رہا تھا، جب ایک دم ہی سینٹ صاحب نے اسے پکار کر آرڈر دیا، وہ فکر مند اور بری طرح گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس نے فوراً ”سین پانی دیا۔“  
 ”سر! کچھ اور۔“ اس نے پوچھا۔

”تو نو، تم جاؤ۔“ انہوں نے اسے ٹالا۔ وہ انہیں دیکھتا نیچے ہال میں آیا، مہمانوں کی دلی دلی سرگوشیاں اب خوب اونچی اونچی آوازیں میں تبدیل ہو گئی تھیں، اور سب ہی بارات کی تاخیر پر اپنی اپنی آرا دے رہے تھے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا اندر باہر بے چینی پھیل رہی تھی۔ اور یہ صورت حال خاصی تکلیف دہ تھی، وہ خود بھی حیران پریشان سا تھا مگر وقت ختم ہوتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں سینٹ صاحب، ٹیکم صاحب اور دوسرے بڑے کہاں غائب تھے۔ نیچے سو چکے تھے، بھوک سے تڑحال ماؤں کی گودوں میں لڑھکے ہوئے تھے، بہت سی خواتین تو آرڈروے کر کھانا منگوا رہی تھیں۔

”کھانا! اشارت کیا جائے۔“ اس نے حیرت سے سینٹ صاحب کو دیکھا، بارات کے بغیر کھانا، اور اس

تمہیں تو کسی بھی سنگھار کی ضرورت نہیں ہے راجہ ہے راجہ اور رانی کا ہونے والا راجہ! اس نے معنی خیزی سے کہہ کر اسے دکھا۔ تو وہ بری طرح چونکا۔

”رانی! راجہ! راجہ! تو کیا کہہ رہا ہے! مجھے بتائیے چکر کیا ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے سب۔“ وہ الجھ کر اسی کو بھجھوڑنے لگا۔

”بے صبر کر کیوں مارے ڈالتا ہے لو ماں آگس۔ ماں سے سن لے۔“ اس نے پلٹ کر ماں کو دردازے میں کھڑے دکھا تو مارے حیرت کے آنکھیں ابل پڑیں۔

”ماں آپ یہاں آپ تو اور یہ!“ وہ حیرت سے ہکلا کر رہ گیا۔

”بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں باہر آئیں بیٹھ سنا آج میں تجھ سے وہ سب کچھ کہتی ہوں جو میں نے تجھ سے چھپا کر راز کی طرح سینے میں دفن کر رکھا تھا۔“ ماں نے سسہنس پھیلا یا۔

”سینہ ہاشم تمہارا تایا ہے بیٹا۔“ ماں کے انکشاف پر وہ حقیقتاً ”کئی فٹ اونچا چھلا۔“

”ہاں باہر یہ دولت اور اس کی ہوس اپنوں سے بیگانہ کرتی ہے۔“

سکے رشتوں اور رشتے داروں کے درمیان اتنی اونچی دیواریں اتنی بڑی دراڑیں بن جاتی ہیں کہ وقت کے بے رحم طوفان بھی گرا نہیں سکتے تمہارے چچا کی وفات کے بعد تمہارے ابو اور تایا ہی ساری دولت کے حقدار تھے تمہارے تایا ساری دولت خود ہڑپ کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے ایک منصوبے کے تحت تمہارے ابا سے ایک ساوا کاغذ پر دستخط کروا لیے اور تمام جائیداد چالاکی سے ہتھیالی۔ تمہارے ابا بھائی کی یہ بے وفا کی برداشت نہ کر سکے بیمار ہو گئے اور یوں وہ بیماری ہی کی حالت میں چل بے تمہارے تایا نے ہمیں کوٹھی سے نکال دیا۔ میں نے تمہاری اور بھئی کی خاطر تمہاری زندگیوں کی خاطر کبھی پلٹ کر بھی ہاشم بھائی سے نہیں پوچھا کہ انہوں نے ہمارے دے کا مال ہمیں دینے کے بجائے خود ہڑپ کیوں کر لیا

میں نے محنت کی، تمہیں اپنی حیثیت سے بڑھ کپالا، بڑھایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی کہ جو قسمت میں نہیں تھا اس کے لیے کیا ترنیا، مجھے اپنے مولا یقین تھا، بیٹیوں کا مال کبھی ہضم نہیں ہوتا، کبھی نہ کبھی تو ضرور اللہ اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ اور آج! آج خدا نے میری سن لی۔! بیٹا میں جو بے سارا کھی میں جو بے وقعت کھی ہاشم بھائی نے مجھے دکھ دے کر نکال دیا تھا۔ آج وہی مجھے عزت دے رہے ہیں مجھے محتر بنا دیا ہے وقت نے میرے مولا نے۔“

ماں کا سر فخر سے بلند تھا، باہر حیرت زدہ سب سن رہا تھا۔

”مگر ماں اب۔“

”اب نہہا ہاشم بھائی کی بیٹی تمہارے بیوی بننے والی ہے۔“

”بیوی! نہہا! ماں آپ۔“ باہر کو اب بختہ یقین ہو رہا تھا ماں کی وفا کی حالت پر۔

”سن باہر! نہہا کا منگیتر جانا گنیر خان فراڈ نکلا ہے وہ پہلے سے شادی شدہ بچوں کا باپ ہے۔ صرف ہاشم صاحب کی دولت ہتھیانے کو نہہا سے جھوٹ بول کر اسے محبت کے جال میں پھنسا لیا تھا اور عین وقت پر آج شام اس کی اصلیت پتا چلنے پر ہاشم صاحب نے اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا۔ اب مسئلہ بہت خطرناک تھا کہ مہمان آچکے ہیں اور بس تیار اور دو لہا عائب لوگوں کو علم ہو جاتا کہ ہاشم صاحب کا ہونے والا داماد فراڈ ہے تو سارے شہر میں ان کی عزت و کوڑی کی برہ جاتی۔ ایسے وقت میں ماں رحمت کا فرشتہ بن کر آئیں انہوں نے ملنا تو تم سے تھا کیونکہ صبح سویرے واپسی تھی اور تم رات بھر یہاں ہی رہتے، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہاں ہاشم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور یوں برسوں کے گلے شکوے، زیادتیاں اور مظالم بھلا کر ماں نے انہیں معاف کر دیا اور نہہا کی خاطر تمہاری قربانی دینے پر تیار ہو گئی ہیں حالانکہ میں جانتا ہوں تمہیں یہ قربانی دینے میں کسی تامل، کسی انکار کی ضرورت نہیں ”تم بکرا“ بننے پر بخوشی راضی ہو گے۔“ اس نے بکرے پر خاص زور

اماں تو دیوار سے جلد باہر آنے کی ناکید کر کے نہا اور بھائی بھانج کے پاس چلی گئی تھیں اور اب راجو سے پھولوں کے ہار پہناتا تھا۔

”یا زویے وہ دولت مند حسینہ تجھے دیکھ لے تو بے ہوش ہو جائے، بڑا اچھا موقع ضائع کیا بادشاہ تم نے۔“

”نہیں راجو یہ جو آج مجھے اللہ نے اتنی بڑی خوشی دی ہے اتنی بڑی مہمانی مجھے نصیب کی ہے تو یہ اسی نیکی کا صلہ ہے، میں چاہتا تو گناہ کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر اپنے نفس کی تسکین کر لیتا، مگر خدا کی لاکھ مہمانی ہے کہ میں بچ گیا، مجھے یہ دولت کے بل پر غلام خریدنے اور دم ہلانے والے چتھے پتھے چلتے مرد پسند کرنے والی لڑکیاں زہر لگتی ہیں۔ نہہا کی نیکی اور شرافت نے مجھے متاثر کیا تھا، جب پتا چلا کہ وہ کسی کی امانت ہے تو میں نے خود کو آگے بڑھنے سے روک لیا اور اب وہ میری ہو رہی ہے تو میں اپنے پروردگار کا بے انتہا شکر گزار ہوں۔“

”بابر نے اس کی بات کا تفصیلی جواب دیا۔

”ہاں یار! ضبط کے امتحان سے سرخرو ہونے والا شخص ہی مومن مسلمان ہے، ورنہ غربت تو انسانیت اور مذہب سب کچھ بیچنے پر تلی رہتی ہے۔“ راجو نے اسے آننے کے سامنے گھڑا کیا۔ پھولوں کی لڑیاں اس کے چہرے کو کھل ڈھانپنے ہوئے تھیں۔

”اور پھر ایک ہنگامہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔ رات کے نو بجے جب آدھے مہمان جا چکے تھے اور کچھ آ رہے تھے بعدہ دولا۔ تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

بہت قریبی عزیزوں کو صورت حال کا علم تھا، جو نا واقف تھے وہ دولا سے بھی انجان تھے، ہاشم صاحب نے باہر کا ہاتھ تمام کر صوفہ پر بٹھایا اور کچھ ہی دیر بعد وہ نہہا ہاشم کا ہو چکا تھا، اور وہ اس کی اتنی بڑی اور اچانک خوشی کا تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، مگر اب مسلسل سامنے راجو اور پہلو میں بیٹھی نہہا احساس دلاری تھی کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔

فی الحال نکاح تھا، رخصتی ابھی ملتوی کر دی گئی تھی، اگرچہ ہاشم صاحب تو اپنے ہی گھر لے جانا چاہتے تھے مگر وہ نہیں مانا، وہ اسے اپنے گھر رخصت کروا

کے لانا چاہتا تھا، اور اس کے لیے وقت اور صبر کی ضرورت تھی۔

گھر والوں نے فکر مندی اور پریشانی کی وجہ سے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا، نکاح کے فوراً بعد ہاشم صاحب بعدہ بیٹھ اور دیکر افرودا کھنگ ہال میں آئے تو اس نے بھی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ساتھ بیٹھی متاع جان و دل کو دیکھا، وہ بے حد سنجیدہ اور خاموش تھی شاید روٹی بھی تھی۔

ایک دم سے دل کو کچھ ہوا۔

”بابر! یہ تو جہا نکیر کے خواب دیکھتی رہی ہے، یہ تو نئی زندگی اسی کے حوالے سے شروع کرنے کا سہانا پینا دیکھ رہی تھی تو درمیان میں کہاں آ گیا، کیسے یہ عزت بچانے اور حکم کی بجا آوری کا سودا تو نہیں ایسا ہے تو یہ طلال عمر بھر کا ہو گا کہ تو مشکل وقت میں ایک ٹیک انسان کی طرح خدمت کر کے معاوضہ وصول کر گیا۔“

اس کے اندر کا شور اتنا اونچا تھا کہ وہ گھبرا کر اسے پکار بیٹھا۔

”نہہا! عجیب سا بے قرار لہجہ، بے تاب انداز، کچھ سننے سنانے کو بے چین وہ اس کی طرف جھکا ہوا تھا۔

نہہا نے آہستہ سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہی عجیب سا کرنٹ مارنا احساس اسے چھو گیا، جیسا شام کو جوس پیتے وقت ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں جو جذبہ تھا، وہ آج سے پہلے اس نے جہا نکیر کی آنکھوں میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ وہ مجنوں کی طرح دیوانہ تھا اس کی محبت میں۔

وہ سب جھوٹ تھا نہہا، دھوکہ فراڈ، دکھاوا، سچ اور حقیقت سے دور مصنوعی اظہار، مصنوعی انداز، تو کیسے جان سکتی تھی۔ ان آنکھوں کے دہکتے جذبوں کو، انگارے برساتے لہجے کو ایسی لوہڑی محبت، بھری نگاہ کہ ہندہ پکسل کر رہ جائے، عجیب سی سنسنی اس کے اندر لس لس میں پھیل گئی۔

”نہہا! میں جہا نکیر سے ہر لحاظ سے کم تر ہوں۔ تم شاید مجھے جس حوالے سے دیکھ چکی ہو، اب قبول نہ کر سکو۔ مگر ایک بات میں کہوں گا، میں تم سے قطعاً

سب کو، مگر وہ نہیں مانا، وہ اسے اپنے گھر رخصت کروا

فخر سے سراونجا کر کے اپنے جیٹھ سیٹھ ہاشم کو دکھا جو سر جھکائے شرمندہ شرمندہ باہر سے باقیں کر رہے تھے۔

”آج میں نے اپنی انا کو ختم کر کے معاف کر دیا سب کو، اور معتبر شہر گئی۔ وقت سے مجھے ایسے ہی شاندار فیصلے کی توقع تھی، اور میری آس، میری امید رائیگاں نہ گئی، آج مجھے ساری محنتوں اور صبر کا پھل مل گیا ہے، معاف کرنے میں جو عظمت ہے، وہ انتقام لینے میں کہاں۔“

ابن نے آگے بڑھ کر ہاشم کو گلے لگا لیا، باہر پہلے ہی آیا ہاشم کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

لوٹ اور حقیقی محبت کرتا ہوں، یہ بندھن خواہ عزتوں کو بچانے کے لیے باندھا گیا ہے، یا کسی گئی زیادتیوں کے ازالہ کے لیے میرے لیے بہت مقدس اور مجھے بہت عزیز ہے۔ میں دعویٰ نہیں کرتا، گوشش کروں گا کہ تمہارے معیار پر پورا اتر سکوں۔“

وہ خاموشی سے دم بخود اس کی گفتگو سن رہی تھی، واقعی یہ بندھن ابھی تو عزتوں کے بجاؤ کی خاطر قائم کیا گیا تھا، بابا سے سب کچھ ہٹا چکے تھے۔ اور ہاتھ باندھ کر اس سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے اسی وقت ان کے بندھے ہاتھ تھام لیے، اسے خود اس فراڈ سے ظالم جہانگیر خان سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی، جس نے اس کے ساتھ محبت کا اتنا بھیانک کھیل اتنا عرصہ اتنی کامیابی سے کھیلا تھا کہ وہ بے وقوف، بس اس کی چلائی کو سمجھ ہی نہ سکی۔

اور اب!

اب جبکہ وہ اس شخص سے وابستہ ہو گئی تھی، جس کے بارے میں پہلے تو وہ کچھ اور سمجھتی تھی، مگر بابا اور جی جان کے مٹنے کے بعد اس کی حیثیت اور رشتے کا تعین ہوا تھا۔ اور اب وہ حیات کا مالک بنا دیا گیا تھا، اتنے اچانک فیصلے اور اس طرح کے آپ سیٹ سے وہ غیر یقینی کیفیت میں دکھتے سر کے ساتھ خاموش منجمد بھی سوچ رہی تھی، بابر کی محبت کا تو علم تھا، مگر وہ لا علم تھا اور اسے جہانگیر کے حوالے سے جو کہہ رہا تھا، وہ درست نہیں تھا، وہ اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی، زندگی کے اس سفر کی شروعات غلط فہمیوں اور اندیشوں سے نہیں ہونی چاہیے تھی۔

”جہانگیر! میرے ماضی کا ایک کربناک کردار تھا، جو میں دفن کر چکی ہوں، مجھے اور کچھ نہیں کہنا، صرف یہ کہ آپ اپنے دل میں جہانگیر اور میرے حوالے سے کسی غلط فہمی، شک کو جگہ نہ دیں۔ کچھ وقت مجھے کہنے اور سوچنے میں لگے گا، مگر فیصلہ مثبت ہی ہوگا۔“

وہ دھیرے دھیرے اس سے کہہ رہی تھی، اور بابر کا دل چاہتا تھا، سچ سچ کر دینا کہتا ہے کہ میں جیت گیا ہوں، میری محبت مجھے مل گئی ہے اور یہ حقیقی خوشی ہے دیکھتے چہوں پر اطمینان بھری نگاہ ڈال کر امان نے

اُردو اور انگریزی ادب کا بہترین انتخاب

## عمران ڈائجسٹ

الکویبر کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

• بہت تاثر دہشے ہے جنوں، سلسلی ریت پر انھیں ٹھونسنے والی ایک دو شیزہ کے پھپھتاوے کی کہانی جس نے تصویر کا ایک ہی رخ دکھایا تھا، اس سے ماہ کی خاص کہانی۔

• آدھے سفر کی پوری کہانی، کرشن چندر کی آپ بیتی، اسے آپ ان کی آخری تحریر بھی کہہ سکتے ہیں

۱۵ طویل و طویل تر مختصر و پراثر کہانیاں  
۳۳ دلچسپ و تپا سرار سلسلے وار کہانیاں  
اور ایک عبرت اثر ناول کی مکمل تلخیص

الکویبر کا عمران ڈائجسٹ آج ہی خرید لیں



رہی تھی۔ آتش دان کے آگے وہ صوفے میں دھنسا  
سگریٹ کے کس پر کس لگا رہا تھا۔ اس کی اداؤں سے  
بے چینی متشعشع تھی۔ وجیہہ سے چہرے پر شمع

ذہم تاریک سے وسیع و عریض ڈرامنگ روم میں  
جس کے چاروں کونوں میں شیڈس سے خارج ہوئی  
ہبزی بائیں ملکہ پاور کے بلب کی مدہم سی روشنی جل

(یہ سلاطنت افخوگ)

حاصلی حاکم  
مجلسی حاکم

مجلسی تاویل



READING  
ction



READING  
Section

Scanned by [www.Pakistanipoint.com](http://www.Pakistanipoint.com)



چڑھا کر عالیہ کی طرف پلٹا۔ جو کسی رکتے ہاتھوں پکڑ لئے جانے والے مجرم کی طرح نگاہیں فرس۔ گاڑے چہرہ جھکائے اپنی انگلیاں موڑ رہی تھی۔ اس کا سہا سہا انداز نگاہیں گراناس کی خاموشی اور بدحواسی غرض یہ کہ اس کی ایک ایک ادا اس کے مجرم ضمیر ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔ اس نے اس کے نزدیک آکر اپنی جلتی سلگتی نظریں اس پر مرکوز کر کے بڑے سخت لہجے میں پوچھا۔

”یہ تم کس سے باتیں کر رہی تھیں کون تھا وہ۔“  
 ”کس کون۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ عالیہ نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی لرزتی کانپتی آواز اس کی بناوٹ کی چغلی کھا رہی تھی۔ کم از کم آذر کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ وہ جذب میں آکر بولا۔

”تم مجھے پٹانے کی کوشش نہ کرو عیار لڑکی! سچ سچ بتا دو کہ وہ کون تھا؟“

”پتا نہیں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں جب کوئی تھالی نہیں تو میں کیسے بتا دوں کہ کون تھا اور وہ بھی ایسے نادقت بھلا کون میرے پاس آسکتا ہے۔“ عالیہ یوں بولی جیسے اس کے سوالوں سے عاجز آگئی ہو۔

”دیکھو مجھے فریب دینے کی کوشش نہ کرو مکار عورت! سچ بتاؤ کہ وہ کون تھا اور رات کی ٹھانیوں میں تم سے ملنے کیوں آتا ہے؟“

عالیہ کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے پر اسے تاؤ آگیا۔ اس نے عالیہ کو شانوں سے پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے کہا۔

”میں چاہوں تو بار بار کر بھی تم سے سب کچھ اگلا سکتا ہوں۔ مگر میں انتہائی شرافت سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے خود اسے تم سے باتیں کرتے سنا ہے۔ اب تم سیدھی طرح بتا دو کہ وہ کون ہے۔“

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں آذر۔ آپ کے سوا میرے پاس بھلا کون آسکتا ہے وہ بھی اس بند کمرے میں کیا۔ آپ مجھے ایسا ہی گیا کزرا سمجھتے ہیں۔ کیا میں نے آج تک کوئی ایسی ناز با حرکت کی ہے جس پر آپ

اور سامنے والے کارپٹ پر مرکوز ہے حد چمکی سی نگاہوں میں ٹیک و سہمت اور غم و غصے کی کیفیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ یوں جیسے ضبط کی انتہا تک پہنچنے کے باوجود برداشت کی قوت بار بار ہورہی ہو۔ مگر بے یقینی اور بدگمانی ان بھری غمگینی کیفیتوں کو بے لگام ہونے کا موقع نہیں دے رہی ہو۔ بہر حال اگر یہ اس کی بدگمانی ہی تھی اور وہ بھی کسی قدر ڈھکمل یقین۔ مگر اس کے کانوں میں بار بار وقفے وقفے سے وہی مردانہ بھاری سی و جھمی آواز کہیں دور پہنچتے خطرات کے سائن کی طرح گونج رہی تھی۔ ہاں یہ تو آواز بڑے واضح طور پر پورے ہوش و حواس کے ساتھ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ گویا کچھ بھی نہ تھا کیونکہ امریکی طرز کے ٹیک کے پالش شدہ دروازے میں کوئی کی ہول تھا نہ جھری جس کی راہ اندر اپنی خوابگاہ کا منظر دکھا جاسکتا۔ مگر عالیہ کی وہ خوشامدانہ سی سرگوشیاں اور مردانہ بھاری آواز میں کسی کی کھسر پھسراتنی واضح تھی کہ ایک اونچا سننے والا انسان بھی آسانی سے اسے سن سکتا تھا۔ اس پر اندر اس کی خوابگاہ میں ہلکی ہلکی کھڑکی بھی ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر دروازے سے کان لگائے وہ خوابگاہ سے آئی ان غیر مبہم سی مشکوک آوازیں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ کہیں اس کی سماعت دھوکہ تو نہیں کھا رہی۔

پھر ایک دم ہی دروازے کا ہینڈل کھما کر خوابگاہ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی عالیہ خوابگاہ کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے جن کا وہ شدید الٹی تھا۔ ہلکا ہلکا سا خوف ہو رہا تھا اور اڑی اڑی رنگت کے ساتھ وہ اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا چیز سے اسی دروازے کی

طرف جھپٹا جو عمارت کی دائیں سمت عقبی حصے تک جاتی روش کی طرف کھلتا تھا اور جس پر دروازہ اب بھی آہستہ آہستہ مل رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے روہ پٹایا۔ دروازہ گواندر سے بند تھا پھر جی اس نے چینی مگر آکر اسے کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا اور پھر چینی

کو مجھے نوکنا پڑا ہو۔ اتنی سخت قسم کی باز پرس کئی پڑی ہو۔

اس کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش میں عالیہ کے پنکھڑوں کی مانند نازک ہونٹ سوکھ کر رہ گئے تھے۔

”مگر یہ پردہ کیوں مل رہا تھا۔ اور تم ہاتھوں کی طرح آپ ہی آپ کیوں بول رہی تھیں؟“ اس نے پھر بڑی کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر سوال کیا۔

”میں۔۔۔ میں آپ ہی آپ بول رہی تھی؟ نہیں نہیں۔ وہ تو آج پھر مجھے وہی محسوس ہوا تھا اس لئے میں نے پردہ ہٹا کر دکھا تھا مگر۔۔۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا؟“

وہ کسی طرح قبول کر کے نہیں دے رہی تھی۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔۔۔ اس کے رنگ اڑے رخساروں کو بھگوتے اس کے لباس میں جذب ہونے لگے۔ اس کی آہوئے خشن جیسی آنکھوں میں ابریاں کا سماں دیکھ کر مزید کچھ پوچھنا اس نے بیکار ہی سمجھا۔ ایک جھٹکے سے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹائے اور خوابگاہ کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

باہر جہاں کوریڈور سے لے کر ڈرائنگ ‘ڈائننگ‘ لابی ‘لاؤنج‘ کچن اور عمارت کے باہر پھیلے خنک اور مہیب اندھیروں میں ڈوبے لائزا اور روشنوں پر سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ مگر خاموش اور ساکت ہونے کے باوجود ہر شے جیسے وقت کے کسی بھی لمحے میں اس میں جان پڑ جائے گی اور بول اٹھے گی۔ اسے خوف نہیں کچھ وحشت سی ہونے لگی۔ مگر دماغ ابھی تک سلگ رہا تھا۔ کیونکہ آج عالیہ کی یقین دہانی عذر معذرت اسے مطمئن نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ عالیہ کی باتوں سے کسی حد تک متاثر ضرور ہوا تھا اس لئے کہ اپنی تین سالہ ازدواجی زندگی میں اسے ایک بار بھی مالیہ کو نوکنا نہیں پڑا تھا۔ وہ بھی ایسی معاملہ شناس

لوہدار بے زبان اور بے ضرر سی۔ اماں اپنی زہر آلود اہل سے اس کا دل اور جگر چھلکتی کر دیتی تھیں مگر وہ منہ سے اذ تک نہ کرتی تھی۔ اور تو اور آڈر کے سامنے

بھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتی تھی۔ اس پر فرض شناس ایسی کہ اگر آدھی رات کو بھی کوئی اسے آواز دیتا تو اس کا کام کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتی۔ اماں کی عمل داری میں گھر کا کام سنبھالنا تو خیر ممکن ہی نہ تھا لیکن اماں نے اس پر جن کاموں کا بوجھ ڈالا تھا۔

انہیں اپنی بساط سے بڑھ کر وہ مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی تھی اور پھر شوہر کی چاہت کا یہ عالم کہ اس کی ذرا سی تکلیف اور پریشانی پر بے چین ہو اٹھتی تھی۔ وہ جو کتا تھا وہی کرتی تھی۔ آڈر کو اس کا بار بار میسجے جانا پسند نہ تھا۔ اس لیے اس نے میسجے جانا بھی کم کر دیا تھا۔ مگر یہ بات جسے وہ پچھلے کئی ماہ سے بہت معمولی اور بے حقیقت سمجھتا آ رہا تھا۔ اسے اب محض ایک وہم اور دھوکا سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی سماعت نے وہ مردانہ آواز اور عالیہ کی کھسر پھسر محفوظ کر لی تھی اور اب وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ عالیہ اسے پچھلے چند ماہ سے دھوکہ دیتی آ رہی ہے۔

آتش دان کے نزدیک رکھے فوم کے صوفے میں دھنس کر اور سگریٹ۔ سگریٹ پھونک پھونک کر وہ حالات کی کڑیاں ملا لگا۔

یہ سلسلہ تو پچھلے کئی ماہ سے جاری تھا۔ تقریباً اب سے پانچ ماہ پہلے ایک رات جب وہ اپنی ڈیوٹی بھگتا کر واپس گھر آیا تو حسب معمول اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھول کر اس نے دیکھا۔ عالیہ بڑی خوفزدہ سی اپنے بیڈ کے قریب کھڑی دوسرے دروازے پر پڑے بیٹھے ہوئے پروے کو دیکھ رہی ہے۔ یہ دوسرا دروازہ عمارت کی دوا میں سمت عقبی حصے تک جانے والی روش کی طرف کھلتا تھا۔ اسے بھی ایک تجسس سا پیدا ہوا۔ اس نے دبے دبے قدموں سے عالیہ کے نزدیک آکر پوچھا۔

”کیوں بھئی کیا دیکھ رہی ہو؟“ اور عالیہ ایک جلی دلی چیخ کے ساتھ ڈر کر اچھل پڑی۔ اور وہ اس کے آس پاس ہی طرح ڈر جائے رہنے لگا۔

”بھئی آخر تا تو تو سہی کہ ماجرا کیا ہے۔ تم کس چیز

سے اس قدر خوفزدہ ہو رہی تھیں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ عالیہ نے بوکھلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر پھنسی پھنسی آواز میں پردے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

”یہ۔۔۔ یہ پردہ۔“

”ہاں یہ ہے تو پر وہ ہی، مگر تم نے کسی بھوت و دوت کو تو اس میں سامنے نہیں دیکھا لیا۔“

وہ اسے چھیڑنے کی غرض سے مسکرا کر بولا۔

”نہیں نہیں بس۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔“ خوف کے مارے عالیہ کے منہ سے الفاظ ہی ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی چیز سے خوفزدہ ہو گئی ہے اس کا ڈر مٹانے کو وہ اسی دروازے کی طرف بڑھا تو عالیہ نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

”نہیں نہیں دروازہ تو اندر سے بند ہے، مگر یہ پردہ پتا نہیں کیوں مل رہا تھا جبکہ پتکھا بھی نہیں چل رہا۔“

”۳۳ رے تو کوئی ملی یا چوہا ہو گا۔ بلکہ چوہا ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ملی تو اتنی سی جھری میں سے نہیں گزر سکتی تم خواہ مخواہ ہی ڈر کر رہیں۔“

اور پھر اپنا کوٹ اتارنے لگا تو عالیہ اس کا بازو چھو کر جلدی سے دوسری طرف گھوم گئی۔

”واہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی ڈر بوک بھی ہو سکتی ہیں۔ ورنہ کوئی باڈی گارڈ ضرور چھوڑ کر جاتا۔“

اس نے کوٹ اتار کر اپنی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے ہنس کر کہا اور پھر کوٹ کو لے کر پر لڑکا کر اس کے نزدیک آکر بولا۔

”سب سے بڑا آسیب تو میں ہوں۔ مجھ سے ڈرو تو کوئی بات بھی ہو۔ یہ چوہوں اور بلیوں سے ڈرنا بھی بھلا کوئی معقولیت ہے۔“ وہ ہنس ہی نہیں رہا تھا بلکہ بڑی وارفتہ نظروں سے اس کے خوبصورت اور معصوم سے چہرے کو تنگ رہا تھا۔ مگر وہ شرمانے کے بجائے کترائی سی لگ رہی تھی۔ کم از کم اسے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ مگر وہ تو اس کی بھولی بھالی اور سوہنی سی صورت کا دیوانہ تھا اور اپنی ماں بہنوں کی زیادتیوں کا

ازالہ وہ اپنی بے پناہ چاہت اور گرجو شہی دکھا کر ہی کرتا تھا۔

”کیوں بھئی، کیا تمہیں مجھ سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔“ اس نے اپنی وارفتگی میں والہانہ پن شامل کر کے اس کی ٹھوڑی اوپچی کر کے پوچھا تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بڑے قاطعانہ انداز میں مسکرائی اور ایک اوائے دلربائی سے بولی۔

”آپ سے تو اتنا ڈر لگتا ہے کہ کیا بتاؤں۔“

”۳۴ چھا۔ مجھ سے یا اماں جان سے۔“ اس نے معنی خیزی سے کہا اور پھر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”بھئی کیا کریں، اماں تو ایک رداقتی ساس کی بہترین مثال ہیں، مگر ہم تو تمہارے دیوانے ہیں نا۔“ اس نے اسے مثالوں سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرے لیے یہی بہت کافی ہے۔ آپ کی رفاقت اور محبت حاصل رہی تو پھر کوئی خواہ ظلم و زیادتی کی انتہا کر دے مجھے بالکل پروا نہ ہوگی۔“

”شباباش بچہ، مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ اس نے اس کا گل آسا چہرہ اپنی ہتھیاریوں میں لیتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ایسی دلکش اور پیاری ہنسی کہ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

”بھئی ہماری آنتیں قل ہو اللہ ہی نہیں بلکہ صدق اللہ العظیم بھی پڑھ چکی ہیں اور آپ ہیں کہ بس اپنی اداؤں ہی سے ہماری بھوک مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔“

”۳۵ وہاں واقعی، آپ کی باتوں میں کچھ خیال ہی نہ رہا۔ کھانا تو کب کا تیار رکھا ہے مگر آپ لباس تو تبدیل کر لیں۔“ وہ اس کے یاد دلانے پر کچھ جھل سی ہو گئی۔

”۳۶ چھا تو ایسا کرو۔ تم کھانے کی ٹرائی نہیں لے آؤ۔ اتنے میں میں کپڑے بدل لیتا ہوں۔ کیوں کھیک ہے نا۔“

”ہاں بالکل بالکل۔“ وہ اس کے لیے اور اپنے لیے کھانا لانے کی جھلت دکھاتی ہوئی بولی اور پھر کمرے

READING  
Section

نکل گئی۔

”میرے خیال میں تو تمہیں کچھ وہم ہو گیا ہے۔“  
اس نے ٹالنے کی گھر ٹھولتے ہوئے قدرے لاپرواہی سے  
کہا۔

”وہم ہاں۔ شاید وہم ہی ہو گیا ہے۔“ عالیہ  
عجیب سے انداز سے بولی۔

”ہاں۔ ورنہ میں تو اسی طرف سے آ رہا ہوں۔ کوئی  
ہوتا تو۔“

”آپ۔ آپ اسی طرف سے آرہے ہیں۔“  
آذر کی بات سن کر اس نے گھبرائے ہوئے تہجے میں  
پوچھا۔

”ہاں بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اسی دروازے سے  
آؤں مگر تمہارے ڈر جانے کے خیال سے ارادہ ترک  
کر دیا۔“ وہ اس کی گھبراہٹ کو اس کے خوف پر محمول  
کر کے ہنس کر بولا۔

”نہیں نہیں۔ میں ڈرتی تو نہیں۔ بس ایک خیال  
سابندھ جاتا ہے۔ یا پھر میرا وہم ہی ہو گا۔ اسی لیے تو  
میں نے کھٹکے کو بھی چیک کیا تھا۔“ وہ سخت گڑبڑا رہی  
تھی۔

”لیکن تمہارا یہ وہم۔ میرا مطلب ہے اس کا کوئی  
سر پیر بھی ہے۔ کیا تمہیں کچھ نظر آتا ہے یا پھر کسی قسم  
کا احساس ہوتا ہے۔“ اس نے غور سے عالیہ کی اتری  
اتری صورت دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں نظر تو کچھ بھی نہیں آتا۔ البتہ کچھ ایسا  
محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کمرے میں موجود ہے۔“ عالیہ  
نے اس کی نظروں سے اپنے چہرے کے تاثرات  
چھپاتے ہوئے کہا۔

”پھر تو یقیناً“ کوئی جن دن تم پر عاشق ہو گیا ہے۔  
کسی پر ہی زاوے سے کم بھی تو نہیں ہو۔“ وہ بڑے شرر  
سے انداز میں آنکھیں منکا کر بولا۔

”نہیں خدانہ کرے۔“ عالیہ نے ایک جھرجھری  
سی لے کر کہا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

”ہاں بس ایک ہی ہوا ہے۔“ وہ اس کے مذاق  
اڑانے پر جھینپے جھینپے انداز میں مسکرا کر آہستہ سے  
بولی۔

”اچھا۔ مگر کون؟“ اس نے بھنویں تان کر بڑے

بات بہت معمولی تھی۔ اس لیے اس نے کچھ  
خیال ہی نہیں کیا۔ یہی سوچا کہ کسی دفنی تاثر کے تحت  
عالیہ ڈر گئی ہوگی۔ ویسے بھی فطرتاً بہت نازک طبع اور  
بھولی بھالی ہے اور پھر نیچے تنہا بھی تو رہتی ہے۔ میں  
اتنی رات گئے آتا ہوں۔ مگر کیا کروں، میرا کام ہی ایسا  
ہے۔ جب بھی رات کی ڈیوٹی لگتی ہے۔ دیر سے ہی گھر  
آنا پڑتا ہے۔ تو کیا آصف سے کہہ دوں کہ عالیہ کا خیال  
رکھا کرے۔ مگر نہیں ایسی حماقت تو کبھی بھول کر بھی  
نہیں کروں گا۔ ہماری اماں تو ایسے موقعوں کی تاک  
میں رہتی ہیں۔ نامعلوم کیسی کیسی تہمتیں لگا دیں۔ پھر  
یہ تو محض اس کا واہمہ ہی تھا ورنہ پہلے تو کبھی نہیں ڈرتی  
تھی۔

ان دنوں اس کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ کشم آفس  
میں پروڈنگ آفیسر کے عہدے پر فائز تھا اور بیرون  
ملک جانے اور آنے والے ہر سامان کی چیکنگ اس  
کے ذمے تھی۔ ویسے بھی ذاتی طور پر وہ ایک معقول  
گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد ایک بڑے  
بزنس مین تھے اور گھر میں اللہ کا دیا وہ کچھ بھی تھا جس  
کے ہونے کی ایسی ضرورت تھی نہ تمنا۔ کبھی رات کی  
اپنی لگتی جو دنوں بعد لگتی تھی تو اسے تمام رات گھر  
سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ مگر ان دنوں بیرونی ملکوں سے مال  
مدار جہاز آنے کی وجہ سے اس کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ  
اسے رات گئے ہی گھر آنے کی فرصت ملتی تھی۔ اس  
آئے کو کوئی روز گزر گئے تھے کہ ایک رات پھر وہ اسی  
طرح بے آواز قدموں سے اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا تو  
بالہ کو بیرونی سمت کھٹکنے والے دروازے کا کھٹکا لگاتے  
ہے پایا۔ اس وقت وہ بہت عجلت میں اور گھبراہٹ  
میں تھی۔ جلدی سے کھٹکا لگا کر مڑی تو اس پر نظر پڑتے  
ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اور نہ جانے کیوں اسے  
لہنے دل میں ایک عجیب سی سرسراہٹ محسوس  
ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے ہنس کر پوچھا۔

”کیوں ہنسی تمہیں آج پھر کچھ نظر آیا؟“  
”نہیں نظر تو کچھ نہیں آیا۔“ عالیہ کی آواز لڑکھرائی

مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

”تو جو میری زندگی کا مختار کل ہے۔“ عالیہ نے کسی قدر اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا تھا۔  
”وہ اچھا اچھا۔ پھر تو تمہیں کسی بھی چیز سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ تمہارے اس جن نے تو تمہیں پورا پورا تحفظ دے رکھا ہے۔“ وہ عالیہ کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

”ہاں“ اسی پر تو میری تمام تر زندگی کا دار و مدار ہے۔“ عالیہ نے بڑی خود سپردگی میں اس کے سینے سے سر نکالیا۔

”اوہو بڑا ناز ہے تمہیں اس پر، مگر پھر بھی اسے بھوکا مارنے سے باز نہیں آتیں۔ معلوم بھی ہے آج لچ کھانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔“

”تو اور میں اس طرح اسٹینڈ ٹو کی حالت میں کھڑی کسی لیے ہوں۔ مگر آپ تو مجھے اپنے پاس سے ہٹنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔“ عالیہ نے بڑے ناز سے کہا۔  
”ہاں کیا کریں سخت مجبور ہیں، ورنہ اپنے بس میں ہوتا تو سماں۔“

اس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

”ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لیتے جس میں تم فٹ آجاتیں اور پھر دفتر کا کروینڈ کر کے تمہیں نکال کر اپنے سامنے بٹھاتے اور فائلیں وغیرہ چیک کرتے۔“ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ایسے حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ عالیہ ہنستے ہنستے رو رہی ہو گئی۔ پھر اس لیے کے بعد قدرے سنجیدگی سے بولی۔

”ایسی باتیں نہ کیا کیجئے آذر! جو عالیہ کو کہیں کا نہ رکھیں۔“

”کہا مطلب ذرا وضاحت تو کرو۔“ جوتے کے تھے کھولتے کھولتے سیدھا ہو کر اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ آپ جلدی سے لباس تبدیل کریں۔ میں ابھی آئی ہوں۔“

عالیہ نے عجلت میں کہا اور پھر اسے انگوٹھا چاکر بھاگ گئی۔ اور وہ تصور ہی تصور میں اس پر مسکراہٹوں کی بجلیاں گراتا رہا۔

اس واقعے کے بعد جب اسے دیر ہو جاتی تو بار بار

اس کا خیال عالیہ کی طرف ہی جاتا اور وہ بڑا فکر مند ہوا جاتا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ عالیہ ڈر رہی ہوگی۔ نامعلوم کیا چکر ہے۔ یعنی یہ محض وہم ہے اس کا یا حقیقت ہی ہے۔ مجھے معلوم ہے ڈرنے کے باوجود وہ اور اماں کے پاس ہرگز نہ جائے گی۔ وہ تو اس کے لیے آسیہ سے بھی زیادہ ڈراؤنی چیز ہو کر رہ گئی ہیں۔ خدا کرے کوئی آہی نہ گیا ہو، تاکہ اس کا تھوڑا سا وقت تو اچھا کٹ جائے کبھی۔ کبھی تو یہ اتنا بے کل سا ہوا تھا کہ جلد جلد آدھا کام مٹا کر باقی اپنے ماتحت کے حوالے کر دیتا اور بھاگ بھاگ گھر پہنچ جاتا۔ مگر یوں روز تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اتفاق سے ہی ایسا موقع میسر آتا تھا۔

\*-\*-\*

اس روز بھی وہ عالیہ کے ہی خیال سے جلد ہی اپنے آفس سے اٹھ آیا تھا۔ پچھلے واقعے کو بھی بہت دن گزر گئے تھے۔ اصل میں تو اسے عالیہ کے بغیر چین ہی نہ بڑاتا تھا۔ وہ حسب دستور اپنی گاڑی سٹڈ کے نیچے چھوڑ کر اندر آیا اور دروازے کا ہینڈل کھمایا تو خلاف معمول اس روز اندر سے دروازہ بند تھا۔ شاید عالیہ نے خوف کی وجہ سے کھٹکا لگا لیا ہے، اس نے سوچا اور دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اندر سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہو۔ اسے سخت اچھنبا ہوا ایک لمحے کو یہ خیال بھی داغ میں رہ گیا کہ کہیں واقعی عالیہ پر کسی آسیہ کا سایہ تو نہیں ہو گیا۔

مگر اس سے آگے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کیونکہ اندر سے یکے بعد دیگرے کھٹکا کرنے اور بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ اس سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور زور سے بولا۔

”عالیہ۔ عالیہ سنو۔ میں آ گیا ہوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی عالیہ نے فوراً ”ہی کھٹکا کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ سامنے دروازے کے ہٹتے ہوئے پردے پر ہی پڑی اور پھر عالیہ کے سفید پڑتے چہرے پر۔

”کیا پھر وہی۔“ اس نے پوچھنا چاہا۔

”جی جی۔۔۔ آج تو۔۔۔ آج تو۔۔۔ پر وہ بھی آپ ہی  
 آپ سرک گیا تھا۔“ عالیہ غالباً ”خوف کی وجہ سے  
 گھانے لگی تھی۔“

”۳۔۔۔“ وہ بڑے تردد سے بولا اور پھر تیزی سے  
 والے کی طرف بڑھ کر پر وہ سرکایا اور دروازے کا  
 ہاتھ کھول کر باہر مھانک کر دکھا۔ پھر کھٹکا بند کر کے  
 اس کی طرف مڑا تو وہ جھک کر قالین پر سے کوئی چیز  
 کھالی ہوئی بولی۔

”میں نے بھی ابھی ابھی کھٹکا کھول کر دکھا تھا۔ مگر  
 ہاتھ تو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔“

”۴۔۔۔“ چھاب بڑی ہمت کر لی تم نے، لیکن یہ پلیٹیں  
 ابھی کسے نظر آرہی ہیں۔ کیا تم نے کھانا کھالیا۔“  
 اس کی نظر اچانک کاہنر ٹیبل پر رکھی جھوٹی ہلٹنوں پر  
 پڑی تو اس نے پوچھا۔

”میں نے ہاں۔ میں نے کھانا کھالیا۔“ وہ گڑبڑا  
 بولی۔

”پھلو خیر اچھا کیا۔“ وہ یوں بولا جیسے کسی چیز کا  
 نقصان ہو جانے کے بعد انسان مجبور ہو کر یہی کہتا

”وہ دراصل مجھے آج بھوک بہت لگ رہی تھی۔“

اس نے وہ سپر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ مگر آپ کو  
 ناگوار تو نہیں گزرا۔“ وہ دعا مست بھرے لہجے میں بولی  
 مگر اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”ہاں ناگوار کیوں نہیں گزرا بلکہ سخت ناگوار گزرا  
 ہے، تم اپنے آپ نکل ٹھولس کر بیٹھ گئیں۔ اور میں  
 ساری وجہ سے ابھی تک بھوکا ہوں۔“

اس نے یہ بات مذاق میں کہی تھی یا سنجیدگی ہے،  
 عالیہ کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔ کیونکہ اس کا لہجہ ناقابل فہم  
 تھا۔

”۵۔۔۔“ آپ تو سچ سچ ہی برا مان گئے۔ اچھا میں  
 آپ کے ساتھ بھی کھالوں گی۔“ عالیہ اپنی مخصوص  
 بات کے مطابق اس کے بازو پر جھول کر بولی۔

”جی نہیں، معاف کیجئے۔ آپ کو بد بھنسی کرا کر  
 مجھے اپنی جان پر نہیں بنوانی۔ مجھے تو پہلے ہی زیادہ  
 بھوک نہیں تھی۔ اب آپ کی خود غرضی نے رہی

سہی بھی مٹا دی۔“

وہ لاڈ بھی کر رہا تھا اور ملامت بھی۔ جانے کیا  
 عجیب سا موڈ ہو رہا تھا اس کا کہ عالیہ کا دل بری طرح  
 دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی  
 سر توڑ کوشش میں مصروف تھی۔

”سنیں، آؤں اس دفعہ معاف کر دیتے آئندہ کان پکڑ  
 کر توبہ کر لی ہوں کہ آپ کے بغیر کبھی کھانا نہ کھاؤں  
 گی۔“ اس نے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھے ہوئے آؤں  
 کے گھٹنے پکڑ لیے۔

”یہ کیا حماقت ہے، بھئی واہ۔ تم تو ذرا سا مذاق بھی  
 برداشت نہیں کر سکتیں۔“ اس نے جھک کر اسے  
 اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو تم سے ہزار بار کہا ہے کہ تم میرے  
 انتظار میں نہ بیٹھا کرو۔ مگر تمہاری ہی نہیں اور میں بھی  
 تمہاری وجہ سے وہاں کچھ نہیں کھاتا۔ سوچتا ہوں کہ  
 جب تم میرے بغیر نوالہ ہی نہیں توڑتیں تو پھر میں  
 تمہارے ساتھ ہی کیوں نہ کھاؤں۔“

”۶۔۔۔“ اچھا جی۔ بڑی نوازش ہے آپ کی، مگر کم  
 از کم تامل تو نہ چھوڑا کریں۔ کفران نعمت میں شمار  
 ہوتا ہے۔“ عالیہ بڑے چلبلے سے انداز میں بولی۔

”خیر شکر ہے، مال تو یہاں بھی تر ہی ملتا ہے۔ اچھا  
 ایسا کرو میرے لیے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔ مگر ٹھہرو۔  
 میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، ورنہ وہ تمہارا  
 عاشق و عاشق نظر آگیا تو۔“

”اف۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

عالیہ نے گھبرا کر اس کی طرف دکھا۔

”اب مجھے ایسا ڈر بھی نہیں لگتا۔“

”۷۔۔۔“ اچھا تو پھر جاؤ۔ تمہیں اللہ کو سونپا۔“ اس نے

شرر سے لہجے میں کہا۔ اور عالیہ ہنستی ہوئی اندر چلی  
 گئی۔ کچھ عجیب سی ہو گئی ہے عالیہ بھی۔ اس نے پہلی  
 بار عالیہ کے مزاج اور عادتوں میں ایک نمایاں تغیر

محسوس کر کے سوچا۔ کبھی ڈرتی ہے کبھی گھبرا جاتی ہے  
 کبھی پریشان ہوا ہنستی ہے اور کبھی ہنسنے لگتی ہے۔ آخر  
 کس وجہ سے وہ اتنی بدل گئی ہے۔ جہاں تک میرا

خیال ہے وہ کچھ محسوس کر لی ہے، مگر اب وہ آجائے تو



رات گئے اس قدر خوف و دہشت کے عالم میں دروازے کا کھول کر کہا ہر دیکھنا کیا معنی رکھتا تھا۔ اور وہ خوفزدہ نہیں گھبرائی گھبرائی سی اور پریشان لگتی تھی۔ یہ بھی اسے دیکھ کر خیر ہو گا کچھ یہ آج کل کی لڑکیاں تو کبھی اور پھر سے بھی ڈرتی ہیں۔ وہ اس عقدے کو حل نہ کر سکا تو تنگ آکر سو گیا۔

\*-\*-\*

کئی روز بہت سکون سے گزر گئے تھے وہ جب بھی آفس سے آتا۔ اسی سلسلے میں عالیہ سے مذاق کرتا رہا۔ اور عالیہ بڑی خوبصورتی سے بات سمجھاوتی۔ ایک دن اس نے عالیہ کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”سنو“ اب وہ تمہارا عاشق نامراد وہاں کبھی نہیں آئے گا کیونکہ اسے میری طاقت اور اختیارات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ میں کتنا جلا اور جلی قوتوں کا مالک ہوں۔“

اور عالیہ بگڑ کر بولی۔

”میں جتنا اپنے ڈر اور خوف کو ذائل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ ایسی باتیں کر کے اسے اور بھی ابھارتے رہتے ہیں۔ آپ تو میری زندگی میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ کو تو میری ہمت بندھانی چاہئے۔“ عالیہ اس کے مذاق پر اس قدر سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کی دل شکنی کے خیال سے اس نے پھر اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں کی۔ پھر تو جیسے بات آئی گئی ہو گئی۔

\*-\*-\*

مگر اس رات اس نے اتفاق سے اپنا سارا کام جلد ہی نمٹا لیا تھا۔ سو آٹھ بج رہے تھے جب گھر جانے کے ارادے سے آفس سے اٹھا تو راستے میں ایک دم ہی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ آج کوئی پکچر دیکھ لی جائے۔ ابھی تو پکچر شروع ہونے میں کافی وقت ہے اور اصل پکچر تو انٹروال کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ ویسے بھی کافی دن سے کوئی پکچر نہیں دیکھی۔ بس یہی سب سوچ کر اس نے شہر کے سینما ہاؤس میں چلتی انگلش فلم کے لیے دو سیٹیں ریزرو کرائیں اور خوش خوش گھر پہنچا۔ کار سینڈ میں چھوڑنے کے بجائے پورچ میں

اس سے پوچھوں کہ کیا اس کے یہ احساسات یا تاثرات عین میرے آنے کے وقت رہی ہوتے ہیں یا کسی اور وقت بھی۔ نو بجے تک تو نیچے خاصی چٹل پہل رہتی ہے۔ وہ تو آج کل اپا میاں کی علالت کی وجہ سے ان کے دوست احباب نہیں آ رہے ورنہ یہاں تو رات گئے تک ملنے جلنے والوں کا اتنا بندھا رہتا تھا۔ اور جب وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اس نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ عالیہ ایک لمحے کو تو سٹ پٹائی پھر اپنا گلا صاف کر کے بولی۔

”اس نکتے پر تو میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا لیکن۔ لیکن اندازہ ہے کہ یہ سب آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی محسوس ہوتا ہے۔“

”ہوں تو ان حضرت کو مجھ سے رقابت پیدا ہو گئی ہے۔“ مذاق براتر آیا۔

”ف تو یہ ایسی باتیں کر کے تو آپ مجھے اور بھی ڈرا دیتے ہیں۔“ عالیہ منہ پھلا کر بولی۔

”ارے ڈرنے کی کیا بات ہے ہماری موجودگی میں تو یہاں پتکے کا بچہ بھی رہ نہیں سکتا۔“ اس نے مضبوطی سے عالیہ کو تھام کر کہا تو وہ اس کے ہتھکنگے کا بچہ کہنے پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ وہ باتیں بھی ایسی گرتا تھا کہ عالیہ کی روح تک شاداب ہو جاتی تھی۔ چائے پینے کے بعد اس نے اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”یہ کب نہیں رکھ دو اور جلدی سے آکر لیٹ جاؤ۔“ آج تمام دن ایک منٹ بھی مجھے بیٹھنے کی صلت نہیں ملی۔ سارا بدن سٹھکن سے چور چور ہو رہا ہے۔“ اور عالیہ نے بلا توقف اس کے کہنے پر عمل کیا اور جلدی سے رکا سو گئی۔

مگر سٹھکن کے باوجود آذر کو نیند نہ آئی۔ وہ معمولی سی بات جسے بے حقیقت اور محض عالیہ کا وہم سمجھ کر وہ اب تک مذاق میں ہی اڑاتا آ رہا تھا۔ اس کے لیے ایک قابل غور مسئلہ بن چکی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عالیہ اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ اگر اس قدر ڈر پوک اور کمزوری کی تھی اور کسی احساس سے خوفزدہ بھی تھی تو پھر اتنی

روکی اور تیزی سے اپنی خواہگاہ کا رخ کیا۔ مگر خواہگاہ کے قریب آکر اس خیال سے رک گیا کہ عالیہ کو تھوڑا سا سربراہ ضرور دے گا کیونکہ وہ فلموں کی دیوانی تھی۔ مگر آج تک کبھی اپنے منہ سے نہیں کہا کہ مجھے پچھو دکھا دو۔ اس نے اپنے دل میں عالیہ کے لیے ایک عقیدت سی محسوس کر کے سوچا اور پھر پنڈل کھمانا چاہا مگر بھرتا ہوا ہاتھ معلق ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اندر سے سرگوشیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تجسس کے شدید غلبے نے اسے دروازے سے کان لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اندر خواہگاہ میں کھڑے پڑ بھی ہو رہی تھی اور عالیہ کی منت سماجت کرتی سرگوشیاں بھی جاری تھیں۔ مگر ان آوازوں پر ایک مردانہ بھاری اور دلی دلی آواز حد درجہ غالب تھی جسے وہ بڑی آسانی سے سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر باہر رک کر وہ ان مبہم اور راسخ سرگوشیوں سے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر غیرت نفس نے جوش مارا تو اس نے دروازہ توڑنے کے سے انداز میں زور سے کھولا اور اس کے بعد وہ کچھ ہوا جو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ یعنی اس نے عالیہ پر سختی کی اور اس سے بدکلامی سے بھی پیش آیا لیکن پھر بھی اس نے کسی طرح قبول نہیں کیا۔ اس پر بھی وہ عالیہ کے کسی عذر بہانے کو ماننے پر تیار ہی نہیں تھا۔ عالیہ نے اس کے خیال میں اس کے اعتماد کو بری طرح مجروح کیا تھا۔ اس نے خود اپنے کانوں سے کسی مرد کی آواز سنی تھی۔ اور یہ اس کی سماعت کا کوئی دھوکا تھا نہ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا سمجھ بیٹھا تھا۔

بہت سی باتیں جنہیں انسان معمولی اور بے حقیقت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے یا کرتا رہتا ہے اور جب سنجیدگی اختیار کرتی ہیں یا انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں تو انسان کے احساسات اتنے نازک اور رقیق ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کے حقیر سے حقیر پہلو کو غور اور توجہ کے لائق سمجھنے لگتا ہے اور اسے بھی اب ہی یہ سارے احساسات ہو رہے تھے۔ اپنی تین سالہ ازدواجی زندگی میں پہلی بار عالیہ سے متعلق ہر بات کا احساس اسے آج ہی ہوا تھا۔ اماں اور اس کی بڑی بہن صالحہ نے جنہیں وہ اور

اس کے دونوں چھوٹے بہن بھائی باجی کہتے تھے۔ کچھ دنوں سے اس سے شادی کرنے کا مطالبہ کر کر کے اس کی جان عذاب میں کر رہی تھی۔ یوں تو وہ بھی اب شادی کرنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا۔ کیونکہ پچھلے دو سال سے ہر سر روزگار تھا۔ بڑی بہن کی شادی بھی ڈیڑھ سال پہلے ہو چکی تھی۔ مگر اس کی والدہ چونکہ گھریلو سیاست میں اپنا ثالی نہیں رکھتی تھیں اور بڑے چلن کی خاتون تھیں۔ اس لیے پورے دو برس تک تو بیٹے کی کمانی پس انداز کرنے اور اپنے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے انہوں نے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں منہ سے بھاپ بھی نہ نکالی تھی۔ مگر اب شاید ان کا کوٹا پورا ہو گیا تھا۔ یا پھر اس وجہ سے کہ اچھی اور خاندانی لڑکیوں کی ارزانی تھی۔ اتفاق سے ان دنوں بہن بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ اور بس اماں پر ایک دم ہی اس کی شادی کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ سارا دن بیٹی کو لیے ایک ایک گھر جھانکتی اور ایک ایک ور کی خاک چھانٹی پھرتی تھیں اور گھر آ کر جب بھی سب کو بجا ہو کر بیٹھنے کا موقع ملتا تو شروع ہو جاتیں اسے لیکچر پلانے کہ بیٹا بس اب تم شادی کر لو۔ صالحہ بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہے اور صالحہ کو اپنی بڑھائی لکھائی سے فرصت نہیں ملتی۔ سو آجائے گی تو گھر میں کچھ رونق ہوگی اور میرا ہاتھ بھی بٹائے گی۔ اصل میں انکار تو اسے بھی نہیں تھا مگر بعض ذمہ داریاں اس کے کاندھوں پر ایسی پڑی تھیں کہ وہ شادی کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر تو خود اس کی والدہ ہی وجہ اجتناب بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی ماں کی ذہنیت اور عادت مزاج سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اپنی بہو کو خوش رکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں۔ انہوں نے مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا۔ حالانکہ سدا پیے میں کھیلتی رہی تھیں مگر اس کے باوجود پیسے کی چاہ بہت تھی۔ اس پر ہر ایک پر نکتہ چینی ضرور کرتی تھیں۔ مزاج کی بھی ذرا تیز تھیں اور اپنے آگے کسی کی چلنے نہیں دیتی تھیں اس پر خیالات اور داغ اتنے اونچے کہ ان کا بس چلتا تو کسی بادشاہ زادی کو ہی بیاہ کر لائیں۔ ادھر باپ پر جب سے فوج گرا تھا۔ ان کا سارا

بار بار تقریباً "ٹھپ ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ چھوٹا بھائی  
 انہیں اور چھوٹی بہن ساتھ ابھی زیر تعلیم تھے۔ بس  
 ان ہی ساری باتوں کے پیش نظر وہ اپنی شادی رچا کر  
 اپنے جانے کے حق میں نہ تھا۔ جبکہ مائی پریشانی کا بھی  
 کوئی مسئلہ حائل نہ تھا۔ اماں کے پاس اتنا تھا کہ  
 ماہ بار بالکل ٹھپ بھی ہو جاتا تو ساری عمر خوب پیر  
 پار کر بے فکری سے کھا اور کھلا سکتی تھیں۔ وہ تو  
 ان میں کچھ نہ نہ کرنے کی عادت ہی ہو گئی تھی اور بس  
 اماں کی اس عادت سے اسے شدید اختلاف تھا۔  
 کیونکہ وہ بھی پورے دو سال سے اپنی پوری تنخواہ  
 کت اور اماں کی بزرگی کے خیال سے یونہی کی یونہی  
 ان کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا تھا۔ ابا کے پاس خاصی وسیع  
 جائیداد بھی تھی اور زمینیں بھی۔ ان کا کاروبار مندا  
 ضرور بڑ گیا تھا۔ مگر تھوڑی بہت آمدنی تو ہو ہی جاتی  
 تھی۔ اس پر بھی اماں کفران نعمت کی انتہا کر دیتی تھیں  
 اور ان کی اسی بات سے اسے سخت چڑھتی تھی۔

کچھ ہی روز بعد اماں اور بہن نے بالا خربھانت  
 صہانت کی لڑکیوں میں سے ایک کا انتخاب کر ہی لیا۔  
 اور اب اس کی تو جیسے شامت ہی آگئی۔ جب وہ کھو  
 لڑکی اور لڑکی کے خاندان والوں کے قصے اور قصیدے  
 بھی سوڈ میں ہوتا تو وہ بھی دلچسپی سے سنتا رہتا اور اگر  
 سوڈ میں نہ ہوتا تو اٹھ کر چلا جاتا۔ مگر اب اس معاملے  
 میں اس کی اماں بڑی سنجیدگی سے ایکشن لینے کی ٹھانی  
 ہو گئی تھیں اور اس کے لیے یہی کیا کم اچھے کی بات تھی  
 کہ ڈنڈی مارنے کی پختہ عادت کے باوجود اماں کے  
 حیار کے ترازو میں کوئی لڑکی پوری اتر آئی ہے۔ ایک  
 دن وہ اپنی قیص میں بیٹن نکوانے صالحہ کے پاس پہنچا تو  
 اماں بھی عقوبتی بہت کے بیچ نما درے میں صالحہ کے  
 پاس دیوان پر بیٹھی اپنے لیے پان بتا رہی تھیں۔ وہ بھی  
 وہیں ان کے پاس ہی کرسی بچھ کر بیٹھ گیا۔ اماں تو جیسے  
 اس کی کھات ہی میں بیٹھی تھیں فوراً شروع  
 ہو گئیں۔

"کو ایسے ہفت ہزاری تو نہیں مگر حیثیت تو  
 رئیسوں کی سی بتا رہی ہے اور بھی سب سے بڑھ کر تو  
 شریف لوگ ہیں۔ لڑکی بھی ہیرا ہے ہیرا۔"

"جی ہاں ای! ایسی باجیا اور نیک اطوار لڑکیاں تو  
 آج کل ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ اس پر اخلاق  
 اور خوش مزاجی کا یہ عالم کہ بات کرتی ہے تو منہ سے  
 پھول جھرتے ہیں۔"

بہن نے فوراً "لقمہ دیا اور اس نے ہنس کر دل میں  
 سوچا۔ یہ تو کسی پرستانی مخلوق کی خصلتیں بتا رہی  
 ہیں۔

"خیر وہ تو ہے ہی مگر بہنوں میں سب سے بڑی بھی تو  
 ہے گویا ان لوگوں کا یہ پہلا کار ہو گا۔ ظاہر ہے بڑھ چڑھ  
 کر ہی دیں گے۔" اماں نے بیان کی گلوری بتا کر منہ میں  
 رکھتے ہوئے کہا اور پھر سرواٹھا کر چھالیہ کترنے  
 لگیں۔

"کیوں نہیں اماں! خدا نہ کرے ایسے گئے گزرے  
 بھی نہیں ہیں۔ خالہ رشیدہ کہہ رہی تھیں کہ کبھی ان  
 کے نام کا طوطی بولتا تھا سارے زمانے میں۔ وہی مسل  
 ہے کہ مر رہا بھی پھر بھی سوالا کھ کا۔ دیں گے تو ایسا کہ  
 دنیا اش اش کرانے گی۔"

اس کی بہن نے کہا تو اس نے سوچا۔ بھلا یہ لینے  
 دینے کی بات کیوں نکلی ہے۔ مگر کچھ بولا نہیں۔  
 "اے ہاں یوں تو غریب سے غریب آدمی بھی اپنی  
 گریبا کو سنوار کر ہی رہتا ہے۔ پھر بھلا وہ لوگ کیوں نہیں  
 دیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اللہ کا نام لے کر بائی بھر لو  
 آذر بیٹے۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملنے خواہ لڑکے کے  
 ہوں یا لڑکی کے۔"

اماں نے براہ راست اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ  
 بھی ہاں اور بہن کے روز روز کے تقاضے سنتے سنتے عاجز  
 آ گیا تھا۔ اسے بالا آخر ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ بڑی  
 بے دلی سے بولا۔

"چھا اماں! اگر آپ اسی قدر بھند ہیں تو پھر مجھے  
 بھلا کب انکار ہو سکتا ہے؟"

اور پھر وہ اپنی قیص بہن کے ہاتھ سے لے کر وہاں  
 سے اٹھ گیا۔ یہ تو اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اس کے ہاں  
 بھرنے کے بعد ماں اور بہن نے مل کر کیا کارروائی کی۔  
 کیونکہ عالیہ کے گھر تک اس کا پیغام پہنچایا۔ مگر چند ہی  
 روز بعد ایک دن اس کی بہن نے خوشی سے جھومتے

ہوئے اسے بتایا کہ ”۳ اور ہر سے تمہارے لیے ہی بھری گئی ہے۔ مگر اماں چونکہ منگنی کرنے کی قائل نہیں اس لیے سیدھی سیدھی بات ہی ٹھہرا دیں گی۔ انہیں تو پہلے ہی تمہاری شادی کرنے کی جلدی ہے اور ویسے بھی دو ڈیڑھ ماہ کے لیے منگنی کرنا کچھ مناسب نہیں۔“ مگر اس نے اپنی بہن کی مصلحت آمیز باتوں کو جیسے سنایا نہیں۔ وہ ٹوٹھے سے بل کھا کر رہ گیا کہ اماں اور بہن نے لڑکی دکھائے بغیر ہی سارے معاملات طے کر لیے اور سارا پروگرام بھی مرتب کر لیا۔

”باجی! میں نے اماں کی ہر بات بے چون و چرا مان لی۔ مگر اب یہ تو کسی قیمت پر بھی مجھے گوارا نہیں کہ لڑکی کو دیکھے بغیر شادی کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ آنکھیں بند کر کے ایک ایسی لڑکی کا ہاتھ تمام لوں جسے میں نے نہ دیکھا تک نہ ہو اور جو زندگی کی رفاقت میں میری برابر کی شریک ہوگی۔“

”۳ رے تو یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔ تم عالیہ کو دیکھنا ہی چاہتے ہو تو اسے دکھانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ ابھی تمہاری بات تو نہیں ٹھہری۔ وہ لوگ خود تم کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ جب چاہو وہاں جا سکتے ہو۔“

بہن نے اسے ٹھنڈا کرنے کی غرض سے بڑی رسائیت سے سمجھایا۔ تب کہیں جا کر اس کا غصہ فرو ہوا۔

اس کے بعد جلد ہی اس کی ماں اور بہن اسے عالیہ کے یہاں لے گئیں۔ ساڈن نہ اس کا گھر نہ تھا نہ عالیہ کا۔ بس عالیہ کی اسے ایک جھلک سی دکھائی گئی تھی۔ وہ خود بھی کسی سے کم نہ تھا مگر عالیہ کی بس ایک ہی جھلک اسے خود سے بیگانہ کر گئی تھی۔ پردکھوے کے فوراً ہی بعد ایک طاق بن اور طاق تاریخ میں ان دونوں کی نسبت قرار پائی تھی۔ اس کی ماں اور بہن کو تو شادی کی بہت جہاں تھی۔ مگر عالیہ کی والدہ چھ سات ماہ سے پہلے کسی طرح ان کی شادی کرنے کے لیے آمادہ ہی نہ ہوتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ میرا پہلا کارہ ہے اور ابھی تو میں نے عالیہ کا ڈھنگ سے جینز بھی نہیں بنایا۔ عذر یہ تھا کہ پہلے سے جوڑے ٹانگ کر رکھو تو

یہاں کی سلی ہوئی آب و ہوا سے مسالے کی آب چلی جاتی ہے اور اگر نہ بھی ٹانگو تو لڑکیاں چکے چکے نکال نکال کر نہیں لیتی ہیں۔ اصل میں عالیہ کے والد حیات نہ تھے۔ ایک بڑا لڑکا تھا اور چار بیٹیاں۔ گواچھے معقول لوگ تھے۔ مگر منگائی کی وجہ سے ہر چیز پر تو آگ برس رہی تھی۔ مگر اماں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بہن ہمیں تو کچھ نہیں چاہیے۔ یہی کیا کم ہے کہ آپ ایک انمول ہیرا ہمارے سر دکر رہے ہیں۔ بس آپ تو اللہ کا نام لے کر تاریخ مقرر کر دیجئے۔ بانی جو کمی مٹی ہوگی ہم پوری کر دیں گے۔ گو مجھے معلوم ہے کہ آپ کا یہ پہلا کارہ ہے پہلی خوشی ہے اور آپ جو نہ دس وہ کم ہے۔ آپ کے دل میں بھی بڑے ارمان ہوں گے مگر ہمیں تو شادی سے مطلب ہے۔ ہمارے بیٹے کا گھر جلد از جلد بس جائے۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ بانی باتوں کی آپ فکر نہ کریں۔“

”نہیں۔ یہ تو آپ کی محبت ہے ورنہ اب میں ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ بیٹی کو غریبانہ طور پر کچھ نہ دوں۔ ویسے بھی خالی بیٹی کون دیتا ہے۔“ عالیہ کی امی اس کی ماں کے خلوص سے متاثر ہو کر بولیں۔

”۳ اور ہو خالہ جان! ذرا ہمیں بھی تو بتائیے کہ آخر آپ کیا کیا دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ اس کی بہن نے بڑی پوچھسی کا اظہار کر کے پوچھا۔

”۳ بے بی! بس اپنی بساط کے مطابق ہی دوں گی۔“ عالیہ کی امی نے مسکرا کر کہا۔

”۳ سالہ! تم بھی بعض وقت بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اللہ رکھے ان کے گھر کی پہلی خوشی ہے۔ کیا یہ اپنے دل کے ارمان نہیں نکالیں گی۔“ نور کی اماں نے جس انداز میں اپنی بیٹی کی فمائش کی۔ عالیہ کی امی پہلو بدل کر بولیں۔

”۳ ارمان کس کے دل میں نہیں ہوتے۔ اور بیٹی والے جتنا بھی دیں کم ہی ہوتا ہے۔ تم نے سنا نہیں شاید پرانے وقتوں میں جبکہ سستے زمانے تھے۔ ایک باپ نے بیٹی کو مکان زمین لاکھوں کا جینز زیور پاتا۔ غرض یہ کہ ہر نعمت دی تھی۔ حتیٰ کہ دولہا کے لیے

گھوڑا بھی۔ اور تو اور یارات میں دو لہا و لہن پر سے  
سونے چاندی کی کچھڑی پچھاور کرائی تھی مگر جب لڑکی  
سارے ساند سامان کے ساتھ سسرال پہنچی تو دو لہا نے  
ساری چیزوں پر ایک نظر ڈال کر ٹاک چڑھا کر کہا۔  
”ہونہہ مسرے نے سب کچھ دے دیا پر گھوڑے  
کی زین تو دی نہیں۔“

اور اس حکایت پر تو صالحہ کا ہنستے ہنستے برا حال  
ہو گیا۔ مگر ماں ذرا سنجیدہ ہو کر بولیں۔  
”مگر ہم اتنے ناشکرے نہیں ہیں بہن! آپ جو کچھ  
بھی دے دیں گی وہی ہمارے لیے بہت ہو گا۔ اور میں تو  
موتی ہوں کہ کچھ دینے کی ضرورت ہی نہیں۔“  
ماں نے لاکھ کوشش کر لی۔ مگر عالیہ کی امی تاریخ  
مقرر کرنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ اصل میں ماں کی  
عادت ہر بات کو جلد از جلد انجام تک پہنچانے کی تھی  
اور بس وہ چاہتی تھیں کہ گھڑی کی چوتھائی میں شادی ہو  
جائے۔ ورنہ ایسی غلٹ بھی نہیں تھی اس کی شادی  
کی۔

\*-\*-\*

پانچ چھ ماہ کا عرصہ بھی ملک جھکتے میں گزر گیا تھا۔  
اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ اس لیے دونوں  
طرف زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گوڑے کے  
کی بری بازار میں گھڑی کے مصداق لڑکے کی ماں  
اونے کی وجہ سے ماں کو ایسی تیاریاں نہیں کرنی پڑ  
رہی تھیں۔ پھر بھی سینکڑوں کام ہوتے ہیں۔ کارڈ  
پھپھوانا، دعوت نامے بانٹنا اور بہت سے کام جن میں  
ماں اور بہن ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ اطمینان  
ہی اطمینان تھا۔ اس لیے بیٹھے ہی بیٹھے حکم چلایا کرتی  
تھیں۔ وہ بھی بالکل ہی ایک نئے اور انوکھے تجربے  
سے دوچار ہونے والا تھا اور پھر یہ اس کا ہی معاملہ تھا  
اس لیے گھر کی باتوں میں بڑی دلچسپی لینے لگا تھا۔ عالیہ کا  
گھرانہ پرانی روایات کا اسیر تھا۔ ادھر ماں سخت  
قدامت پرست۔ بیچارہ عالیہ کو دیکھنے اور اس سے ملنے  
کی خواہش میں اپنا دل مار کر رہ جاتا تھا۔ بس بہنیں اور  
بھالی ہی ہر وقت چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ یا پھر  
صالحہ عالیہ سے متعلق کوئی بات سنانے بیٹھ جاتی تھی۔

اس جستجو میں ماں اور بہنوں کے پاس آکر بیٹھ جانا کہ  
عالیہ کا کچھ ذکر ہی سن لے۔

اور اس دن بھی وہ ماں اور بہنوں میں آکر بیٹھا تو  
ماں جو صالحہ سے باتیں کر رہی تھیں کسنے لگیں۔

”اے ماں ان لوگوں نے خواہ مخواہ ہی دیر لگائی۔  
اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ان کے پاس پھر نامعلوم بیٹی کو  
ایسا کیا دینا چاہتی ہیں جو اب بھی بڑی مشکل سے تیار  
ہوئی ہیں تاریخ مقرر کرنے کے لیے۔“

”بیٹھے ماں! آخر گوڑی کا معاملہ ہے۔ کوئی لڑکا تو  
نہیں کہ دو چار جوڑے کھڑے کھڑے بازار سے خرید  
کر بری میں لگا دیئے۔ اور ان کی باتوں سے معلوم ہوتا  
ہے کہ بڑا بھاری جینزویں کی بیٹی کو، بھی تو دونوں سے  
تیاریاں کر رہی ہیں۔“

”ہاں دیکھو کیا دیتی ہیں، بے چاری بیوہ بھی تو  
ہیں۔ شوہر سر پر موجود ہو تو عورت کا دل شیر رہتا  
ہے؟“ ماں نے گود کے میوے کو چھان پھنگ کر کسنے  
میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بیوہ بھی ہیں تو حیثیت میں تو ہمارے برابر ہی ہیں  
اور سب سے بڑھ کر دل کی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔  
آپ نے دیکھا نہیں کہ جب بھی ہم جاتے ہیں تو کس  
طرح ہماری خاطر میں بچھ بچھ جاتی ہیں۔“ صالحہ  
بری کے خان پوشوں میں کرن ٹانگتے ہوئے بولی۔  
”ہاں دل والی تو بہت ہیں اور پھر بیٹی کے لیے تو  
سجھوس سے کجھوس بھی دل بڑا کر لیتے ہیں۔ ان کا تو ہاتھ  
بھی کھلا ہوا ہے۔“

”ہاں ماں! مگر یہ تو میں مان ہی نہیں سکتی کہ انہوں  
نے عالیہ کے لیے بہلے سے کچھ جمع ہی نہ کیا ہو۔“

”لو بھلا کیوں نہ کیا ہو گا۔ بیٹی پیدا ہوتی ہے تو چلن  
کے لوگ چھٹی چھوٹک سے ہی اس کی نیت سے  
چیزیں جمع کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور میرے خیال  
میں تو یہ لوگ فریز ’لی روی اور گاڑی بھی دیں گے۔“  
ماں ہمیشہ فرج کو فریز ہی کہتی تھیں۔

”ہاں دیں گی کیوں نہیں دیں گی تو ہمہاٹک کر  
لے لیں گے۔“ صالحہ کچھ دھونس جمالی ہوئی بولی۔

”میرے خیال میں اپنے منہ سے کہنا کچھ مناسب

نہیں۔ ہم سیدھے سبھاؤ ان سے پوچھ لیں گے۔“  
 اماں پر خیال انداز میں بولیں۔ تو وہ جو عالیہ کا ذکر سننے  
 کے شوق میں آکر بیٹھا تھا۔ ماں اور بہن کی فضول سی  
 باتوں پر جھٹلا کر بولا۔

”مگر اماں! یہ آپ چیز وغیرہ کا ذکر کیوں لے بیٹھتی  
 ہیں۔ ہمارے پاس تو ایک چھوڑا فرج ٹی وی ریڈیو  
 گرام گاڑی سب کچھ ہی موجود ہے پھر ان لوگوں سے  
 کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت۔“

”اے لو! بھلا ضرورت کیوں نہیں۔ گھر  
 میں خواہ لاکھ چیزیں موجود ہوں۔ مگر لڑکی کی لائی ہوئی  
 چیزوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ ایک تو سب کی نظروں  
 میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی ہے دوسرے یہ ساری  
 چیزیں اس کی اپنی ہوتی ہیں۔ اور پھر سسرال کی چیزوں پر  
 لڑکی کا حق ہی کیا ہوتا ہے۔ وہ تو لڑکے کے والدین اور  
 بہن بھائیوں کی ہوتی ہیں نا۔“ اماں نے اسے چیز کا  
 فلسفہ سمجھاتے ہوئے تمام نزاکتوں سے آگاہ کیا تو وہ  
 کندھے اچکا کر بولا۔

”یہ بھی خوب ہے اماں! لڑکی تو گھر کی عزت اور گھر  
 ہی کا ایک فرد بن کر آتی ہے۔ پھر یہ کہنا کہ سسرال کی  
 چیزوں پر کوئی حق نہیں ہوتا اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔“  
 ”اے تم ان باتوں کو کیا جانو بھیا۔ سدا سے یہی  
 ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اب ہمیں ہی دیکھ لو۔ ہمیں تو اماں  
 نے اتنا دیا تھا کہ کیا کوئی بادشاہ اپنی بیٹی کو دے گا۔ پھر  
 بھی ہمارے سسرال والوں کی کچھ بھادیں ہی نہ آیا۔  
 اور اس پر مزے کی بات یہ کہ ہماری ہی چیزوں پر حق  
 ایسا جمایا جاتا ہے جیسے ان کے باپ دادا ہی کی ہوں۔“  
 صالحہ نے کہا۔

”اے ہاں اسے کیا معلوم یہ تو بس مزے سے  
 عیش کرنا ہی جانتا ہے۔ تمہاری سسرال والوں نے تو  
 فرمائش کر کے میرا جینا حرام کر دیا تھا۔ گاڑی فریج  
 ٹی وی اور وہ موا کیا ہوتا ہے ہاں وہ ریڈیو گرام سلائی  
 مشین کپڑے دھونے کی مشین بجلی کا بڑا چولہا منہ  
 پھوڑ پھوڑ کر ساری چیزیں مانگتی تھیں۔ اور تو اور تینوں  
 بھائیوں چاروں بہنوں بہنوئیوں بہوؤں  
 بھانجیوں بھانجیوں اور خود بڑھے بڑھیا کے لیے

پہناؤئیاں بھی مانگی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو پیٹ کی  
 اولاد کے لیے بھی مانگ لیتے پورے سات لاکھ خرچ  
 ہوئے تھے صالحہ کی شادی پر۔“

”نہیں بلکہ کہیں زیادہ اماں۔ آپ نے آدھا چیز تو  
 بہت پہلے ہی تیار کر لیا تھا۔ اور وہ زیورات کے چار  
 سیٹ سجے موتیوں کا ست لڑا چندن ہار اور کنٹھی  
 گربان گے بن اور سونے کا جوڑا۔ وہ تو لگایا ہی نہیں  
 آپ نے حساب میں۔“

”ہاں ہاں وہ بھی دو لاکھ کی مالیت کا ہی ہوگا۔ ان  
 لوگوں نے تو کیلے کپڑے کی طرح چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ خیر  
 اب میں اپنے بیٹے کی شادی پر ساری کسر نکال لوں گی۔  
 آخر میں نے بھی تو صالحہ کی شادی پر اتنا پیسہ خرچ کیا  
 ہے؟“

”ہاں اماں! ہم بھی پہناؤئیاں لیں گے مگر کچھ زیادہ تو  
 نہیں ہوں گی باجی کی دو لہا بھائی کی صبح (صالحہ کا بیٹا  
 اعظم بھائی کی اس طرح ابا کی اور آپ کی کل سات ہی  
 تو ہوں گی نا۔“ صالحہ نے خوش ہو کر کہا۔

”مگر اماں! کیا پہناؤئوں میں صرف جوڑے ہی  
 آتے ہیں۔“ اپنی بات کہہ کر صالحہ نے پوچھا۔  
 ”تیس زیور۔ پاتا اسکوٹر اور بہت سی ہستی چیزیں  
 بھی دی جاتی ہیں۔“ اماں کے بجائے صالحہ نے جواب  
 دیا۔

”ہاں اور کیا۔“ تو لڑکے والوں کی مانگ پر منحصر ہوتا  
 ہے وہ پھو بھی چھو نکم ہیں نا ان کے بیٹے کی شادی پر تو  
 ان لوگوں نے اپنے دونوں بہنوئیوں کے لیے اسکوٹر اور  
 بہنوں کے لیے زیور مانگے تھے۔“ اماں نے بتایا۔

”پھر تو ٹھیک ہے اماں! آپ بھی میرے لیے سیٹ  
 اور اعظم بھیا کے لیے اسکوٹر مانگ لیں اور ہاں صبح  
 کے لیے نوائے کار باجی اور دو لہا بھائی کو جوڑے ہی کالی  
 ہوں گے۔“ صالحہ بولی۔

”لا حول ولا۔“ آذر لن کی باتوں پر جربز سا ہو کر بولا

”اے لا حول ولا کیسی یہ تو دستور دنیا ہے وہی مثل  
 ہے کہ کیا نقد سودا خوب ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ  
 لے۔ اے یہ شادی بیاہ کا معاملہ تو ایک سودا ہی ہوتا

ہے جتنا میں نے اپنی لڑکی کو ریا اتنا ہی ہوسے لے لیا۔

بیٹھی تھی۔

وہ ہستی جواب سے چند گھنٹے پہلے اس کے لیے بالکل غیر  
تھی اب اپنے تمام تر جملہ حقوق کے ساتھ اس کی اپنی  
ہو گئی تھی اور یہ احساس اس کے لیے بڑا ہی نرالا اور  
انوکھا سا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں ایک رشتہ کی  
حیثیت سے داخل ہوئی ہے اس کے دکھ درد، حرج۔  
مرض اور غم اور خوشی میں برابر کی شریک ہونے کا عہد  
کر کے آئی ہے۔ کم از کم آزر کے لیے تو یہ ایک بالکل  
ہی انوکھا اور اچھوتا سا تجربہ تھا۔ ایک عجیب سا مسرت  
آگیاں اور گد گدا دینے والا احساس تھا جو اس کے  
دو تیس دو تیس کو انگیز اور دھڑکنوں کو منتشر کر رہا تھا۔  
کچھ دیر دو اڑے کے آگے ٹھہرنا کا وہ زندگی کے اس  
نئے باب میں پہلا قدم رکھنے کے متعلق ہی سوچتا رہا  
پھر کچھ سوچ کر اس نے دروازہ بند کیا اور عالیہ کی طرف  
برصاوتوں ہاتھوں سے مسہری کے ارد گرد لنگتی پھولوں  
کی لڑیوں کو سمیٹ کر وہ بڑی پر اشتیاق اور والہانہ  
نظروں سے سرخ زربازہ پٹے میں لپٹی عالیہ کو دکھاتا رہا  
جو گھونٹھی ہی نہیں منہ بھی اٹھائے ساکت سی بیٹھی  
تھی۔

آزر نے اس کے قریب بیٹھ کر بڑی از خود رفتگی کے  
عالم میں عالیہ کے گود میں رکھے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ  
میں لے کر بہت غور سے جھک کر اسے دیکھا۔  
سینٹ اسپرے عطر اور پھولوں کا ایک روح تک کو ہکا  
دینے والا مہذبہ کا اس کے نتھنوں کی راہ اس کے دل  
میں اترتا چلا گیا جس میں حتا کی خوشبو سب سے نمایاں  
تھی۔ خوبصورت مخروطی انگلیوں میں دکتی انگوٹھیاں  
اور گداڑسی کلائیوں میں پھنسی طلائی چوڑیاں جن پر  
اس کی نظریں ٹپک کر رہ گئیں۔ یہ چوڑیاں جو عالیہ کو  
میکے کی طرف سے جینز میں ملی تھیں اس کی خوبصورت  
گوری گوری اور گداڑ کلائیوں میں پھنسی بہت ہی  
دلغریب لگ رہی تھیں۔ مگر عالیہ کے ہاتھ کس قدر سرد  
تھے کہ سینے میں اترتے طمانیت کے گہرے احساس  
کے باوجود ایک دم ہی اسے خیال آیا، دل نہیں تو اپنا چہرہ  
ہاتھوں سے چھپائے رکھتی ہیں مگر یہ دلہن کیسی ہے؟  
بالکل کسی بے جان شے کی مانند گود میں ہاتھ رکھے

”اچھا دستور ہے اماں! معلوم ہوتا ہے جیسے شادی  
نہیں شے بازی ہو رہی ہے یہ تو کھلا ہوا جوا ہوا۔“ وہ  
تو رچی پڑھا کر بولا۔

”ہمیں خیر جوا تو نہیں ہوتا، اسی لیے تو پہلے سے ہی  
سارے معاملات طے کر لیے جاتے ہیں۔“ صالحہ نے  
کہا۔

”مگر غیرت اور حمیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ باجی  
ایک تو لڑکی والوں پر پہلے کیا کم ہار ڈالا جاتا ہے۔ اس پر  
لوہا اپنے منہ سے کہہ کر بھائی بہنوں کے لیے زیورات  
اور اسکوڑ بھی مانگو، میرے نزدیک تو اس سے بڑھ کر  
کوئی بے غیرتی ہی نہ ہوگی۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

”ارے چل بڑا آیا ٹکیلا کہیں کا، یہ تو خوشی کی  
رسمیں ہوتی ہیں کوئی مارے بندھے کا سودا نہیں ہوتا۔  
لڑکی والے تو اپنی ناک اور نچی رکھنے کو بن مانگے ہی  
بہت کچھ دے دیتے ہیں۔“ اماں نے بڑے دلار سے  
اسے سمجھایا۔

”خیر کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔ اس سے مجھے  
کوئی غرض نہیں، مگر اتنا بتائے دیتا ہوں کہ اپنے  
سعاٹے میں ایسی جاہلانہ اور ناچار تر سوات کو برداشت  
نہیں کروں گا اور اس پر بھی اگر آپ نے ان لوگوں  
سے کوئی فضول سا مطالبہ کیا تو میں سرے سے شادی  
ہی نہ کروں گا۔“

”ارے واہ! کچھ مانع چل گیا ہے کیا۔“ بہن نے  
مزید کچھ کہنا چاہا مگر اماں نے اشارے سے اسے منع  
کر دیا۔

اس کی بات پر کہاں تک عمل کیا گیا، یہ تو اس نے دیکھا  
ہی نہیں البتہ چند روز بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی  
شادی ہو گئی۔

وہ بے نمایاں جن پر روایات اور نزاکتوں کے بند باندھ  
باندھ کر اس نے یہ چھ سات ماہ کا عرصہ گزارا تھا،  
سارے بند توڑ کر بے لگام ہوتی لگ رہی تھیں جس  
وقت اس نے جملہ عروسی میں قدم رکھا۔ عالیہ سامنے  
ہی پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گھری عروسی سچ پر

گھونگھٹ اونچا کئے یوں ساکت و جاہد سی بیٹھی ہے  
 جیسے یہاں اس قسمی پر کوئی سنگی مورتی نصب کر دی  
 گئی ہو اور اس کے یہ خوبصورت ہاتھ کس قدر سرد اور  
 بے جان سے لگ رہے ہیں یوں جیسے ان میں زندگی کی  
 حرارت بھی دوڑی ہی نہ ہو مگر یہ سوچنے اور غور کرنے  
 کا موقع نہیں تھا بلکہ نزاکت اور لطافت سے بھرپور  
 زندگی کی وہ اہم ترین ساعتیں تھیں جن میں مختلف  
 اور انجانی سمتوں سے آنے والے دو راہی ایک  
 دوسرے کے کاندھوں پر اپنے یقین اور رفاقت کی  
 اساس رکھ کر اور ایک دوسرے کا ہاتھ تمام کر زندگی  
 کے سفر میں شانہ بہ شانہ آگے بڑھتے ہیں اور بڑھتے ہی  
 رہتے ہیں۔

عالیہ نے اس کی توقع کے برعکس اپنے ہاتھوں کو  
 اس کے چوالے کرنے میں تھوڑی سی بھی مزاحمت  
 نہیں کی تھی اور نہ اس کے قرب پر کوئی رد عمل ہی  
 دکھایا تھا اور یہ کوئی ایسی قابل گرفت بات بھی نہ تھی  
 یعنی اس کے خیال میں عالیہ کا یہ بے جان اور خاموش  
 سا طرز عمل اس کی لاعلمی اور نا تجربے کاری کی وجہ  
 سے بھی ہو سکتا تھا لیکن ابھی جب وہ دولہا بن کر  
 ہارات کے ساتھ عالیہ کے گھر پہنچا تھا تو مہر کے معاملے  
 میں تھوڑی بد مزگی پیدا ہو گئی تھی۔ عین نکاح کے  
 موقع پر کسی بات پر فریقین کے درمیان سختی یا بد مزگی  
 پیدا ہو جائے تو دونوں میں ٹھوڑا بہت تکدر ضرور پیدا ہو  
 جاتا ہے اور یہ ایک قدرتی بات ہوتی ہے حالانکہ دیکھا  
 جائے تو ہر لحاظ سے دولہا والوں کا پلا بھاری ہوتا ہے اور  
 وہ شیر بھی ہوتے ہیں مگر آذر کے دل میں تو ایک گہری  
 پڑ گئی تھی اور اسی لیے وہ معمولی معمولی سی باتوں کو اتنی  
 اہمیت دے رہا تھا۔

پھر اس نے بڑی نرمی اور احتیاط سے عالیہ کے  
 دونوں ہاتھ اس کی گود میں رکھ دیئے اور بے ترتیب سی  
 وہ ہر کنوں کے ساتھ اس کا ہاتھ تک جھکا گھونگھٹ  
 اونچا کرنے کا مرحلہ بھی طے کر لیا تب بھی وہ یونہی بے  
 حس سی بیٹھی رہی مگر وہ تو جیسے اپنے ہوش نہ رہا  
 مہوت سا اس کا عروسی جلوہ دکھتا رہ گیا۔ روشن اور  
 کشادہ پیشانی جس پر چمکتا ایک کالوں تک جھکی جڑاؤ پٹی

’سچی موتیوں کا جڑاؤ جھومر تھ سے سچی ستواں تاک‘  
 سمٹا ہوا دہانہ ابھرے ہوئے لب اشک سے رکتے  
 خمیدہ ہونٹ افشاں اور بلو آئی ٹیڈو میں لپٹے غلانی  
 پونے جن کے سروں پر پلوں کی سیاہ جھالیں صبح  
 رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر وہ  
 زیورات جو وہ کالوں اور گلے میں پہنے ہوئے تھی۔  
 کالوں میں جڑاؤ مگر بالے اور گردن سے لے کر ناف  
 تک ایک دو نہیں چھ سات قسم کے ہار جن میں گلوبند  
 ٹیکلیس ست لڑا مال اور چند ہار وغیرہ شامل تھے۔  
 ”میں تو بھی صرف دو سیٹ دے رہی ہوں  
 چڑھاوے میں۔ اے ہاں بری میں تو اتنا ہی زیور کافی  
 ہوتا ہے اور پھر ٹپکانی بھی تو ہے وہ جو چاہیں دے دیں  
 ویسے تو میں نے پانچ سیٹ ہی مانگے ہیں۔“

ایک دم ہی کالوں میں بڑی اپنی ہاں کی آواز صدائے باز  
 گشت کی طرح اس کے کالوں میں گونجی تو اپنی محبت  
 سے چونک کر اس نے منہ ہی منہ میں ملاحظہ پڑھی اور  
 پھر عالیہ کو مخاطب کر کے بولا۔

”سین عالیہ! جو کچھ ابھی کچھ در پہلے نکاح کے  
 موقع پر ہوا تھا۔ اس میں میری مرضی کو بالکل دخل نہ  
 تھا۔ اصل میں شادی بیاہ کی رسومات کا تمام تر انحصار  
 بزرگوں کی مرضی اور خواہش پر ہوتا ہے جب کہ میں تو  
 ایسی رسومات کو بالکل لغو ہی سمجھتا ہوں۔“

تب بھی عالیہ اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی اور تب  
 ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بہت بے موقع بات کہہ گیا  
 ہے۔ اس نے فوراً ہی پینتزا بدل کر اپنی فطری شوخی  
 سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”بھئی آخر کیا معاملہ ہے۔ اپنا جلوہ دکھا کر تو مجھے اپنا  
 دیوانہ بنا دیا مگر میری طرف اٹکھ اٹھا کر دیکھنے کی زحمت  
 بھی گوارا نہیں کی ویسے اطمینان رکھے اتنا بھیا تک  
 اور بد ہیئت بھی نہیں ہوں کہ مجھے دیکھ کر آپ کی  
 گھٹکی بندھ جائے۔“

اس نے بڑے پیار سے عالیہ کی ٹھوڑی اور نچی کر کے  
 کہا تو عالیہ کے سپاٹ سے چہرے پر مسکراہٹوں کے  
 چاند اتر آئے۔ اس نے ڈرتے۔ جھنجھکتے شرارتے  
 لجاتے آہستہ سے پلوں کی چلن اٹھالی لیکن بار حیانے



تھے تو پھر ہم پر اتنا احسان بھی کیوں کیا۔“  
اور کبھی کہتیں۔

”اے اچھے سسرال والے ہیں نہ کبھی خود آتے ہیں نہ بیٹی داماد کو بلائے کی توفیق ہی ہوتی ہے اور کبھی خود میرا بچہ وہاں چلا جاتا ہے تو یونہی بغلیں جھاڑتا ہی آتا ہے۔ ایسا کچھ دیا بھی نہیں جینز میں جو پھر کچھ دینے کی ضرورت ہی نہ ہو، ایک اللہ رکھے وہ ہمارا داماد ہے جب بھی آتا ہے جیہیں خالی کرا کے ہی جاتا ہے یہ بھی دے دے وہ بھی دے دے اس کا بس چلے تو تن کے کپڑے بھی اتار کر لے جائے اور ایک آڈر کی سسرال والے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرے بچے کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“

اماں کو اس کا ڈر تو نہیں بڑا تھا کہ اس کے سامنے ایسی باتیں کرنے سے پرہیز کرتیں۔ وہ تو ڈنکے کی چوٹ پر آئے گئے کے سامنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی تھیں۔ ان کی اور باتوں پر تو وہ کان ہی نہیں دھرتا تھا مگر یہ عالیہ کے گھر جانے کی بات اس کے دل کو بہت لگتی تھی۔ اس نے بھی کئی بار محسوس کیا تھا کہ وہ جب بھی عالیہ کے ساتھ اس کے میکے جاتا ہے اس کی سالیان اس سے منہ چھپائے چھپائے پھرتی ہیں۔ ساس بھی لیے دیئے رہتی ہیں اور اس کے جاتے ہی گھر میں ایک کچھڑی سی اپنی شروع ہو جاتی ہے۔ آج تک کسی نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ عالیہ کو چھوڑ کر جا رہے ہو تو خود بھی ایک دو روز ہمارے یہاں رہ جاؤ بلکہ وہاں تو کوئی سیدھے منہ بات ہی نہ کرتا تھا۔ قسمت سے ایک ہی سالا تھا جو لائلپور کے کسی مل میں چیف اکائونٹنٹ لگا ہوا تھا اسے بھی صرف شادی کے موقع پر سرسری طور پر دیکھا تھا کیونکہ اسے کل پانچ دن کی چھٹی ہی مل سکی تھی۔ اور شادی کے تیسرے روز ہی اپنی ملازمت پر واپس چلا گیا تھا عالیہ سے بڑا تھا، یا پھر فطرتاً نہ تو تھا جو ر سمیں ادا کرنے کے موقع پر بھی غائب ہی رہا تھا اور سامنے بھی آیا تھا تو منہ پھلائے خاموش بیٹھا رہا تھا آڈر نے تو شادی کے ہنگامے کی وجہ سے اچھی طرح اسے دیکھا بھی نہ تھا۔ لیکن آڈر کے دل میں تو اس سے ملنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی۔ واقعی

دوسرے ہی لمحے اسے گرا دیا پھر بھی اس ایک لمحاتی وقفے میں عالیہ کی موہنی صورت اس کی مدح کی گرائیوں تک اترتی چلی گئی۔

موہنی صورت، کومل اور محسوس سی عالیہ نے پہلی ہی شب پہلی ہی نظر میں آڈر کے دل میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو کم ہی کسی بیوی کو حاصل ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو کچھ عرصے دونوں کے درمیان ایک لکھ سا قلم رہا مگر جب بقول اماں دلہن برائی ہو گئی تو اس نے محسوس کیا کہ لکھ ہی نہیں عالیہ اس سے تھوڑی تھوڑی غیرت بھی برتی ہے اور ہر دم جب چپ سی کسی فکر میں غلطاں اور پہچاں نظر آتی ہے۔ گو اسے معلوم تھا کہ وہ فطرتاً ”کم گو اور بے زبان سی لڑکی ہے مگر اس کا فکر مندی سے کچھ سوتے رہتا آڈر کو بہت عجیب سا لگتا تھا۔ ادھر ماں کی زہر میں کبھی گفتگو سے بھی وہ لاعلم نہیں تھا جو کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی موضوع نکال کر ڈائریکٹ عالیہ پر اٹھلتی رہتی تھیں۔“

”بس بہت ہو لیے ماں گون، اب کام کاج پر لگاؤ اپنی بیگم کو، صائمہ بے چاری اکیلی جان کیا کیا کرے۔ پڑھنے جائے گھر سنبھالے باوا کی سوسو جھٹکیں کرے اور پھر خدا معلوم اس کا نصیب کیا ہو اپنے گھر میں کس طرح رہے۔ اسی لیے تو ماں باپ کے گھر میں لڑکی لعلوں کی لعل بن کر رہتی ہے اور اب تو تمہاری شادی کو خیر سے چار مہینے ہو گئے مگر تمہاری بیوی نے آج تک ایک پھلی بھی تو نہیں پھوڑی۔“

”اٹے لو ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں تو نہ معلوم بیٹی کو ایسی کیا بادشاہت عطا کر دیں گی مگر وہاں تو کل اکیس جوڑے، تین سیٹ، جھومر اور سونے کے بن ہی دیئے ہیں وہ بھی پتا نہیں موائے کس دل سے، پورے چھ مہینے لگائے اس پر گاڑی اور بجلی کا بڑا چولہا بھی نہیں دیا اور پستایاں بھی ایسی کہ میں نے تو جل کر اپنی دھوین کو دے دیں آج کل تو بجلی اور چھار بھی اچھا پہنتے ہیں وہ تو میں نے خود منہ پھوڑ کر اور زبردستی کہہ من کر صالحہ کے دلہما کو اسکو ڈر دوائی ہے میں تو کہتی ہوں کہ اگر کسی قابل نہ

عجیب لوگ تھے عالیہ کے میکہ والے بھی، آذر کی تو سمجھ میں ہی نہ آئے تھے اور بقول اماں کے وہ تو اپنے سکوں سے بھی نہیں ملتے تھے تو آذر کو بھلا کیا گھاس ڈالتے اور اماں کو جہاں کنبے داری نبھانے میں کمال حاصل تھا، وہاں وہ ڈیپلو میسی برتنے میں بھی بست ماہر تھیں اور جوڑ توڑ کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں اور ہمیشہ ہی بڑی خوبصورتی سے اس کے کان بھرتی رہتی تھیں۔

”اے بس! اب ان لوگوں کو زیادہ منہ نہ لگاؤ عالیہ کی ایسی ہی پسلی پھڑکتی ہے، تو وہ خود ہو آیا کرے گی اپنے میکے۔ تم کوئی اس کے زر خرید ہو جو دم چھلا بنے اس کے ساتھ جاتے ہو، سسرال والوں سے دور رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے غرضیکہ اماں اسے ساری اونچ نیچ اور مصلحتوں سے آگاہ کرتی رہتی تھیں۔

اصل میں اماں کو شروع ہی سے اپنی اولاد کی زندگی میں بڑا دخل تھا، ابا تو ویسے بھی مرتجان منجھ قسم کے آدمی تھے۔ بست کم گو اور ساہ لوح اور جب سے معذور ہو کر بستر سے لگے تھے انہیں بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔ مگر اماں تو ہمیشہ ہی سے ان پر حاوی تھیں گھر کے سارے معاملات بھی اماں ہی مرضی اور حکم سے طے پاتے تھے۔

مگر اماں خواہ کچھ بھی کہیں، عالیہ کے میکہ والے اس سے کیسا بھی سلوک روا رکھتے، اسے تو صرف عالیہ سے غرض تھی۔ اور چونکہ عالیہ کے ساتھ اماں کا رویہ بھی اس سے مخفی نہ تھا جو عالیہ کے ہر کام میں عیب نکالتی تھیں۔ ہر بات پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔ اور پھر اماں کی زبان تو شاید نیم اور کرلے کے مرکب سے بنائی گئی تھی، جس سے عالیہ کے لیے زہریلے پیکتا تھا وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ عالیہ کی والدہ نے اماں کی مرضی اور مانگ پوری نہیں کی تھی اور اماں کو اس بات پر سخت پچھتاوا تھا کہ بقول ان کے کن لفظوں میں پختہ گئی تھیں۔ سخت دھوکا ہوا تھا ان کے ساتھ ورنہ آذر کے لیے ایک سے ایک رکھیں گھر لے کر لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ اماں ہمیشہ اس کے سامنے یہی

دکھڑالے کر بیٹھ جایا کرتی تھیں اور وہ چپ چاپ ان کی خرافات سنتا رہتا تھا اور کبھی بہت ہی تنگ آجاتا تو جل کر کہتا۔

”اباں! آپ کسی طرح عالیہ کا پچھا بھی چھوڑیں گی، میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی رکھیں گھر لے کر لڑکی ابھی آجاتی تو آپ کی ان باتوں سے ایک دن بھی میرے ساتھ نہ کرے گی۔“ اور اس بات پر تو اماں کی وہی شکل ہو جاتی کہ آئیں تو جائیں کہاں جس وہ بے نقط سنا میں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

اسی روز روز کی حج حج کی وجہ سے ہی تو اس نے چلی منزل میں رہائش اختیار کی تھی جب کہ رہائشی کمرے بالائی منزل پر تھے اور شادی سے پہلے وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ چلی منزل میں تو ڈرائنگ ڈائننگ کچن پینٹری لاؤنج وغیرہ کے علاوہ بس ایک ہی کمرہ تھا جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور جس سے ملحق ایک پارلر بھی تھا اور اماں کی شدید مخالفت کے باوجود اس نے گیسٹ روم کو ہی اپنے بالائی کمرے پر ترجیح دی تھی لیکن نیچے گیسٹ روم میں رہائش اختیار کرنے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ عالیہ اوپر جا کر جھانکتی ہی نہیں۔ صالحہ تو زیادہ تر اپنے شوہر کے پاس بہاؤ پور ہی رہتی تھی۔ بس سال میں ایک دو مرتبہ چند روز قیام کی غرض سے ہی میکے آتی تھی اور ساتھ اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔ سارے کام عالیہ کو ہی انجام دینے پڑتے تھے بول تو گھر میں تین ملازم بھی موجود تھے ایک خانساں ایک لڑکا جو اوپر کے کاموں پر مامور تھا اور ایک چوکیدار، مگر اماں سالن وغیرہ عالیہ سے ہی پکواتی تھیں۔ اس پر گھر کی صفائی ستھرائی اور دیگر بھال مہمانوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارت، ڈھولی کو کپڑے لینے اور دینے حتیٰ کہ صائمہ اور اعظم کے چھوٹے موٹے کام بھی عالیہ ہی کے ذمے تھے۔

عالیہ کی جان نالوں پر اماں نے جو کام ڈالے تھے وہ آذر کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے اور اسی بات پر کئی بار اماں سے بڑی لے دے ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ تو عالیہ کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

اسی طرح روز روز کے جھگڑوں، قضیوں میں وقت بڑی

تیرے کان بوجوں تک نہیں رہتی اور یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں کم از کم ہمارا اطمینان ہی ہو جائے گا۔  
 اماں خاص طور پر اسے مخاطب کر کے بولے ہی چلی گئیں تو چائے کی پہالی تپائی پر بیچ کر نیچے چلا آیا۔ اماں کی فضول سی باتوں پر اسے جھنجھلاہٹ بھی ہو رہی تھی کیونکہ انہوں نے جس موضوع کو ٹارگٹ بنایا تھا۔ اس نے آؤر کو ایک الجھن میں گرفتار بھی کر دیا تھا اولاد کی خواہش کے نہیں ہونی مگر اسے تو کبھی احساس تک نہ ہوا تھا۔ وہ تو اماں نے ہی احساس دلایا تھا گو وہ الجھ ضرور گیا تھا پھر بھی اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ نیچے اپنے کمرے میں آکر کچھ دیر وہ بھی سوچتا رہا تھا کہ اماں نے صرف ہماری ازدواجی زندگی کا

ہلائی سے گزرنا رہا۔ عالیہ نے تو خیر اپنا مقدر سمجھ کر شروع ہی سے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا ویسے بھی اسے یہ اطمینان تو تھا کہ اس کا شوہر اس کا اپنا ہے وہ اس کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے اور اس پر جان بھر کر رہتا ہے اور بس یہی عالیہ کو چاہئے بھی تھا، مگر اماں نے بھی کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ اب زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھیں آؤر بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ چلو اماں نے کسی طرح عالیہ کو گھر کا ایک فرد تسلیم کر لیا ویسے بھی اس کی شادی کو دو ڈھائی سال کا عرصہ گزر گیا تھا کہ انہی دنوں اماں کو بیٹھے بٹھائے گھر کی پہنچنے والی کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا تھا۔

”اے شادی کو تین برس ہونے کو آئے مگر عالیہ نے اب تک چوہے کا ایک بچہ بھی نہ جتا جانے کیا بات ہے، کسی ڈاکٹرنی ڈاکٹرنی کو تو دکھاؤ، تاکہ پتا چلے کہ عالیہ میں بچہ جننے کی صلاحیت بھی ہے۔“

اماں دبی دبی زبان میں آؤر سے کہتیں۔ اماں کے ہاتھ کوئی موضوع آجانا تو شرط تھا۔ پھر تو وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے ہی بڑ جاتی تھیں۔

شروع شروع میں تو دبے دبے لفظوں میں آؤر کے سامنے یہ موضوع لے کر بیٹھ جایا کرتی تھیں مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بیٹے کے کان بوجوں تک نہیں رہتی تو انہوں نے علی الاعلان ہی کہنا شروع کر دیا۔

”میری صالحہ کے تو خیر سے پانچ برس میں دو بچے ہو گئے اور تمہارے یہاں ابھی دو دور دور تک بچے کے آثار نظر نہیں آتے۔“

اصل میں بچوں کے دم سے ہی گھر میں رونق ہوتی ہے اسی وجہ سے صالحہ چلی جاتی ہے تو یہ گھر مجھے کانٹے کو دوڑتا ہے یوں بھی بیٹی کی اولاد پرانی ہوئی ہے۔ اسی لئے تو بیٹے کی اولاد پر وادی بواوا کا بہت حق ہوتا ہے۔“

اس روز وہ اوپر اماں کے پاس بیٹھا چائے پی رہا تھا عالیہ بھی وہیں موجود تھی، اماں نے اس کی پروا کئے بغیر پھر زہریلے حیر چلانے شروع کر دیئے۔

”اے نیچے! میں کہتی ہوں کہ آخر تو کب اسے ڈاکٹرنی کو دکھائے گا، میرا تو کہتے کہتے منہ خشک ہو گیا مگر

آؤر اور انگریزی ادیب کا بہترین انتخاب

## عمران ڈائجسٹ

اکتوبر ۹۷ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

• بہت نامراد شے ہے جنوں، سلگتی ریت پر  
 آنکھیں پوڑنے والی ایک دو تیزو کے پھتاوے  
 کی کہانی جس نے تصویر کا ایک ہی رخ دیکھا تھا  
 اسے نہا کی خاص کہانی

• آدھے سفر کی پوری کہانی، کرشن چندر کی  
 آپ بیٹی لے آپ ان کی آخری تحریر بھی کہہ سکتے ہیں

۱۵ طویل و طویل تر مختصر و پراثر کہانیاں  
 ۳ روپے و پراثر سلسلے وار کہانیاں  
 اور ایک غیرت اثر ناول کی مکمل تلخیص

اکتوبر ۹۷ء کا عمران ڈائجسٹ آج ہی خرید لیں

سکون درہم برہم کرنے کے لئے یہ نیا شو شاپ چھوڑا ہے  
ورنہ بعض عورتوں کے یہاں ویر میں بھی بچے پیدا  
ہوتے ہیں اور جب اسے عالیہ کے ساتھ یکجا ہو کر بیٹھنے  
کا موقع ملا تو اس نے ہنس کر کہا۔

”لو بھئی اب اپنی خیر مناؤ تمہیں جلانے اور  
کلسانے کے لئے اماں کے ہاتھ ایک نیا موضوع آگیا  
ہے۔“

”خیر نیا تو نہیں کافی پرانا موضوع ہے مگر اماں کچھ  
غلط تو نہیں کہتیں عالیہ کے لہجے میں افسردگی شامل  
تھی۔“

”یعنی کیا۔۔۔ کیا تمہارے خیال میں وہ سچ کہتی ہیں  
کہ تمہاں بننے کے قابل نہیں ہو۔“

اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔  
”ہو سکتا ہے سچ ہی کہتی ہوں۔“ عالیہ بچھے بچھے  
سے لہجے میں بولی۔

”لیکن تم نے یہ کسے سمجھ لیا کہ وہ سچ ہی کہتی ہیں  
کیا وہ کوئی عیب کا علم جانتی ہیں۔ انہیں تو صرف  
تمہارے اور میرے درمیان کھنڈت ڈالنے کے لئے  
کوئی نہ کوئی بہانہ ہی چاہیے۔“

عالیہ کے بچھے بچھے لہجے پر اسے دکھ سا ہوا تو اس نے  
زری سے کہا، عالیہ نے قدرے توقف کے بعد کچھ  
سوچ کر کہا۔

”لیکن آؤ! اگر میڈیکل چیک اپ کرانے کے بعد  
اماں کا خیال درست نکلا تو پھر کیا ہوگا؟۔“ عالیہ کے  
لہجے میں گہری یاسیت تھی۔

”ہائیں۔“ وہ جل بھن کر رہ گیا۔  
”پھر وہی ہوگا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آ رہا ہے یعنی  
اماں مجھ سے دوسری شادی کے لئے مطالبہ شروع  
کروں گی۔“

اور عالیہ کا چہرہ اتر گیا۔  
”اچھا تو کیا آپ ان کی بات مان لیں گے۔“ عالیہ  
نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہوگا۔“  
”یعنی دوسری شادی کر لیں گے۔“ عالیہ کو جیسے اس  
کی بات پر یقین نہیں آیا۔

”بالکل کر ہی لیں۔ گے۔ تم تو ماں بننے کے قابل ہی  
نہ ہوگی اور پھر اولاد کی تمنا کیسے نہیں ہوتی ویسے بھی  
اماں کی تو یہ سب سے بڑی آرزو ہے کہ وہ میری اولاد  
کوسے۔“

اور ابھی وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ٹپ ٹپ عالیہ کی  
خوبصورت آنکھوں سے برکھارت ہونے لگی اور آؤ  
کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے فوراً ہی اسے سینے سے  
لگا لیا۔

”پنگی۔ تمہیں کم از کم میری فطرت سے تو واقف  
ہونا چاہیے میں تو تمہاری احمقانہ باتوں پر جل کر تم  
سے مذاق کر رہا تھا ورنہ عالیہ کے سوا کون مانی کالال ہے  
جو اس دل میں گھر کرنے کی جرات بھی کر سکے اور میں  
کوئی اماں کے ہاتھ کی ڈگڈگی تو نہیں ہوں کہ وہ جس  
طرف مجھے کھمبائیں گی میں گھوم جاؤں گا اول تو انہوں  
نے اب تک اشارہ بھی کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا  
دوسرے اگر وہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی کہیں گی تو  
ان کی طبیعت بھی ٹھیک کر دوں گا۔“

وہ اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش میں بڑے پیار سے  
ہنس ہنس کر کہتا رہا۔  
مگر عالیہ کی آنکھوں سے تو باہل سے اٹھ رہے تھے  
شاید وہ دل پر چھایا غبار اسی بہانے نکال رہی تھی۔ وہ  
پھر اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔

”اماں خواہ کچھ بھی کہیں مجھے تو اولاد کی ذرا سی  
خواہش نہیں مجھے تو بس زندگی کے ہر لمحے اور ہر گام پر  
تمہاری رفاقت درکار ہے اور کیا تم یہ بھول گئیں کہ ہم  
نے سینکڑوں آدمیوں کی موجودگی میں خدا کے سامنے  
ایک دوسرے کا ساتھ بھانے کا عہد کیا تھا اور پھر ہم تو  
تمہارے شیدا کی ہیں۔ تم پر روانہ ڈرنا۔“

”کاش آپ کے یہ۔۔۔ یہ وعوے سچ ہی ثابت ہوں  
ورنہ مردوں کی زبان تو صرف ان کی مرضی اور  
خواہشات کی تابع ہوتی ہے۔ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے  
کچھ ہیں۔“ عالیہ بڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد  
اپنے آنسو خشک کر کے بولی۔

”اچھا تو تمہیں مردوں کی فطرت کا بڑا تجربہ ہے۔“  
اس نے ہنس کر کہا۔

”موم مجھے نہیں۔ نہیں زیادہ تجربہ تو نہیں ہے۔“

عالیہ نے سٹپٹا کر کہا۔

”مگر تھوڑا بہت سے ضرور۔“ اس نے شوخی

نظموں سے اسے دیکھ کر کہا۔

”نہیں تھوڑا بہت بھی نہیں ہے، البتہ تھوڑا سا

مشاہدہ ضرور کیا ہے۔“ عالیہ اس کی بات پر گڑبڑا سی

مندی۔

”چلو مشاہدہ ہی سہی مگر کوئی کیا ہے ذرا یہ تو بتائیے۔“

اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بس۔۔۔ گری لیا، اصل میں قصے کہانیوں کے

ذریعے میں نے کچھ ایسا ہی اندازہ لگایا ہے۔“ عالیہ نے

موڈ توڑ کر جواب دیا اس کے انداز سے گھبراہٹ

متشعشع تھی۔

مگر وہ تو اس وقت مذاق کے موڈ میں تھا، لٹے سیدھے

سوالات کر کے اس کی گھبراہٹ سے حظ اٹھا رہا تھا،

اس لئے اس نے کچھ خیال ہی نہ کیا۔

”اوہ تو ابھی تک آپ قصے اور کہانیوں کے پھیر

سے نہیں نکلیں تب ہی تو ہر وقت خواب اور خیالوں

کی بونیا میں کھوئی رہتی ہیں۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”نہیں بلکہ جب سے ایک پری زاد سے واسطہ پڑا

ہے جاتے ہی میں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔“ عالیہ نے

اس کی طرف دیکھ کر شوخی سے کہا یا پھر بات ہی گھما

دی۔

”اوہو، ٹھہرو، ابھی اماں سے جا کر کہتا ہوں کہ عالیہ

آپ کو ناری مخلوق سمجھتی ہے ویسے ایک بات بتاؤں

اماں کبھی وضو کے لئے پانچے اونچے کر کے پردھو میں تو

ذرا غور سے دیکھنا کہیں ان کی پنڈلیوں پر ریچھ کی طرح

لبے لبے بال تو نہیں ہیں، سنا ہے پریوں یا پری زادوں

کی شناخت اسی طرح ہوتی ہے اور اماں تو اس پر بھانپے

میں بھی ماشاء اللہ چندے آفتاب ہیں۔“ اس نے کہا

تو عالیہ ہستی ہوئی بولی۔

”ہاں اماں ضرور ہیں مگر آپ تو اتنے خوبصورت

نہیں ہیں۔“

”ارے ہم۔۔۔ ہمارا کیا پوچھتی ہو، ہم تو جدھر سے

بھی گزر جاتے ہیں ایک فنل عام ہی ہو جاتا ہے ادھر

”جی ہاں جیسے کہ بڑے ہی تو خوبصورت ہیں آپ۔“

عالیہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

”کیوں کیا ہم تمہیں اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے

دو کھا سامنے بنا کر پوچھا۔

”اونہوں بالکل نہیں عالیہ نے برا سامنے بنا کر کہا

اور جواب میں وہ غور سے عالیہ کی صورت دیکھنے لگا۔

”ارے یہ تو بتاؤ یا ر! کیا تمہارا بھی کوئی آئیڈیل تھا؟“

اس نے کچھ سوچ کر پوچھا اور عالیہ کے چہرے پر

ایک ساہ سالہرا گیا۔

”یہ آپ کو کبھی بٹھائے کیا خیال آگیا۔“ اس نے

قدرے ترش سے لہجے میں کہا۔

”ارے بھئی ویسے ہی پوچھ لیا، سنا ہے لڑکیوں کو

آئیڈیل بنانے کا خط ہوتا ہے۔“ اس نے اپنی بات کو

غیر اہم ثابت کرتے ہوئے کہا۔

”خط جنہیں ہوتا ہوگا نہیں ہوتا ہوگا۔ میں نے تو

کبھی ایسی حماقت کی ہی نہیں۔“ وہ یوں بولی جیسے اسے

بہت ناگوار گزارا ہو۔

”میں نے تو انٹرنیٹ ہی کیا تھا کہ میری شادی ہو گئی اور

اگر آئیڈیل کا ہی سوال ہے تو ایک بیوی کے لئے تو اس

کا شوہر ہی کسی آئیڈیل سے کم نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ

اس کی توقعات پر پورا اترے۔“

”جیسے کہ میں۔“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر

پستے ہوئے کہا۔

اور عالیہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر چہرہ

جھکا کر بولی۔

”ہوں۔“

اور وہ اس کی ہوں بر ہی خوش ہو گیا کیونکہ اس وقت تو

اس پر عالیہ کی محبت کا رنگ چڑھا ہوا تھا اس نے بالکل

محسوس ہی نہیں کیا تھا مگر اب

اب تو معمولی سے معمولی بات بھی بڑی شدت سے

محسوس ہو رہی تھی۔

اماں نے اس کا رنگ اور تیور دیکھ کر اب بچے کے

معاملے میں خاموشی تو اختیار کر لی تھی مگر اشاروں

کنا یوں میں کسی نہ کسی بہانے اس کے سامنے یہ ذکر

اماں بولیں تو اس نے بھی سوچا اماں کسی حد تک ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔

”چل فضل دین! یہ تینوں کشتیاں دھوپو پونچھ کر احتیاط سے الماری میں رکھ دے اور ہاں اوپر بڑے صاحب سے پوچھ کر آگے کیا وہ ہر وہ بھی کھائیں گے“

اماں نے اس سے بات کرتے کرتے ملازم کو مخاطب کر کے کہا، عالیہ شاید اس وقت کچن میں تھی۔ آذر بار بار کچن کے دروازے کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی رست و اراج میں وقت دیکھنے لگتا۔ فضل دین کشتیاں لے کر چلا گیا تو اماں اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔

”ایسا کرو ٹیلیفون پر کسی ڈاکٹرنی سے وقت لے لو پھر تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر عالیہ کو دکھانے لے جانا اسے ہاں کچھ تو ہوتا چلے کہ عالیہ میں خرابی کیا ہے“

اماں کے منہ سے بہت غیر متوقع پھر وہی ذکر سن کر وہ ایک دم ہی بگڑا تھا۔

”یہ آپ نے آپ ہی آپ کیسے اندازہ لگا لیا کہ عالیہ میں کوئی خرابی ہے“

مگر اماں نے اس کے لب و لہجے کا ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیا۔ ایک سردی آہ بھر کر بولیں۔

”یہ خرابی نہیں ہے تو اور کیا ہے بیٹے کہ اب تک عالیہ کی کوکھ ہری نہیں ہوئی ورنہ ادھر لڑکی کی شادی ہوئی اور ادھر دوسرے ہی برس بچہ ہوا۔ سارے تم کیا جالو بیٹے، بچے کے بغیر یہ گھر چھوٹے کیسا سونا سونا لگتا ہے۔“

”اگر عالیہ کی وجہ سے آپ کو یہ سارے احساسات ہوتے ہیں اماں تو آپ فکر نہ کریں اس کا بھی جلد ہی انتظام ہو جائے گا۔“ وہ تشریح کر لولا۔

”اے کیسا انتظام یہ تو ذرا سی بات میں پھلکی کی طرح جانچنے کیوں لگتا ہے۔“

”آپ باتیں ہی ایسی کرتی ہیں اماں، بہر حال میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں بھی اب اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کر لوں گا پھر تو یقیناً آپ کو ان فکروں سے نجات مل جائے گی۔“

اس نے تیز و تند لہجے میں کہا اور اسی وقت ہینڈلری سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر عالیہ پر پڑی اور

لے کر ضرور بیٹھ جاتیں۔ اس روز جمعہ کا دن تھا اور چونکہ وہ اعظم کو ساتھ لے کر جمعہ کی نماز ادا کرنے مسجد جاتا تھا اس لئے تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہا تھا اور اسے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی جب کہ اماں کا قاعدہ تھا کہ وہ نماز پڑھ کر آنے کے بعد ہی کھانا لگواتی تھیں آذر نے سوچا کہ وہ عالیہ سے کوئی ہلکی پھلکی چیز لے کر کھالے گا اس لئے وہ پینٹری میں پہنچا تو اماں کو وہیں بیٹھے پایا۔ وہ منڈی سے آئے پھلوں اور ترکاریوں کو دیکھا اور پوچھا کہ ملازم سے فریج میں رکھوا رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔

”ارے تمہو نوں ابھی تک مسجد نہیں گئے۔“

”نہیں اماں! ابھی تو نماز شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں اور اعظم بھی تیار نہیں ہوا۔“

اس نے عالیہ کو تلاش کرنے کی غرض سے نظریں ادھر ادھر دوڑاتے ہوئے کہا۔

”اے ہاں اس میں تو شیطان سا گیا ہے خاص طور سے جمعہ کے دن ہی سستی کرتا ہے ویسے بھی آج کل کے بچے تو بس مارے باندھے کو نماز پڑھ لیتے ہیں وہ بھی میں زبردستی کہہ کہہ کر بھیجتی ہوں ورنہ دل کس کا چاہتا ہے۔“ اماں بولیں۔

جواب میں وہ کیا کہتا بھوک کے مارے تو پیٹ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ کاؤنٹر پر رکھی ہوئی ٹرے میں سے ایک کیلا اٹھا کر وہ کھانے لگا۔

مگر اماں تو شروع ہو گئی تھیں اس لئے بولتی ہی گئیں۔

”اے ہاں وقت کے وقت مسجد میں جا کر جلدی جلدی دو چار فکریں مار لیتے ہیں۔ یہ کج کل کے بچے نہ خطبے میں شریک نہ دعا میں۔ دل سے تو کوئی جاتا ہی نہیں نا ایک ہمارے باولو ادا تھے کہ گیارہ بجے سے ہی تیار ہو کر مسجد میں جا بیٹھتے تھے اور جمعہ کی تیاری بھی ایسے کرتے تھے جیسے دو لہا بارات کی کرتا ہے اور ایک یہ ہمارے چھوٹے صاحبزادے ہیں کہ گیارہ بجے تک تو بستر میں ہی پڑے اینڈ تے رہتے ہیں۔ اور پھر اٹھتے بھی ہیں تو سو محروں سے اتنا بھی نہیں کہ جمعے کا ہی احترام کریں۔“

دو بار سے لگی اس کی اور اماں کی منگلوں میں رہی تھی اور اسے دیکھ کر گھبراہٹ مٹی مٹی مگر اس وقت تو اس پر سخت جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ اس نے اعظم کو بھی ساتھ نہ لیا اور تیزی سے مسجد کا رخ کیا۔ مارے غصے کے اس سے ڈھنگ سے نماز بھی ادا نہ ہو سکی یہ خیال اسے نماز میں بھی پریشان کرتا رہا کہ عالیہ نے بھی اماں کی منگلوں میں ہی ہے اسے معلوم تھا کہ اماں نے کس وجہ سے اس موضوع کو اپنا ٹارگٹ بنایا ہے یعنی وہ عالیہ پر سوکن لانے کے منصوبے باندھ رہی ہیں اور ان ہی ساری باتوں کے پیش نظر اس نے واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہی فیصلہ کر لیا تھا کہ عالیہ کو لے کر کسی اچھے سے مکان میں منتقل ہو جائے گا۔

\*...\*

اماں بیٹے کی دھمکی سے خائف ہو گئی تھیں یا پھر کوئی اور چکر چلانے کی فکر میں تھیں جو انہوں نے اس روز کے بعد سے چپ سا دھلی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی گزرا ہر کسی اچھے مکان کی جستجو میں لگا ہوا تھا، مگر انہی دنوں کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اماں کو اچانک صالحہ کے پاس بہاولپور جانا پڑا۔ اصل میں صالحہ پھر امید سے تھی اور کسی بد احتیاطی کی وجہ سے بیمار ہو گئی تھی۔ اماں اعظم کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ صرف صائمہ ہی باپ کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر رہ گئی تھی۔ ادھر اب تک آذر کو اپنے مطلب کا کوئی مکان ہی نہیں ملا تھا، اس لئے مکان کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا اور اماں کے جانے کے چند روز بعد ہی عالیہ کو وہ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے تھے جن کو شروع شروع میں گزرنے کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی، مگر اب اب تو اس نے خود اپنے کانوں سے وہ آواز سنی تھی جو عالیہ کی تو ہرگز نہ تھی جو عالیہ نے اس کے ہر الزام کی سختی سے تردید کی تھی اور اس کے سختی برتنے پر بھی اس نے کسی طرح قبول کر کے ہی نہ دیا تھا مگر اب وہ عالیہ کی کسی عذر معذرت کو ماننے پر بالکل تیار نہ تھا اور انہی واقعات کی روشنی میں تمام پچھلے واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ اپنی اتنی بے اندازہ اور شدید جاہت کے جواب میں عالیہ کا اپراپا اپرا اور کترایا کترایا سا رویہ

کھویا کھویا سا انداز افسردگی اور فکر مندی جسے اب تک وہ اماں کی بد سلوکی کا سبب گردانتا رہا تھا اب حقیقت کا روپ و عمار کر اس کے سامنے آرہی تھیں آج کل تو اماں اور اعظم کے جانے کی وجہ سے گھر میں بالکل سا ناثر رہتا ہے اب اب کی وجہ سے صائمہ بھی نیچے نہیں اترتی اور دن میں تو وہ کالج جاتی ہے پھر تو عالیہ کو اور بھی گل کھلانے کا موقع ملا ہو گا مگر کیا واقعی عالیہ ایسی ہے ایسی فریبی اور بد کردار۔ اور پھر اس کی نظروں میں عالیہ کی بھولی بھالی شکل گھوم گئی تو ایک اضطرابی سی کیفیت میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آتش و ان کے آگے ہی ٹھٹھنے لگا۔

لیکن عالیہ بظاہر تو ایسی نہیں لگتی وہ کس قدر بے چین اور جزبزی ہو رہی تھی جب میں اسے بہنچھوڑ بہنچھوڑ کر پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ وہ کون تھا تو وہ کتنی عاجزی اور بے چارگی سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں نے بالکل غلط سنا ہے جو کچھ سنا ہے وہ میرا وہم ہے ہو سکتا ہے یہی بات ہو گی تو تکہ اس کے لہجے میں رہا اور بیکاری نام کو نہیں تھی اور وہ زچ ہو کر رونے بھی تو لگی تھی۔ اگر بھولی اور مکار ہوتی تو پھر یوں بلک بلک کر کیوں روتی۔ اس پر بھی میں اسے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں اگر واقعی وہ بے قصور ہے تو میں نے خواہ مخواہ اس پر ظلم توڑا۔

اس کی شدید جاہت نے ایک دم ہی اس کی بد گمانیوں پر تھینا مارا تو وہ تیزی سے اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک جھنگلے سے ہینڈل کھمایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تو سامنے ہی مسمری بر عالیہ کو سوتے ہوئے پایا۔ وہ دبے قدموں سے اس کے قریب آیا اور تھوڑا سا جھک کر اسے دیکھا وہی معصومیت وہی دلربائی سوتی ہوئی عالیہ کے حسین تر چہرے سے ہویدا تھی جس کا وہ شیدا کی تھا۔ وہ سوتے میں بھی ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی۔ نیند سے جڑی کھینچی پلکوں میں تھمے تھمے قطرے اب بھی چمک رہے تھے، ناک گریہ و زاری کی وجہ سے تھوڑی سی سرخ ہو رہی تھی اور تھوڑے رخساروں پر اشکوں کے نشان لیکر سی سیچ رہے تھے وہ عالیہ سے اس معاملے میں مزید کچھ کہہ کر

اس کے احساسات مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا وہ سو گئی ہے تو اس وقت اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ سوئی رہے اس نے دل میں سوچا اور اس کے بے آرام ہوجانے کے خیال سے وہ رات اس نے کوچ پر لیٹ کر گزاری۔

دو دنوں کے درمیان ایک بیچ سی قائم ہو گئی تھی یا کیا بات تھی تین روز گزر گئے تھے نہ اس نے عالیہ سے کوئی بات کی تھی اور نہ عالیہ نے ہی اس سے اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا ہی گوارا کیا تھا جب کہ وہ اس سے اسی بات کا متنبی تھا کہ وہ اپنے بارے میں مزید کچھ کہے تاکہ اس کی بدگمانی کی تردید ہو سکے کیونکہ وہ اپنی بدگمانی اور زیادتی پر سخت متاسف تھا۔ عالیہ نے خاموشی اور لا تعلق سے رویے سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ واقعی بالکل بے تصور ہے۔ ورنہ اگر خطا وار ہوئی تو ضرور اس کے سامنے جھک جاتی۔ مگر وہ تو میری موجودگی میں کمرے میں بھی کم آتی ہے اور جب میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتا ہوں تو وہ چپکے سے آکر کوچ پر لیٹ جاتی ہے وہ اب مزید عالیہ کی بے رخی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

چوتھے روز وہ آفس سے آیا تو ایسے چپکے سے آکر خوابگاہ میں بیٹھ گیا کہ کسی کو ہاتھ نہ چلا ویسے بھی وہ وقت سے کچھ پہلے ہی آیا تھا اور عالیہ اس وقت گھر کے کاموں میں مصروف تھی کچھ ہی دیر بعد وہ کسی کام سے خوابگاہ میں آئی تو اسے بیٹھا دیکھ کر دروازے کے آگے ہی لہٹھک گئی اور پھر لیٹ کر باہر جا کر رہی تھی کہ اس نے جھپٹ کر اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

”ہمارے چنگل سے بچ لکھنا آسان نہیں جانم مگر یہ تمہارے منہ میں کیا بھرا ہوا ہے جو پھول کر عیار ہو رہا ہے۔“  
 وہ گزشتہ تینوں کو بھلاؤنا چاہتا تھا اس لئے اس نے یوں کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، مگر عالیہ بدستور منہ پھلائے کھڑی تھی۔

”وہ کھو بھی یہ سخت زیادتی ہے۔ ہم تو صرف تمہاری وجہ سے جلد جلد کام نمٹا کر وہاں سے بھاگے

ہیں اور تم ہو کہ ہمیں دور کرنے پر تلی ہوئی ہو۔“  
 اس پر بھی عالیہ نے اپنی طرف سے کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔ کسی ساکت اور بے جان شے کی طرح اس کی بانہوں میں کھڑی کھڑی رہی۔

”اچھا بھئی ٹھیک ہے تو پھر تم جاؤ جہاں جانا چاہ رہی تھیں۔ ہم بھی باہر جا کر تھوڑی سی آواہ کر دی کریں گے۔ سخت حماقت ہی کی جو جلدی چلے آئے۔“  
 اس نے اپنی بانہوں کا حصار توڑ کر برا مان جانے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو عالیہ نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اپنی ساری ایکٹنگ بھول گیا مگر جلد ہی سنبھل کر بولا۔

”جو کچھ ہوا ہے اس پر مجھے بہت افسوس ہے عالیہ اگر تم سے ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔“  
 اس کے ندامت بھرے لہجے میں تاسف بھی شامل تھا عالیہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بڑے سخ و ترش لہجے میں بولی۔

”نہیں نہیں تُوڑ! میری بھلا کیا حیثیت اور کیا اوقات جو آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں وہ بھی ایک فریبی اور بد چلن لڑکی سے جو آپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آپ ہی کے گھر میں آپ ہی خوابگاہ میں غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہے۔“

اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر عالیہ روئے لگی۔

اور وہ تڑپ اٹھا عالیہ کو سینے سے لگا کر بچپتے ہوئے اس نے نادم سے لہجے میں کہا۔

”مجھ سے واقعی بڑی سخت زیادتی ہو گئی ہے لیکن تمہیں بھی اختیار ہے جو سزا چاہو مجھے دے سکتی ہو میرے یہ ہاتھ جلاؤ جنہوں نے تمہارے نازک سے بدن کو جتھوڑا تھا۔ میری اس زبان پر انکار ہے رکھ دو جس نے تم پر جھوٹی تہمت لگائی تھی میں قسم کھاتا ہوں کہ میں آف تک نہ کروں گا۔“  
 لیکن عالیہ بدستور روٹی رہی۔

”اچھا تو آؤ میرے ساتھ کچن میں چلو میں خود تمہارے سامنے اپنے یہ گناہ آلود ہاتھ جلاؤں گا۔“



اس کا منہ پر رکھا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا بولا تو عالیہ نے گھبرا کر جلدی سے اپنے آنسو پونچھے۔  
 ”اچھا آپ میرا ہاتھ تو چھوٹیے۔ میرا دل آپ کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا ہے، یہ یہ تو صرف آسف کے آنسو ہیں۔“ عالیہ نے مسکوں کے درمیان کہا۔

”کاش آپ نے مجھ پر تھوڑا سا ہی اعتماد کر لیا ہوتا آذر! مگر آپ نے تو ایک ذرا سی غلط فہمی میں الٹا میرے ہی دل کے آئینوں کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔“  
 ”اوہ پلیز عالیہ! ایسی تکلیف دہ باتیں تو نہ کرو کہ میں خود اپنے آپ ہی سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔“  
 وہ عالیہ کی دل گرفتہ باتوں پر تڑپ کر بڑی عاجزی سے بولا۔

”یہ تکلیف دہ باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ اعتماد کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ آذر ڈرتی ہوں کہ اگر آئندہ بھی آپ کو کچھ ایسی ہی غلط فہمی ہو گئی تو۔“

”نہیں نہیں اب سبھی ایسا نہ ہو گا، تم اطمینان رکھو۔“ وہ عالیہ کی بات قطع کر کے بولا۔

”میں تو تب بر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئی تھی آذر! مگر مگر آپ نے میرے احساسات اور جذبات کو اتنی شدید شخصیت پہنچائی ہے کہ آپ کی بات پر یقین کرنے کی کوشش بھی کروں تو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مگر تو مختار کل ہر تر اور عالی طرف ہوتا ہے آذر! پھر وہ اس قدر کو نامہ نظر کیوں ہو جاتا ہے کہ ذرا سے شبیہ میں اپنی ہستی مسکرائی زندگی کو خزاں کے حوالے کر دیتا ہے اور آپ کو تو اپنی محبت پر بڑا ناز تھا بہت دعوے تھا اور آپ ہی ایک بے بنیاد بات پر مجھ پر شک کر بیٹھے۔“

آنکھوں کی راہوں کا غبار نکالتے نکالتے اب عالیہ زبان سے بھی دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

”افسوس بھئی اب کہاں تک چپ کے لگاؤ کی اس دل ناتواں پر تمہارے دل میں اب اتنی بھی گنجائش نہیں رہی کہ میری ایک ذرا سی خطا کو معاف کر دو۔“ وہ عالیہ کی باتوں سے بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا اس نے

پھر عالیہ کو مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

”اچھا تو دوستی۔“ اس نے جلدی سے دو انگلیاں عالیہ کے سامنے نچاتے ہوئے کہا تو عالیہ نے ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی دونوں انگلیاں اس کی انگلیوں سے ملائیں اور پھر ہنستے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

”دوستی تو ہو گئی مگر پھر بھی آپ سے ڈر ہی لگتا ہے کہ کہیں پھر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تو شاید میری کھال ہی اتروا دیں گے۔“

اور آذر نے بڑی شاک کی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو عالیہ نے جلدی سے بات پلٹ کر پوچھا۔  
 ”آپ کے لئے چائے ملاؤں یا کافی۔“

”نہ چائے نہ کافی بس تم میرے سامنے بیٹھی رہو میں تو آج تمہاری دید سے اپنا پیٹ بھروں گا بہتر کھٹے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں تم سے پھنڑے ہوئے۔“  
 ”مگر وہ اپا میاں کی سنی بھی تو تیار کرنی ہے مجھے“ عالیہ نے جانے کیوں اس سے تکرار ہی تھی۔

”ہاں میں کیا کیا آج غصے میں اپا میاں کی سنی ہی بنا ڈالی تھی سچ یہ تو بڑا برا ہوا۔“

اور عالیہ جواب میں بڑے اوپری سے انداز میں مسکرائی۔

”خیر کسی کی سنی اپنا ہی ہو یا قیسم میں تمہیں اب کہیں نہ جانے دوں گا تمہو میں صائمہ سے کہہ دوں گا وہ آخر کس مرض کی دوا ہے۔“ وہ اسے بستر پر بٹھا کر باہر جانے لگا تو عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”آپ صائمہ سے کچھ نہ کہیں بس ایک وٹمنٹ کا کام ہے میں آپ کے لئے چائے بھی لے آؤں گی۔“ اور پھر عالیہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے مگر تیرا منٹ نہ ہونے پائے ورنہ میں وہیں سے تمہیں پکڑ لاؤں گا۔“ اس نے کمرے سے باہر نکلتی عالیہ کو وارننگ سی دی۔

دونوں میں صلح ہو گئی تھی صفائی نے دل میں بھری کدورتوں کو بھی کاٹ دیا تھا، مگر وہ برابر محسوس کر رہا تھا کہ اس ناخوشگوار واقعے کے بعد سے عالیہ اس سے کھینچی کھینچی سی رہتی ہے اور اگر کھینچی کھینچی سی ہی

کہا۔

”اچھا یہی سمجھ لو۔“ اسے بھی عالیہ کے طنز کرنے اور برامانے پر تاؤ آگیا وہ درشت لہجے میں بولا اور بس اسی بات پر اس کے اور عالیہ کے درمیان ایک کٹنی سی پیدا ہو گئی عالیہ نے اس سے منہ پھلایا اور اس نے بھی عالیہ کے اتنے بے موقع میکے جانے کے مطالبے کو اس کی بے حاشد تصور کرتے ہوئے اسے منہ لگانا چھوڑ دیا وہ خود کو اپنے اس رویے میں حق بجانب سمجھتا تھا وہ عالیہ کے کتنے مان اور ناز بردار بن کر رہتا تھا اسے کتنی شدت سے چاہتا تھا اور عالیہ بھی کہ اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ معمولی معمولی بات پر بگڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے تو اس مرتبہ اس نے عالیہ کی فحش کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دی تھی پھر بھی وہ عالیہ کو ناراض کر کے بڑی بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

اس روز صائمہ شام کی ٹرین سے بہاولپور جا رہی تھی تھوڑے دنوں کے لیے کام بہت بڑھا ہوا تھا اس لیے یہ ہوا کہ اسی کی کار میں اعظم صائمہ کو اسٹیشن چھوڑ کر گئے گا ٹرینیں لیٹ بھی ہو جایا کرتی ہیں نہ معلوم اعظم کو واپسی میں کتنی درگے ساڑھے آٹھ بجے شب تو ریل کی روانگی ہے۔ کیوں نہ میں گھر چلا جاؤں عالیہ بالکل تنہا ہوگی اور پھر لاپتہ کی حالت میں اس کا اصل میں اس کا ایک ہم پیشہ شہر آ رہا تھا اور اس روز اس کے پاس کار بھی نہ تھی اس لیے یہ سب سوچ کر اپنا بانی ماندہ کام اپنے ایک اور ساتھی کے سپرد کر کے وہ بھی گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اسی ہم پیشہ کی کار میں گھر کا رخ کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

واقعی کبھی کبھی میں بھی عالیہ پر خواہنا ہی زیادتی کر بیٹھتا ہوں، اماں نے اس کے بار بار میکے جانے پر اعتراض کر کے اور طعنے دے دے کر پہلے ہی اس کا میکے جانا بند کر دیا تھا۔ کبھی ہفتوں مہینوں میں جاتی بھی ہے بے چاری تو بس کھڑے کھڑے اور اب تو جب سے اماں گئی ہیں۔ کبھی گئی ہی نہیں بے چاری اور نہ دل تو بہت چاہتا ہو گا اپنی ماں بہنوں سے ملنے کو جب کہ رہائش بھی ایک ہی شہر میں ہے اور اسی وجہ سے وہ

رہتی تو وہ بھی سمجھتا کہ اس کے دل پر اب تک اس طرح واقعے کا اثر غالب ہے۔ مگر عالیہ تو کچھ سمجھ کر بھی رہ گئی تھی ہر دم سوگوار سی رہتی تھی یوں جیسے کسی کا غم کر رہی ہو۔ یہ بات اس نے بڑی شدت سے محسوس کی تھی۔ چونکہ اس کے خیال میں سوائے اس طرح واقعے کے کوئی دوسرا سبب ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے عالیہ سے اس نے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

\*-\*-\*

اماں گئی تھیں ایک دو ہفتے قیام کے ارادے سے مگر وہاں صائمہ کی بیماری نے کچھ طویل کھینچ لیا تھا۔ اماں وہیں کی ہو کر رہ گئی تھیں البتہ اعظم کو انہوں نے واپس بھیج دیا تھا کیونکہ ایک تو وہ اپنے والد کا کاروبار سنبھالے ہوئے تھا اور دوسرے بڑھ بھی رہا تھا۔

صائمہ کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ اور اماں نے اسے بھی اپنے پاس بلایا تھا اور ان دنوں صائمہ اماں کے پاس بہاولپور جانے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ اس کی روانگی سے دو دن قبل عالیہ نے اپنے میکے جانے کی خواہش ظاہر کی تو آڈر نے کہا۔

”تمہیں پہلے خیال نہیں آیا تھا جواب ایسے موقع پر جانا چاہ رہی ہو جب کہ صائمہ بہاولپور جانے کو تیار ہو چکی ہے۔ تم ہی بتاؤ اگر تم چلی گئیں تو گھر میں رہ کون جائے گا۔“

لیکن میں تو صرف دو تین روز کے لئے ہی جا رہی ہوں، کوئی ہمیشہ کے لئے تو نہیں۔ یہ کہئے کہ آپ مجھے بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ عالیہ برامانے کے سے انداز میں بولی۔

”کمال ہے۔ کیا تم میری فطرت سے واقف نہیں ہو جو تمہیں یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں تمہیں وہاں بھیجنا پسند نہیں کرتا۔ بھئی یہ تو وقت اور موقع کی بات ہے۔ پر سوں صائمہ بہاولپور جا رہی ہے اور تم بھند ہو کہ تمہیں میکے جانے دوں۔“ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں وہاں نہیں جا سکتی۔“ عالیہ نے بڑے طنز سے ہاتھ چلا کر

وہاں جانا چاہ رہی ہوگی کہ صائمہ بھی اماں کے پاس جا رہی ہے نہ معلوم وہ اور اماں کب تک واپس آئیں اور میں نے خواہ مخواہ اس کی ذرا سی خواہش کو رد کر کے اس کا دل توڑ کر رکھ دیا۔ خیر میں کل ہی تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی اسے اس کی امی اور بہنوں سے ملوانے لے جاؤں گا۔" وہ تمام راستے یہی سوچتا رہا وہ جو اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کو جلد ہی تسلیم کر لینے کا عادی تھا وہ عالیہ کی بہت سی خامیوں کے باوجود اسے دل و جان سے چاہتا تھا جب کہ عالیہ کی طرف سے اپنی اپنی شدت چاہت کے جواب میں اسے اتنی گرجوٹی بھی نہیں ملی تھی جس کا وہ عالیہ سے خواہاں تھا متنی تھا۔

کار سے اتر کر اس نے کلائی پر بندھی رستہ و اراج میں وقت دیکھا۔ ساڑھے آٹھ ہی ہو رہے تھے۔ گویا ابھی اعظم اسٹیشن پر ہی تھا۔ عالیہ اس سے سخت خفا تھی۔ اور یہ اس کی کمزوری تھی عالیہ اس سے خفا ہو جاتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ زندگی ہی اس سے روٹھ گئی ہو اور آج تو وہ ہر طریقے سے اسے منانے کا تہیہ کر کے آیا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی ہوگی کہ میں اپنے اسی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے وقت آؤں گا اس نے دل میں سوچا اور پھر بڑی لگن اور شوق سے اندر کا رخ کیا۔ اس روز بھی گھر پر غیر معمولی سناٹا طاری تھا نیچے بچن وغیرہ بھی سب بند پڑا تھا۔ عالیہ کو سر پر اتار دینے کی غرض سے وہ چپکے سے بیڈ روم میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور احتیاط سے اسے دھکیلا تو خلاف دستور دروازہ اندر سے بند پایا شاید ڈر کی وجہ سے عالیہ کھٹکا لگا کر بیٹھی ہے۔ اس نے ایک لمحے کو دل میں سوچا اور پھر آہستہ سے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔

اور اسی دم عالیہ کی خوف و ہشت میں ڈوبی آواز اس کے کانوں سے گھرائی۔

"اے کیسے شاید کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔"

"تمہارے کان بچ رہے ہوں گے ورنہ میں تو کوئی دستک نہیں سنی۔" وہی مردانہ بھاری آواز آئی تو اسے یوں لگا جیسے پھنس اور دیواریں اس پر گر رہی ہوں۔ وہ

دروازے سے کان لگائے ساکت کھڑا رہ گیا۔

"لیکن میں نے تو سنی ہے" اب آخر آپ یہاں کیوں آگئے اگر آذر کو معلوم ہو گیا تو پھر۔"

عالیہ پر اس کے عالم میں قدرے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ جب کہ مرد کی آواز بہت سچی اور بھنجی بھنجی سی تھی گوشش کے باوجود وہ سن ہی نہ سکا کہ اس نے عالیہ کی بات کا کیا جواب دیا۔

"ہاں مجھے بھی احساس تھا۔ میں خود آپ سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی مگر کیا کرنی سخت مجبور تھی۔ آذر نے وہاں آنے کی اجازت ہی نہیں دی۔"

"اس لئے تو آج پھر میں اتنا بڑا رسک لے کر۔۔۔ آگے کچھ سناٹی ہی نہ دیا۔"

"اچھا اچھا خدا کے لئے آپ جلدی سے یہاں سے چلے جائے۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔" عالیہ کی ملتجیانہ اور خوشامدانشہ سی آواز آئی۔

"نہیں نہیں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، تمہاری مسرتوں اور سکون کی خاطر تو میں نے اپنی عزت اور جان کی بازی لگائی ہے اچھا آؤ آخری بار میرے گلے سے لگ جاؤ پھر قسمت یا نصیب نہ معلوم کبھی ملنا بھی ہو یا۔"

اور وہ جواب تک بڑے ضبط و تحمل سے کام لے کر دروازے سے کان لگائے کھڑا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اس کی شریاٹوں کے اندر چھتی ہوئی چنگاریاں اس کی غیرت نفس پر اس کی شرافت اور مردانگی پر آگے کوڑے بن کر گریں تو اس کے پورے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اور اس نے توڑ دینے کے سے انداز میں دروازے کو اتنے زور سے دھڑکھڑایا کہ دیواریں لرز اٹھیں۔

"دروازہ کھولو ورنہ میں اسے توڑ ڈالوں گا۔" اس نے چیخ کر کہا۔

اور ادھر سناٹا چھا گیا مگر وہ برابر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ وہ چاہتا تو دوسرے دروازے سے بھی اندر جا سکتا تھا۔ جو یہ بونی سمت کھٹکتا تھا۔ مگر اس کا تو پورا وجود غصے

سے کھول رہا تھا۔ اسے خیال ہی نہ آیا۔ اور ابھی اس نے دروازے پر ٹکمارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ عالیہ نے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔

دھوئے ہوئے کپڑے کی طرح سفید بڑتی عالیہ چٹخنی کرتے ہی ایک کونے میں دیک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پوری قوت سے دروازہ کھولا۔ اور پانکلوں کی طرح اسی دروازے کی طرف بڑھا جو بیرونی سمت کھلتا تھا۔ اس نے کوچ دینے کے سے انداز سے دروازے پر پڑا پر وہ اٹھایا تو دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ اور اس دروازے کو چند روز پہلے عالیہ کے خوف زدہ ہو جانے کے خیال سے اس نے خود مقفل کیا تھا اور اب اس دروازے کے سوا اس شخص کے لیے جس نے اس کی بیوی سے ناجائز تعلقات قائم کر کے اس کی غیرت کو لٹکارا تھا۔ فرار کی کوئی راہ ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کی خواب گاہ میں ہی کیس چھپا ہوا تھا۔

مقفل دروازے نے اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اس نے مڑ کر خواب گاہ میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر سامنے کونے میں دیک کر زنی کی پکپاتی عالیہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اس پر اس طرح جھپٹا جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے ایسے شکار پر جو عین اس کی گرفت کی زد میں ہو اور پھر اس نے عالیہ کا گریبان پکڑ کر بڑی بے دردی سے اسے جھٹکے دیتے ہوئے پوچھا۔

”بتاؤ اسے کہاں چھپایا ہے۔ تم تو۔“ عالیہ اس مرتبہ خود بھی رست کی دیوار ثابت ہو رہی تھی۔ اب اس کا کوئی عذر، کوئی بہانہ اسے آذر کے غضب سے نہیں بچا سکتا تھا۔

”فاحشر عورت! بتا وہ تیرا آشنا کہاں ہے؟ تو اب تک میری آنکھوں میں دھول ہی جموکتی رہی، مگر اب میں تجھے جان سے ہی مار ڈالوں گا۔ بد چلن اور آبد پاختہ عورتوں کو مار ہی دینا چاہیے۔“ وہ غصے سے آگ بگولا ہو کر لولا اور اس کا گلا گھونٹ کر مار ہی دینا چاہتا تھا کہ وہ رکے ہوئے سانسوں کے ساتھ بھینچی بھینچی آواز

میں بولی۔  
”میں مرجانا پسند کروں گی مگر آپ کو یہ راز کبھی نہیں بتاؤں گی۔“ اور ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ عین اس کی پشت پر بننے پار کے دروازے کو کوئی نور نور سے کھٹکھٹانے لگا اور آذر کی گرفت نہایت غیر اختیاری طور پر اس کی گردن پر ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے خون بار نظروں سے ایک لمحے کو عالیہ کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف جس پر نور نور سے دستک ہو رہی تھی۔

”ہوں تو یہاں چھپا رکھا ہے اپنے۔“ اس نے ایک بہت غلیظ سالفظ کہا اور عالیہ کو ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ عالیہ دروازے سے پیٹھ لگا کر تن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔  
”نہیں ہیں۔ آپ اسے نہیں کھول سکتے، جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

مگر اس نے ایک جھٹکے سے عالیہ کو دروازے کے آگے سے ہٹا دیا اور چٹخنی کھولنے لگا تو عالیہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

”خدا کے لئے آذر! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں، ان کی راہ میں حائل نہ ہوئے۔ نہیں تو ہم سب کی قسمت تاریک ہو جائے گی۔“

مگر اس نے عالیہ کو اٹھا کر پوری قوت سے پٹخ دیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ اسی دم دروازہ کھلا اور جو کوئی بھی دروازے پر نمودار ہوا اسے دیکھ کر آذر ایک لمحے کو تو چونک ہی گیا پھر اس کی خون بار آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی بھٹی سلگ اٹھی۔

”ہوں تو یہ تم ہو، خود اپنی عزت اور ناموس کے دشمن، بہن کے دلال، ہٹو میرے راستے سے، میں بھی تو دیکھوں تمہارے اپنے شکار کو کہاں چھپا رکھا ہے۔“

”تمہیں سے بات کر گستاخ! مجھے اپنی بہن کا پاس نہ ہوتا تو تمہاری اس ذلیل گفتگو پر ہی تمہارا جیڑا توڑ کر رکھ دیتا۔“ عالیہ کا بڑا اور اکلوتا بھائی مظہر آذر کی اخلاق سوز گفتگو سن کر اپنے آپ میں نہ رہا اور آذر نے بڑھ

کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”مذلیل کہنے عورتوں کے دلالی تم میں اتنی ہمت ہے کہ میرا جیڑا توڑ دو گے۔ بے غیرت انسان! میں تمہارے سارے وانت تمہارے حلق میں گھسا دوں گا۔“

گوار بھی غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور قریب تھا کہ دونوں قسم گھٹا ہو جاتے کہ فرش پر بڑی کراہتی ہوئی عالیہ تیزی سے گھسٹی ہوئی ان دونوں کے نزدیک آئی اور چلا کر بولی۔

”بھائی جان! آپ کو میرے سہاگ کا واسطہ آپ انہیں کچھ نہ کہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں۔ غصے اور لاعلمی میں کہہ رہے ہیں۔ آپ کو امی کی قسم بھائی جان! اپنے مرے ہوئے باب کی قسم۔“

اور پھر شدت گریہ سے عالیہ کی آواز بند ہو گئی منظر نے ایک نظر اپنی روٹی اور فریاد کرتی بہن پر ڈالی اور پھر مضبوطی سے پکڑی آذر کی کلائیوں سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ عالیہ بھائی کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ مگر خوف و ہراس کی وجہ سے اس کے اشک بھی رک رک کر بہ رہے تھے۔ آذر برا بھی تک جنوں سوار تھا۔ وہ منظر کا گریبان پکڑے کھڑا تھا۔ اور اس کی اس حرکت پر حالیہ بڑی سنجی نظروں سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہیں چھوڑ دیجئے آذر! میں حلفیہ کہتی ہوں کہ ان کے سوا یہاں کوئی بھی نہ تھا۔“

مگر آذر پر اس کی بات کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوا وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم مجھے مزید دھوکہ نہیں دے سکتیں بدکار عورت! میں تمہارے اس بد معاش بھائی کو بھی مزہ چکھائے بغیر نہ رہوں گا۔“

اور اپنی اس اہانت پر منظر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے پوری قوت اور جذب سے آذر کو دھکا دیا تو آذر پیچھے کو ڈول گیا۔ اور بھی عالیہ ان دونوں کے درمیان میں آگئی۔

”آذر پلیز! صرف ایک بار اور میری بات سن لیجئے۔“

آپ کو اماں جان کا قسم، صرف آخری بار میری بات سن لیجئے۔ پھر چاہے آپ میری جان بھی لے لیجئے گا۔“

اور وہ جو سنبھل کر اس کے بھائی پر چھٹائی چاہتا تھا۔ عالیہ کے بیچ میں آکر کھڑے ہو جانے پر نہ جانے کیوں اپنی جگہ پر ساکت سا رہ گیا خوف و دہشت کی وجہ سے اس سے عالیہ کے آنسو بھی آپ ہی آپ خشک ہو گئے۔ مگر اس کی فحش رنگت، خشک ہونٹ اور کانپتا لرزنا وجود، عالیہ کی یہ ساری کیفیات، دھوکہ، فریب، ریا اور مکاری کی مظہر ہرگز نہ تھیں۔ شاید اسی ایک احساس نے آذر کو اپنے ارادوں سے باز رکھا تھا۔

”ہاں بتاؤ آج اسے سب کچھ عالیہ! کوئی بات بھی نہیں چھپانا جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہنا۔“ منظر آذر کے غضبناک سے موڈ میں سکوت پیدا ہو جانے پر یوں بولا جیسے عالیہ کی ہمت بندھا رہا ہو۔

”یہ یہ چھپ چھپ کر مجھ سے ملنے آتے تھے۔ اس لیے اس لیے کہ ان کا وارنٹ نکلا ہوا تھا۔“ امی بات بڑے کرب کے ساتھ ہونٹ بھیج کر عالیہ نے کہی۔ اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کو آذر پر مرکوز کر کے رقت سے بوجھل آواز میں دل کا سارا کرب شامل کر کے بولی۔

”یہ گھر میں بھی نہیں رو سکتے وہاں بھی چوری چھپ جاتے ہیں، اسی طرح مجھ سے بھی ملنے آجاتے ہیں۔ حالانکہ میں نے انہیں سختی سے یہاں آنے کی ممانعت کر دی تھی۔ مگر اب یہ کبھی یہاں نہ آئیں گے، یہ ان سے میری آخری ملاقات ہے آذر۔ کیونکہ یہ کل سعودی عرب روانہ ہو رہے ہیں۔“

”اور۔۔۔ تو یہ کہو کہ یہ یہاں سے منہ کالا کر کے کہیں بھاگ رہے ہیں۔ مگر کیا تم سمجھتی ہو، میں اتنی آسماں سے اس ضمیر فروش اور خطرناک مجرم کو یہاں سے نکلنے دوں گا۔ میں تو اب اسے پولیس کے حوالے کر کے ہی دم لوں گا۔“

آذر نے عالیہ کی ساری بات نہایت قتل اور خاموشی سے سنتے رہنے کے بعد بڑے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں آذر! آپ انہیں پولیس کے حوالے

نہ کیجئے۔ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کسی کے یہاں ڈاکہ ڈالا ہے نہ چوری ہی کی ہے یہ تو گردش ایام میں آگئے ہیں۔“ آذر کی دو ٹھنکی بر عالیہ تڑپ کر بولی۔

”تمہیں عالیہ! یہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے اسے کر لینے دو۔ اگر تپاتی اور بریادی ہی میرا مقدر بن گئی ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔“ منظر نے بڑے یاس بھرے لہجے میں کہا اور پھر آذر سے بولا۔

”تمہیں اس سلسلے میں زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا البتہ تم سے اگر ہو سکے تو تھانے تک میرے ساتھ چلو۔“

”اجی نہیں آپ اپنے پیروں کو زحمت کیوں دیتے ہیں وہ لوگ خود ہی اگر آپ کو یہاں سے اٹھالیں گے بس تھوڑا سا انتظار ضرور کرنا پڑے گا۔“

آذر نے بڑے جلے بھنے لہجے میں کہا اور فون کرنے کی غرض سے پارلر میں جانے لگا تو سارا ڈر اور خوف بالائے طاق رکھ کر عالیہ اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”میں اپنی جان دے دوں گی آذر! مگر آپ کو کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانے دوں گی جو میرے پورے خاندان کی تباہی کا باعث بن جائے۔ میں نے بقول آپ کے اگر دھوکہ ہی دیا ہے تو صرف اپنی مصلحتوں کے تحت اور ایک ماں جانے سے چھپ کر ملنا کوئی ایسا جرم تو نہیں جس کی معافی ہی نہ ہو۔“ عالیہ نے بڑی جرات اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

”ہو نہ ماں جا یا۔ مجرم اور روسیہ کہو۔“ آذر نے اپنی دو انست میں بڑی گہری چوٹ کی۔

”ٹھیک ہے اگر یہ مجرم اور روسیہ بھی ہیں تو انہیں ایک ایسے جرم کا ارتکاب کرنے پر جو آپ کی نظروں میں ناقابل تلافی ہے۔ آپ کی والدہ اور جنم نے ہی مجبور کیا تھا۔“ عالیہ بڑے سچ لہجے میں بولی۔

”میری ماں کا نام نہ لو ذلیل عورت۔“ وہ پھر کر بولا۔

”کیوں نہ لوں آپ کی ماں کا نام۔ وہی تو اس ساری تباہی کی اصل ذمے دار ہیں۔ انہوں نے ہی تو چیزیں

دینے کے لیے قیمتی اور قسم قسم کی چیزوں کا مطالبہ کر کے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے کہ بھائی جان گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ امی کا ندوس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور بہنوں کا چین بوسکون برباد۔“

”مسنو بد ذات عورت! اب اگر تم نے اماں کا نام لیا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے بھائی کے ڈراوے میں آکر میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

”بیجئے یہ میرا منہ حاضر ہے۔ آپ اسے توڑیں یا مسخ کر دیں۔ مگر آج میں وہ سب کے بغیر نہ رہوں گی جس نے پورے تین سال سے میری زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔“ عالیہ نے غصے میں اپنا چہرہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ جانے کیا بات تھی کہ اس نے عالیہ کی اس جرات رندانہ بر کوئی رد عمل نہیں دکھایا۔ وہی کڑے تیور لیے ہونٹ پیچھے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی شعلوں کی لہک تھی۔

”ہم نے تو اپنی اعلیٰ پوشی قائم رکھنے کے لیے اپنی ظاہری حیثیت ہی بنا رکھی تھی۔ کیونکہ ابامیاں ہماری کسبوسی میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ انہوں نے جو تھوڑا بہت اثاثہ چھوڑا تھا بس اسی کے سہارے ہم پروان چڑھتے رہے۔ امی جان نے اپنی ساری پونجی بھائی جان کی تعلیم پر لگا دی تھی۔ خدا خدا کر کے وہ اس قابل ہوئے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔“

ایک جذب اور روانی سے اپنی بات کہتے کہتے عالیہ کے گلے میں دھسک سی ہوئے لگی تو اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ مگر عم دیاس کی بدلیاں پھر پلکوں کی سرحدوں پر جمع ہونے لگی تھیں۔ ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود جنم سے چند بوندیں رخساروں پر ٹپک گئیں۔

”بھائی جان کو لائبلور کی ایک مل میں چیف اکاؤنٹنٹ کی نوکری ملی تھی۔ تنخواہ کل دس ہزار تھی۔ اور یہ اپنا خرچ رکھ کر باقی ساری تنخواہ امی کو بیچ دیتے تھے۔ اور اس طرح چھ ہزار روپے ماہوار، مہانچہ دموں کے سر آتے اور دس پاؤں جاتے تھے مگر ابھی بھائی جان کو ملازمت کرتے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ

ایک دن آپ کی والدہ اور بہن مجھے دیکھنے آئیں۔ امی اس وقت میری شادی کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہ تھیں اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ابھی میں نے عالیہ کا جینز تیار نہیں کیا اور نہ اس قابل ہوں کہ جلدی شادی کر سکوں۔ لیکن بد قسمتی سے اماں جان اور باجی کو میں اتنی پسند آئی تھی کہ انہوں نے ہمارے دروازے کی مٹی لے لی۔“

”سنو میں ایسی کوئی بکو اس سننے کا متحمل نہیں۔ اور تم خواہ اپنے بھائی کی صفائی میں کچھ ہی کہہ دو میں وہی کروں گا جو میرا فرض ہے۔“ وہ عالیہ کے بد قسمتی کہنے پر کھیل اٹھا۔

”میں بھی آپ کے ارادوں میں حائل نہیں ہوں گی۔ لیکن کم از کم مجھے بھی تو ایک بار دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دیجئے۔ اماں جان نے مجھ پر کون سا ستم نہیں توڑا۔ اپنی امانت آمیز گفتگو اور دل آزار باتوں سے میرا دل دھچک چلتی کر کے رکھ دیا۔ میرے ہر کام میں عیب نکالے، میری ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی کی۔ مجھے میری غریبی کے طعنے دئے حتیٰ کہ یہاں تک کہہ دیا کہ اب خواہ آذر اسے ڈاکٹری کو دکھائے یا نہ دکھائے میں تو اسے بچے کی بد سوری شادی کروں گی۔ لیکن کیا میں آپ کے سامنے کبھی شکایت زبان بر لالی۔ کیا میں نے کبھی اماں کے خلاف آپ کے کان بھرے کیا میں نے۔“

”یہ سب بے کار باتیں ہیں عالیہ اور انہیں جتانے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ یہ جو کچھ بھی کرنا چاہ رہا ہے اسے کرنے دو میں برے سے برے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

منظر جواب تک بالکل خاموش اور ستا ستا سا چو لیے کھڑا تھا اس نے عالیہ کی بات قطع کر کے کہا۔

”نہیں بھائی جان! آج مجھے سب کچھ کہہ لینے دیجئے ورنہ میرے اندر جلتی نامرادیوں کی آگ مجھے بھسم کر کے رکھ دے گی۔“ عالیہ یوں بولی جیسے آہوں کا کر رہی ہو۔ آڈیو دستور اپنے اسی خونخوار موڈ میں کھڑا تھا۔ اور عالیہ کو بری طرح ٹھوہر رہا تھا۔

”میں نے تو صاف صاف انکار کر دیا تھا۔ مگر اماں

جان اور باجی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ جب تک نسبت قرار نہیں پائی یہی کہتی رہیں کہ ہمیں صرف عالیہ چاہیے۔ آپ جینز و ہیز کی فکر نہ کریں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ ہم خود اپنی بیٹی کے لیے سب کچھ بنا لیں گے۔ مگر اس کے باوجود بھی امی میرا جینز جمع کرتی رہیں۔ لیکن جب نسبت قرار پائی تو اماں جان اور باجی کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی اور ہر دو سرے تیسرے دن اسی ٹوہ میں ہمارے گھر آئیں کہ امی جینز میں مجھے کون کون سی چیزیں دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ امی کو بھی احساس تھا کہ ایک متمول گھرانے میں انہوں نے بیٹی کی بات ٹھہرائی ہے اپنی حیثیت سے زیادہ انہیں بھی کرنا ہو گا کیونکہ اس وقت تک اماں جان اور باجی نے کھل کر ان سے کچھ نہ کہا تھا مگر ادھر تاریخ ٹھہرا اور ادھر اماں جان کے نت نئے مطالبات بڑھتے ہی چلے گئے اور پھر... پھر امی کو مجبور ہو کر بھائی جان کو لکھنا پڑا۔“

عالیہ نے ایک تسلسل کے ساتھ بولتے بولتے ایک زور کی سسکی لی۔ اور اتنی دیر سے رکاوٹیں اشک یکدم ہی بہ نکلا۔

”تاریخ ٹھہر گئی تھی۔ دعوت نامے جھنڈے چلے گئے تھے اور ادھر لوگوں کی انگشت نمائی کا خیال تھا۔ امی انکار ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ ویسے بھی کون سی ماں ایسی ہوگی جو اپنی بیٹی کا سکھ اور چین دکھانا نہ چاہے گی۔ مگر اماں جان کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنا امی کے بس میں نہ تھا۔ پھر بھی انہیں دنیا کی نظموں میں اپنا بھرم اور اپنی عزت تو قائم رکھنی ہی تھی اور بھائی جان کی بندہ لے بغیر وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ گو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا بیٹا اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتا کہ شادی کے اخراجات ہی ادا کر سکے۔ جینز جمع کرنا اور اماں جان کی خواہش کے مطابق جمع کرنا تو بڑی بات تھی۔ پھر بھی یہ بہن کی زندگی کا معاملہ تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے اپنی عزت داؤ پر لگا کر آفس کے اکاؤنٹ میں سے تین لاکھ روپے خرید کر کے ماں کو بھجوا دیے اور یوں اپنی عزت اور جان پر کھیل کر ساری نمانے کی خواری اپنے

سر لے لی۔ یہی تو میری بیوہ ماں اور بہنوں کا واحد سہارا تھے۔ آذر۔ اب یہ لوہیت ہے کہ میری ماں اور بہنوں کو ڈھنگ سے کھانے کو بھی نصیب نہیں۔“

عالیہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔  
 ”میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا یہ سب کیا دھرا آپ کی ماں اور بہن کا نہیں ہے۔ کیا ان کی وجہ سے ہمارے خاندان پر یہ مصیبت نہیں آئی۔ جس کے نتیجے میں آج میرا جان سے پہارا اکلوتا بھائی بے در اور بے گھر ہو کر جوڑوں کی طرح چھپا چھپا پھر رہا ہے۔ آہ امی نے جو کچھ بھی ان کے پاس بچا رکھا تھا۔ سب کچھ بیچ ڈالا۔ پھر بھی تین لاکھ کی رقم وہ کس طرح سے پوری کر سکتی تھیں۔“

عالیہ نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اشکوں کی یلغار میں بڑی بے بسی سے کہا اور وہ جو شروع ہی سے اماں کی زیادتیوں سے واقف تھا اور عالیہ کی کسی بات کی نفی کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ ساری حقیقت جان لینے کے باوجود بھی اس کا دل ذرا بھی نہ پھینچا۔

”بہر حال.... مجھے ایک چور اور عاصب شخص کی بسن کی رفاقت بالکل منظور نہیں۔ اماں واقعی بالکل ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ ہم بہت غلط جگہ پھنس گئے ہیں۔ لیکن میں کہیں پھنسنے ورنے کا قائل نہیں ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ اپنی نظرت میں ایک کراہیت سی شامل کر کے بولا۔ اور عالیہ نے بڑی بے بسی سے منظر کی طرف دیکھا۔

”لیکن اس نے تو کوئی ایسا تصور نہیں کیا آذر۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کرو۔ کیونکہ اپنی مجبوریوں کے تحت نہیں تو میں نے کیا ہے۔“ منظر نے قدرے عاجزی سے آذر کو مخاطب کر کے کہا۔

”تو کیا تم مجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا یا فرار ہونے میں مدد کروں گا۔“ اس نے ایک زہر خند سے کہا۔

”نہیں، نہیں، اب انہیں چھوڑ دیجئے آذر۔ خدا کے لیے آذر یہ رحم کر دیجئے ورنہ میری ہی نہیں میری دونوں بہنوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آخر آپ بھی تو وہ بہنوں کے بھائی ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے

اگر خدا نخواستہ بھائی جان کے بجائے آپ کو ایسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو آپ کیا کرتے؟ میرے بھائی نے تو میری خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی۔ خدا را انہیں جانے دیجئے آذر! یہ وہی رقم واپس کرنے کے ارادے سے تو جا رہے ہیں۔ ان کی زندگی بالکل توتاہ نہ کیجئے۔“

اور پھر روٹی، بلکتی عالیہ نے اس کے پیر پکڑ لیے۔ وہ کچھ دیر تو بت کی طرح ساکت سا کھڑا رہا۔ پھر اس کی گرفت سے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے بولا۔

”آہ جاؤ۔ مگر جس قدر جلد ممکن ہو سکے تمہ دونوں میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ میں اب ایک منٹ کے لیے بھی تمہ دونوں کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”آہ۔“ عالیہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے منظر کی طرف دیکھا۔ جس کے تھوڑے تھوڑے بجھے ہوئے چہرے پر بڑی تیزی سے رنگ بدل رہے تھے عالیہ بھی ایک منٹ ضائع کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے لیے یہی کیا کم تھا کہ آذر نے اس کے بھائی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ گو بھائی کے چہرے سے شرمندگی اور تأسف صاف عیاں تھا مگر اس نے اس کی ہر کیفیت کو نظر انداز کر دیا۔

”آئیے بھائی جان۔“ اس نے دوپٹے سے اچھی طرح سر ڈھانپے ہوئے پست سی آواز میں کہا اور پھر بھائی کا ہاتھ پکڑ کر خوابگاہ سے باہر نکل آئی۔

وہ اسے جاتا دیکھ کر قدم برعکس کر رہا تھا اور وہاں تھا اور جانے کتنی دیر کھڑا رہا تھا اور کیا کیا سوچتا رہا تھا کہ وقت کے گزرنے کا اسے احساس ہی نہ رہا تھا۔ البتہ عالیہ کے آخری فقرے دور سے آتی کسی آواز کی طرح اب تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

”ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں اگر خدا نخواستہ بھائی جان کے بجائے آپ کو ایسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو آپ کیا کرتے میرے بھائی نے تو میری خوشیوں کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی۔“

”آہ ڈیم اسٹ۔“ نہ معلوم اپنی کس سوچ کے تحت اس کے منہ سے نکلا۔ اور تب ہی باہر کار کا انجن بند



ہونے کی آواز آئی۔ شاید اعظم گیا تھا۔ اس نے اپنی رست و اوج میں وقت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ کچھ سوچ کر پہلے باہر جانے کے ارادے سے پارلر سے باہر نکلا مگر پھر پلٹ کر الماری کی طرف بڑھا اور اس کی بالائی دراز کھول کر اس میں سے کوئی چیز نکالی اور جیب میں ڈال کر باہر آیا۔ باہر اعظم کھڑا تھا جو اسے دیکھتے ہی بولا۔

”کمال سے بھائی جان! یعنی کہ آپ یہاں ابھی گئے اور ادھر میں آپ کو لینے آپ کے آفس پہنچا تو کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”ہوں۔ بس ذرا جلدی اٹھ گیا تھا۔ خیر لاؤ کار کی چابی کہاں ہے۔“ اس نے یوں جواب دیا جیسے اپنے ہوش میں نہ ہو۔ اعظم نے جیب سے چابی نکال کر اسے تھمائی تو فوراً ہی کار کی طرف بڑھ گیا۔

\*\_\*\_\*

”پاپا! اپنا۔ دو لہا بھائی آئے ہیں۔ عالیہ کی سب سے چھوٹی بارہ سالہ بہن نانکھ نے بڑے وحشت ناک طریقے سے زار و قطار روتی ہوئی عالیہ کا شانہ ہلا کر اطلاع دی تو عالیہ کے ہوش اڑ گئے۔ قریب بیٹھی ہوئی آنسو بہانی ہوئی بہنوں کے رنگ فق ہو گئے اور اس کی ای کو اختلاج ہونے لگا۔“

مگر منظر سکون سا بیٹھا رہا۔

”دیکھا بھائی جان! میں نے آپ سے کتنا کہا تھا کہ اس وقت کہیں اور چلے جائیے۔ مگر آپ مانے ہی نہیں۔ اور اب وہ خود آگئے۔“ عالیہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ کر منظر سے کہا۔

”ہاں خدا خیر کرے۔ نہ معلوم کس ارادے سے آیا ہے۔ بیٹے! تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی تو اس نے تمہیں دیکھا بھی نہیں۔“ عالیہ کی ای اختلاج کی وجہ سے لرزتی کانپتی آواز میں بولیں۔ اور تبھی وہ اندر آ گیا۔ حالانکہ اتنی بے تکلفی سے کبھی اندر نہیں آیا تھا۔

”نہیں! میں نے انہیں دیکھ لیا ہے۔“ اس نے کہتے ہی کہا تو منظر سمیت سب کو سائب سوکھ گیا۔ عالیہ نے دوہشت زدہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا

اور پھر گھبرا کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔  
”میں نے انہیں ہی نہیں دیکھا بلکہ اور بھی بہت کچھ دیکھ اور سمجھ لیا ہے۔“ اس کا لہجہ بہت عجیب و غریب سا تھا اور اس کے چہرے پر ایک ناقابل فہم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”بہر حال آداب عرض کرتا ہوں ای جان۔“ اس نے اپنے اسی عجیب و غریب انداز میں اس کی امی کو آداب کر کے گویا ان سب کے خشک ہوتے خون کو بالکل ہی منجمد کر کے رکھ دیا۔ عالیہ کی امی اپنی بدحواسی اور گھبراہٹ میں اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکیں۔

”آپ..... آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔“ آخر عالیہ سے نہ رہا گیا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

”مجھے پکڑوانے کی عرض سے آئے ہیں اور بھلا یہ کس لیے آسکتے ہیں۔ کیا اپنے ساتھ پولیس بھی لائے ہو یا اس کے آنے کے انتظار میں کھڑے ہو۔“ منظر نے بڑے تلخ سے لہجے میں کہا۔

”جس عرض سے بھی آیا ہوں۔ ابھی آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ وہ قدم بڑھا کر عالیہ اور منظر کے درمیان آکھڑا ہوا۔

”مگر بیٹے! تم نے کچھ تو ہمارے اور اپنے رشتے کا لحاظ کیا ہوتا۔ کیا تم یہ بھول گئے کہ ہماری بدنامی تمہاری رسوائی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔“ عالیہ کی باوقار والدہ نے بڑے گلے آمیز لہجے میں کہا۔

”یہ آپ اس سے گلے شکوے کر کے اپنی بات کیوں کر رہتی ہیں امی۔ اس کے دل میں اگر تھوڑا سا بھی خدا کا خوف ہوتا تو یہ آپ کی بے گناہ بیٹی کو اپنے گھر سے ہی کیوں نکالتا۔ بہر حال مسٹر آذر میں بھی ہر طرح سے تیار ہوں۔ آپ پورے اطمینان سے اپنے دل کے ارمان نکال سکتے ہیں۔“ منظر نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔

”مجھے اس قدر بھی شرمندہ نہ کیجئے بھائی جان۔ میں پہلے ہی آپ کی شان میں سخت گستاخی کا مرتکب ہو چکا ہوں۔“ آذر نے ایک دم ہی بڑے معذرتی لہجے میں کہا تو پھر پھر کانپتی عالیہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور

”آخر ان باتوں سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا مجھے نکال کر بھی آپ کے دل کا غبار ہلکا نہیں ہوا۔“  
 ”نہیں۔ بلکہ کچھ سوا ہی ہو گیا ہے۔ مگر یہ ندامت اور تاسف کا غبار ہے عالیہ۔“ وہ واقعی تادم سے لہجے میں بولا۔

”آخر تم ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو بیٹے۔ ہم نے تو تمہارا کچھ بگاڑا بھی نہیں۔ خدا گواہ ہے بیٹے ہم نے عالیہ کو جو کچھ بھی دیا ہے اپنی بساط سے بڑھ کر ہی دیا ہے۔ گو وہ بھی تمہارے شایاں شان نہیں مگر ہماری۔“

”فہ امی جان! ایک وقت آپ ہی ان سب کی غزروں کے مقابلے میں میری ذہال بن سکتی تھیں۔ میں آپ کی برہبار اور باوقار شخصیت سے کچھ ایسی ہی توقعات وابستہ کر کے آیا تھا۔ مگر آپ بھی مجھ پر ہٹکار کے ڈو مگرے پر سانسے لگیں مگر ایک ناہنجار بیٹے کے لیے ماں اپنی متا کا دامن اس طرح حتی تو نہیں کھلتی جیسا آپ کر رہی ہیں۔“ وہ عالیہ کی امی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتا ہوا بولا۔ اس کی گفتگو سے ایک بار پھر سب سناٹے میں آگئے۔

”عالیہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں امی جان کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہی ہے جو آپ پر معصیتوں کے پہاڑ بن کر ٹوٹا ہے۔“ اس نے مڑ کر اپنی گفتگو کو سمجھنے میں گوشاں خاموش کھڑی عالیہ پر ایک نظر ڈالی اور پھر عالیہ کی امی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”لیکن میرا بھی خدا گواہ ہے یا پھر عالیہ کہ میں ایسی لغو اور دوسروں کو معصیت میں مبتلا کر دینے والی رسموں کے خلاف تھا۔ میں نے خود بھی عالیہ کو کسی چیز کی کمی یا زیادتی کا طعنہ نہیں دیا۔ آپ خود ان سے پوچھ سکتی ہیں کہ میں نے انہی کی وجہ سے اماں کی خفگی مول لے لی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ اماں اور باجی نے آپ سے کسی کس چیز کا مطالبہ کیا ہے۔ بلکہ میں نے تو ان دونوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہ کریں۔ ورنہ میں سرے سے شادی ہی نہ کروں گا۔“

وہ گویا اپنی صفائی میں بڑی تفصیل سے بولا۔  
 ”ہاں بیٹے! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ اپنی ذات سے تو تم بہت ہی اچھے ہو۔“

اور وہ اس کی امی کی بات نظر انداز کر کے بولا۔  
 ”نکاح والے روز یہاں جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں بھی میری مرضی کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ مجھے تو آج تک معلوم ہی نہ ہو سکا کہ آخر قصہ کیا تھا۔“

”آپ کی امی نے پسانوں میں آپ کے بھائی اور بہنوئی کے لیے اسکوڑا مانگا تھا۔“ عالیہ سے چھوٹی بہن نانمہ جھٹ سے بولی تو اس کی امی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

”ہاں بیٹے اصل میں انہوں نے وقت کے وقت مانگا تھا۔ اگر پہلے سے ہتا دیتیں تو میں اسکوڑا کا بھی انتظام کر دیتی۔“

”لیکن امی جان! خالہ جان کے جھگڑا کرنے کے ڈر سے آپ نے وقت کے وقت اسکوڑے کے پیسے تو دے دیئے تھے۔“ نانمہ پھر بول اٹھی۔

”مگر جھگڑا تو مہر کی رقم پر ہوا تھا امی۔“ نانمہ سے چھوٹی بہن عالیہ بھی بولے بغیر نہ رہ سکی۔

”خیر جس وجہ سے بھی ہوا تھا۔ تم کو اس سے مطلب، تم خاموش بیٹھی رہو۔“ عالیہ کی امی نے اسے ڈانٹا تو عالیہ بولی۔

”ہاں بیٹوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے عالمہ۔“

”کمال ہے اماں نے اتنے بڑے بڑے کارنامے انجام دے لیے اور یہاں خبر تک نہ ہوئی۔“ آذر شرمندہ اور طول سے لہجے میں بولا۔

”نہیں مہر پر جھگڑا تو باجی نے کیا تھا۔ خود ہی عند الطلب دینے کا وعدہ کیا تھا اور عین نکاح کے وقت خود ہی مکر گئی تھیں۔“ عالیہ بولی۔

”خیر چھوڑو اس قصے کو۔ شرمندگی تو ایک طرف مجھے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔“

آذر اس طرح منہ ہٹا کر بولا جیسے واقعی اسے سخت تکلیف ہو۔

”اماں اور باجی کی باتوں سے آپ لوگوں نے ہی

نہیں میں نے اور عالیہ نے بھی کافی تکلیف اٹھائی ہے۔ مگر ایک فائدہ بھی ہوا ہے اور وہ یہ کہ میں خود ایک بڑی تباہی سے بچ گیا ہوں۔ ورنہ میری آنکھوں پر خود غرضی اور مادہ پرستی کی پٹی بندھی رہتی تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو نادان اور ناعاقبت اندیش لوگوں کا ہوتا ہے۔

”لیکن یہ پٹی میں نے اتاری ہے۔“ عالیہ مسکرا کر دلی زبان سے بولی۔

”ہاں اس کا سرا بھی تمہارے ہی سر ہے۔ تم نے مجھے ٹھنڈے دل سے ساری باتوں پر غور کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ تمہارے جاتے ہی تمہاری باتوں کی روشنی میں میں نے واقعی ٹھنڈے دل سے غور کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے برنخ میں کھڑا ہوں، جہاں اضطراب ہی اضطراب ہوتا ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کی دھول اڑتی رہتی ہے۔ جہاں امنگیں بھی ہوتی ہیں تو ایسی تڑپتی اور سسکتی کہ انسان کے پاس اپنی کچھلی زندگی کے اعمالوں پر لوجہ کرنے کے موا کچھ نہیں رہتا تو میں نے سوچا ابھی تو میری اگلی زندگی شروع نہیں ہوئی۔ کیوں نہ میں اپنے اعمالوں کا بوجھ ہلکا کر کے اپنی ارضی جنت پالوں اسی لیے میں آپ سب سے اپنے گناہ بخشوانے چلا آیا۔“

”ارے ارے تو بے گروہیے غنور الرحیم تو وہ ہے کیوں ہمیں گناہ گار کر رہے ہو۔“ عالیہ کی امی رقت آمیز لہجے میں بولیں۔

بڑے ہی رقت آمیز اور اثر انگیز لہجے سے وہ جنہوں نے تقریباً سب ہی کے قلوب کو بوجھل اور آنکھوں کو نم کر دیا۔ خود آذر کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے، پھر دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے تو آذر نے جیب سے کوئی چیز نکال کر منظر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب بھائی ہی کہا ہے تو اب کہیں آپ کو جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیک بک حاضر ہے۔ جس قدر رقم بور کار ہو، آپ میرا چیک کاٹ کر لے سکتے ہیں۔ وہ گیا اور نشہ وغیرہ کا معاملہ تو میں آپ کی ضمانت دے کر پولیس والوں کو کچھ کھلا پلا کر ایک دو دن میں ہی ختم

کرادوں گا۔“

مگر منظر نے نہ صرف اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے بلکہ چند قدم پیچھے بھی ہٹ گیا اور بڑی محنت سے بولا۔

”نہیں نہیں یہ کیا کہ رہے ہو، میرے لیے تمہارا یہ خلوص ہی کافی ہے۔“

”خدا کی قسم بھائی سمجھ کر رہا ہوں سالہا سمجھ کر نہیں، اگر آپ نے قبول نہ کیا تو میرا دل ٹوٹ کر رہ جائے گا۔“

آذر نے زبردستی وہ چیک بک منظر کی قمیص میں ٹھونستے ہوئے کہا اور جواب میں منظر تو کیا کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ شاید سب ہی شرمندہ اور خفیف ہو رہے تھے۔ آذر ماحول کو خوشگوار بنانے کی غرض سے وہیں فرش پر عالیہ کی امی کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

”مچلو بھئی نائتم۔ تم ذرا میرا سر کھچاؤ اور ہاں نائتم! تم میرے ہاتھ دباؤ اور تم عالمہ آذر اجددی سے مجھے نکلنا۔“

اور سب ہی اس کی بات پر ہنس دئے۔

”۳۔ یہ کھانچہ سلیمانے کی نوبت کیوں آئی۔“ عالیہ کی امی نے مسکرا کر پوچھا۔

”بس وہ ذرا اماں کے کار ناموں سے ہوش گم ہوتے جارہے ہیں۔“ اس نے بڑی برجستگی سے جس طرح گردن ڈال کر کہا بلکہ پھلکے نکتوں سے نضا میں رچی تمام کسافت دور ہو گئی۔ بچیاں نوری پر اس کے حکم کی تعمیل میں اس کے ارد گرد بیٹھی اس کی ناز برداریاں کر رہی تھیں۔ اور طمانیت کا گہرا احساس لیے بیڈ سے پشت ٹکائے اور آنکھیں بند کئے وہ سوچ رہا تھا۔ آج میں نے کھل کر بات کی ہے تو بچیاں مجھ سے کتنی اپنائیت سے پیش آرہی ہیں۔ ورنہ بے چاریاں اپنے حالات کی بوجہ سے کیسی ڈری ڈری سی رہا کرتی تھیں کہ مجھے دیکھتے ہی ادھر ادھر کونوں میں چھپ جایا کرتی تھیں۔

”آذر بیٹے! اگر تمہیں محسوس ہو رہی ہے تو آرام سے پلنگ پر لیٹ جاؤ۔“ اسے آنکھیں بند کئے بیٹھا دیکھ کر عالیہ کی امی نے بڑی دھار سے کہا۔

”۴۔ نہیں شکریہ امی جان! مجھے ان منٹھی منٹھی

بیٹھی ہو خیر چلو اٹھو۔“  
 ”لیکن امی آپ کو بغیر کھانا کھلائے جانے ہی نہیں  
 دیں گی۔ ذرا میں بھی تو جا کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہی  
 ہیں۔“

”میں کھانا تو ضرور کھاؤں گا مگر اس شرط پر کہ امی  
 جان اس سلسلے میں کوئی اہتمام نہ کریں جو کچھ بھی  
 موجود ہے بس وہی کھلاؤں۔“ اس نے جاتی ہوئی عالیہ  
 کو تاکید کی اور پھر اس کے پیچھے ہی باورچی خانے میں  
 آگیا۔ جہاں عالیہ کی امی، بہنیں اور مظفر بھی موجود  
 تھے۔ وہ بھی ان میں جا کر کھل مل گیا۔ اور اس گھر کی  
 بو جھل اور کثیف فضا میں مدتوں بعد سب کے خلوص  
 اور سچائی کے مدھ بھرے کہتوں سے زعفران زار  
 ہوتی رہیں۔

﴿﴾

اُردو اور انگریزی ادب کا بہترین انتخاب

## عمران ڈائجسٹ

اکتوبر ۱۹۷۹ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

- بہت نامراد شے ہے جنوں، سلتی ریت پر  
 آنکھیں نوڑنے والی ایک دوشیزہ کے پھپھتاوے  
 کی کہانی جس نے تصویر کا ایک ہی رخ دکھا تھا۔  
 اس سے ماہ کی خاص کہانی۔
- آدھے سفر کی پوری کہانی، کرشن چندر کی  
 آپ بیتی اسے آپ ان کی آخری تحریر بھی کہہ سکتے ہیں

۱۵، طویل و طویل تر مختصر و پُر اثر کہانیاں  
 ۳، دلچسپ و تپا سرار سلسلے وار کہانیاں  
 اور ایک عبرت اثر ناول کی مکمل تلخیص

اکتوبر ۱۹۷۹ء کا عمران ڈائجسٹ آج ہی خرید لیں

ہوں کہ باس بیٹھ کر بڑا ہی لطف آ رہا ہے۔“ اس  
 نے آنکھیں کھول کر نالہ کی ناک کھینچتے ہوئے کہا۔ تو  
 عالیہ کی ہاں خوش ہو کر اٹھتی ہوئی بولیں۔  
 ”اے بیچو! اپنے دو لہا بھائی کو کچھ کھلاؤ پٹاؤ تو سہی  
 کسی سے اتنا بھی نہ ہو آ کہ چائے کی ایک پیالی ہی دے  
 دیتا۔“

عالیہ کی امی اشارے سے مظفر کو بھی اٹھا کر اپنے  
 ہاتھ لے گئیں اور ان کے جاتے ہی پچیاں بھی اٹھ کر  
 چلی گئیں تو آڈرنے سبز بیوڑا کر اور بھوں چڑھا کر عالیہ  
 کی طرف بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بولا۔  
 ”دیکھا کس ترکیب سے تخلیقہ کرایا ہے امی جان  
 نے۔“ مگر عالیہ خاموش ہی بیٹھی رہی۔

”یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تمہاری ملتے ہی تم  
 اب قیل مچاؤ گی۔ بلکہ مرغا تکہ جانے سے دریغ نہ کرو  
 گی۔ پھر بھی تم سے میری یہ التماس ہے کہ مجھے معاف  
 کر دو۔۔۔ کرو تا یار! شرمندگی بذات خود ایک اعتراف  
 ہوتا ہے انسان کی اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا لیکن  
 ان کی بار بھی بڑی زبردست ہوتی ہے انسان۔۔۔“  
 ”آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آڈرن۔ میرا دل تو  
 اس وقت بھی آپ کی طرف سے صاف تھا جب۔۔۔  
 جب آپ کے کہنے پر میں آپ کے گھر سے نکلنے پر  
 مجبور ہو گئی تھی۔“

”لیکن پھر بھی۔“ وہ اس سے حد درجہ متاثر ہو کر  
 بولا۔

”میرا ضمیر تو مجرم ہے۔ خیر آؤ ابھی میرے ساتھ گھر  
 چلو تاکہ میں۔“ آگے اس نے جو کچھ کہا لوگوں تک  
 سرخ بڑتے چہرے کے ساتھ عالیہ قدرے گھبراہٹ کا  
 اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”چھا میرا ہاتھ تو پھوڑے ہوئی آگیا تو۔۔۔“  
 ”تو آجائے۔ یہی دیکھے گا تاکہ ایک شوہر نے اپنی  
 بیوی کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔“ وہ عالیہ کی گھبراہٹ سے  
 حکا اٹھا کر بڑی لاپرواہی سے بولا۔

”مہونہ شرم تو نہیں آئی۔“ عالیہ نے محبوب سے  
 انداز میں کہا۔

”آئے بھی کیسے جبکہ ساری شرم پر تو تم قبضہ کئے

# سورج کی ساری دنیا

ٹھہرا۔ اب تو کوریڈور کا فرش بھی خود پر ایک ہی انداز سے پڑنے والے قدموں سے بیزار ہو چکا تھا۔ مگر جس کے انتظار میں اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ وہ نہ آیا۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد اگرچہ کوریڈور میں اور اس کے سامنے پھیلے ہوئے وسیع لان میں بلب جل اٹھے تھے مگر ان کی روشنی بھی اس اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی جو اسے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تھک کر وہ وہیں کوریڈور کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی اور نگاہیں لان کے دوسری جانب ایسا وہ اپنی گیٹ پر گاڑ دیں یکبارگی دل جاہا کہ بھاگ کر وہ اس گیٹ پر چڑھ جائے اسے پھلانگ کر اس حویلی نما گھر اور اس کی پڑا سارا قید سے نجات حاصل کر لے مگر درحقیقت یہ سب بھی ایک خواب تھا۔ اصل مسئلہ گیٹ نہیں بلکہ اس کے پیروں میں پڑی آزمائش کی زنجیر تھی اس کی آنکھوں میں طغی اورد بے بسی سے آنسو آئے لیکن ابھی یہ آنسو ٹھکنے نہ پائے تھے کہ چپے سے بوا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اب اندر آ بھی جائے بورا نی۔ ابالکل اندھیرا ہو چکا ہے۔ بھلا آپ تک یوں بیٹھی رہیں گی؟ اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔  
ہاں۔ چھوٹی بی بی دیکھیے۔ آٹھ بجنے والے ہیں؟  
صغوب بھی بولی، اگر چھوٹے سرکار کو آنا ہوتا تو وہ اب تک آچکے ہوتے۔  
صغوب، تو چل بلا رہی خانے میں، بوا نے اسے حکم دیا۔

”میں نہیں جا رہی، وہ تک کر بولی“ میں تو ابھی چھوٹی بی بی کے ساتھ ڈراما دیکھوں گی؟  
”ہونہہ، ڈراما دیکھوں گی، بوا بڑ بڑاتی ہوئی چلی گئیں اور صغوب اس کے قریب آ کر فرش پر بیٹھ گئی۔“  
”چھوٹی بی بی؟ اس نے مخاطب کیا تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔“  
”آخر آپ کب تک یہاں بیٹھی رہیں گی اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا؟“  
وہ لمبی ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس مکان میں آئے ہوئے اسے چار مہینے ہو چکے تھے مگر اسے یوں لگتا تھا جیسے چار سال بیت گئے ہوں ابھی اسے پتا نہیں کہنے دن یہاں گزارنا تھے جبکہ اس پر ایک ایک بل بھاری تھا۔ مگر کسی سے وہ کیا شکوہ کرتی۔ یہ آج آزمائش یہ کڑا امتحان تو اس کا۔ اختیار کر وہ تھا۔ ایک ایسا امتحان جو آج تک کسی کے نہ دیا تھا۔

اس وقت اسے گزر سے دنوں کی یادیں۔ پچھن کے دے رہی تھیں۔ وہ دن جو اس نے شہر کی زلف میں گزارے تھے اور جن کا ہر لمحہ اس کے لیے خوشیوں اور مستیوں کا خزانہ لے کر آیا تھا ان دنوں وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی اسے خود اپنی قسمت پر رشک آئے لگا تھا وہ جو ایک لوئر مڈل کلاس کی پروردہ تھی اور جس نے خوب میں بھی ایسی خوشیوں کا تصور نہیں کیا تھا اتنی دھیروں خوشیاں پا کر یا گل ہی تو ہونے لگی تھی شہر لوہوں جیسے ٹھٹ باٹھ اور سب سے بڑھ کر شہر جیسے شخص کی رفاقت و محبت۔ اسے اچانک ہی یہ



Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint.com

HEALING  
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

سب کچھ مل گیا تھا۔ ان دنوں اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان چند روزہ خوشیوں کی قیمت اسے اب عجیب آزمائش سے گزر کر ادا کرنا ہوگی۔ اور اب جبکہ وہ اس آزمائشی دور سے گزر رہی تھی تو اسے یہ ننگ اندازہ نہیں تھا کہ یہ آزمائش کب ختم ہوگی۔

وہ بھی کیا دن تھے جب اسے کوئی فکر کوئی غم نہیں تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کی محبتوں، مال باپ کی شفقتوں کے زنج آزادی کا ایک احساس اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس وقت بھی تہمتی مہلتی اور اسے اپنی کم مائیگی کا کوئی دکھ نہیں تھا اور ایک اسے کیا اس گھر میں کسی کو بھی احساس کمتری نہیں تھا سب مطمئن تھے اس کے والد اپنی بساط کے مطابق اپنے سب بچوں کو تعلیم دلوا رہے تھے۔ محمد و آمدنی

ہونے کے باوجود وہ اپنے بیٹوں بیٹوں اور بیٹیوں کی مناسب تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھ رہے تھے۔ جب بڑا بیٹا تعلیم مکمل کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی اہلیت کی بنیاد پر ان ہی کے حکمے میں ملازم ہو گیا تو گھر کا خرچ جس میں کبھی کبھی تنگی ہو جایا کرتی تھی۔ میں بھی آسانی ہو گئی اور انہوں نے فوری اپنی بڑی بیٹی کی شادی کر دی۔ بہنوں میں دوسرا نمبر اس کا تھا۔ مگر ایک دن بڑی حیرت انگیز بات ہو گئی جن دنوں وہ بنا اسے فائل کا ایگزٹام و سے رہی تھی۔ ایک دن اچانک "نور خالہ" اس کے لیے ایک رشتہ لے کر آئیں۔

وہ ہائیں آیا۔ اہم ہوش میں تو ہو! اماں ان کی بات سن کر حیران ہی تو رہ گئیں۔

اسے میں تو ہوش میں ہوں۔ اب تم بھی ہوش میں آ جاؤ۔ اپنی نگینہ صرف نام ہی کی نگینہ نہیں ہے۔ یقین ہے بیگم افتخار اسے ضرور پسند کر لیں گی انہیں اپنے بیٹے کے لیے صرف خوبصورت اور ترقی یافتہ لڑکی چاہیے۔ ان کے نزدیک دولت کی کوئی اہمیت نہیں، نور خالہ نے تفصیل سے انہیں بتایا۔ وہ تو ٹھیک ہے آیا۔ مگر یہ اماں تذبذب میں پڑ گئیں۔

اب یہ اگر مگر چھوٹو۔ اور تیاری کرو۔ کل بیگم افتخار آ رہی ہیں نگینہ کو دیکھنے مارے میں تو ہوتی ہوں شکر کرو شکر! تمہاری بیٹی کے لیے اتنے بڑے گھر کا رشتہ آیا ہے!

ابھی آیا کہاں ہے آیا۔ اولد پھر ہم کہاں ایسے لوگوں سے میل کھاتے ہیں!

اسے میل کھانے کی بات چھوڑو۔ کبھی کبھی تو امیر امیر سے اور غریب غریب سے میل نہیں کھاتے۔ اب یہ بیگم افتخار کی بڑی بہو کو ہی دیکھ لو! وہ خالہ بان جلتے ہوئے بولیں۔ شکر کے لئے بڑے بل والے کی بیٹی تھی مگر بیگم افتخار کی نہیں تھی اس سے!

ہیں آیا۔ اہم خود ہی سوچو۔ جب اس سے بیگم کی نہیں بنی تو میری بیٹی تو سیدھی سادی ہے۔ وہ کیسے ان لوگوں میں رہے گی! اماں کا فکر سے مبرا حال تھا۔

وہ اسے۔ سیدھی سادی ہے اس لیے تو بیگم آ رہی ہیں تمہارے در پہ! خالہ نے انہیں پھر حیران کر دیا۔ بڑی بہو کی تیزی طراری نے ہی ان سے چاری کو بڑے بیٹے سے جدا کر دیا۔ اس لیے اب دوبارہ وہ بڑے گھر کی بیٹی لاکر اپنا دوسرا بیٹا نہیں گھوانا چاہتیں!

مگر تم خود سوچو آیا! ہم میں کس قدر طبقاتی فرق ہے! اماں بولیں۔

اسے اس بات کو جاننے دو بس یہ دیکھو کہ اپنی نگینہ بڑی سعادت مند ہے ان کو خوش رکھے گی تو راج کرے گی وہاں۔ بیگم دل کی بہت اچھی ہیں! خالہ نے زور دیا "اب مجھے ہی دیکھ لو۔ کیا ان کے ہم پلہ ہوں؟" مگر بیگم نے بہت عزت دیتی ہیں! وہاں یہ بات تو ہے! اماں ان کی اس دلیل سے کچھ کچھ قائل ہو گئیں تو خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

انجنا اب میں چلتی ہوں۔ تم کل لڑکی کو تیار رکھنا! اگلے دن شام پانچ بجے بیگم افتخار کی لمبی سی گاڑی ان کے گھر کے سامنے آ کر رکی بیگم افتخار بڑی تکنت سے گھر میں داخل ہوئیں۔ گھر کے کمینوں کی کم مائیگی

کو دیکھ کر انہوں نے اپنے تاثرات سے ناگواری کو ظاہر تو نہیں ہونے دیا مگر نگینہ کو دیکھ کر ان کی نگاہوں کی پسندیدگی چھپی نہ رہ سکی۔ نول لگا جیسے نگینہ انہیں پہلی بار ہی نظر میں پسند آئی ہو۔ لگے ہی لمبے انہوں نے کھلے لفظوں میں رشتے کی بات رکھ دی اور جاتے جاتے تمکنت سے کہہ گئیں۔

”ہیں آپ کی بیٹی پسند۔ آئی ہے اور یہ بات شاید نور آیا زیادہ بہتر طور پر آپ کو بتا سکتی ہیں کہ آپ کی بیٹی ہمارے یہاں کتنی خوش رہے گی“

یہ کہہ کر وہ ایک شان سے اپنی گاڑی میں بٹھ کر چلتی بنیں اور اپنے پیچھے اماں سے جاری کوسیرانے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی کر گئیں حیران کی اس بات پر کہ انہوں نے نگینہ کو پہلی نظر میں کیسے پسند کر لیا اور پریشان یوں کہ اتنا اچھا رشتہ وہ لوگ طبقاتی فرق کو دیکھ کر ٹھکرا دیا یا قبول کر لیں۔

اس رشتے کے بارے میں بھائی جان کا خیال تھا کہ فوراً مسترد کر دینا چاہیے، جبکہ دولہا بھائی اور باجی اسے قبول کر لینے کے حق میں تھے۔ بہر حال یہ بحث اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دی گئی جب تک شہیر کے بارے میں تحقیقات نہ کروالی جائیں۔ تحقیقات کے نتیجے میں کوئی قابل اعتبار بات سامنے نہیں آئی۔ شہیر ایک امیر زادہ ہی نہیں بڑھا لکھا سلجھا ہوا جوان ثابت ہوا۔ اب اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی چنانچہ اللہ کا نام لے کر ہاں کر دی اور دو بیٹے کے شہر سے عرسے میں نگینہ رخصت ہو کر خانولا میں آگئی۔ اس کی شادی کی تقریب میں شریک ہر شخص نے اس کی قسمت پر رشک کیا۔ خود اسے جب جملہ عروسی میں لایا گیا تو اسے اس سب پر یقین نہیں آ رہا تھا اور پھر جب اس نے شہیر کو دیکھا تو دنگ رہ گئی۔

پہلی مرتبہ جو اس نے شہیر کو نظروں کے لیے اٹھائیں تو بے یقینی کے عالم میں بلکیں بھکنے لگی۔ ”کیا دیکھ رہی ہیں۔ کیا کسی بات کا یقین کرنا چاہا رہی ہیں“

شہیر نے اس کے حیرے پر نظر کیا جاتے ہوئے شوخی سے کہا تو اس نے عمل ہو کر نگاہیں چھکالیں۔ ”وہ ویسے یقین تو ہمیں بھی نہیں آ رہا اپنی آنکھوں پر کہ اتنی جان نے ہمارے لیے ایسا بے خیال ہو گیا ہے جس کے رخ کی چمک ہماری آنکھوں کو حیرہ کیسے دے رہی ہے“ وہ اس کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔

”ذرا ہاتھ تو ادھر لائے تاکہ آپ کو چھو کر ہم یقین تو کر سکیں، اس نے اس کا ہاتھ تھامنے کا کو یا بہانہ کیا اور وہ یقین کرنے لگی کہ واقعی یہ سب کچھ حقیقت ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تو تھی نہیں کہ جنہوں نے اپنے ذہنوں میں آئیڈیل بنا رکھے ہوتے ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ بڑی صابر اور تابع قسم کی اگر اسے یہ سب کچھ نہ بھی ملتا اور اس کا شوہر۔ شہیر جیسا شاندار نہ بھی ہوتا۔ تب بھی وہ شکوہ کرنے والوں میں سے نہ تھی مگر اب جبکہ اسے اتنی بہت سی آسائشیں اور شہیر کی دُھیروں محبت اور توجہ ملی تو وہ حیران رہ گئی۔ اپنی قسمت کو مہربانی پر وہ اپنے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی۔ کیا وہ واقعی اتنی خوبصورت ہے کہ پہلے شہیر کی اتنی اور پھر شہیر نے اسے دل و جان سے پسند کر لیا کیونکہ اس کے علاوہ تو کوئی بھی پس پوائنٹ اس کے پاس نہیں تھا۔

شہیر تو گویا اس کا دلوانہ ہو گیا تھا! اس کی صورت کا ہی نہیں اس کی سادگی کا بھی۔ شادی کے بعد کئی دنوں تک اس کی یہ حالت رہی کہ وہ شہیر سے بھگتی رہی۔ وہ اس سے بات کرتا تو اس سے نگاہیں ہی نہیں ملاتی جاتیں۔ آخر ایک دن شہیر نے پوچھ لیا۔ ”ولیکن۔ ایک بات تم آج مجھے بتا ہی دو لا۔ کون سی بات؟“ وہ اس کے سنجیدہ لہجے سے چونکی۔

”ایسے نہیں۔ پہلے میرے پاس آ کے بیٹھو“ وہ بولا تو وہ جو الماری میں کیڑے سیٹ کر رہی تھی اس کے پاس آئی اور الجھن کے عالم میں اس نے اس کی طرف ایک نظر ڈال۔



”جی کہتے، کیا بات ہے“

”پہلے میری آنکھوں میں دیکھو“

”وہ بولا تو وہ حیران ہوئی ”جی!“ اور تیزی سے  
پلیس جھپکانے لگی۔

”بھئی میں کہہ رہا ہوں میری آنکھوں میں دیکھو“

”دیکھو تو رہی ہوں۔ اس نے صرف ایک نظر ڈالی۔

”آخر تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کیوں  
نہیں کرتیں۔ بھئی میں تمہارا شوہر نامدار ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے، وہ نہیں پڑی۔

”تو پھر کیا میری آنکھیں بہت بُری ہیں؟“

”نہیں تو۔ آپ کی آنکھیں تو بہت پیاری ہیں؟“

”پھر تم یہ میری طرف اجنبیوں کی طرح کیوں  
دیکھتی ہو؟“

”مجھ سے آپ کی آنکھوں میں دیکھا نہیں جاتا۔“

”کیوں نہیں دیکھا جاتا۔“

”مجھے نہیں معلوم، مگر آپ کی آنکھوں میں شاید

کچھ ہوتا ہے۔“

”میریں آنکھوں میں؟ مگر میری آنکھوں میں تمہاری

چاہت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔“

”ہم۔ مگر مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں آپ کے

قرب ہوتے ہوئے بھی دور ہوں، وہ بے چین ہو

کر بولی۔

”ارے! اس نے ایک قبضہ لگایا، کسی بے وقوف

لڑکی ہو تم۔ بھلا یہ کیوں نہیں محسوس ہوتا ہے۔ تم سے

پہلے مجھ سے اتنا قریب نہ تو کوئی لڑکی آئی ہے اور نہ

تمہارے بعد کوئی آئے گی۔“

”مجھے نہیں معلوم مجھے کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے۔

مگر ایک احساس ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ”وہ

کہتے کہتے رک گئی۔

”کہو نا۔ رک کیوں گئیں؟“

”کچھ نہیں! اس نے سر جھکالیا اور وہ ہلنے لگا

اور بولا۔

”میں نے سنا ہے! بہت زیادہ حسین لوگ۔ کبھی

کبھی بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔“

”جی نہیں، میں کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔“ وہ

خفا ہو کر بولی اور اٹھ کر دوبارہ الماری میں کپڑے  
درست کرنے لگی۔

یہ بات اس وقت وہیں ختم ہو گئی تھی مگر حقیقت

تنگین واقعی اس عجیب و غریب احساس سے دوچار تھی

کہ شہیرا اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس سے دور

ہے۔ وہ جب بھی شہیرے کے ساتھ ہوتی، بیگم افتخار کی

آنکھوں میں اپنے بے گنے کے لیے ایک تنبیہ ہوتی اور

اس کے لیے ایک تنہی کبھی کبھی وہ اس سے بہت

محبت کا اظہار کرتی تھیں مگر یہ برداشت نہیں کر

پاتی تھیں کہ شہیرا ان کی موجودگی میں اسے زیادہ اہمیت

دے دے حالانکہ وہ نئی تو ملی دہن تھی اور دہن بھی ایسی

کہ دیکھنے والوں بے جہاں اس کے حسن و مصومیت

کو سراہاؤ ہاں بیگم افتخار کے انتخاب کو بھی واروی۔

ایسے میں شہیرے کا اس کی جانب جھکاؤ ایک نظری بی

بات تھی مگر بیگم افتخار کی تفلروں کا تنبیہ انداز سے ایک

عجیب احساس سے دوچار کر دیتا۔ خود شہیرے بھی ماں

کے سامنے اس سے کسی حد تک لائق سارہتا مگر ان

کی غیر موجودگی میں اس کے ہر لہذا میں اس کے لیے

ایک شدت کا دالبانہ پن ہوتا۔

اس تمام عرصے میں وہ تین چار مرتبہ ہی اپنی اماں

کے گھر گئی تھی اور وہ لوگ ایک دفعہ ہی اس سے ملنے

آئے تھے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا سالوں

کا ساتھ ایک دم سے تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ان کی

رفاقوں کی یاد ایک دم سے تو نہیں بھلائی جاسکتی۔

اس کا کتنا دل چاہتا کہ وہ روز نہ ہی ہر دوسرے

بیسرے دن اپنی وہاں چلی جایا کرے یوں ہی آنے

جانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر وہ اپنی اس خواہش کو

زبان پر نہیں لاسکتی تھی اسے ان سے بہت ڈر لگتا تھا

اسے یوں لگتا کہ اگر اس نے زیادہ گھر جانے کی

بات کی تو وہ ناراض ہو جائیں گی۔ اسے ان کے غصے

سے نہیں ناراضگی سے خوف آتا تھا اور عجیب بات

یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ

بھی محسوس کرتی تھی مگر ایک دوسرا احساس بھی اسے

ہر وقت گھیرے رہتا ایک مرتبہ اس نے سنا۔

فون پر کسی سے کہہ رہی تھیں۔

میری بھوتی نہو؟ اللہ نہ کرے کہ وہ ندا جیسی ہو

اور یہ سن کر وہ لاٹوئج کے دروازے پر ہی رک گئی وہ بڑے میٹھے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔  
» اسے وہ تو بہت پیدل ہے۔ اتنی شرمیلی اور مہذب۔ بس میری دعا ہے کہ وہ مجھے باٹھنے والی ہو۔  
مجھ سے بچنے والی نہ ہو۔ ورنہ میری بیوی کی طرح یہ نکمیں بس اتنا ہی بن سکی تھی کیونکہ انہوں نے اس کے بعد زیادہ بات نہیں کی۔

زبیر دراصل شہیر کے بڑے بھائی کا نام تھا۔  
ان کے بارے میں شہیر نے اُسے صرف یہ بتایا تھا کہ وہ کچھ اختلافات کی بنا پر علیحدہ رہتے تھے۔ ندا ان کی بیوی کا نام تھا۔ خون برائی کے الفاظ سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ اختلافات ندا کے پیدا کردہ تھے مگر حقیقت سے وہ بالکل بے خبر تھی کیونکہ شہیر نے اُسے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس دن صبح ناشتے پر اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ دراصل کل رات ہی وہ اماں کے گھر دو دن گزار کر لوٹی تھی۔ رات کھانا شہیر نے وہیں کھایا تھا اور بہت انجوائے کیا تھا۔ ناشتے پر بھی شہیر اماں کے ہاتھ کے کھانوں کی تعریف کر رہا تھا۔ جبکہ بیگم افتخار خلاف معمول اسے کسی بھی قسم کی ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے کے بجائے چُپ چاپ ناشتے کی طرف توجہ تھیں پھر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ شہیر سے مخاطب ہوئیں۔

» شہیرا!

» جی ماما!

» تمہیں اپنے وہ الفاظ یاد ہیں؟ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

» کون سے الفاظ ماما! شہیر چائے کا سپ لیتے لیتے رُک گیا۔

» یہی کہ تم اپنی اماں سے زیادہ کسی ہستی کو اہمیت نہیں دو گے؟

» جی ماما! اس نے کہتے کہتے رُک کر ایک نظر

نگینہ پر ڈالی جو حیرت سے آنکھیں کھولے ان کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

» میں اپنے الفاظ پر قائم ہوں ماما!  
» تو اس کا مطلب ہے کہ تم تیار ہو کہ میں تمہارے الفاظ کی سچائی کو پرکھ لوں!

» جی ہاں۔ آپ جب چاہیں مجھے آزما سکتی ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں ماما اور آپ کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہوں!

شہیر ان کو یقین دلانے والے انداز میں کہہ رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ان کے ان الفاظ کے پیچھے کیا دکھ پوشیدہ ہے۔

» تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟» ماما نے چائے کا آخری سپ لے کر کپ فینر پر رکھا۔

» شاید تین برسے! وہ نگینہ کی طرف دیکھتے ہوئے

بولتا جس کی الجھن اب پہلے سے بڑھ گئی تھی۔

» میرا خیال ہے اتنا عرصہ انڈر اسٹیڈنگ ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے؟

» جی ماما۔ مگر آپ!

» میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی تھی بیگم افتخار نے شہیر کی بات کاٹ دی کہ تم نگینہ کو یہ بات بتا دو

کہ اسے اب کچھ دن ہمارے آباں گھر میں گزارنا ہونا چاہئے! یہ کہہ کر انہوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولیں۔

» اود یہ بھی بتا دینا کہ میں ایسا اس لیے چاہتی ہوں کہ میں اب دوبارہ اپنی لولا کی طرف سے زخم نہیں کھانا چاہتی!

یہ کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئیں نگینہ نہ سمجھنے والے انداز میں اور شہیر کسی قدر پریشانی سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ پھر شہیر نے اس کی طرف نگاہ کی اور

کہہ کر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

» نگین! تم اگر ناشا کر چکی ہو تو کمرے میں آؤ!

اود نگینہ جو اس وقت ناشا وغیرہ سب کچھ بھول چکی تھی فوراً اٹھ کر شہیر کے پیچھے چلی دی۔ اس کی بالکل

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیگم افتخار کی اس بات کا کیا مطلب ہے۔ وہ اس کے پیچھے چلتی کمرے میں داخل ہوئی تو شہیر صوفیہ پر جا بیٹھا اور اسے قریب بیٹھنے

کا ایشارا کیا۔

”نیکین! شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے تمہاری روایتی ساسوں والی ایک خاصیت بھی نہیں تھی، وہ دھیرے سے بولا تو یقین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہیلو، تمہارے اتنی محبت کرنے والی ساس ہو کر تھی تھیں کہ کوئی بھی بھائی کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ وہ بھائی کی ساس ہیں، شہیر نے بتایا۔

”تو پھر ماسا اب کیوں ویسی نہیں ہیں؟“ نیکین نے بالآخر سوال کر ڈالا۔

”وہ مجھے بھی ایسے کیوں نہیں چاہتیں جیسے بھائی کو چاہتی تھیں۔ جبکہ میں تو ان کا انتخاب ہوں آپ کا نہیں؟“ وہاں شہیر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”یہ سوال تم

نے اس لیے کیا ہے کہ تم تم کو ملنے والے اس دکھ کے بارے میں نہیں جانتیں جس کے تدوین کے طور پر ان کا رویہ تمہارے ساتھ اتنا سرد ہے؟“

”کیسا دکھ شہیر؟ کس لیے دیا ہے انہیں یہ دکھ؟“ وہ سرتا سوال تہی پوچھ رہی تھی۔

”یہ دکھ انہیں زبیر بھائی اور بھائی نے دیا ہے۔ شہیر نے کچھ دیر تو وقت کیا پھر بولا۔ ”زبیر بھائی کی

شادی سے پہلے وہ ایسی ہرگز نہ تھیں وہ تو اتنی بڑی مائٹڈ ڈیٹیلز کہ انہوں نے زبیر بھائی کی پسند پر کوئی

اعتراض نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ زندگی زبیر کو گزرنے ہے اس لیے شریک حیات بھی ان کی پسند

کی ہونا چاہیے جب زبیر بھائی نے انہیں بتایا کہ انہیں سرفراز انکل کی بیٹی ندا پسند ہے تو بھی انہوں نے کوئی

اعتراض نہیں کیا حالانکہ ندا بہت ماڈرن تھیں اور تمہا کو مومنا لڑا ماڈرن قسم کی لڑکیاں پسند نہیں آئیں،

مگر انہوں نے زبیر بھائی کی پسند کو اس لحاظ سے سراہا کہ وہ بڑھی لکھی اور خوش اخلاق تھیں چنانچہ

انہوں نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ زبیر بھائی کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔ ان دنوں تمہا کوئی خوشی تھیں۔ یقین کرو نیکین میں نے تمہا کو بہت کم مواقع پر اتنا خوش دیکھا ہے۔ شادی کے بعد بھی

تمہا، ندا بھائی اور بھائی کی خواہشات اور خوشیوں کا خیال رکھتی تھیں۔ زبیر بھائی تقریباً ایک ماہ کے لیے ہی ہونے مانے پورے گھنٹے تھے مگر وہاں سے والی بھائی نے کافی تبدیلیاں ہونے سے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے تمہا کو گھر میں اہمیت دینا بہت کم کر دی تھی بلکہ انہوں نے تمہا کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ تم خود تصور کر دو جس ماں نے اپنے بچوں کے لیے ساری زندگی محنت کی ہو۔ جوانی میں جو وہ ہو جانے کے بعد ساری عمر صرف اس لیے دوسری شادی نہ کی ہو کہ اس سے بچوں کی زندگی متاثر ہونے کا خدشہ تھا جس ماں نے باپ کی کمی ساری عمر بھری محسوس نہ ہونے دی ہو۔ آسے عمر کے اس حصے میں اگر اولاد نظر انداز کرنا شروع کر دے تو اس کے دل پہ کیا گزرے گی؟ وہ چند لمحوں کے لیے زکا پھر بولا۔

”دوسری تبدیلی ان میں یہ آئی تھی کہ انہوں نے

بزنس ایفیرز میں تمہا کے فیصلوں پر اعتراض کرنا شروع کر دیا تھا۔ پاپا کی ڈیٹھ کے بعد سے بزنس تمہا نے

سنجھالا ہوا تھا۔ زبیر بھائی نے تو اپنی شادی سے چند ماہ پہلے ہی بزنس کے معاملات میں مہا کی ہلیب

کرنا شروع کی تھی۔ جب تمہا نے زبیر بھائی کے اعتراضات سے تو انہیں شاک لگا۔ مجھے معلوم ہے وہ زبیر بھائی

کی اپنی زبان نہیں تھی۔ وہ ندا بھائی کے ڈیڈی کی زبان تھی جو وہ بول رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ

اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ زبیر بھائی نے تمہا سے پیکی وراثت میں اپنے حقے کا مطالبہ کر دیا۔ پھر

ایسا بزنس اور گھر علیحدہ کر لیا۔ میں وہ دن نہیں بھول سکتا لیکن جس دن زبیر بھائی یہاں سے جا رہے تھے۔

اس دن بھی تمہا نے اگرچہ ان کی کوئی غلطی نہیں تھی زبیر بھائی کو روکنا چاہا تھا مگر جلتے جاتے زبیر

کی ایک بات نے انہیں مزید دکھی کر دیا۔ یہ کہہ کر شہیر خاموش ہو گیا۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے شہیر؟“ ندا نے زبیر بھائی نے کیا بات کہی تھی؟“ نیکین اس کی خاموشی سے بے چین ہوا تھی۔

”انہوں نے کہا تھا، شہیر نے پھر پھر کہنا کہ

تو آپ یقیناً ایک بہترین ماں تھیں مگر جب سے آپ نڈا کی سانس بنی ہیں۔ آپ ماں نہیں رہیں اس لیے میں جا رہا ہوں۔  
 "اوہ! لیکن کے منہ سے افسوس کے عالم میں نکلا۔"

"یہ بات تو مجھے بھی اپنے دل پہ ایک تازہ مانہ لگی تھی۔ میں سوچتا ہوں تمہارے دل پہ کیا گزری ہوگی یہ سن کر۔ جبکہ انہوں نے نڈا بھائی۔ کی محبت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی، شہیرا اس وقت بہت دکھی ہو رہا تھا۔  
 "کیا نڈا بھائی نے بھی تمہارے گستاخی کی تھی؟"  
 "لیکن نے پوچھا۔  
 "نہیں۔ یہی تو بات ہے، شہیرا ایک دم بدھا ہو بیٹھا، نڈا بھائی نے کبھی خود برادر راست جھگڑا نہیں کیا۔ البتہ تمہاری محبت کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا انہوں نے۔ میری بھائی کے اتنے کان بھرے کہ وہ تمہارے اور مجھ سے بہت دور ہوئے، میرا بھائی اتنا برا نہیں تھا۔ یہ سب صرف اس ایک عورت کی وجہ سے ہوا ہے، وہ ایک لٹلے کوڑکا پھر بولا اور تم بھی ایک عورت ہو لیکن جس سے تم ڈرتی ہیں کہ وہ ان کا دوسرا بیٹا بھی نہ بچیں لے؟  
 "ہم مگر شہیرا۔ میں نڈا تو نہیں ہوں۔ مجھ میں اور ان میں تو بہت فرق ہے، وہ بے چین ہو کر بولی۔  
 "یقیناً جان شہیرا، شہیرا نے اس کا ہاتھ تھام لیا، تم میں اور نڈا میں زمین آسمان کا فرق ہے، نڈا کو بھائی نے پسند کیا تھا تمہیں تمہارے خود چنا ہے نڈا میں بناوٹ تھی تم میں سادگی سے معصومیت ہے، تو پھر۔ تو پھر ماما ایسا کیوں سوچتی ہیں۔ کیا انہیں اپنے انتخاب پر پھر و سنا نہیں؟  
 "انہیں ان کے خون نے دھوکا دے دیا تو انہیں کس پر پھر و سا ہو سکتا ہے۔ انہیں تو مجھ پر بھی پھر و سنا نہیں لیکن؟  
 "تو پھر خود کو ہم قابل پھر و سنا کیسے ثابت کریں؟  
 "لیکن ایک اضطراب کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔  
 "ہیں ایک امتحان سے گزرنا ہو گا، شہیرا نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔"

کیسا امتحان؟

یہ امتحان تو دراصل میرا ہے، ایک بیٹے کی حیثیت سے مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں واقعی اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں اور میں کسی اور کی محبت کی وجہ سے ان کی محبت کو نہیں بھلا سکتا۔ مگر میں اس آزمائش میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہوں جب تم میرا ساتھ دو؟

"میں آپ کا ساتھ دوں؟ مگر کس طرح؟" اس نے سوالیہ نگاہ اس پر ڈالی، انہیں اس دوران تھوڑی سی مشکل کا سامنا کرنا پڑے شاید۔ مگر تمہیں میری خاطر سب برداشت کرنا ہو گا، شہیرا نے آہستہ آہستہ بتایا۔  
 "کیا برداشت کرنا پڑے گا؟" وہ الجھ رہی تھی۔  
 "میرنی جدائی؟"  
 "آپ کی۔ جدائی؟"

"ہاں لیکن مجھے تم سے کچھ دن دور رہنا ہو گا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمہاری محبت تمہاری محبت پر غالب نہیں آسکتی اور یہ کہ میں اب بھی تمہاری محبت دیتا ہوں اتنی اہمیت کسی اور کی بات کو نہیں دیتا۔ تم مجھ رہی ہوتی؟"  
 "جی ہاں، اس نے زنگا ہی ٹھکالیں۔

"لیکن؟" شہیرا نے اس کا ہاتھ تڑپی سے دبایا۔  
 "کی محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ جس سے محبت کریں اس کی عزیز ترین ہستیوں کو بھی چھوڑیں؟ جو اب لیکن لے اثبات میں سر ہلایا۔  
 "تو پھر میری جان نہیں یہ ثابت کرنا ہو گا کہ تم مجھ سے ہی نہیں میری ماں سے بھی محبت کرتی ہو۔ یقین کرو اگر تم نے اس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت کر دیا تو ماما بھی تمہارے لیے اپنی چھپی ہوئی محبت کے اظہار میں دیر نہیں کریں گی، وہ بغیر رُکے کہا چلا گیا۔  
 "تم مجھ رہی ہونا لیکن؟"

"جی۔ میں مجھ رہی ہوں، وہ کہتے کہتے رُک کی اس کے ذہن میں تمہارے فون والے الفاظ گونجنے لگے، میں یہ ثابت کر دوں گی کہ میں نڈا نہیں ہوں بلکہ ان کے دکھ بانٹنے والی ہوں۔"  
 "اوہ۔ تھینک یو لیکن، شہیرا نے اس کے

دونوں ہاتھ تھام کر ان پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔ چند دنوں بعد اسے شہیر کے آبائی مکان میں پہنچا دیا گیا جو شہر سے کچھ دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا۔ اس پاس کچھ کھیت تھے۔ باغات تھے۔ قصبے میں بجلی اور ٹیلی فون کی سہولتیں بھی موجود تھیں مگر اس بڑے سے گھر میں اب اسے صرف ایک بوا اور اس کی بیٹی کے ساتھ رہنا تھا ان دونوں کے علاوہ وہاں مکان کی حفاظت کے لیے ایک جوکیدار بھی تھا جو ہر وقت گیٹ پر موجود رہتا دن میں ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا بھی بوا کی مدد کے لیے آجاتا کرتا تھا جو قصبے میں ہی رہتا تھا۔ اس مکان میں وقت گزاری کے لیے بہت سی چیزیں تھیں۔ شہیر نے اس کی پسند کی آڈیو کیسٹ اور موویز لا کر رکھ دی تھیں۔ کتابیں بھی تھیں تاکہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو وہاں جانے سے پہلے وہ اپنے والدین سے ملنے گئی تھی مگر اس نے انہیں یہ بتایا تھا کہ اسے شہیر کے خاندان کی ایک رسم کے مطابق کچھ دن ان کے آبائی مکان میں گزارنا ہیں، اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے جا رہی ہے اس نے شہیر سے لے کر وہاں کا فون نمبر بھی اپنی کو دے دیا تھا۔

جس دن شہیر اسے چھوڑنے قصبہ جا رہا تھا تو سامانے گلے لگا کر پیار کیا اور اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی مگر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ شہیر سارا راستہ اسے ہنساتا آیا تھا مگر وہ دراصل اوپر ہی دل سے ہنس رہی تھی۔ اندر سے اسے طرح طرح کے دوسو سے پریشان کر رہے تھے جنہیں وہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی گھر کے دروازے پر اسے اتارتے ہوئے شہیر نے کہا۔

”نگین میں کبھی تمہیں اس قسم کی آزمائش سے دوچار نہ کرتا اگر میرے سامنے تمہاری یہ جذباتی کیفیت نہ ہوتی۔ مگر تم بھی مجھے کم عزیز نہیں ہو۔ اس لیے اپنا خیال رکھنا۔“  
”اب آپ پھر کب آئیں گے؟“ اس نے اس

کا بازو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا۔

”بہت جلد۔ اس نے اس کا ہاتھ تھپکا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔“

وہ کافی دیر تک اس کی گاڑی پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بو جھل قدموں سے اندر آئی۔ اس کا استقبال بوا اور ان کی بیٹی نے کیا۔ بوانے تولے دیکھتے ہی بلائیں لے ڈرائیں اور صفو نے ایک عجیب انداز میں خوشی کا اظہار کیا۔

کچھ دیر تو وہ ان دونوں کی باتوں میں سب کچھ بھول گئی۔ مگر جب بوا شام کے کھانے کی تیاری کے لیے اس کے پاس سے اٹھ کر گئیں تو صفو کو بھی ساتھ لے گئیں تاکہ وہ کچھ دیر آرام کر

کے سفر کی تھکن اتارے۔ مگر اس سے آرام تو کیا ہوتا انہیں کمرے کا خالی بن اسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بوا اور صفو کو اپنے کمرے میں ساتھ ہی سونے کے لیے کہے گی ورنہ اسے تو یہ تنہائی اور خاموشی مار ڈالے گی۔

دن گزارنا تو اس کے لیے اتنا مشکل نہ ہوتا تھا کیونکہ وقتی طور پر دل بہلانے کو وہاں بہت سی چیزیں تھیں مگر رات بہت طویل اور خاموش ہوتی تھی۔ صفو اور بوا تو دن بھر کے کام کاج کے بعد تھک کر جلد سو جاتی تھیں حالانکہ اس کے کمرے میں ہی سوتی تھیں۔ مگر اسے نیند نہیں آتی تھی اور سب لوگ اسے بے طرح یاد آتے۔

اسے دن میں قصبے میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔ مگر قصبہ تھا ہی کتنا بڑا تو مین ون میں اس نے پورا قصبہ دیکھ ڈالا۔ فون گھر میں تھا بھی تو وہ کر نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ون سے تھا اس پر کال آتی سکتی تھی جانہیں سکتی تھی۔ اسے ہر وقت اماں اور شہیر کے فون کا انتظار رہتا۔ شہیر سفتہ و سفتہ میں ایک بار فون کر لیا کرتا تھا۔ جبکہ اماں کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اماں سے کہے کم از کم

وہ تو روز فون کر لیا کریں شہمیری تو مجبوری ہے مگر وہ کہہ نہ سکی کیونکہ وہ جانتی تھی اس کے اپنے گھر میں تو فون تھا نہیں اماں جب بھی فون کرتی۔ پی سی او سے ہی کرتی اور کال بھی کافی مہنگی پڑتی تھی۔

وہ عجیب طرح سے بے بس تھی۔ دوسری چیزوں سے وہ آخر کب تک دل بہلاتی شہمیر نے ایک مہینے میں صرف تین فون کیے تھے۔ ہر مرتبہ اس نے بے چین ہو کر اس کے آنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے ہنس کر بات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔ وہ فون پر مسلسل اسے ہنسنے اور اس کا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا۔ پھر ڈیڑھ مہینے کے بعد آخر کار وہ ملنے آئی۔ اسے اچانک سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے گنگ

رہ گئی۔ اس دن اتنے دنوں بعد اس نے ڈھنگ سے کپڑے پہنے سنگھار کیا۔ شہمیر اس کے لیے گہرے لایا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں لگانے۔ مگر وہ بہت جلد چلا گیا۔ وہ پھر ادا اس ہوئی اور ایک مرتبہ پھر طویل انتظار شروع ہو گیا۔

دوسری مرتبہ شہمیر نے پورے چار مہینے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا تو یہ فون بھی پورے دو مہینوں کے انتظار کے بعد آیا جس میں اس نے اپنے آنے کا بتایا تھا۔ اس کے آنے کی خبر نے ایک بار پھر اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اس نے اس دن — کتنے اہتمام کیے تھے اور سورج غروب ہونے کے بعد تک نگاہیں روزے پر ہی لگی رہی تھیں مگر وہ نہ آیا۔

وہ تنہا دنیا کے عالم میں برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی تھی۔ صفو نے بھی کہہ دیا یہ چھوٹی بلی۔ آخر آپ کب تک یوں بیٹھی رہیں گی اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا اور وہ تھک ہار کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج اس کا دل بے تحاشا رونے کو جا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ صرف ادا اس ہو جانا کرتی

تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ صرف ایک آزمائش ہے جو جلد ختم ہوگی مگر آج جب شہمیر کو اپنا وعدہ پورا کرنا یاد نہ آیا جب وہ اسے اتنے آرام سے قبول گیا۔ اس سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا تو وہ اندر سے ٹوٹنے لگی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ ماما کو نہ ہی شہمیر کو تو اس کا احساس ہے مگر آپ جب شہمیر وعدے کے مطابق نہ پہنچا۔ تو اسے یوں لگا جیسے اس نے اسے کھو دیا ہو ہمیشہ کے لیے۔ اور یہ احساس لمحہ بہ لمحہ شدید تر ہوتا گیا وہ اپنے بستر پر پڑی بے آواز روتی رہی۔

ہوائے بہت کھانگہ ہو رانی دونوں نے تو کھالیے آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ اگر احساس تھا تو صرف یہ کہ شہمیر اب اس کا نہیں

رہا۔ وہ اب کبھی اسے نہیں دیکھ سکے گی۔ نہ جانے یہ شدید احساس کیسے اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا اور وہ اسی احساس تلے آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب بے سدھ ہو گئی۔

» ماما میں آج قصبہ والے گھر سے ہو آؤں شہمیر نانتے کی ٹیبل پر ان سے پوچھ رہا تھا۔ « کیوں؟ کیا آج جانا بہت ضروری ہے؟ بیگم افتخار بولیں۔

» آپ کو تو معلوم ہے ماما کہ میں نے اس سے کل پہنچنے کا وعدہ کیا تھا مگر آپ کی ہدایت پر کوریا کے ڈیٹیکشن سے ملنا پڑا اور میں وہاں نہیں جا سکا، شہمیر نے دفاحت کی۔

» تو ٹھیک ہے۔ ایک دو دن بعد چلے جانا۔ آج بھی کچھ ضروری کام ہیں پہلے انہیں نمٹا لوں گا بیگم افتخار ڈاسٹنگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولیں اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

» مگر ماما، شہمیر بھی اٹھ کر ان کے پیچھے لکڑیہ کام تو نیتے رہیں گے۔ میرا وہاں جانا ضروری ہے کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا، «

» لیکن اتنی نازک مزاج نہیں کہ تمہاری ذرا سی

# جہاں ڈاکٹر نہ ہو

صحت کی دیکھ بھال  
اور بیماریوں کا علاج

یہ امریکہ میں چھپی ایک بہت مقبول عام فہم طبی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اس انتہائی اہم کتاب کا 506 سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور 100 سے زائد ملکوں میں استعمال ہو رہی ہے۔ اردو ترجمہ کتاب کے نئے نظر ثانی شدہ انگریزی ایڈیشن کا ہے جو 1992ء میں چھپا ہے۔

یہ کتاب تقریباً ان سب بیماریوں کا احاطہ کرتی ہے جو عام لوگوں کو اور خاص طور پر دیہات میں رہنے والوں کو متاثر کر سکتی ہیں۔ کتاب بتاتی ہے کہ وہ کون سے صحت کے مسائل ہیں جو پڑھنے والا خود حل کر سکتا ہے اور کون سے ایسے ہیں جن کے لیے ڈاکٹر اور تجربہ کار سلیجہ ورکر کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ آسان اور فہم انداز میں تصویروں کی مدد سے سمجھایا گیا ہے کہ کس طرح بہت سی عام بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے اور علاج کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ان کے لیے انتہائی مفید ہے جو طبی سہولتوں سے محروم اور طبی مراکز سے دور ہیں، ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے آپ کو اپنی، اپنے گھر والوں کی اور بستی والوں کی صحت کا خیال ہے تو یہ کتاب آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔

بڑا سائز 508 صفحات قیمت 200 روپے

ملنے کا پتہ  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ ط 37 اردو  
بازار کراچی فون 216361

دعہ خلاق سے اسے کچھ ہو جائے گا انہوں نے طنز کیا۔

مگر ماما آپ جانتی ہیں کہ وہ حاسس ہے آپ اس کے لیے اتنی سسٹل تو نہ بنیں پلیر، شہیریا، وہ غصے سے بولیں۔ کیا تم بھی میرے لیے ذہیر ثابت ہو گئے؟

”تھا۔ تھا۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں“ وہ ان کے قریب فالین پر بیٹھ گیا۔

”میں ذہیر بھائی کیسے ہو سکتا ہوں جبکہ میں نے صرف آپ کی خاطر اسے اتنا عرصہ خود سے بلا جواز دور رکھا۔ اسے کئی کئی دن تک آپ کی اجازت کے بغیر فون تک نہیں کرتا اور اس چارہینے کے طرے میں یہ دوسرا موقع ہے جب میں اس سے ملتے جا رہا ہوں تو کیا اب بھی“

”تم یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے دن رات اس کے بغیر بے کیف ہیں“ تمہاری کہتے ہوئے اسے اپنی ماں بالکل نہیں لگ رہی تھیں۔

”جی ہاں“ وہ بہت تھل سے بولا ”میرے دن رات اس کے بغیر بے کیف ہیں۔ مجھے رات کو دیر تک نیند نہیں آتی اس کے بغیر لیکن میں تو پھر بھی سکون میں ہوں میرے پاس تو پھر بھی آپ موجود ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ ساوا دن آتش کی مصروفیات ہیں مگر وہ تو بالکل تنہا ہے۔ نہ کوئی عزیز نہ دوست۔ نہ ہی کوئی مصروفیت اس کا تو فون بھی ون سے ہے مگر وہ کسی سے خود بات تک نہیں کر سکتی ساوا وقت کسی نہ کسی کے فون کی منتظر رہتی ہے۔ مگر تم اب تو اس کی یہ آزمائش ختم ہو جانا چاہیے کیا آپ کو اس کی وفاداری کا یقین نہیں آیا، شہیر کے بغیر بولنا چلا گیا۔“

”شہیریا، ہمیں افتخار کی آواز اونچی ہوگی۔“

”چلے جاؤ یہاں سے بھگے اب مزید پریشان نہ کرو۔ جاؤ۔“ انہوں نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ تو وہ اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں اس کی خوشبو ہر طرف بھری ہوئی

کو بیمار کر دیا، اسے شہیر سے سخت غصہ آرہا تھا وہ اس کی ہتھیلیاں بھی مستی جا رہی تھی اور عا میں بھی کرتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بوا کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کیا ہوا اماں۔ ڈاکٹر ملا؟“

”کہاں سے ملا۔ کم بخت اتنے چھوٹے قصوں میں مٹے کہاں ہیں۔ بس کیا ڈاکٹر بیٹھا ہوا تھا ڈاکٹر کی کرسی پر، بوا غصے میں تھیں۔“

”اب کیا ہوگا اماں۔ بی بی تو ہوش ہی میں نہیں آ رہی۔“

”تو پھر تو ہی بتا کیا کروں۔ فوراً ڈاکٹر کہاں سے لاؤں، بوا پریشانی سے بولیں۔“

”ہم چھوٹے سرکار کو فون کر دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئیں گے۔“

”اے کہاں سے کر دیں فون۔ یہ موائو نمبر ملتا ہی نہیں، بوا نے فون کو کوسا۔“

”تو اماں تم قصے کے ڈاک فون سے کر آؤ۔ کہیں دیر ہوگی تو بی بی کی حالت زیادہ نہ بگڑ جائے، صفو بولی تو بوا گھبرا کر پھر باہر کی طرف لپکیں۔“

فون کی گھنٹی بھی تو شہیر نے ریسوزاٹھا یا۔ وہ ابھی تک الجھن کے مارے آفس نہیں گیا تھا۔

”ارے بوا آپ؟ خیریت تو ہے، اس کو ایک دم پریشانی نے اگھیرا۔“

”اوہ کیا ہوا تمہیں کو، وہ بے تاب ہو کر بولا۔ عین اسی وقت بیگم امتحان لائونج میں داخل ہو رہی تھیں وہ فون کی گھنٹی سن کر آئی تھیں۔“

”تو قصے کے ڈاکٹر کو بلا یا۔ کیا ڈاکٹر بھی نہیں ہے، اس کی بے چینی بڑھ گئی۔“

”میں سچ رہا ہوں ڈاکٹر کو لے کر، اس نے عجلت میں فون رکھ دیا اور تیزی سے مڑا تو دیکھا تھا کھڑی تھیں وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔“

”نما۔ میں نے کہا تھا نا کہ وہ بہت حساس ہے اس نے میرے کل شہ پہنچنے کو کسی اور انداز میں لے لیا ہے اور اب۔“

تھی۔ وہ اپنی چیزیں جس انداز میں چھوڑ کر گئی تھی ویسی ہی پڑی تھیں۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ یہ دن اس کے لیے کتنے گھنٹے تھے۔ پچھلی ملاقات میں وقت زحمت اس کا یا سیت بھرا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

”اوہ۔ میں کیا کروں۔ اپنی کس محبت کو بچاؤں۔ کس کو ڈوب جانے دوں؟ وہ سر پکڑ کر صوفے پر گر سا گیا اس وقت اسے یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسے آفس جانا تھا۔“

”بہورانی۔ بہورانی۔ اب اٹھ بھی جائے دیکھو دس بج رہے ہیں دن کے، بوا اس کے سرانے کھڑی پکار رہی تھیں۔“

”بہورانی“ بوا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بلانا چاہا

تو وہ دوسری طرف لڑھک گئی۔ اور بوا کے توجھے تو اس ہی جواب دینے لگے۔

”ارمی صفو، اتنوں نے گھبرا کر اسے آواز دی۔ جلدی سے ادھر آ۔ دیکھ تو بہورانی کو کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے چھوٹی بی بی کو، صفو دوڑی ہوئی آئی۔“

”دیکھ تو سہی کسی سے ہوش پڑی ہیں،“

”ہائے اماں اب کیا ہوگا، صفو بھی ایک دم گھبرا گئی، چھوٹی بی بی کو نجانے کیا ہو گیا ہے، قصے میں تو کوئی بڑا ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔“

”یہی تو مجھے بھی فکر ہے، بوا بولیں۔“

”اچھا تو یوں کر ان کے متہ سے ٹھنڈے سے پانی کے چھنٹے دے۔ ان کی ہتھیلیاں تلوے مسل۔ میں قصے کے دو اخلنے سے ہو کر آئی ہوں شاید ڈاکٹر موجود ہو، وہ تیزی سے کمرے سے نکلتے ہوئے بولیں۔“

”وہ یہ سب چھوٹے سرکار کی وجہ سے ہوا ہے، صفو بڑا راز ہی تھی، کیا ہوتا جو اگر وہ وعدہ پورا کر دیتے۔ چھوٹی بی بی کتنی بے چین تھیں ان کے لیے۔ بے وفا کہیں کے، لے کر میری چھوٹی بی بی



یہ کہہ کر وہ تیزی سے لاڈلج سے نکل گیا۔ تیز ترین رفتار سے کار چلاتے ہوئے قصبہ پہنچی اور اتنی ہی تیز رفتاری سے وہ اسے کار میں ڈال کر شہر کے اسپتال لے آیا۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا وہ دنیا و مابینا سے بے خبر تھی اور شہیر کا پریشانی سے بہل بہل کر برا حال ہو چکا تھا یہ تصور ہی سوہان روح تھا کہ وہ اسے کھودے گا۔ ڈاکٹر نے اگرچہ ابھی مایوس نہیں کیا تھا مگر شام میں وہ کسی کام سے گھر آیا تھا تو اسے ممتا نظر نہیں آئیں۔ وہ ان کے کمرے کی طرف آیا تاکہ انہیں اس کی حالت کے بارے میں بتا دے تو دیکھا کہ وہ جاہ نماز پر بیٹھی دعا گو ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔

کا ہاتھ تھا سے اس پر جھی ہوتی تھیں۔ نگین۔ بیٹا دیکھو میں۔ میں تمہاری نما۔ یہ دیکھو شہیر بھی موجود ہے۔

مما۔ شہیر، نگین کے کیساتے بوں سے نکلا۔ اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور نگاہوں کے سامنے ممّا کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی، کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ اس نے جھٹ اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔

نہیں میری بیٹی یہ خواب نہیں ہے۔ شبلیاش آنکھیں کھولو، وہ بہت دلا ر سے کہہ رہی تھیں اور اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کہتی رہیں۔ کیا واقعی؟ اس نے آنکھیں کھول کر نگاہ ڈرائی تو شہیر کو ممّا کے پیچھے کھڑا ہوا پایا۔

مما، اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

میں جانتا ہوں آپ سے چاہتی ہیں وہ ذریعہ بولا۔ بین اس کی لمحے وہ دعا کر کے فارغ ہوئیں اور پلٹیں تو اسے کھڑا ہوا پایا۔ اپنے آنسو پونچتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکیں۔

اب وہ کیسی ہے؟ انہوں نے بے مینی سے پوچھا۔

دیکھو شہیر بیٹے میں نے خود اللہ سے اس کے لیے دعا کی ہے میں نہیں جانتی کہ اسے کچھ ہو؟ میں جانتا ہوں ممّا شہیر بولا۔

مگر اس کی حالت ابھی نہیں ہے اسے واقعی آپ کی اور سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے آپ پلیز اس کی امی وغیرہ کو خبر کرویں میں نے اب تک انہیں نہیں بتایا ہے وہ یہ کہہ کر مڑا تو انہوں نے روک لیا۔

مگر وہ بیٹے میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں انہوں نے جلدی سے رہنمائی اور موبائل فون اٹھایا اور اس کے ساتھ چل دیں۔

اور ہاسپٹل میں جب ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ اب وہ بالکل خطرے سے باہر ہے اور سوش میں آ رہی ہے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ نگین۔ نگین میری بیٹی آنکھیں کھولو! وہ اس

کیا واقعی میری آزمائش ختم ہو گئی ہے۔ کیا واقعی میں اس امتحان میں کامیاب ہو گئی ہوں؟ ہاں میری بیٹی۔ تم واقعی اس امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ سدا خوش رہو! انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر سیا کیا اور کمرے سے چلی گئیں یہ کہہ کر کہ میں جا کر نگین کا صدقہ نکالتی ہوں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے شہیر کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

جان شہیر میری خطا معاف کر دو! اس نے ہاتھ جوڑے دیکھو اتنے دن تمہاری جدائی برداشت کی ہے۔ اب تمہاری بے زخمی سنے کی سکت نہیں ہے مجھ میں؟ اس نے یہ بات اتنے غلطی اسٹائل سے کہی کہ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ساری نٹکیاں خود بخود ڈھل گئی تھیں اور اسے یوں لگا جیسے وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہی ہو۔



# ہوشیاری کی علامتیں

اتنے مضبوط اور اٹوٹ بندھن کے درمیان  
جھوٹ کیوں جنم لیتا ہے مبالغہ آرائی کیوں اختیار کرنی  
پڑتی ہے توجیہات کیوں دینی پڑتی ہیں عذر کیوں  
تراشنے پڑتے ہیں۔

سیدھے سادے راستے پر کیوں گامزن نہیں ہوا  
جاسکتا۔

مستل سوجھوں نے اس کے اعصاب کو شل  
کر دیا۔ طویل سفر کی تکلیف اس کے وجود پر سوار ہونے

میاں بیوی کا خوشگوار حسین تعلق دراصل اعتبار  
اعتماد یقین کی بنیادوں پر مستحکم ہوتا ہے اعتبار  
اور خلوص نہ ہو تو ہر بندھن وقت کے ساحل پر بکھر  
جائے۔

محبت رشتے کو مضبوطی بخشتی ہے، نفرت دلداریاں  
پھیلا دیتی ہے جھوٹ مبالغہ آرائی درازیں ڈال دیتا  
ہے ایک وقت ایسا آتا ہے سب جوگ کی کوئی صورت حال  
نظر نہیں آتی۔



## طویل افسانہ

لگی اپنا مضبوط بندھن عارضی سہارا محسوس ہونے لگا۔  
 رعنا حسام کا اصول تھا کہ ملو تو خلوص، پکا نکتہ بے غرضی اور دلی تعلق سے ملو، اگر نہیں تو ضروری نہیں ہے تعلق کو مشکوک بنا ڈالو، دلوں کو کدورتوں کی نذر کر کے چہرے پر مبالغہ آرائی سجالو، محبت اور شک ایک بدل میں رہی نہیں سکتے۔  
 جھوٹی محبت ہر حال میں جھوٹی ہوتی ہے کسی بھی لمحے بدترین نفرت میں بدل جاتی ہے۔  
 کیا میری محبت بھی بدترین نفرت میں بدل جائے گی؟

’کیا میں بھی حسام عارف سے شدید نفرت کا اظہار کروں گی۔‘  
 ”نہیں۔!۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔  
 ”یہ کس طرح سے ممکن ہے؟ میں۔ میں۔ میں۔ یعنی رعنا نصیح احمد جس نے حسام عارف کو ٹوٹ کر چاہا، انمول رتن سمجھ کر دل کی دستکوں میں چھپایا جو میرا حاصل زندگی ہے؟ کیا۔ کیا اس سے میں نفرت کر سکتی ہوں۔ نہیں، قطعی نہیں ناممکن۔“ اس نے گہل پر رکھے ہاتھ پر اپنی پیشانی ٹکا دی۔



READING  
Section

Scanned By Wa... PakSociety.com

”جو محبت کرتا ہے اسے ناممکنات کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔“ زہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔  
 ”محبت نہ سیکھی جاتی ہے اور نہ سکھائی جاتی ہے یہ تو وہ احساسات جذبات ہوتے ہیں جو دل کی نرم گرم زمین پر نمودار پروان چڑھتے ہیں۔“  
 اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دور افق کے پار ڈوبتے سورج کی زرد شعاعوں کو دیکھا، ہر جانب عجیب ملگجاسا اندھیرا چھانے کو تھا۔  
 ”کل سورج دوبارہ نکلے گا آج ڈوب گیا تو کیا ہوا۔ یہ اٹل حقیقت ہے اور حقیقت کا سامنا کرنا بہت دل گروے کا کام ہے یا تو تم خوف کی چادر اوڑھ کر بے سائبان ہو جاؤ۔“

یا پھر!۔  
 حسام عارف کو اپنے روج و قلب میں ڈھال لو۔“  
 اس کے دل نے جذبات میں آئے بغیر اس کے مد مقابل کھڑے ہو کر بلا کسی مشروط جذبے کا سارا لئے بغیر فیصلہ سنا دیا۔  
 ”یہ اگرچہ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں اسے تم چیلنج سمجھ کر قبول کرو، آخری ضرب کسی بھی کامیابی سے بھی ہٹکنار کر دیتی ہے اور کسی سے۔“  
 ”کہہ سکتی ہو گئی۔ اس کسی کے آگ اس نے مزید کوئی بات نہیں سنی کہ ہر حال میں اسے خود کو ثابت قدم رکھنا تھا۔ مضبوطی سے قدم اٹھاتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔“

\*...\*...\*  
 ”گویا تم شکست کھا بیٹھی ہو۔“ کنول نے بڑے یقین سے کہا۔  
 ”نہیں! اس نے مضبوطی سے تردید کر دی۔  
 ”یہ میری محبت ہے اور محبت کسی شکست نہیں کھاتی۔“  
 ”تو یقین اور وہ جو اس کے رویے اعتراضات شکایت ہیں وہ۔“ اس کے لہجے میں تحقیر اور گفتگوں میں گمان غالب تھا۔  
 ”وہ کچھ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ ایک جذباتی مرد ہے اور جذباتی مرد بہت جلدی باغی ہو جاتا

ہے اور مجھے اسے بغاوت سے باز رکھ کر تمام تر شعوری کوشش کا اختیار حاصل کر کے ایک راہ پر چلانا ہے۔“

میں نے اسے وقتی نہیں ایسی ورد آشنا چنا تھا اپنے مزاج کے تمام موسموں کا سامنی سمجھا تھا بے شک مجھے اعتراف ہے میرے انتخاب میں کہیں کوتاہی ہوئی ہے کہیں کچھ ہوا ہے مگر میں پشیمان نہیں ہوں عورت محبت ایک پار کرتی ہے اور پھر اس کے سارے زندگی گزارتی ہے میری محبت ہاتھ میں پکڑا رکھ کر نہیں ہے۔

عورت کا طرف بہت بلند ہوتا ہے اور میں عورت پر کوئی الزام نہیں آنے دیتا چاہتی جس کو پہلی میٹریں ر میں شکست کھا کر ڈھ نہیں جاؤں گی بلکہ ات الفت کے معنی سمجھاؤں گی۔“  
 اس کے لہجے میں اعتراف یقین مضبوطی مہرانی سب ہی کچھ تھا۔

”یہ صورت دیکھو!۔“ بے ساختہ سوال تھا۔  
 ”یہ محبت کا چیلنج ہے اور محبت بصورت دیکھ نہیں دیکھتی۔“ وہ فائنہ انداز میں مسکرائی۔  
 ”ہوں!۔“ کنول سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔  
 ”خدا تمہیں تمہارے مقاصد میں کامیاب کرے۔“  
 کنول نے جس دل سے کہا وہ جانتی تھی۔  
 ”واقعی تم ٹھیک کہتی ہو عورت محبت کے چیلنج میں سو دزیاں نہیں دیکھتی اور نہ ہی پار تسلیم کرتی ہے۔“ وہ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی، ”میں بھی شکست تسلیم نہیں کروں گی۔“  
 ”کہاں چلیں؟۔“

”بس اب چلوں اسی انتظار کر رہی ہوں گی۔“  
 ”تم کب تک یہاں ہو؟۔“  
 ”صبح ہی حسام چھوڑ کر گئے ہیں شام کو لے جائیں گے، وہ تو کہہ رہے تھے کہ چند دن رہ جاؤ مگر میں نے ہی منع کر دیا۔“ وہ ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔  
 ”کیوں!۔“ کنول کے چلتے قدم رک گئے۔  
 ”ہر مرد کی قسمت میں ایک عورت ہوتی ہے ہر عورت کی قسمت میں ایک مرد۔ اس مرد کو بھر پور

طہرت سے ہمارا ہی ہونا چاہیے، کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔“

”اس مرد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کی قسمت میں وہ عورتیں ہوں۔“ سوال بے ساختہ اور ذمہ معنی تھا تاہم کنول کے ہونٹوں کی نیم دائرہ مسکراہٹ سے وہ اسے شرارت ہی سمجھی۔

”میری جان وہ کشتیوں کا مسافر خسارے میں بھی تو رہتا ہے۔“ اس کے کبجے میں ٹیکھا پن تھا اور وہ کنول کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

”بےوقوف۔“ وہ اپنی معصوم دوست کی بات پر ڈیر لب مسکرائی اور اماں کی جانب آئی۔

”کبھی ہمارا معصوم دوست خود ہی ہمارا انڈیا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ آکھ بند کر کے اعتبار کرنے کی بے اعتباری بہت سے گھاؤ بھی لگا دیتی ہے۔“

\* \* \*

”بچلو۔“ آفس سے آتے ہی کھڑے کھڑے حسام نے آرڈر دے ڈالا۔

”ارے اتنی جلدی بابا تو آجائیں۔“ رعنا نے اطراف میں نظر دوڑا کر اسے دیکھا۔

”کیوں کیا صبح نہیں ملیں بابا سے؟“ اس نے کڑی نگاہ ڈالی۔

”مٹی تھی اور ان کے پوچھنے پر ہی کہا تھا آپ کی آفس سے واپسی کے بعد جاؤں گی۔“

”مجھے کچھ فالٹیں دیکھنی ہیں۔ تم بعد میں فون پر معذرت کر لیتا۔“

”پلیز حسام یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”حسام بھالی چائے۔“ نبیلہ ٹرے تھامے آئی۔

”سویری بھی آج تو بہت چائے پی ہے ٹھنڈے کی خواہش تھی۔“ اس نے معذرت کے ساتھ ساتھ اپنی خواہش بھی بتادی رعنا شرمندہ ہو گئی حالانکہ چائے اس کا پسندیدہ مشروب تھی۔

”اس بھی لائی۔“ اس نے ٹرے رکھ کر رعنا کو چائے کی آفر کی اور پلٹنے لگی۔

”تمہارا ٹھنڈا پھر کبھی سسی، مجھے جلدی گھر جانا ہے۔“

”تھی بھی جلد بازی ٹھیک نہیں، بیٹاریات کا کھانا کھا کر جانا۔“ اماں جان ادھر آگئیں انہوں نے آخری جملہ سن لیا تھا۔

”ٹھیک سے تم رہو، میں چلا جاتا ہوں تو کوری ہوگی تو سب کچھ ہوگا۔“ خاصی بے رخی سے کہتا وہ کھڑا ہو گیا، اماں جان بھی پیکا بکا رہ گئیں اس کے انداز پر، شرمندگی اور شرمندگی تھی۔

مزید سوالوں سے بچنے کے لئے وہ بیگ لے آئی۔

”جھا اماں جان ہم جارہے ہیں اگلے ویک اینڈ پر آئیں گے بابا کو سلام کہجے گا، نبیلہ میرا گلا تھملا کر دینا اور فاروق سے کہنا کہ جلدی سے مجھے وہی گفت لاکر دے۔“

بالکل نارمل لہجے میں بات کرتی مسکراتی دھیرے سے نبیلہ کے رخساروں پر پیار کرنی وہ حسام کے برابر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

شدید اضطرابی ماحول میں اندر کے غلجھان کو باہر نکلنا سراسر خسارے کا سوا ہوتا ہے لب بھینچ کر وہ تمام راستہ خاموش بیٹھی رہی۔

اس کے اور حسام کے تعلق کے درمیان یہ تو طے تھا کہ وہ گھر والوں کی انسٹلٹ نہیں ہونے دے گی آج کے اس ناروا سلوک پر اس کی احتجاجی خاموشی حق پر تھی تاہم حسام پر مطلق اثر نہ تھا۔

اور ہوتا بھی کسے آج کل وہ سنہری زلفوں اور براؤن آنکھوں والی مارگرٹ کے چکر میں چکر کر چاروں شانے حیات گریزا تھا موصوفہ گرین کارڈ کی مالک امریکا کی شہری تھیں، اچھی خاصی جائیداد بھی امریکا میں، تاج کل یہاں انجوائمنٹ گروپ کے ساتھ آئی تھیں پاکستان کی کشش یہاں بھینچ لائی تھی۔

ٹریول ایجنسی میں مشکل کا شکار ہو کر بے ساختہ ہی حسام عارف کو مدد کے لئے ریکارڈیشن حسام صاحب جی جان سے فدا ہو کر تمام تردد کے لئے تیار ہو گئے۔

”حاضر ہوں، اگرچہ میں کیمرا ڈرا سا ہوں مگر راہ میں روشنی کول گا۔“

کے مصداق اور وہ گوڈے گوڈے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

دوسرے دن مسکرا کر اس نے سب کو پسندیدگی کی سند دے دی تھی۔ پہلے دن ہی سے حسام اسے سمجھا ہوا شائستہ مولگا اور مولگی کی شائستگی و وقار اس کا آئیڈیل تھی گزرتے وقت نے اس پر مہر لگا دی تھی۔

حسام نے اسے کنول کے گھر میلاد میں دیکھا تھا قرأت کا انداز و پاکیزگی والا رویہ اتنا بھلایا کہ بے اختیار وہیں محفل میں ہی مل گیا اور کنول اس کے دوست اظہار کی بہن تھی۔ ان کے گھر قرآن خوانی تھی ساتھ ہی محفل میلاد بھی۔

کنول رعنا کی بھی دوست تھی قریب ترین دونوں کے گھر ایک ہی روز پر چند گھروں کے فاصلے پر تھے۔ اظہار اور حسام بچپن کے دوست تھے دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا کنول بچپن سے ہی حسام کو پسند کرتی تھی حسام کو بھی وہ اچھی لگتی تھی مگر صرف بچپن دوست کے بچپن میں تو لڑکے لڑکیاں ساتھ ہی کھلتے بڑھتے جوان ہوتے ہیں ان جذیوں کو محبت کا جذبہ نہیں کہا جاسکتا۔ کنول اس کو ٹوٹ کر چاہتی تھی اپنی پسند سے آگاہ بھی کر دیا تھا کچھ عرصے کے لئے حسام بھی سنجیدہ ہو گیا اپنی محبت کا یقین بھی دلا دیا۔

مگر یہ سب کچھ وقتی تھا اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا ایک جگہ پر ٹنگ نہیں سکتا تھا اس کے نزدیک زندگی کھاؤ پو موج اڑاؤ کی طرح تھی یہ ہی وجہ تھی وہ لڑکیوں کے حلقے میں مشہور تھا کالج میں لڑکیاں اس پر فدا ہو میں یونیورسٹی میں اس کی شخصیت کا گرس کچھ اور بڑھ گیا۔

اور جب مرد کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہو جائے تو وہ کچھ اور خاص طریقے اختیار کر لیتا ہے حسام کا شمار ان ہی مردوں میں ہوتا تھا۔

اس کے انداز نے نہ صرف کئی لڑکیوں کو گھائل کیا بلکہ کئی لڑکیاں اس پر مر میں بلکہ حسام صرف خاص لڑکیوں کو ہی لطف کراتا جو یک بیک ہی اس کے من کو بھاجاتیں۔

حسام اظہار کا بہت اچھا دوست تھا اظہار کو بس حسام کی اس ایک بات سے اختلاف تھا کہ وہ کیوں بلا وجہ لڑکیوں کے نازک آہنگنوں جیسے جذبات سے کھیلا

کرتا ہے کیوں ان کے دلوں کو توڑتا ہے جواب میں "ایک بلند و بانگ قہقہہ لگا کر بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔" "ہنسی تو نہیں بلاتا نہیں۔" وہ خاص ادا سے ہنک کر کہتا۔

"تو جانتا ہے کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں اس معاملے میں ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں پھر بھی۔ پھر بھی۔" اظہار کو دکھ ہوتا۔

"کیا ان کے والدین کو علم نہیں کہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں مت سمجھیں تعلیم حاصل کرنے سے آگے بند کر کے مسکراتا، کبھی کبھی اظہار کو بہت برا لگتا تھا۔

کنول کو حسام کی شادی کا شدید دکھ تھا۔ وہ تو صبر و آس کا دامن تھا اسے انتظار میں تھی یہ کیا ہوا اس کے سچے کسی اور کے لیے قبولیت کا درجہ یا گئے اس کی مانگی ہوئی دعائیں کسی اور ہتھیلی پر رقم ہوئیں۔

وہ شاک کی کیفیت میں تھی اس کی دوست اس کے دکھ سکھ کی ساتھی نے اس کے جذیوں پر شب خون مارا تھا۔ اس کے اندر کی حسد و رقابت کی آگ میں جلتی لڑکی جھٹکے سے شعلوں کی پیش سے جھلس کر اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیوں ہو گیا۔" وہ تحیر کے سمندر میں غوطہ زن تھی کہ ادھر وہ لمحہ ہو گیا اور وہ جوڑا ہنی مون کے لئے بھی پرواز کر گیا۔ رعنا تو اس کی محبت سے آگاہ تھی۔

اس نے حسام کا صرف نام ہی تو نہیں بتایا تھا صرف تعارف ہی تو نہیں کروایا تھا اسے یقین تھا کہ رعنا سمجھ گئی ہوگی مگر افسوس کنول کئی سالوں کی دوستی میں یہ ہی نہ سمجھ سکی کہ رعنا فصیح احمد کو ٹوہ لینے کی عادت نہیں ہے جتنا بتا دیا جائے اسی پر قناعت کرتی ہے اور کنول دل و جان سے رعنا سے شدید نفرت کرنے لگی تھی مگر ظاہر ہر وہ بالکل نارمل انداز میں ملتی تھی منافقت کا لہار بہت سے روپ چھپا لیتا ہے۔

رعنا شادی سے پہلے کی محبت کی قائل نہیں تھی جذیوں کو رازیاں کرنے سے کیا فائدہ جب کہ یہ طے

کوئی حساب نہیں ہوتا خسارے کا سودا دکھ 'اقت' آنسو ہی دیتا ہے۔

”بھابھی کیا پکایا ہے آج۔“

خلاف توقع تاج جلدی آگیا تھا، کوریڈور میں ہی فائزہ سے پوچھ لیا اس کے قدم لاؤنج میں ہی ٹھہر گئے۔  
”معلوم نہیں کیا پکایا ہے آج تو تمہاری بیگم کی باری تھی۔“ بھابھی کی ذمہ معنی مسکراہٹ نظروں کے سامنے گھوم گئی۔

”تو گویا آج بد مزہ کھانا کھانا بڑے گا اس سے بہتر تھا کہ میں باہر کھا لیتا۔“ اس کی ناگواری کا احساس رعنا کے رگڑے میں سرایت کر گیا۔

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے کی تو بات تھی اس سے اچھا کھانا تو کوئی پکایا نہیں سکتا تھا اور اب اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ رک گئی۔

کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں ارجمند خاتون بغور حسام کا جائزہ لے رہی تھیں اندر ہی اندر کتنے خدشات نے جنم لے لیا تھا نوٹ تو وہ کتنی ہی دونوں سے حسام کی حرکات و سکنات۔ کر رہی تھیں موقع کی تلاش میں تھیں کہ اس کو سمجھایا جاتا۔

”کیوں! ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ اچھا بھلا مزیدار کھانا تمہیں بد مزہ لگنے لگا۔“

”آب کو خود اندازہ ہونا چاہیے کبھی نمک تیز ہو جاتا ہے کبھی گرم مسالہ۔“

”اور تمہارے مزاج کی — گرمی کا کیا کردوں؟“ انہوں نے گھبراؤ کیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، کیوں بھابھی کیا میں نے غلط کہا۔“ اس نے فوراً ”فائزہ بھابھی کی جانب مدد طلب نگاہ موڑی۔

”میں کیا جانوں میاں بیوی تمہاری ہے مزہ بد مزہ تمہی جانو۔“

ارجمند خاتون کو فائزہ کی پہلو تھی کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا جانتی تھیں اس کی وجہ بھی۔

”اپنا قبلہ درست کر لو حسام، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ انہوں نے اپنی قوت برداشت کو استعمال کر کے تنبیہ کی۔

ہے کہ کوئی ایک مرد ہماری زندگی میں رقم ضرور ہو گا کیا فائدہ پھر محبتوں کی بھیک مانگنے کا اور نہ ہی اسے اس بات پر یقین تھا کہ محبت ایک نظر میں ہو جاتی ہے۔

یہ ہی وجہ تھی کہ وہ کنول کی خود ساختہ محبت سے خائف تھی، اسے سمجھاتی تھی کنول اس کی بات کو اہمیت نہ دیتی تھی۔

کنول سوچتی ”یہ ہی وجہ تھی جو رعنا سے حسام سے محبت کرنے سے روکتی تھی اندر ہی اندر دوست ہو کر جڑیں کاٹی رہی دیکھنا میں ایسا بدلہ لوں گی تمہاری جڑیں بھی ایسی کند چھری سے کاٹوں گی کہ اس کا تریاق بھی نہ ہو گا میں اپنی محبت کو حاصل کر کے رہوں گی۔“ اس کا قلعی فیصلہ تھا۔

لڑکیاں واقعی بے وقوف ہوتی ہیں اس لئے حقیقت کی آنکھ کو بند رکھتی ہیں ”کنول فارینی کو لوگوں کو پرکھنے جاننے کا کوئی تجربہ نہیں تھا رعنا کو سمجھنے میں بھی اس سے سراسر غلطی ہوئی۔

بچپن سے جوانی کے فاصلے نے بھی حسام کو سمجھنے نہ دیا آنکھ بند کر کے حسام کو پوچھتی رہی۔

درحقیقت محبت صرف شکلوں سے نہیں ہوتی عادت، اطوار، گفتار، نچر، جذبات عقل، رکھ رکھاؤ، نشست برخاست تمام چیزوں کا احاطہ کرتی ہے۔ محبت جذبات سے نہیں عقل سے ہوتی ہے۔ پہلی نگاہ میں صرف شکل اچھی لگتی ہے عقل نظر نہیں آتی دوسری نگاہ بھی چہرے پر ہی پڑتی ہے۔

محبت ہمیشہ سیرت سے کرنی چاہیے، چہرے ہمیشہ دھوکا دے جاتے ہیں۔

جیسے بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے سرورق کے ساتھ بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن انہیں خرید کر پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے اسوائے رقم اور وقت کے ضائع کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔

فرق صرف اتنا ہے اس زیاں کا کچھ عرصے بعد احساس ہوتا ہے جب وقت کا دھارا تیزی سے بہ جاتا ہے، جب کہ کتاب کے معاملے میں رد عمل فوری ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں پر حساب برابر ہوتا ہے سود زیاں کا

”میں نے کیا کیا ہے امی۔“ اس نے تحیر سے انہیں دیکھا۔

”تم جو کرنا چاہتے ہو وہ بھی میں جانتی ہوں اب میں تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں اور نہ ہی اب تم چھڑے پھانٹ ہو کہ من مانیوں کرتے پھو جو کرنا تھا تم کر کے ہو اور جو کچھ ہوا ہے تمہاری ایما پر ہوا ہے بہتر ہے کہ مجھے کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔“

پس برہانہوں نے بہت کچھ سمجھا دیا۔  
”خواتین! ناراض نہ ہوں امی میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“ وہ مزید ان کی کوئی بات سے بغیر باہر نکل گیا رونا بھی اٹھنے قدموں جانے کو تھی۔ پھر رک گئی۔

”تم بھی ہر وقت اس کی ہاں میں ہاں نہ ملایا کرو اپنی عقل کا استعمال بھی کیا کرو بچہ نہیں ہے حسام۔“  
ساس نے فائزہ کو بھی تنبیہ کی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ صفائی میں بولتی وہ باہر نکل گئیں گرا سانس لے کر رونا لٹ گئی۔

اسے تو کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اس کی ڈھال ہی بہت مضبوط تھی۔  
ڈھال جتنی بھی مضبوط ہو خود پر گرفت بھی رکھنی چاہیے اپنی قوت برداشت اور گویائی پر اسے بخوبی کنٹرول تھا۔

\*-\*-\*

”آج امی کے گھر جانا ہے۔“ بڑے دلوں بعد اس نے حسام کی کج روی کو یکسر نظر انداز کر کے کہا۔

”کیوں ابھی تو تم ہو کر آئی ہو کیا مزہ آتا ہے روز جا کر۔“ اس نے ناگواری سے اسے گھورا۔

”بھی کہاں پورے اٹھارہ دن ہو گئے ہیں کتنا کمزور مہنت ہے آپ کا ظاہر ہے سب کو میری نظر ہوتی ہے کیا میں ان کی فکر نہ کروں پھر وقاص کی سالگرہ بھی ہے آج۔“

”ٹھیک ہے چھوڑو گا رات کو پک کر لوں گا۔“  
وہ بریف کیس میں جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

”کیا آپ کا کام صرف پک اینڈ ڈراپ کا ہی رہ گیا۔“ اس نے مطمئن انداز میں پوچھا۔

”پھر کیا چاہتی ہو تم۔“ یک دم ہی ٹیکھی نظروں

سے لہجہ بدل کر بولا۔

”وہی جو ہر لڑکی چاہتی ہے وہی جو ہر داماد کا حق ہوتا ہے۔“

اس کے سخت لہجے کے جواب میں رعنا نے بالکل ہی ٹھنڈے لہجے میں قدرے مسکرا کر بات کی۔

”میرے پاس اتنا فالٹو وقت نہیں ہے رعنا بیگم کہ فضول کے جو پچھلے برداشت کرتا ہوں اطلاقاً عرض ہے کہ میں ایک مصروف بزنس میں ہوں اور یہ میرا شوق نہیں مستقبل بھی ہے۔“ اس نے وارننگ دیتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یک بات میری طرف سے بھی اطلاقاً عرض ہے ہر انسان مصروف ہوتا ہے لیکن حقوق و فرائض بھی کوئی اہمیت رکھتے ہیں جب میں آپ کے ساتھ ہر تقریب میں آپ کی فہمیلی میں جاتی ہوں تو میرا بھی تو حق بنتا ہے کہ آپ۔“

”آپ تقریر کرنے مت بیٹھ جانا کہہ دیا ہے کہ میرے پاس فضول ٹائم نہیں ہے چلنا ہے تو چلو گیٹ پر امارتوں گا۔“

وہ وارننگ دیتا کھڑا ہو گیا اس کی بات دلیل کے ساتھ ہی رد کر دی۔

کچھ لوگ ہوتے ہی اس طرح کے ہیں جہاں اہمیت دی جائے وہیں بس جاتے ہیں باقی ہر جگہ پر ٹانگ ٹوئیاں ماریں گے حسام احمد کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں جا رہی۔“ اس نے حتمی فیصلہ دے دیا۔

”سوچ لو میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس نے ڈیڑھی انداز میں دیکھا مگر وہ سنی ان سنی کر کے باہر نکل گئی۔

وہ بھی کندھے اچکا کر باہر نکل گیا راستے کا پتھر خود ہی لڑھک گیا ویسے عجیبی اسے آج ہر صورت میں مارگریٹ کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا رعنا۔“ رحمتہ خاتون نے اسے لان میں بیٹھ دیکھ کر کہا۔

”اور کیا کروں امی اب میرے پاس ان کے لئے



ہم نہیں ہے ہر بار میں اسی جاتی اچھی لگتی ہوں بھلا،  
 ہر بار گھر والوں کے سوال و جواب میں کہاں تک  
 ہمیں مطمئن کروں والدین کے سوچنے کے انداز بدل  
 کی سکتے ہیں۔

”بے شک بدل سکتے ہیں بیٹا مگر انہیں ایسا موقع ہی  
 دے۔“

”اس کا وہ ہنسنا چہرہ دیکھ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں  
 اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔“

”میں بے موقع دیتی ہوں انہیں۔“ اس کی  
 آنکھیں بھینکنے لگیں۔

”میری جان! میرا بیٹا۔“ انہوں نے شفقت و محبت  
 سے اس کا سر شانے سے لگا لیا۔

”میں بھی عورت ہوں بیٹا اور عورت ہی عورت کا  
 بہت اچھی طرح سے جان سکتی ہے بے شک میں  
 بیٹے کی ماں ہوں ایک سانس ہوں مگر سخت گیر نہیں  
 ہوں حق بات کہوں گی چاہے میرا بیٹا ہی کیوں نہ برا  
 ہو۔“ وہ دھیرے دھیرے اس کے بالوں کو سہلانے  
 لگیں۔

”یہ جو مرد ہوتے ہیں نا جب شوہر بنتے ہیں تو خود کو  
 طلاق العنان سمجھ کر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے ہیں  
 انہیں اپنے بیٹے کی عادت سے واقف ہوں اس لئے  
 تمہارا ساتھ دوں گی تمہیں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا  
 ہے اور ٹھنڈے کبجے کو اختیار کرنا ہے ہر جگہ لوہا گرم  
 دیکھ کر چوٹ لگانا صحیح نہیں ہوتا، حسام تمہارا ہے  
 تمہارا ہی رہے گا اس کی لگاموں کو مضبوطی سے تھام  
 لو پھر کتنا وہ کیسے تمہارا نہیں بنتا۔“

تمہارا حق بنتا ہے بیٹا کہ اس کو اپنے معیار کے  
 مطابق ڈھال لو جب بیوی شوہر کے معیار میں ڈھل  
 سکتی ہے تو پھر شوہر کیوں نہیں پھر یہ تو ایک بیوی کا حق  
 ہے۔“

رہنا حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی ایک ماں کا یہ  
 حکم شوہر کو اپنے معیار کے مطابق ڈھال لو جب کہ وہ  
 سانس بھی ہو، لگتی اعلا طرف عورت ہے۔

”خامیاں اور خوبیاں تو ہر ذی مدح میں ہوتی ہیں نہ  
 کوئی خوبیوں کا مرقع ہوتا ہے نہ خامیوں کا مجموعہ بات

بس حوصلے ضبط و شائستگی اور ثابت قدمی کی ہے تم  
 بہت اچھی ہو اور میں چاہتی ہوں حسام تمہارا ہی  
 رہے۔“

”ہی۔۔۔۔۔“ اس نے قدرے حیرانی سے دیکھا۔

”یہ کیسی باتیں اور کس قسم کی نصیحت ہے۔“

”تجسس تم نہیں سمجھو گی بس جو میں کہتی ہوں وہ کرو  
 حسام پر اپنی گرفت مضبوط رکھو اپنی منواؤ ہر جگہ پر  
 خاموشی کی حضوری نہیں چلتی اپنی بات منوانا ہر  
 عورت کا حائر حق ہے اور میں کہیں اس حق سے منع  
 نہیں کروں گی۔“

رہنا کے جوہ طبقہ ایک ساتھ روشن ہو گئے یہ  
 کس قسم کی نصیحت تھی کیسی حکمت عملی تھی یا  
 خدا یا۔ حقیقت میں اس کی سمجھ میں اور حند ہالو کی گہری  
 باتیں نہیں آئیں اور نہ ہی یہ حکمت عملی کا محتاط انداز  
 بلکہ وہ تو عالم تحریر میں تھی اور ار حند خاتون اٹھ کر اندر  
 بچھلی گئیں۔

رہنا کے لئے سوچوں کے بہت سے دروا ہوتے  
 چلے گئے کیا اس کے دل کے خدشات درست ہیں  
 اس کی چھٹی حس نے جو حسام کے متعلق فیصلہ دیا ہے  
 وہ ٹھیک ہے؟ اور کیا اس کو ہی کوئی قدم اٹھانا ہو گا؟  
 ”نہیں۔!“ بہت دیر تک سوچ و بچار کے بعد وہ  
 اٹھ بیٹھی۔

”نہیں۔ اپنی الحال وہ کوئی فیصلہ نہیں دے گی تیل  
 کی دھار کا رخ دکھے گی طوفان کا اندازہ کرے گی پھر  
 پھر کوئی بات کرے گی جلد بازی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوا  
 کرتی۔“ اس نے اطمینان سے سوچا۔

ہارن کی آواز پر اس نے خود اٹھ کر گیٹ کھولا  
 گاڑی کی روشنی میں حسام نے اسے دیکھا چونکا اور پھر  
 گاڑی اندر لے آیا اتنی دیر میں رہنا گیٹ بند کر چکی  
 تھی۔

حسام نے اس کے چہرے کے تناؤ سے اندازہ لگا لیا  
 کہ آج کوئی بات ضرور ہوئی ہے اور کئی دلوں سے  
 حسام کسی چور دروازے کا منتظر تھا جس سے جست لگا  
 کر وہ اپنی منزل تک پہنچ سکے  
 ”آج جو کیدار نہیں آیا؟“

”نہیں اس کی بیوی بیمار ہے اسپتال گیا ہے“  
 ”اوہ“ سٹی کے انداز میں ہونٹ سیٹھے اور  
 اندر بڑھ گیا۔

”کھانا۔“ حالانکہ پوچھنا فضول تھا، کھانے کا  
 نام گزرنے بہت دیر ہو چکی تھی۔  
 ”کوئی نہیں ہوٹل میں ڈنر تھا۔“

اس نے گھڑی دیکھی ڈیڑھ بجے ڈنر سے واپسی کا وقت  
 نہیں ہوتا اس کی نظروں نے رعنا کی نظروں کا تعاقب  
 کیا اسی سرعت سے اس کی نگاہ پلٹ آئی۔

وہ کھسان کے رن کا خطر تھا، مگر سماں پر سبک سا  
 انداز تھا۔

”جائے۔“

”نہیں گرمی بہت ہے۔“ وہ کہتا ہوا ہاتھ دم میں  
 کھس گیا رعنا اپنی جگہ پر چلی گئی۔

وہ ڈریس پیچ کر کے واپس آیا اور ٹالے بھر کو حیرت  
 میں جلا ہوا رعنا تقریباً ”سوچکی تھی وہ بھی شانے اچکا  
 کر اپنے بستر پر گر گیا۔“

آج کا دن بہت اچھا اور خوبصورت گزرا تھا  
 مارگٹ کو اس کی محبت پر اعتبار تھا اور وہ اس سے  
 شادی کر کے اسے امریکا لے جانے کے لئے تیار تھی۔

امریکا کی شہریت اس کا اولین خواب تھی اب اس کی  
 تعبیر ملنے والی تھی امریکا کی شہریت اس کی پہلی خواہش  
 تھی لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اب۔

اب جب کہ قسمت نے اسے اتنا نادر موقع فراہم کیا  
 تھا تو کیوں نہ وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا اس کے لئے کیوں نہ  
 سو زیاں کا احساس کرے ایسا حسین اتفاق دوبارہ اس

کی زندگی میں نہیں آسکتا تھا پھر وہ کیوں آنکھیں بند کر  
 کے موقع ضائع کرے۔

بے شک رعنا بہت اچھی تھی اس کی پسند تھی،  
 جسے اس نے حاصل کیا تھا اس کی ایما پر ہی تمام مراحل  
 طے ہوئے تھے لیکن اب امریکا کی محبت تمام محبتیں

بھلانے پر مجبور کر رہی تھی۔

اسے یقین تھا کہ وہ جب بھی اس بات کا ذکر کرے گا گھر  
 میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا اس لئے تمام مراحل  
 سے بخیر و خوبی گزرنے کے لئے اس نے یہ پروگرام

ترتیب دیا تھا پہلے رعنا سے گریز کی راہ اختیار کی اور پھر  
 گھر سے فرار اختیار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے  
 سوال و جواب باز پرس ہوگی جواب میں وہ ہنگامہ کھڑا  
 کر دے گا۔

اسے یقین تھا اس کے دیر سے گھر آنے پر گھر میں  
 کھانا نہ کھانے پر بات بات پر نکتہ چینی کرنے پر اس  
 کے گھر والوں سے بلاوجہ کا الجھاؤ رعنا کے صبر کو ہوا

وے گا جواب میں وہ اس پر بے صبری کا بد زبانی کا الزام  
 لگائے گا بات کو اتنا طول دے گا کہ معاملہ کسبیر  
 صورت اختیار کر جائے گا پھر فیصلہ کرنا آسان ہوگا اور

وہ ہا آسانی دوسری شادی کر کے اپنے خوابوں کی تعبیر  
 پالے گا لیکن ابھی تک رعنا کی جانب سے کوئی شدید  
 رد عمل نہ ہوا تھا۔

بندہ کتنا نا سمجھ ہے لاکھ عمل ترتیب دیتا ہے  
 پروگرام پر آخری ضرب لگاتا ہے مگر یہ بھول جاتا ہے  
 کہ آخری سرور اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے وہی اپنے بندوں

کے معاملے بہتر طور پر جانتا اور سمجھتا ہے جوڑے وہی  
 تشکیل دیتا ہے بولوں میں خیال وہی ڈالتا ہے ورنہ ہم  
 کچھ نہیں بے عمل ہے ہماری ذات وہ جو کرتا ہے

بہتر کرتا ہے۔

”اب کیا کیا جائے؟“ رعنا کا صبر و استقلال دیکھ کر  
 حسام سوچ میں پڑ گیا تھا اس کے لئے تو لکھ بھر کی  
 کمزوری بہت تھی۔ اب تو اس نے رعنا سے بات کرنا

بھی چھوڑی اللہ کی بندی نے پلٹ کر وجہ دریافت نہ  
 کی اور شاید حسام یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی پشت پر  
 مضبوط ہاتھ ہے عورت ہی عورت کا گھر بتاتی ہے

عورت ہی ہے جو دوسری عورت کا گھر اجاڑ دیتی ہے کتنا  
 فرق ہوتا ہے گن عورتوں کے درمیان۔

حسد و جلن کی ماری وہ عورت جس کا نام کنول  
 صدیقی تھا ہر حال میں رعنا کو اجاڑ کر حسام کی زندگی  
 سنوارنے کا تہیہ کئے بیٹھی تھی وہ اس کی زندگی میں

آنے والا پہلا مرد تھا، پہلی محبت پہلا عشق اور بارش  
 کا پہلا قطرہ ہی بہت طاقتور ہوتا ہے ابر نیساں کا پہلا  
 قطرہ سیپ میں بند ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ اور بیش  
 قیمت تو قیر پاتا ہے دوسری جانب بھی معاملہ اس کے

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

برعکس نہیں تھا۔

رہنا کی زندگی میں بھی حسام پہلا مروتھا، خود سے وعدے کے مطابق والدین کے اس انتخاب کو اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔

پھر کس طرح سے اسے جانے دیتی، اس کی محبت اتنی بے توہینہ تھی، کس طرح سے اپنی ذات کی تبدیل اپنے جذبوں کی انسلٹ برداشت کرتی بظاہر وہ ہستی مسکرائی نظر آئی ہر فصل میں آگے آگے چاہکتی تھی کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہوئی مگر اس کے اندر آگ تھی جو بجڑ رہی تھی۔

فی الحال اس نے خود کو خاموشی کی شاہراہ پر ثابت قدمی سے چلنے رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

اس روز بھی لان میں بظاہر میگزین دیکھتی وہ سوچوں میں گم تھی۔ ابرجد خاتون آج اپنی بڑی بیٹی راضیہ کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ فائزہ بھائی اندر اپنے بچوں میں گم تھیں ان سے تو بہت کم ہی راہ ورسم بڑھائی تھی اس نے ان کے اور اس کی بچر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حنا اس کی دیورانی جس کی شادی اس سے ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی خاصی خوش مزاج اور حاضر جواب تھی اس سے خاصی دوستی تھی، ابراہیم بھائی سے بس دعا سلام تھی۔ ابو سے دوستی تھی ابرار آتے جاتے خیریت دریافت کر لیتا تھا، دونوں ننہیں بھی اچھی تھیں۔

اگر ہم پھر اٹھائیں گے تو جواب میں اینٹ تو آئے گی ہی نا، اسی لئے سسرالی رشتوں کو بھانے کے لئے اس کا رویہ بہت محتاط تھا، اور محتاط رویے بہت دور اندیشی سے راستے منزلیں طے کرتے ہیں۔

ارادہ کرتی ہوں، باندھتی ہوں توڑ دیتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے، ”بھابھی! اپنی سوچوں میں غلطیاں وہ چونک گئی۔“

سامنے حنا کھڑی تھی۔

”نہ میگزین پر معا جا رہا ہے اور نہ کسی ڈیزائن پر ڈسکس کر رہی ہیں آپ کا مانع کیا سوچ رہا ہے۔“ وہ مسکرائی ہوئی شرارت سے ابواٹھائی اس کے سامنے

بیٹھ گئی۔

”ہیں۔ نہیں تو۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔  
”حزہ کہاں ہے؟“

”ارے ابھی تو اپنے بھائے کے ساتھ گیا ہے۔“ اس نے خاصی حیرانی سے دیکھا۔

”چھوڑو اصل فیچر اتنا زبردست تھا کہ بس کسی اور جانب دھیان نہیں گیا۔“

”فیچر اچھا تھا، کیا مسئلہ کبھی ہے۔“ وہ قدرے جھک کر رازداری سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ رعنا نے اچھٹے سے پوچھا۔

”مطلب تو آپ خود سے پوچھنے میں تو صرف کچھ بتا سکتی ہوں۔“

”مثلاً کیا؟“ اس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”مثلاً یہ کہ آج کل آپ بہت بریشن ہیں، کیا کریں کس طرح سے اس صورتحال کو فیس کریں؟“

وہ شرارت سے اس کی صورت دیکھ کر مسکرائی۔  
”ہیں سبھی نہیں! اس نے بات سمجھ کر پہلو تھی برتی۔“

”یہ آپ کا مسئلہ ہے ویسے آپ جیسی بیماری خاتون کے ساتھ گم سے کم حسام بھائی کو اس طرح نہیں کرنا چاہیے، لیکن آپ بے فکر رہیں، حسام بھائی ایک جذباتی موہ ہیں اور جذبات تو بس جڑھتی اترتی موجوں کی مانند ہوتے ہیں، دودھ کے ابال کی طرح جلد ہی گرتے اور شرجاتے ہیں، بس آپ صبر و استقلال سے منظور دیکھتی جائیں۔“

”حنا۔۔۔“ وہ منہ کھولے عالم تحریر میں تھی، حنا مسکرا دی۔

”یہ میرا خیال ہی نہیں تجربہ بھی ہے، حسام بھائی کی مثال میرے سامنے ہے، آپ تو اب ان کی زندگی میں شامل ہوئی ہیں میں تو ڈھائی سال سے انہیں دیکھ کر کھ اور جانچ رہی ہوں۔“

اس کے چہرے پر بخ مسکراہٹ تھی۔

”حنا تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھا۔

”وہی جو آپ سمجھتی ہیں اور جانتی ہیں بس تھوڑی

سی آگہی اور دے رہی ہوں میں کافی دنوں سے آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی، مگر موقع نہیں ملا گرفت مضبوط رکھنے سے بہتر ہے کہ آپ ڈھیل دے کر خاموشی سے تماشا دیکھیں جوش ہوش اڑاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں نہ جانے والی لڑکیوں کی کئی ہے اور نہ آنے والی امی نے ایسے ہی آپ کو سمجھا کر ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا اپنے بیٹے کی عادات سے وہ اچھی طرح سے واقف ہیں۔

اسے اپنا دماغ کھولتا ہوا محسوس ہوا وہ جواب پندل و دماغ کی آگہی سمجھتی تھی وہ تو ساری دنیا کی زبان پر تھی۔

یا اللہ یہ کیسا سکھ اس کی زندگی کا منظر ہے۔  
 ”حسام بھائی کا ہر فیصلہ جذباتی ہوتا ہے، آپ سے پہلے انہوں نے کتنی لڑکیوں سے ٹوٹ کر محبت کی اور ان میں سے صرف ایک لڑکی کے لئے سیریس ہوئے جانتی ہیں وہ کون تھی وہ ایک اداکارہ کی بیٹی تھی۔“  
 اس کے ہوش اڑ گئے آج کیسے کیسے انکشافات کا دن تھا۔

”پھر۔۔۔ پھر۔۔۔“ بے ساختہ ہی اس کے لب لرزے۔

”پھر یہ کہ ان کے جذبات کا رخ موڑ دیا گیا سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔“ چاروں طرف طنزیہ ہنسی بکھر گئی۔  
 ”یہ تو بس انوکھے لاڈ لے ہیں ان پر قہر دجبر کیا جائے تو طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔“

”آپ کی سی آئی ڈی کیا کہتی ہے؟“ حنانے اچانک باتوں کا رخ بدل دیا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ اس نے اپنے ماؤنٹ ہوتے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔

”آپ کو سب سمجھ میں آ رہا ہے بس یقین نہیں کر پارہیں مگر یہ حقیقت ہے اور میری نظر اتنی کمزور نہیں ہو سکتی میں آپ کو کبھی غلط بات نہیں بتاؤں گی مگر عورت کو ہر حال میں اپنا کھربچانا ہوتا ہے اس لئے وہ عروسی جوڑا نہیں پہنتی کہ دکھ کا کھنڈر بن جائے اپنے شوہر کی ہر بات کا عورت کو علم ہونا چاہیے، اس پر

گرفت مضبوط رکھو مگر ظاہر نہ کرو۔“

”جتنا تم کتنی گہری باتیں کرتی ہو۔“

”آپ بھی گہری باتیں کر سکتی ہیں، اگر حالات کو سمجھ کر جائزہ لیں، آپ نے آنکھیں بند کر کے محبت میں دھوکا کھلایا ہے آپ کی دوست کنول آپ کی جڑیں کاٹنے کے چکر میں ہے۔“

حسام احمد دو کشتیوں کے مسافر آج کل کسی انگریز لڑکی سے لاشعق لڑا رہے ہیں روز ایئر پورٹ کی حدود میں پائے جاتے ہیں میرے بھائی جان نے نہ صرف بتایا بلکہ ابرار نے مجھے خود کھلایا بھی ہے۔“

”مائی گاڈ!۔۔۔“ اسے چکر آیا کیسے کیسے انکشافات کا دن تھا آج اس کی سوچ کے دھارے تو کسی اور ہی سمت رواں تھے یہاں تو پورا منظر تو کیا ماحول ہی بدلا ہوا ہے۔

”کیسا شخص اس کی زندگی میں رقم ہوا ہے، اسے افسوس صد افسوس تھا۔“

”میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا، لیکن جو بات میرے علم میں ہے اس کو بتانا ضروری تھا ان لوگوں کے لیے حدیں لے حد ضروری ہوتی ہیں ورنہ حد سے تجاوز کر کے یہ لوگ بہت بہادر بن جاتے ہیں۔“ اس نے دھیرے سے رعنا کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ رعنا نے تشکرانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

”کنول کے بارے میں تم کیسے جانتی ہو وہ تو میری بہت پیاری دوست ہے۔“ اس نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔

”بہت پیاری؟“ حنانے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھرنے لگی۔

”یقین کریں پیارے لوگ ہی ہماری جڑیں کاٹتے ہیں یہ پیار و محبت ہی ہمیں دھوکا دیتا ہے محبت برا اعتبار بے شک اچھی چیز ہے مگر بہتر ہے آنکھوں کو کھلا رکھنا چاہیے، اگر آپ کو یقین نہیں تو میں ثبوت دینے کے لئے تیار ہوں۔“

رعنا یقینی اور بے یقینی کے درمیان اسے دیکھنے لگی کیسی عجیب سی بات تھی چاروں طرف۔ ایک عجیب سی اداسی بکھرنے لگی، ٹھنڈا سا نس لے کر وہ گر

سی گئی، حتا کسی کام سے اندر جا چکی تھی۔

”تو یہ تھی تمہاری پسندیدہ زندگی یہ تھا تمہارے  
ایڈیٹل شوہر کا تصور۔“ وہ دکھ کی انتہائی سرحدوں پر  
کھڑی تھی۔

آج سمجھ گیا تھا کہ اس کی سانس کیوں اتنی باریک بینی  
سے اسے سمجھایا کرتی ہیں یقیناً ”وہ اپنے لاڈلے کے  
تمام کروتوتوں سے آگاہ ہیں اس کے باوجود اس کی زندگی  
برہاد کی ایک جذباتی مود۔ کہ بھر میں تمام سوچیں  
سرحدیں عبور کر لیتا ہے اس کی سوچوں میں نھراؤ  
نہیں ہوتا۔“

”کنٹول۔“ ایک دم سے رعنا چونک کر سیدھی  
ہوئی گویا وہ سامنے آمو جو ہو۔

”کیا کنٹول ایسی ہو سکتی ہے کہ اپنی دوست کے گھر  
میں شب خون مارے۔“

”جیتا۔“ ایک دم سے اس نے پکارا، مگر وہ اندر  
جا چکی تھی۔

حتا کس طرح سے جانتی ہے، جب کہ کنٹول تو اس  
کی بچپن کی دوست ہے ساتھ بچپن گزرا تھا پھر پھر  
کس طرح سے جب کہ وہ تو کسی اور سے محبت کرتی  
تھی اس کی باتیں اس کے قصے سنایا کرتی تھی اور اس  
کی نام نہاد محبت کے قصے سن کر وہ ہنسا کرتی اور پھر  
سمجھایا کرتی۔

”ایک طرف محبت کوئی محبت نہیں ہوتی مزوتب ہے  
جب آگ دونوں جانب برابر کی ہو۔“

”ارے وہاں بھی آتش دیکھادیں گے فکر کس بات کی  
ہے۔“

شان بے نیازی سے پورے یقین سے کہتی تھی،  
رعنا اس کا ساتھ دیا کرتی تھیں بھی تو اس کا جھکاؤ حسام  
کی جانب نظر نہیں آیا۔

کنٹول شادی میں شریک نہ ہو سکی کیونکہ اس کی  
وادی کا انتقال ہو گیا تھا وہ ایبٹ آباد میں تھی بعد میں ملی  
تو بھر پور طریقے سے ملی۔ پھر پھر کس طرح سے۔

حتا کے لہجے میں اتنا یقین کس طرح سے ہے اور کیا  
جانتی ہے وہ۔ حتا سے ایک بار پھر تفصیل سے بات  
کرنے کی خواہش پیدا ہوئی، مسلسل سوچوں نے اس

کے اعصاب مثل کر دیئے۔

رات کا اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا فائزہ بھی لائٹ  
تکن کر کے گئیں تاہم اس کے تنہا یوں بیٹھنے کا مطلب  
نہیں پوچھا وہ خود ہی اپنے بیڈ روم میں آگئی، آج اپنی  
خواب گاہ ہی اجنبی اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی۔

حتا سے پھر سامنا نہیں ہوا، اور نہ اسی وقت پوچھ لٹی  
کیا۔ کیوں۔ کیسے اور اب اسے کیا کرنا چاہیے اس  
قسم کے سوالوں نے اسے پریشان کر دیا جانے کب وہ

سو گئی صبح آنکھ کھلی تو برابر میں حسام محو خواب تھا۔ وہ  
دھیرے سے اٹھ بیٹھی بل بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا،

کس قدر معصوم چہرہ تھا ذرا احساس نہ ہوتا تھا کہ یہ چہرہ  
اس قدر دوغلا اور مکر و فریب کا مالک چہرے ہوئے

ہے اس نے باتھ روم کا رخ کیا۔  
محبت چڑھتے سورج کی طرح روشن اور ڈھلتے چاند کی  
طرح تاریک ہوتی ہے۔

زیاں تو صرف عورت کا ہی مقدر ہوتا ہے، مرد تو ہر  
حال میں مرد کے ساتھ جیتا ہے۔

”تمہیں تمہارا نیا بھٹو مبارک ہو، مجھے  
جھوٹے برتن کی عادت نہیں ہے۔“ باہر نکل کر تو لے  
سے منہ پوچھتے ہوئے ایک دم اس نے فیصلہ دے دیا۔

ہر عورت میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ مرد کی دوہری  
شخصیت کو برداشت کرے فی الحال میں ثابت قدمی  
سے اپنی بنیادوں پر کھڑی رہوں گی۔“ اس نے بیٹھے

میں بل بناتے ہوئے بغور حسام کی جانب دیکھا۔ اور  
دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر باہر نکل گئی۔

حسام جھٹکے سے اٹھ بیٹھا، آج رعنا اسے بہت  
انوکھی سی لگی تھی۔ خاموشی گہری خاموشی۔ کسی  
طوفان کا پیش خیمہ ہی ہوتی ہے دل سے صدا ابھری۔

”ارے حسام احمد میں تمام طوفانوں سے نکرانے  
کا حوصلہ ہے۔“ وہ سر جھٹک کر مسکراتا ہوا بیڈ سے  
اترا وہ مرد ہی کیا جو نئی منزلوں کا راستہ نہ طے کرے اور  
ڈیک تن کر دیا۔

ایک روز ملوں، ہمیں شام ڈھلے  
سن تو لو میری جان  
دھڑکنوں نے چھپا رکھے ہیں جو گلے

READING  
Section

”کیا بات ہے آج کل بہت چپ چپ سی ہو۔“ اخبار دیکھتے ہوئے احمد صاحب نے یک دم۔  
 ہی رعنا کو مخاطب کیا جو بظاہر ہنس لی اور فریٹنگ لگی۔  
 ”نہیں۔ نہیں تو خبریں سن رہی تھی۔“ وہ دھم سے مسکرائی۔

”کیا حسام سے لڑائی وڑائی ہوئی ہے۔“ اس نے  
 جھک کر شرارت سے پوچھا رعنا نے حیرت سے اسیں  
 دیکھا۔

”ہوئی ہے تو تیار وہ کان کھینچوں گا۔“

”نہیں بھائی ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہنس دی۔

”پھر کیا حسام گھر لے کر نہیں جاتا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کھونٹے نہیں لے کر گیا، ہاں میں نوٹ کر رہا  
 ہوں، آج کل پر خوردار زیادہ ہی سرگرم ہیں اور اپنی  
 نصف زندگی سے غافل، خیر تم فکر مت کرو میں کان  
 کھینچتا ہوں۔“

”واقعی بھائی ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے یقین  
 دہانی کروائی۔

”چلو شاہاش اچھی سی چائے بنا کر لاؤ باقی ہمارا کام  
 ہے۔“ وہ اپنی کئی کئی بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی  
 زیادہ بولتا ہی فضول تھا۔ گرام سٹریٹ لے کر ارجمند  
 خاتون بھی اسے جاتے دیکھتی رہ گئیں کیسی کھلا کر  
 رہ گئی تھی۔

”ذرا خیال رکھا کرو ہو کا بہت نازک ہے۔“  
 انہوں نے بیوی کو حکم دیا۔

”میں کیا خیال رکھوں، آپ کے بیٹے کے کام ہی  
 ایسے ہیں، آپ ہی کی طرح دل پھینک ہے اور تو کوئی  
 نہیں یہ ہی آپ پر گیا ہے۔“ وہ جل بھن کر کوئلہ  
 ہو گئیں۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے اچھے سے سوچا۔

”اور کیا جوانی میں جو گل آپ نے کھلائے تھے ان  
 ہی پھولوں کو پر خوردار بھی جن رہے ہیں۔“ انہوں نے

جھنپلا کر منہ پھیر لیا۔ ان کے انداز پر احمد صاحب  
 مسکرا دیئے۔  
 ”کیا مثل پیش کی ہے مگر آپ سے شادی کے بعد تو

میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا خوف سے۔“  
 ”مگر آپ کے بیٹے کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے وہ  
 آپ سے رہا تھا آگے ہی نہیں چاہا تھا آگے ہے مجھے  
 خود مسز کرمالی نے بتایا ہے وہ ڈیوٹی فری شاہد رشادنگ  
 کے لئے گئی تھیں وہاں آپ کے بیٹے انٹرنش میم کو  
 شاہنگ کروا رہے تھے۔“

”کیا مطلب؟“ احمد صاحب سنجیدہ ہو گئے۔  
 ”مطلب خود ہی سمجھ لیں، مگر ساتھ ہی یہ بات بھی

سمجھا دوں بہت ہو گیا، اب اگر حسام نے ایسی کسی  
 حرکت کی تو اس کے ایسے کان کھینچوں گی کہ تیر کی طرح

سیدھا ہو جائے گا۔“ واقعی وہ حسام کی حرکتوں سے  
 دلبرداشتہ تھیں اور اب معاملہ ان کی بہو کا تھا جو عزت

دار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔  
 ”ہوں۔۔۔“ وہ گارسلہ کا سوچنے لگے۔

\*-\*-\*

حسام اب مسلسل در سے گھر آ رہا تھا اور رعنا یوں  
 بوز کر رہی تھی کہ گویا اس کو پروا ہی نہ ہو، حسام کو بہت

جلدی تھی مارگریٹ کو اس نے شادی کے لئے رضامند  
 کر لیا تھا اس کا گروپ جاچکا تھا، شمالی علاقوں کی سیر

کے لئے وہ حسام کے ساتھ جانا چاہتی تھی اور حسام کا  
 پروگرام یہ تھا کہ اس کے ساتھ جانے سے پہلے

مارگریٹ کو مسلمان کر کے نکاح کرنا ان کا ہی مومن  
 پریڈ بھی ہو جاتا واپسی میں پاسپورٹ پر امریکا کا ویزا

لگواتا، مارگریٹ کے ساتھ نکل جاتا، جاتے جاتے وہ  
 رعنا کو فارغ کر جاتا۔

حسام بہت خود پسند شخص تھا اس کی اپنی رضا اپنی  
 خوشی کے آگے سب کچھ بچ تھا۔ امریکا کی کشش نے

سو زیاں کا فرق مٹا دیا تھا ہر حال میں اسے اس سرزمین  
 کو چھوڑنا تھا مگر یہاں پر موسم بالکل سرد تھا۔

اس نے یہ کیا کہ جان بوجھ کر لڑائیاں کرنی شروع  
 کر دیں۔

”آئندہ سے میرے کپڑوں کو ہاتھ مت لگانا، یہ  
 استری کی ہے نہ گریزینی ہے نہ جیک انٹی  
 ہے۔“ اچھی خاصی ڈیگر کی ہوئی شرٹ کو اس نے  
 مسل کر پھینک دیا۔

”ٹھیک ہے میں آئندہ دھوبی سے دھلوا کر دوں گی۔“ اس نے سہل انداز میں کہا۔  
 ”رعنا بی بی اگر مجھے دھوبی سے ہی دھلوانے ہوتے تو آپ کا کیا مصروف ہے کس مقصد کی دوا ہیں آپ؟“ اس نے کہا جانے والے انداز میں دیکھا۔

”مگر آپ کو تو اپنی سوجوں سے ہی فرصت نہیں ملتی کون سے ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہیں۔“ اس نے بد مزیزی سے کہا۔ رعنا چپ ہو گئی ایک لفظ کہنا اپنی انسٹلٹ کروانا تھا اور فی الحال اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ خاموشی سے باہر نکل گئی حسام مل کھا کر رہ گیا۔  
 باہر فائن بھا بھی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی گویا تصور اس کا ہو، حنا کے چہرے پر بھرپور یقین تھا کہ چڑھتا چاند اب ڈھلنے کو ہے۔

فی الحال اسے مطلق پروا نہیں تھی پاس سے گزر کر آگے نکل گئی۔ کسی کی پروا کئے بغیر حسام کی تیز توار پر ارجحند بانو باہر نکلیں، سیدھی اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

حسام بیڈ پر حنا پر اتھا استری شدہ شرٹ اپنی چمک کھو کر ہاتھ روم کے دروازے کے پاس بڑی تھی۔  
 ”حسام! انہوں نے خود پر کنٹرول رکھا۔“  
 ”ہی آپ؟“ جھٹکے سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”یہ کیا تم نے مذاق بنا رکھا ہے اس گھر کے مردوں کی آواز تھی کبھی اتنی بلند ہوئی ہے، تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو، کبھی تم نے اپنے باپ کی بلند آواز سنی ہے تمہارے کپڑے دھوبی استری کرتا تھا مگر تم نے خود منع کیا کہ رعنا استری کرے گی پھر اب کیا قباحت ہے۔“  
 ”ہی دیکھیں یہ شرٹ استری کی ہے ذرا بھی شائینگ نہیں آئی۔“ اس نے شرٹ ان کے سامنے ڈالی۔

”اس کی چمک تمہارے مسلنے سے ماند ہوئی ہے اپنی حد میں رہو خواہ مخواہ کی لڑائی اچھی نہیں ہوتی۔“ انہوں نے اس کو مورد الزام ٹھہرایا۔

”ہی! وہ ہکا بکارہ گیا اس قسم کے جواب کی توقع نہیں تھی۔“  
 ”اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، ہر کام اس کا ٹھیک

ہے میں ہوں نا اس کا جائزہ لینے والی، تم پتاؤ تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے، کیوں راتوں کو دیر سے گھر آتے ہو ایسا کون سا مسئلہ ہے جو راتوں کے ڈھانکی تین بجے تک حل ہوتا ہے، کون سی فائلیں ہیں کہ آدمی آدمی رات تک کھلی رہتی ہیں۔“  
 آج ان کے صبر کا پیمانہ کبیرز ہو گیا تھا۔

”کس بات کی بے سکونی، بے آرامی ہے تم اب شادی شدہ شخص ہو، پہلے کے سارے پھمن چھوڑ دو ایک زندگی تمہارے ساتھ ہے کل کو گھر نہ بڑھے گا تم ابھی تک غیر سنجیدہ ہو جب کہ رعنا تمہاری پسند ہے میرا نودو جبر نہیں۔“

”ہی! حسام تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ دیں گی مگر۔“

”یہ آپ اس سے پوچھیں کہ میں گھر سے باہر کیوں رہتا ہوں وہ کون سی خیالی دنیا آباد رکھتی ہے پہلے کیوں نہیں تھا میں ایسا جب گھر والی صحیح نہیں ہوگی تو کیسے سکون رہے گا۔“

”تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے کیا تم ٹھیک ہو۔ بہت سی خبریں مل رہی ہیں تمہارے بارے میں، مگر میں یقین نہیں کر رہی کیوں کہ تم ایک شادی شدہ شخص ہو اور تم سے حماقت کی توقع نہیں، لیکن جس دن مجھے ثبوت مل گیا اسی دن میں تمہارے لئے مرحاؤں کی نکل جانا اس گھر سے تم اور اگر تمہارے باپ نے تمہارا ساتھ دیا تو مجھے ان کو چھوڑنے پر بھی اعتراض نہیں، ایسی ناہنجار اولاد سے بہتر ہے کہ میں تھی دامن ہو جاؤں اب روز روز کی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوتی۔“ انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا حسام ساکت کھڑا ہو گیا ان کا یعنی لہجہ تار ہا تھا کہ انہیں کچھ نہ کچھ سن گن مل گئی ہے۔

”سن لیا تم نے؟“ وہ جانے کے لئے پلٹ گئیں۔

”ہی!۔۔۔!“ اس نے اسی وقت بات کرنے کا فیصلہ کر لیا انہوں نے رخ موڑ کر دیکھا۔

”ہی میرا انتخاب غلط تھا میرا اس عورت کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔“



”حسام...!!“ ارجمند خاتون کے پیروں تلے  
لمن نکل گئی۔

”ہوش میں ہوتے شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل  
ہے جو مذاق بن کر رہ گئی ہے کیا برائی ہے اس میں قصور  
اس کا نہیں تمہارا ہے تم زندگی کے بارے میں سنجیدہ  
میں ہو زندگی کو غیر سنجیدگی کی نذر نہیں کیا جاسکتا  
ہے میں تمہیں کسی عیاشی کی اجازت نہیں دوں گی  
رہے تم۔ سے اور اس گھر سے ہر تعلق ختم کر لوں  
گی۔“ انہوں نے مضبوط کنبے میں کہا اور باہر نکل  
گئیں۔

”یا اللہ! بازی تو بالکل الٹ گئی تھی۔“ حسام  
دوڑے پر گر گیا۔

اس تمام قصے سے بے خبر رہتا کچن میں پالک گوشت  
لے میں مصروف تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا  
ان چیزوں سے کام کر رہا تھا۔

\*-\*-\*

”کیا بات ہے رعنا اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟“  
اس روز وہ ای کے گھر آئی تھی ابو چھوڑ کر گئے تھے کہ  
تول آئی وہ گہری خاموشی سے اس کا جائزہ لے رہی  
تھی۔

”ممتا نے جو کچھ کہا کیا وہ درست ہے تول اس کی  
دست ایسی ہو سکتی ہے۔  
”ہاں بس پچھلے دنوں قلو تھا ساتھ ہی بخار بھی  
پڑ گیا۔“

”حسام بھائی کا کیا حال ہے؟“ اس نے خود ہی ذکر  
لا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔“

”اور ان کے اندر کا جذباتی مو؟“  
بے ساختہ رعنا اچھے سے اسے دیکھنے لگی اس کے  
پہلے پر کچھ تھا جسے کوئی نام نہ دے سکی۔

”ہنوز برقرار ہے۔“

”اور تمہاری کوششیں؟“

”جی جگہ قائم۔“

”محبت کے امکان۔؟“ سوال بڑا غیر یقینی تھا  
کیا ممتا کی رائے مستند ہے۔

”میں نے کہا تھا نا محبت الفت کے معنی خود ہی  
سمجھا رہی ہے میں عورت کی عظمت پر حرف نہیں  
آنے نا چاہتی۔“

”اور جو عورت کو احترام ہی نہ دیتا چاہے۔“ اس  
نے ہتھیاریاں مسلتے ہوئے سوال کیا۔

”اسے عورت کے معنی مفہوم سیکھا نا چاہیے  
عورت صرف جذباتیت کی تسکین کا ہی ذریعہ نہیں  
ہوتی اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے حسام والدین کے بعد  
میرا انتخاب تھے اور میں اپنے انتخاب پر شرمندہ نہیں  
ہوں غلطیاں تو پھر انسانوں سے ہی ہوتی ہیں  
اور۔ اور معاف کرنے کا ظرف عورت کے حصے  
میں ہی آتا ہے۔“

(ہو سکتا ہے تمہیں معافی کے دروازے سے گزرنا  
ہی نہ پڑے۔)

”سنو تمہارے روپونل کا کیا ہوا؟“ رعنا نے بے  
ساختہ اسے روک کر گہری نگاہ ڈالی۔

”نی الحال کچھ نہیں ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ  
نہیں ہے پھر تمہارا انجام میرے سامنے ہے میں کسی  
طرح بھی دور استوں کی مسافر نہیں بن سکتی۔“

اس کے جواب پر رعنا بے ساختہ مسکرائی۔  
”میں تو دو راستوں کی مسافر ہوں ہی نہیں پھر  
ازدواجی زندگی میں تو یہ سب چلتا ہی ہے دراصل  
یکسانیت مرد کو جلد ہی پتہ چلتی ہے ماحول بدلنا  
عورت کا ہی کام ہے۔“

وہ جو بشری رحمان نے اپنے ناول میں کہا ہے۔  
”مرد ہر روز عورت کا نیا روپ دیکھنا چاہتا ہے ہر  
رات اس کے نئے بھید پانا چاہتا ہے۔“

تو بس پھر سو دریاں کس بات کا میری مانو تو ہاں  
کروں قاندہ ہی قاندہ۔“

”نہیں!!“ حنا بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

”میرے اندر تمہارے جیسا حوصلہ نہیں ہے میں  
چلتی ہوں خدا حافظ۔“

وہ کچھ اتنی سرعت سے اٹھی اور چلی گئی کہ رعنا کچھ  
کہہ بھی نہ سکی تاہم اس کے چہرے پر جو دکھ کا عجیب  
سا تاثر تھا اس نے اس کو بھی دیکھی کر دیا میرا تو اس میں

کوئی دوش نہیں ہے، یہ تو قسمت کا کھیل ہے میری سہیلی تمہارا محبوب میری قسمت کی لکیوں میں لکھا تھا، بتاؤ میں کہاں تصور دار ہوں۔ اس نے تھک کر کرسی کی پشت سے نیک لگا دی۔

نہ جانے اس رشتے کا کیا انجام ہوگا اس کے قدموں کی مضبوطی کہیں اس کے کردار کی کمزوری نہ بن جائے حسام کو ہر حال میں اس کی جانب لوٹنا ہوگا، اس کی جذباتیت کی سزا وہ خود کو نہیں دے گی۔

”آئی حسام بھائی آئیں گے لینے؟“ نیلہ اسکو اٹھنے لے کر لان میں آئی۔

”نہیں میں دسیم کے ساتھ جاؤں گی کیا وہ ٹینس کورٹ سے آیا۔“ اس نے سنبھل کر گلاس تمام لیا۔

”بس آنے والا ہے حسام بھائی نہیں آئیں گے کیا۔“

”میں نے انہیں خود ہی منع کر دیا تھا دراصل مصروفیت بہت ہے پھر روٹ بھی دو سرا ہو سہا پائیک پر آسانی سے چھوڑ دے گا۔“

”ذرا ان کے کان کھینچا کرو تم ان کی ذمہ داری ہو یہ چھوٹے چھوٹے راستے ہی تو مضبوط خوشیوں کا سا تباہ بناتے ہیں میں تو کبھی بھی اسامہ کو اجازت نہیں دوں گی کہ میں کسی اور کے ساتھ میکے جاؤں جب ذمہ داری اٹھائی ہے تو بھلاؤ بھی۔“

”یار مصلحت بھی کوئی چیز ہوتی ہے اگر میں انتظار کرنے لگوں تو بس پھر سال میں ایک بار ہی تم میری شکل دیکھ سکو گی۔“

”چھا چھوڑو یہ تمہارا مسئلہ ہے ہنول اتنی جلدی کیوں چلی گئی۔“

”کوئی کام تھا؟“

”چھا اسے تو تمہارا بہت انتظار تھا، ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔“

”چھا۔“ اس نے حیرت سے دیکھا۔

”تمہاری شادی کے بعد بہت چپ چپ سی ہو گئی ہے۔ شرارتی تو رہی نہیں آئی اتنی پریشان ہیں کہ یہ کسی رشتے کے لئے ہاں نہیں بھرتی۔ بہت گھری

دوست ہے وہ تمہاری۔“

”ہوں۔!۔“ وہ سوچوں کے دریا عبور کرنے لگی تب ہی باہر پائیک رکنے کی آواز آئی۔

”وسیم آیا ہے شاید۔“

”ہوں۔۔۔“

”چلو پھا کے پاس جا کر بیٹھے ہیں تمہوڑی دیر۔“

کھڑی ہو گئی نیلہ، رے اٹھا کر اس کے پیچھے ہوئی۔

\*\*\*

ای کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا، ایک طرف ماں بھی اور دوسری جانب خواہوں کی تکمیل، کسی صورت وہ یہ نادر موقع کھوٹا نہیں چاہتا تھا، اور مارگریٹ بالکل تیار تھی۔ ہنڈہ کی داویاں دیکھنے کے لئے پھر ساتھ بھی اتنا خوبصورت ڈشنگ سے شہما سے ہی ایشیائی مرد پسند تھے عجیب سی کشش ہوتی ہے ان میں وفادار بھی ہوتے ہیں ایشیائی مردوں کی وفاداریاں، اس نے خود دیکھی تھیں اس کی ایشیائی دوست لکی، شوہر خرم اس کی ہم وطن مارٹینا کا ایشیائی شوہر صدام یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ۔

اس نے بھی عہد کیا تھا وہ کسی ایشیائی مرد سے شادی کرے گی ساری عمر پابند وفا تو ہوگی ہم وطنوں نے صرف بے وفائی کا دکھ ہی دیا تھا اس لئے اس نے حسام عارف احمد کو خوب رکھ لیا تھا۔

شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی اور یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے قسمت کس روپ میں اس کا مذاق اڑانے کے لئے کھڑی ہے۔

اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ کہ وفا کے نام پر بے وفائی کا وہ بہت بڑا اور عظیم دکھ اٹھائے گی حسام کا انتخاب اس کی زندگی کی سب سے بڑی کوتاہی اور غلطی ہے اس کا ارادہ تھا امریکا کے شہر نیو یارک میں جا کر دونوں گھر بسائیں گے سب سے الگ تھلگ نئی دنیا نئے لوگ، نئے ہاں۔

حسام بھی اس دنیا میں تھا تھا اور مارگریٹ بھی تھا، تاکہ جانتی تھی ماں باپ نے تو بچپن سے ہی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اس نے اپنی محنت سے آج یہ مقام بنا لیا تھا۔

\*\*\*

”میری پلیز“ آپ میری بات سمجھیں کہ میں اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا بہت فرق ہے ہمارے درمیان“ اس کی عادات بالکل مختلف ہیں ہمارے مزاج آپس میں بالکل نہیں ملتے ہیں میں اور نہیں رہ سکتا اس کے ساتھ۔“

”داف۔ داف۔ بر خوردار“ داف۔“ مہر صاحب ہاتھ روم سے نکل کر اندر آگئے حسام ارجمند خاتون کے قدموں میں بیٹھا اپنی بات کو دلیل اور عاجزی سے منوانے کی کوشش کر رہا تھا اپنے باپ کی آواز سن کر نہ صرف چونکا بلکہ جریز ہو کر شرمندہ ہو گیا پھر بھی ایک شرمناک تھی ان کے درمیان۔

”میر خوردار!“ مہر صاحب اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھ گئے۔

”میاں بیوی کا رشتہ تو اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ ساری عمر بھی اس کو سمجھنے کے لئے ناکافی ہے اور آپ دو سال میں سمجھ گئے دادو بی چاہے آپ کی سمجھ کی ہرزوڈ اس کے لئے اسرار چلتے ہیں تمہک ختم ہی نہیں ہوتی اور آپ توڑنے کے چکر میں ہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”کیا مذاق بنا رکھا ہے تم نے اب تم چھوٹے بچے نہیں رہے کہ تمہاری ہر بات ہر ضد مان لی جائے رعنا تمہاری پسند تھی ہم لوگ کھیل کا ذریعہ بنے اب دو سال میں ہی تم میر ہو گئے نف ہے تمہاری مردانگی پر۔“ ایک دم سے ان کا لہجہ بدل گیا۔

”میں تمہیں نہ کسی نئے رشتے کو استوار کرنے کی اجازت دوں گا اور نہ ہی کسی پرانے رشتے کو توڑنے کی رعنا ہم سب کو بے حد عزیز ہے خود کو درست کرو۔“

”میں بد سوری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

بالاخر اس نے وہ بات کر دی جس کے لئے وہ اتنی تمہید باندھ رہا تھا ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے پھر آج ہی کیوں نہیں بیڈ روم کی فضا ساکت ہو گئی۔

”بکو اس بند کرو یہ کیا مذاق ہے اس فرنگی عورت سے شادی کرو گے جس کے حسب و نسب کا علم نہیں کس بات کی کمی ہے تمہارے اندر کون سے ارمان پورے نہیں کئے۔“ وہ غصبتاک ہو کر کھڑے ہو گئے۔

ارجمند خاتون ہکانکاں گئیں۔

اس بات کی تو انہیں بھی امید نہ تھی لہجہ بھر کو وہ بھی چپ ہو گیا۔

”وہ بہت اچھی ہے میں ملواؤں گا آپ سے۔“

اس نے دفاعی راستہ اختیار کیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اسے یہاں لانے کی سمجھے تم۔“

”لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے ہٹ دھرمی دکھائی، ضدی لہجہ اختیار کیا۔

”تو پھر تم یہ بھی سن لو جس دروازے سے تم اسے اندر لاؤ گے اسی لئے اسی دروازے سے تمہاری ماں باہر نکل جائے گی۔“

ایک بار پھر ہر چیز ساکت ہو گئی وہ توہاں کی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا یہاں تو باپ نے ہی تیر چلا دیا۔

”ہاں۔!“

”مگر کیا ہے تمہارا باپ جاسکتے ہو تم یہاں سے۔“

اس نے ایک لمحے کو باپ کے سرخ چہرے اور ماں کے متوحش انداز کو دیکھا اور جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

\*-\*-\*

”یہ عورت۔ یہ عورت کس قدر معتبر ہو گئی ہے۔“

اس نے جھنجھلا کر اس کے سوتے ہوئے وجود کو دیکھا کل تک کتنی قریب تھی یہ لیکن آج۔ آج اس کے دل سے اترا ہوا غبار بن گئی تھی مارگریٹ کا سحر ایسا تھا کہ ہر صورت وہ اس عورت سے ہر ناما توڑ لینا چاہتا تھا۔

لیکن اب درمیان میں ای، ابو کا انٹو رشتہ آ گیا تھا پہلے تو سوچا تھا کہ ماں کو منانے کا لیکن اب باپ کے آگے سر اٹھانا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی بند باندھ سکتا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

”یا خدا یا۔۔۔“ اس نے سر ہاتھوں پر گرایا اور صوفے پر ڈھے گیا۔

اور ساری رات دھومیں کے مرغولے بناتا خود سے لڑتا جھگڑتا سوچ دہچار میں مصروف رہا اور بظاہر سوتی رعنا یہ سوچتی رہی۔

وہ کر یہ بات میرے دل میں  
کانٹے کی طرح کھلک رہی ہے  
کیا میری وفاؤں میں کچھ کمی ہے  
عاری سے خلوص سے پرستش  
پگھلانہ سکی مجھے کو  
لیکن!

یہ گمان بھی ہے شاید  
اندر سے وہرت پگھلا گیا ہو  
چہرے پر نہ ہو کوئی تاثر  
اور دل میں  
چراغ جل گیا ہو۔

صبح پھر ایک نئی سحر نمودار ہو گئی اور دونوں اپنے  
اپنے مصطفیٰ انجام تک نہ پہنچ سکے  
گھر میں ایک غیر معمولی خاموشی کا راج تھا سب نے  
اس نئی بات کو سن لیا تھا فائزہ اور حنا یہ سوچ کر بیٹھ  
گئیں یہ تو ہوتا ہی تھا حسام کمزور کردار کا مرد جو شہرا  
رہنا خاموشی سے اپنے صبر کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی اس  
نے تو زندگی کا یہ سفر اعتبار، اعتماد یقین و خلوص کے  
سہارے شروع کیا تھا مگر وہ سری جانب یہ سب نہیں  
تھا صرف لچائی اثر تھے تو کیا اس نے صرف لچائی اثر  
کے سہارے مات کھائی ہے اس کی اقیہہ زندگی ایک ٹوٹی  
پھولی بیساکھی بن جائے گی۔

”نہیں زندگی کو وہ بھی پر جوش انداز میں گزارے  
گی لیکن صبر سے اس انتہائی حدوں کو چھوٹے شخص کی  
انتہاؤں کو دیکھے گی سنا اور پڑھا تھا صبر سے ساری  
منزلیں آسان ہو جاتی ہیں وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ  
نہیں کرنا چاہتی تھی اسے یقین تھا کہ حسام اس کے  
سامنے ضرور بولے گا اور وہ اس وقت کی منتظر تھی۔  
”رہنا تم نے سنا حسام بھائی کج کل ہواؤں میں اڑ  
رہے ہیں۔“ کنول کی آواز فون کی لہروں پر پر جوش  
انداز میں سنائی دی۔

”تم نے کچھ نہیں کہا کس چیز کا مان ہے تمہیں خود  
پر ہکان کھینچوں ان کے یہ کیا چکر چلایا ہے انہوں نے“

اس نے خامے استجاب سے اس کی آواز کو سنا یہ کنول

ہی ہے نا۔۔۔  
”گویا تم شکست کھا بیٹھی ہو۔۔۔“  
”نہیں۔۔۔!“ بے اختیار اس کے ہونٹوں سے  
نکلا۔

”یہاں فتح و شکست کا کوئی کھیل شروع نہیں ہوا یہ  
موڑ تو آتا ہی تھا۔“

”گویا تم اپنی محبت سے دست بردار ہو چکی ہو۔“

محبت طاق دل پر  
چلنے والا وہ چراغِ آخر شب ہے  
کہ اس کی لو آگر  
بد صدم بھی پڑ جائے  
تو اندر کا

اجالا کم نہیں ہوتا۔

”انتہا یقین سے تمہیں حسام کی زندگی میں وہ سری  
عورت داخل ہو چکی ہے اور تمہاری خاموشی۔“

”میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ وہ کشمیریوں کا سیافر  
خسارے میں رہتا ہے۔“

”گویا تم حسام کی واپسی کی منتظر ہو اور اسے دوبارہ  
دل کے سنگھاسن پر بیٹھا لو گی۔“

”نہیں وہ میرے دل کے سنگھاسن سے اترا ہی  
نہیں ہے میں نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا تھا پھر وفا تو  
ہوتی ہی بے وفا سے ہے۔“

اس کے لہجے میں محبت کی حلاوت تھی کنول کے  
اندر کا حال جانتی تھی اس لئے اس کے سامنے مطمئن  
رہنا چاہتی تھی۔

”حیرت ہے!“

”تم میری جگہ ہو تمیں تو کیا کرتیں۔“

”میں۔۔۔ میں اس شدید محبت میں جتلا ہوتی تو پھر ہر  
چیز کو تس تس کر کے اس سے پہلے ہی حسام کی زندگی  
سے نکل جاتی۔“ اس نے سرعت سے اپنا فیصلہ سنایا  
اور ایک دم خاموش ہو گئی رہنا نے اس کی خاموشی کو  
دل پر محسوس کیا۔

”مگر میں بھی حسام کی طرح جذباتی ہو جاؤں تو کیا  
فرق رہ جائے گا ہم دونوں میں۔“

”وہ۔۔۔“ بات بہت گہری تھی۔

”ٹھیک ہے پھر میں تمہیں کل تک کی مہلت دیتا ہوں۔“

”مجھے کوئی مہلت درکار نہیں ہے۔“ وہ جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

”ٹھیک ہے پھر میں یہ سب چکر ہی ختم کر دیتا ہوں ڈھیٹ عورت“ حسام جنون میں دیوانہ ہو چکا تھا اس کے پیچھے باہر نکلا۔

”ستب تم۔“ یک دم ہی زبان گنگ اور وجود منجمد ہو گیا لان کا منظر تھا ہی حیران کر دینے والا۔

ابراہیم بھائی کے برابر میں مارگرٹ کھڑی تھی اور مارگرٹ سے گھر والوں کا تعارف کروا رہا تھا یہ میرے ابو امی یہ بڑے بھائی جان یہ فائزہ بھابی ہیں یہ میری وائف حتا یہ میرا بیٹا یہ میرا بھائی حسام۔ انہوں نے ستون پکڑے گنگ کھڑے حسام کی جانب اشارہ کیا۔ اور مارگرٹ ساکت ہو گئی اس کا حسام اس کی محبت اس نے تو بتایا تھا کہ کوئی نہیں تھا اس کا ایک ٹوٹا بکھرا شخص ہے۔

”اور یہ اس کی بیوی رحمتا۔ اور رحمتا یہ میری دوست مارگرٹ ہیں پاکستان وزٹ پر آئی ہوئی تھیں پاکستان اور ہاں کے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں انہیں آج میں انہیں آپ سب سے ملانے لایا ہوں۔“

ابراہیم بھائی نے مسکرا کر سب کی جانب دیکھا۔

حسام کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو یون میں لو نہیں یہ وقت نے کون سی چال چل دی تھی ابراہیم بھائی کہاں طے مارگرٹ سے اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا مارگرٹ کے چہرے پر خون کی سرخی پھیل چکی تھی۔

وہ تو وفا کی تلاش میں نکلی تھی اور سعی لاکھ حاصل رہی بے وفا تو ہر قوم میں ہوتے ہیں خواہ مخواہ ہی ایشیائی لوگوں کی وفا کے گیت گائی رہی۔ وفا کے نام پر کھیل تو ہر قوم میں ہی کھیلا جاتا ہے اچھے برے لوگ تو ہر نسل میں ہوتے ہیں۔ آنکھ دھوکا کھاتی ہے یقین کو فریب ہوتا ہے۔“

اس کے وجود میں شکوے شکایات کا طوفان تھا آج اسے ایک عظیم غم کا سامنا تھا اور جو سانحہ آج اس کے دل نے جھیلا تھا اس کا اثر ساری عمر رہتا تھا۔

”اس کا کیا حل ہے۔“

”وقت ہر منٹے کاٹل ہوتا ہے بس استقامت سے انتظار کی ضرورت ہے۔“

”مجھے بہت افسوس ہے۔“

”کس بات کا؟“

”حسام کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اور رحمتا اندازہ نہ کر سکی کہ یہ غم و خوشی کا ٹون تھا یا اطلاعی جو چیز ایسے نہ مل سکی ایسے ہی سہی دل نے قیاس کیا۔

”میں تمہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔“ وہ جواب بھی ابھی فریش ہو کر خوشگوار احساسات کے ساتھ بیڈروم میں آئی تھی حسام کی آواز پر ساکت ہو گئی۔

”بولو کیا قیمت لوگی۔؟“ سندو ترش لہجے میں خشونت تھی۔

”میں نے آپ کی زندگی میں داخل ہونے کی کوئی قیمت نہیں لگائی تھی۔“ اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

”گورو جو میرے اتنے حریف پیدا کر دیئے ہیں۔“

کھا جانے والا انداز تھا اس کا۔

”آپ کے خود ساختہ ہیں مجھے ضرورت نہیں ہے تحفظ کے لئے کچی دیواریں اٹھانے کی۔“ اس کے اطمینان نے آگ لگادی۔

”بھیک مجھے منظور نہیں ہاں کے سر سے زیادہ قیمتی شے کیا ہوتی ہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو۔“ اس نے جھٹکے سے اسے سامنے کیا۔

”میں نے سوال ہی نہیں کیا تو جواب کیا مانگوں۔“

اس نے رساں سے ہاتھ جھٹک دیا۔

”پھر امی سے جا کر کہو کہ میرے راستے کی دیوار نہ بنیں مجھے ہر سو یہ راستہ طے کرنا ہے۔“ اس نے اسے دھکا دے کر صوفے پر اسے گرا دیا۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے مل بننے کی۔“ اس کا اطمینان دیکھ کر اس کے اندر کی آگ کو بھڑکا رہا تھا۔

# قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرستی سے محفوظ رکھیں

گئی تھی اس کی وفا ممبر و استقلال کا خدا نے کس طرح ساتھ دیا تھا۔ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا اس کی حسام سے کوئی ناراضگی نہیں تھی مگر اب اسے خود ہی اس کی جانب بڑھنا تھا یہ انا کی جنگ نہیں تھی ازواجی رشتوں میں انا نام کی چیز نہیں ہوتی۔

\*\_\*\_\*

وہ کچھ دلوں کے لئے امی کے ہاں آگئی۔

شادی کے بعد دو سراون تھا اس نے اور نبیلہ نے مل کر تمام بھولی بھنگی یادوں کو پھر سے تازگی بخش دی۔ وہی پکوٹے اور ہری مرجوں کی چٹنی وہی جمبولوں پر بیٹھ کر ورختوں کو چھوٹا پارٹس میں نہانا اور اونچے سروں میں ڈیک سٹا گھر کی رونق زندہ ہو گئی تھی۔

اس سارے سیٹ اپ سے حسام تھک چکا تھا اس کے جذباتی قدم نے اسے سب سے الگ کر دیا تھا اب تو مارگرٹ کی یاد بھی تصپا رہنے بننے کو تھی۔

اور شاید جذباتی محبتیں ایسی ہی ہوتی ہیں ایک دم سے اٹھی اور خہار کی مانند پختی کھیں لڑکھ کے اہال کی طرح۔

وہ باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی بہت بدل گیا تھا اس نے ماں سے معافی مانگی اور ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو دیا اور انہوں نے دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔

”جاؤ بیٹا اس کو مناؤ جو تمہاری زندگی کی ساتھی ہے“

”کیا وہ مان جائے گی۔“ اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔

”ہاں! عابت قدی سے اپنی جگہ کھڑے لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔“

کرٹ رات گئے تک ان سب لوگوں کے ساتھ ہی ایرار کی فیملی اسے بہت اچھی لگی حسام فوراً منظر سے غائب ہو گیا۔ ایرار کا مقصد پورا ہو گیا محسوس ہی اس کا گھر بچانے کے لیے اس نے بہت بڑا جوا کھیلا۔

حسام سے کسی قسم کے بھی سلوک کی توقع کی جاتی تھی مگر اس کے لب خاموش تھے ارچند دنوں نے بہت محبت سے اسے رخصت کیا تھے نف دئے پھر آنے کو کہا لیکن اب اس نے کبھی نہیں آنا تھا دوسری صبح اسے اپنے دس لوٹا تھا اور وہیں جا کر اپنے نام کی وفا تلاش کرنی تھی۔

اب حسام نے ملے بغیر ہی جانا تھا کہیں کوئی مبالغہ محسوس نہیں تھا پس منکر سے اچانک ہی دہرے منظر میں آگئی تھی اب وہ اتنی باغی نہیں تھی کہ کسی کا ہاتھ پٹا کر تباہ کر دیتی۔

\*\_\*\_\*

معتاد معمول پر آگئی وہی صبح وشام کا کھیل سب کے اس بچوں کے اسکول بدل گیا تھا تو حسام عارف احمد اس کے اندر کی دنیا بدل گئی تھی۔ اپنی خواہشات کا حلام پھر ہار گیا۔ تقدیر نے اب کنارے لا کر راکھا تھا اس کے سمیہ ہوا کہ مارگرٹ اس سے ملے بغیر واپس جا چکی تھی ورنہ کچھ نہ کچھ کہہ کر اسے منالیتا۔

یڈ روم میں گہری خاموشی دو نفوس کی موجودگی کا احساس ہی نہ دلانی۔ دونوں اپنی اپنی تخیلاتی دنیا میں لباورہتے اس کے ناروا سلوک کے متعلق رعبانے ایک لفظ نہ پوچھا تھا اور نہ کچھ کہا تھا اس کی خاموشی نے اسے سخت سے ہلکا کر دیا تھا۔

ایرار نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور وہ ہکا بکا ہونق رہ

”میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے امی آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے ماں کی گود میں منہ چھپا لیا۔  
 ”مائیں اپنے بچوں کی خطا میں معاف ہی کرتی ہیں کبھی ان کا برا نہیں چاہتیں اور سنو ایک بات کا فیصلہ کر کے اس تک جانا آئندہ تم اس قسم کی حرکت نہیں کرو گے، بے شک باوقاف عورتوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں مگر شدتِ غم سے کبھی کبھی یہ دل پھٹ بھی جایا کرتے ہیں۔“

اس نے اس بات کو دل پر لکھ لیا ویسے بھی اب وہ بہت بدل چکا تھا اپنی جذباتیت کا گلا خود اپنے ہاتھوں گھوٹ دیا تھا۔

”آئیے۔ آئیے۔ حسام بھائی آئے ہیں۔“ وہ جو درتے تھے میں تم سم خاموش بیٹھی تھی چونک گئی آج کچھ بھی کرنے کا موڈ نہ تھا اس لئے درتے تھے سے لگی بیٹھتی

رہی اور بہت کچھ سوچتی رہی نبیلہ کی آواز نے چونکا دیا۔ ایک دم پٹی نبیلہ حسام کو دروازے میں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ حسام کی جھکتی آواز کالوں میں اتر گئی۔

”موسم کا تقاضا ہے پکڑے شوگرے بناؤ۔“ اسے دیکھ کر حسام خاموش ہو گیا۔

”مجھے اندر آنے کی اجازت مل سکتی ہے۔“

”ایک شرط پر۔“ رحنائے کوئی لحاظ نہیں کیا۔

”عظم سر کا۔“ حسام نے کان پکڑ لئے۔

زندگی کا نیا سفر وقتاً بوقتاً یقین، خلوص، اعتماد کے سارے شروع کریں گے اپنے اندر سے جذباتیت کو نکال دیں دو کشتیوں کا مسافر ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے اگر میں بھی اپنی کشتی کا رخ سوڑ لوں پھر۔“

”بندہ معافی کا طلبگار ہے۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ہر جگہ صبر و استقامت نہیں چل سکتا۔“ اس نے رخ پھیر لیا۔ باہر بارش یک دم ہی تیز ہو گئی تیز بوچھاڑ نے اسے بھگو دیا غیر محسوس انداز میں حسام اس کے بالکل پیچھے کھڑا ہو گیا تیز بوچھاڑ نے اسے بھی بھگو دیا۔

”باخدا، خدا کو حاضر ناظر جان کر سارے سبق پڑھا۔“

کر آیا ہوں اور سارے جذباتی راستوں سے گزر کر صرف یہ سیکھا اور سمجھا ہے کہ سب کتے جاتے موسم ہوتے ہیں، زمانہ وہ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ٹھہر جاتا ہے زندگی اتنی بے کار نہیں کہ اسے یوں گزار دیا جائے اور میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ میرا عملی دور شروع ہو چکا ہے فی الحال خواب دکھنا بند کروں جو پت اس پر قناعت کروں۔“

اس کی اتنی لمبی تقریر پر وہ بے ساختہ پلٹی۔

حسام بڑے دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا اس نے پہلے بے یقینی سے اسے گھورا پھر بے ساختہ ہنس دی۔  
 ”اور کنول اس کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”وہ!۔“ اس نے دیر سے سر کھچایا۔

”تمہاری دوست سے منع کرونا کہ مجھے فون کر کے غلط مصلحت پٹیاں نہ پڑھایا کرے۔“

وہ شرارت سے ہنس دیا۔

”اور اگر آئندہ شکایت ملی۔“ اس نے باز پرس کی۔

”جو مزاج چار میں آئے۔“ حسام نے ذرا سا جھک کر سر تسلیم خم کیا وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔

”صل بات تو یہ تھی کہ اس کے صبر و استقلال اور

جاہت قدمی نے اس کی خوشیاں لوٹا دی تھیں، اگر وہ

بھی عام سی لڑکیوں کی طرح تخیل و پیکار کرتی تو اس کی

منزل آسان ہو سکتی تھی بھلا۔“

”اور سنو۔!۔“ وہ اس کے شانوں پر جھکا۔

”میں اپنے دل سے جذباتیت کو تو نکال سکتا ہوں

جذبات کو نہیں، آخر ہمیں بھی تو۔“ رحنائے نے ہنس ہو

کر اسے دکھا اور مجبور ہو کر پلکیں جھکالیں اب کے

تیز بوچھاڑ نے انہیں ایک ساتھ بھگو دیا۔“



# طرس کا رشتہ میں

## ٹاؤلٹ

نیہا اور شہوار آپس میں چھاڑا، نہیں تھیں ان کے والدین ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ شہوار اور نیہا میں بہت دوستی تھی۔ نیہا کے بھائی زوہیب سے شہوار کی سنگنی ہو گئی تھی لیکن نیہا کو تو ایک ہی لگن ایک ہی جنون تھا کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ جب اس کو میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تو اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

قیصر بزنس کے سلسلے میں پاکستان آیا تھا۔ اس نے ایک تقریب میں نیہا کو دیکھا تو دل ہار بیٹھا۔ اپنی ذمہ داری کے سامنے اظہار مدعا کیا تو وہ نیہا کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ قیصر کے والد شاہنواز خان کو بتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ قیصر کے لیے انہوں نے جو لڑکی منتخب کر رکھی ہے، قیصر کی شادی اسی سے ہوگی۔ لیکن جب انہیں بتا چلا کہ قیصر کی پسند نیہا ہے تو وہ فوراً رضامند ہو گئے۔ نیہا شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن شاہنواز خان نے اس قدر اصرار کیا، دوسرے گھر والوں کو بھی رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ اسے مجبوراً رضامند ہونا پڑا۔ گھر والوں کا ارادہ تھا کہ سنگنی ہو جائے جب نیہا ڈاکٹر بن جائے گی تو شادی کر دیں گے۔ لیکن سنگنی کی تقریب میں شاہنواز خان نے نکاح کے لیے کہہ دیا۔ اور نکاح کے فوراً بعد وہ ارٹ گئے کہ رخصتی بھی ابھی ہوگی چونکہ نکاح ہو چکا تھا، اس لیے گھر والے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ نیہا رخصت کر دی گئی۔







Scanned By Waqar Azeem [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)



قیصر جب جدی میں جانے لگا تو شاہنواز خان نے کہا کہ قیصر طلاق نلے پر مائل کر دے۔ قیصر چلا کر رہ گیا لیکن باپ کی حکم عدولی نہ کر سکا۔ اس نے نیہا کو طلاق دے دی۔ جب شاہنواز خان نے بتایا کہ نیہا کے والد نے برسوں پہلے ان کو جیل بھجوا دیا تھا۔ ان کے والد اور بہن اس صدمے سے وفات پا گئے تھے۔ نیہا کو طلاق دلا کر انہوں نے اس کا انتقام لیا ہے۔ نیہا یہ داغ لے کر گھر واپس آ گئی۔

عائشہ کاغ میں بیگماری تھی۔ اس کی بہن اور بہنوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی بیٹی ویسا کو عائشہ نے ہی پالا تھا۔ عائشہ خود بھی ایک بڑی جائیداد کی مالک تھی۔ اور ویسا کے نام بھی بہت سی جائیداد تھی۔ زینب عائشہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن ویسا، زینب کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے عائشہ پریشان تھی کہ وہ زینب کو کیا جواب دے۔ خود زینب بھی ویسا کو شدیداً پسند کرتا تھا۔

## آنکھوں پر قیصر

رو کر کے دوسرے کو پہلے لا دیا اور۔۔۔  
 ”ان کی تو خالی چائے تھی جی اور آپ کا آرڈر بڑا تھا اور تیار ہو رہا ہے جی اس لئے۔۔۔“  
 ”کہو اس بندے کو۔۔۔ راشد نے اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔۔۔“  
 ”مظلوم اور بے بس پر طاقت کا مظاہرہ بہاوری کے زمرے میں نہیں آتا اور یہ تو بچہ ہے۔“ احمر نے چھوٹے پرائیڈا ہوا راشد کا ہاتھ پکڑا تو وہ اسے گھورنے لگا۔  
 ”تم سے مطلب ہے؟“ راشد اسے گھورنے لگا۔  
 ”مظلوم کی حمایت کا مطلب صرف انسانی ہمدردی ہوتا ہے، ویسے اس کا قصور کیا ہے۔؟“ احمر نے بارہ تیس سالہ چھوٹے رفیق کو اپنی طرف کر کے پوچھا۔  
 ”جب میں نے جلدی لانے کو کہا تھا تو اس نے پہلے اس کو چائے لا کر دے دی وہ بھی چوکیدار کو۔“ اپنی حیثیت کا غرور اور دوسرے کی کمتری کا احساس حمرے پر رعونت کی تھی بن کر اتر آیا۔  
 ”وہ کمزور راشد! کوئی انسان دولت کے زیادہ یا کم ہونے سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہو جاتا۔ یوں بھی درس گاہ عبادت گاہ، قبرستان ایسی جگہیں ہیں جہاں بڑے چھوٹے کی تخصیص نہیں ہوتی۔ اور پھر بھی جب چھوٹا کہہ رہا ہے کہ تمہارا آرڈر بڑا ہے اس کے تیار ہونے

”لگتا ہے راشد داوا کو پھر غصہ آیا ہوا ہے۔ یار! کیا چیز ہے یہ اور کیا سمجھتا تھا خود کو۔ ہر وقت مجھے میں تارہتا ہے۔“  
 راشد ان کا کلاس فیلو تھا اور کسی بڑے آدمی کا بیٹا تھا اور اس زعم میں وہ کسی دوسرے کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔  
 ”یار! لینڈ کروزر میں گھومتا ہے۔ ملازم ساتھ ہوتے ہیں۔ ہرے نیلے ٹوٹوں سے جیب بھری رہتی ہے تو پھر خیر آؤ۔ ذرا حال احوال پوچھیں ورنہ تو یہ آج چھوٹے کا ہناوے کا قیصر۔“ احمر اٹھ کھڑا ہوا تو تنویر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
 ”احمر! اس بندے کو اچھی طرح جانتے ہو ناں۔ اس کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ ہو گا چھوٹے کا بھی قصور۔“ تنویر کتر رہا تھا راشد کے منہ لگنے سے۔  
 ”غریب ہمیشہ بے تصور ہی پٹتا ہے۔ کوئی تصور ہوا نہیں۔ چھوٹے یار! آؤ۔ محل سے بات کرنے میں کیا ہرج ہے۔ اچھا چلو تم جاؤ۔ میں آتا ہوں۔۔۔“  
 احمر اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا تو تنویر بھی کھڑا ہو گیا۔  
 ”اب میں اتنا بھی بے غیرت نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ دوں چلو۔“  
 ”ویل کیل کیلے! تم نے یہ حرکت کی کیسے کہ میرا آرڈر

میں وقت لگے گا تو ایک غریب بندہ اتنی دیر میں چائے کا ایک کپ بھی نہیں پی سکتا؟ طاقت کا بے جا استعمال بری بات ہے۔ پارا کول ڈاؤن۔ ”احمر نے اسپتالی سے اس کا ہاتھ نیچے کیا اور شانہ تھپتھا کر اسے ٹھنڈا کیا تو وہ جڑ گیا۔

”تم اگر غریبوں کے حقوق کے اتنے بڑے علم بردار ہو تو ان سے کو تیز سیکھیں یا تم سکھاؤ ان کو تیز۔“  
 ”جس دن یہ واقعی تم سے بد تمیزی کرے گا ناں تو میں اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا کیوں چھوٹے۔“  
 احمر نے مسکرا کر چھوٹے کے شانے پر ہاتھ مارا جس کی نظروں میں احمر کی آج بہت عزت بڑھ گئی تھی۔  
 ”آپ جان سے مارو نا احمر بھائی۔“ چھوٹے نے جاں نثارانہ انداز میں احمر کو دیکھا۔

”چلو پھر راشد بھائی کے لئے اور ہمارے لئے دوستانہ سی ای بھی سی چائے لاؤ اور ساتھ بھینڈ بھی۔ چلو شاہاش۔ چلو آویا راشد کول ڈاؤن پارہ پنچھ۔“  
 ”اب بیٹھو راشد بھائی! میں ابھی۔“

”او شٹ اپ! آگیا نہیں سے راشد بھائی کہنے والا۔ اوقات میں رہو ہاں۔“ راشد نے حقارت سے چھوٹے کو گھورا پھر ایک تیز نگاہ احمر اور ثور پر ڈال کر میز کو ٹھوکر کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔  
 ”حمر بھیا! آپ آگئے شکر ہے خدا کا درنہ تو آج یہ مجھے مارو تا۔“ چھوٹے پر ابھی بھی خوف کے اثرات باقی تھے۔

”ارے چھوٹے! ہم نہ بھی ہوتے تو کیا ہوتا۔ خدا تو

ہوتا ہے ناں انسان کا محافظ۔ چلو اب چائے لاؤ۔ اچھا ایسا کرو۔ چائے وہاں لے آتا۔“

بات کرتے کرتے احمر کی نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں، جہاں سے نہہا ارم اور نائلہ آ رہی تھیں۔ شوخ سی چمک سے اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

”ہیلو گرلز کیسی ہو ارم۔؟“ احمر نے ایک گہری نگاہ نہہا پر ڈالی۔ میز پر قابل رکھی اور ارم کے سر پر ہلکی سی چست لگائی۔

”او! شکر ہے احمر! تم مل گئے۔“ نائلہ اسے دیکھ

کر خوش ہو گئی۔

”ہائیں تو کیا میں گم ہو گیا تھا۔ اور کس قدر بد تمیز ہو تم لوگ کہ گمشدگی کا اشتہار بھی نہیں دیا اور وہاں میں خود کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ریشان ہو گیا تھا۔ اب تم نے بتایا کہ میں مل گیا ہوں۔ شکر ہے خدا کا۔“

اس کی آنکھوں میں شوخیاں رقصاں تھیں۔  
 ”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آو گے وہ میری بک رو۔ نہہا کو چاہیے۔“ اس نے شوخی سے نہہا کو دیکھا جو اس کو بری طرح نظر انداز کئے کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

”بھی تو سیریس ہو جایا کرو احمر۔“  
 ”سیریس۔ ارے میں تو شروع سے دیکھتے ہی سیریس ہو گیا تھا مگر۔“

احمر نے ذرا سا جھک کر نہہا کو دیکھا تو اسی وقت اس نے بھی دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں شوخیاں رقصاں تھیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر کتاب بند کر کے بیگ میں رکھ لی اور چائے پینے لگی۔ بے اعتنائی کا تیر سیدھا طر پر لگا مگر وہ ہنس کر سیدھا ہو گیا اور ارم سے بات کرنے لگا۔

”آں۔ آں یہ کیا کر رہی ہونا نائلہ۔؟“ احمر نے نائلہ کو بیگ سے پیسے نکالتے دیکھ کر کہا۔

”یہ جو کچھ ٹھونسا ہے مٹا نہیں تھا۔ نہ ہی کیفے والوں سے رشتہ داری ہوئی ہے کہ مفت میں۔“

”رکھ۔ رکھ۔ آج کیا دن ہے بھلا۔؟“ احمر نے ہاتھ اٹھا کر اسے دیکھا پھر کن اکھوں سے نہہا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جمرات ہے۔“ ارم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہو تو تمہیں پتا نہیں کہ جمرات خیرات کا دن ہوتا ہے۔ لہذا آج کی چائے جناب احمر کی جانب سے۔“

احمر نے شوخی سے نہہا کو دیکھا جو اس کی اس بات پر اندر ہی اندر کھول اٹھی تھی۔

”کیپ دا چینج Keep the change۔ نہہا نے بیگ سے دس روپے نکالے اور اپنی چائے کے

پیسے اس کی طرف اچھل دیئے۔ اس کا انداز اس قدر  
تعارف آمیز لہجہ اتنا سخت تھا کہ کچھ دیر کے لئے  
خوشگوار ماحول پر سناٹا سا چھا گیا۔ احمر کے چہرے پر سختی  
سی آگئی۔

”مس نہہا! احمر! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آپ  
جنگل میں نہیں ہیں۔ اب آپ انسانوں میں آگئی  
ہیں۔ لہذا انسانوں کے انداز اختیار کیجئے۔“

احمر نے اس کالوٹ بھاڑ کر اسی پر اچھالا اور تیزی  
سے کینے ٹیرا سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر کے لئے وہ  
سن سی ہو گئی اور تاملہ ارم کے سامنے شرمندہ بھی۔

”نہہا! نامتذ نہ کرنا مگر احمر کے ساتھ تمہارا یہ رویہ  
مناسب نہیں۔ وہ دل کا صاف اور اچھا لڑکا ہے۔ وہ  
یہ سب مذاق میں کرتا ہے ورنہ کسی کی دل آزاری اس  
کا مقصد نہیں ہوتا۔“

ازم احمر کی عدم موجودگی میں اس کا دفاع کر رہی تھی  
تو وہ جب چاہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ مگر نبجانے کیا  
بات تھی کہ احمر کو دیکھتے ہی اسے غصہ آجاتا تھا۔

\*\_\*\_\*

”سوچ یار! تنویر کوئی ترکیب سوچ۔ کس بندے کو  
یہاں وہاں کیا جائے۔“

احمر مستقل مثل مثل کر سوچ رہا تھا اور جب سوچ  
کی دعوت اس نے تنویر کو دی تو اس نے تکیہ اٹھا کر  
اسے دے مارا۔

”گھاس وہ تجھے ڈالتی نہیں اور موصوف مرے  
جار ہے ہیں ان کے بیچ میں جانے کے لئے۔“

”اس لئے کہ اسے معلوم ہے۔ میں گھاس نہیں  
کھاتا۔ مجھے ہر حال میں اس کے بیچ میں جانا ہے۔“

چلو آؤ۔ سر منیر سے بات کرتے ہیں وہ تو انچارج بھی  
ہیں۔“

احمر نے کتاب تنویر سے لے کر الگ رکھی اور اس  
کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔

”کیا کر رہے ہو یار! پڑھنے وہ Substage  
آ رہی ہے۔ مجھے بہت پڑھنا ہے سار کس کم آنے لگے  
ہیں۔“

”دو چھوڑ یار! پاس تو نے ہر حال میں ہونا  
ہے۔ میری نقل کر کے۔ چلو تو میرے ساتھ۔“  
اور پھر تنویر کو گھسیٹتا ہوا منیر صاحب کے پاس لے  
آیا وہ کھانا کھانے ہی لگے تھے۔

”او بھئی بچو! کیسے آتا ہوا۔؟“ منیر صاحب نے  
پلیٹاٹے سامنے کھسکا لی۔

”سر! آپ بھی ہو مثل کا کھانا کھاتے ہیں۔“  
تنویر اور احمر نے نذیروں کی طرح ان کے کھانے کو  
دیکھا۔

”ظاہر ہے یہاں رہتا ہوں تو کھانا بھی یہاں کھاؤں  
گا، کہو۔“

”یہی تو کہہ رہے ہیں سر کہ کاش آپ کا کوئی گھر  
ہوتا۔۔۔ گھر والی ہوتی۔ کھانا خود بنا کر کھلاتی۔ سب  
سے بڑھ کر فائدہ تو ہمارا ہوتا سر کہ اگر آپ ہماری بات  
نہ مانتے تو ہم آپ کی شکایت کر کے آپ کو ٹھیک  
کرواتے۔ مگر سر! اب تو آپ کچھ بھی کر لیں۔ ہم  
آپ کی کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔“

احمر نے باقاعدہ روٹی صورت بنا لی تو سر گھورنے  
لگے۔

”۳ حرمیاں! میں کھانا کھانے لگا ہوں۔ ایسی مثل  
بناؤ گے تو اندر کا بھی باہر آجائے گا۔ کہو۔ کس لیے  
آئے ہو۔“ سر نے کہا تو وہ بھی سیدھا ہو گیا۔

”کام تو خاص نہیں سر! وہ ذرا ایک بندہ یہاں سے  
وہاں کرتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے۔ مجھے کرائے کا غنڈا سمجھا ہوا  
ہے۔ بندہ یہاں سے وہاں کرتا ہے۔“

منیر صاحب اس کی بات سمجھ نہ سکے تو ڈپٹ کر  
بولے۔ توں گزر رہا گیا۔ تنویر کا مشورہ تھا کہ بھاگ چلو مگر  
وہ حمار ہوا۔

”نہیں۔ سر کرائے کا تو نہیں۔ وہ  
دراصل۔“

تب اس نے بھاتی ہوئی مردانہ ہمت کو پکڑا اور  
ساری بات کہہ دی۔

”دو سال گزر جانے کے بعد تمہیں بیچ بدلنے کا  
”

خیال کیسے آیا۔

سرنے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے مفلوک سی نگاہ  
اس پر ڈالی۔ تو وہ لاجواب سا ہو کر سر کھجانے لگا۔  
”سرا! وہ کشش۔ ہی اب آئی ہے۔ میرا مطلب  
ہے سر کہ بس آپ کچھ کر دیں۔ سمجھ لیں کہ کسی نے  
میری قابلیت اور میرے اقتدار کو چیلنج کیا ہے۔“  
”حق نہ بنو! حرام تم مستقبل کے ڈاکٹر ہو۔ فلمی  
ہیرو نہیں کہ اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ جاؤ جا کر  
ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ پچھلی دفعہ تمہارے نمبر کم آئے  
تھے۔“

سرنے نے بری طرح جھاڑ دیا۔

”سرا! تمہوں کی بات نہ کریں۔ میں آپ کو دس  
نمبری بن۔ اوہو! میرا مطلب ہے کہ خدا کے فضل  
سے میں بہت محنت کروں گا اور اچھے مارکس لاؤں گا۔  
بس آپ میرا یہ کام کر دیں۔“

احمر جیسے شرر اور گلنڈرے لڑکے کے اس  
مطالبے میں شوخی کے ساتھ سنجیدگی بھی تھی۔ انہوں  
نے بغور اسے دیکھا۔ اور کچھ دیر دیکھتے رہے۔  
”یہ معاملہ کیا ہے؟ کہیں سیاست میں تو نہیں پڑ  
گئے اگر ایسا ہے تو۔“

”نہ۔ نہ۔ سرا! سیاست کا سوال ہی پیدا نہیں  
ہوتا۔ سیاست اور میں دو مختلف چیزیں ہیں۔ میری تو  
زندگی کا نصب العین ہی محبت ہے۔ میرا پیغام بھی  
محبت ہے اور اس بیج میں جانے کا سبب بھی محبت  
ہے۔ میرا مطلب ہے سر کہ۔“

وہ ردالی میں زبان سے پھسل جانے جملے سے  
شرمندہ سا ہو کر کان کھجانے لگا تو سر منیر کچھ نہ سمجھتے  
ہوئے سمجھ گئے۔

”دیکھو! حرام! یہ انتہائی بچکانہ اور احمقانہ سی ضد ہے

تمہاری اور یوں بھی اصول کے خلاف بات ہے۔“

”سرا! آپ تو انچارج ہیں ان تمام۔“

”ہاں تو تب ہی کہہ رہا ہوں کہ یہ اصول کی بات

ہے۔“  
”سرا! پلیز۔“ حمر نے رونی صورت بنائی۔

”چھا بابا جاؤ میری طرف سے صرف اس صورت  
میں اجازت ہے کہ اگر کوئی اسے بیچ کا بندہ والی سٹری۔  
تمہاری بات مان جائے۔ دوسری صورت میں یہ  
اصول کے منافی بات ہے۔ بھائی چارے میں کوئی  
مان جائے تو الگ بات ہے۔“

”اوکے۔ سر تھینک یو سر۔ تھینک یو آپ  
جنہوں۔ سر آپ کے بچے جیٹوں سر نیچے۔ او سرا!  
ہم بھی تو آپ کے بچے ہیں ناں۔ جیتے رہیں پھولیں  
چلیں۔“

وہ خوشی میں اوٹ پٹانگ باتیں کرتا چلا گیا تو سر منیر  
کتلی ہی دیر محفوظ ہوتے رہے۔ ان کو واقعی اپنے  
اسٹوڈنٹ اپنی اولاد کی طرح پیارے تھے۔

\*\_\*\_\*

نہانے گھر میں قدم رکھا تو ڈرائنگ روم سے  
باتوں کی آواز رہ رہے پاؤں اپنے کمرے میں آئی۔  
اسے بہت محکم ہو رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ  
بھابھی کی سہیلیاں آئی ہوں گی اور وہ اچھی طرح  
جاتی تھی کہ بعض تو آتی ہی اس کے لئے تھیں۔ کسی  
کا بھائی ڈاکٹر ہے۔ کسی کا بھائی ایم بی اے ہے تو کسی  
کا دیور امریکہ میں پڑھ رہا ہے اور اس کی آئیڈیل لڑکی  
کے سانچے میں نہ ہاڈل جاتی ہے اس لئے۔

”ہونہ۔ خود غرض لوگ۔ اپنی پسند کے غلام  
ہوتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جس کو ہم پسند کر رہے  
ہیں اس کی بھی کوئی پسند کوئی آئیڈیل ہو سکتا ہے۔  
بھابھی بھی کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ کہ۔“

اس کے ساتھ ہی وہ باغی کی اندھیری داوی کی  
طرف نکل گئی۔ ایک خوبہ شخص قیصر جو چند لمحوں کے  
لئے اس کے سر کے تاج کی حیثیت سے اس کی زندگی  
میں آیا اور۔ اس کی شفاف بے داغ پیشانی پر طلاق  
کا بد نما دھبہ لگا کر نجانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ وہ تو اس

دھند میں نجانے کب تک بھٹکتی کہ لوی پوی نے دھڑ  
سے دروازہ کھول دیا۔

”ارے پچھو! وہاں مہمان آپ کا انتظار کر رہے  
ہیں۔ آپ یہاں چھپ کر بیٹھ گئی ہیں۔ اٹھئے ناں۔“

”خدا یا میں گناہ گار تیری ذات پاک کا شکر ادا نہیں کر سکتی کہ میری بیٹی پھر لوٹاوی تو نے۔ ماشاء اللہ اب تو صحت بھی اچھی ہے نہہا کی۔“

عذرا بیگم نے لان میں زوہیب کی کسی بات پر سہ ساختہ ہنسی ہوئی نہہا کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

”امی جان ماشاء اللہ نہہا۔ تو بالکل تھلے جیسی ہو گئی ہے۔ بس ذرا کبھی گزارے لٹھے کی یا وکاشا بن کر چبھ جاتی ہے تو بے قرار ہو جاتی ہے۔ لیکن انشاء اللہ کچھ دنوں میں بالکل بھول جائے گی۔ ویسے امی جان اس کے تو کئی رشتے بھی آپکے ہیں مگر میں نے منع کر دیا ہے۔ کہ آپ سے مشورہ کئے بغیر میں کوئی جواب نہیں دے سکتی۔“

انیقہ نے لگے ہاتھوں نہہا کے آنے والے پر پوزر کے بارے میں بتا دیا۔

”ٹھیک ہے بیٹی! رشتہ تو کرنا ہی ہے اس کا مگر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں اپنا حارث ہے نا۔“

”امی جان! حارث کا تو اس کی کنز کے ساتھ ملے چکا۔“

”ہے نہیں تھا۔ حارث تو خیر شروع ہی سے اتنا تیار نہیں تھا۔ وہ تو ان دونوں بہنوں کی خواہش تھی۔ اس لئے بات کر لی مگر سچ بات یہ تھی کہ لڑکی لڑکا قطعی تیار نہیں تھے۔ بلکہ لڑکی اپنے کسی اور کنز کو پسند کرتی تھی۔ کھل کر سامنے آئی تو دونوں بہنوں نے اچھے طریقے سے ایک دوسرے سے معذرت کر لی۔ اب تو میرے خیال میں صبا کی شادی بھی ہو گئی ہوگی۔“

”اچھا یہ تو بڑی عجیب بات بتائی آپ نے امی جان۔“ انیقہ کو اس خبر سے جہاں حیرت ہوئی تھی وہاں اطمینان بھی کہ نہہا کا مسئلہ بھی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

”ہاں میں نے۔ تو تب ہی ارادہ کر لیا تھا کہ اب اپنی بچی کو گھر ہی میں رکھوں گی۔ خدا نے چاہا تو حارث اور نہہا کی شادی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی لئے سب ہوا ہوا اب تو ہرگز اپنی بیٹی کا رشتہ باہر نہیں کر دیں گی۔“

”میں وہ اتنا بلا رہے ہیں چلئے۔“

دونوں بچوں نے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ چڑھ گئی۔

”کیا مشکل ہے لوی بہالی سے کہہ دو کہ مجھے کسی مہمان سے نہیں ملتا۔ آجانا ہے اٹھ کر روزانہ کوئی نہ کوئی۔“

”ارے پھو! بری بات ہے۔ مہمانوں کو یوں نہیں کہتے۔ اللہ سے شاکر۔“

”توی! پوی! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بالکل کسی مہمان سے ملنے کا جی نہیں چاہ رہا۔“ اس نے ذرا غصے سے کہا اور پھر لٹ گئی۔

”اچھا بھئی۔ اگر مہمانوں سے نہیں ملتا تو مہمان واپس چلے جاتے ہیں۔“

اس کو اڑ پر نہہا نے چونک کر دیکھا تو سامنے امی زوہیب شہوار اور حارث کھڑے تھے۔

”امی جان!۔۔۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ جدائی کی اتنی گھڑیوں کو اس نے نکلیں پالی کے سمندر میں بہا دیا۔“

”امی! میں کس قدر ادا اس تھی اور یہ آپ لوگوں نے بتایا کیوں نہیں آئے گا۔“ وہ شہوار سے مل کر شکوہ کر رہی تھی۔

”جو مڑا سر برازدینے میں ہے وہ اطلاع میں کہاں کیسی ہو تم نہہا۔؟“

زوہیب نے بہنوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہار کیا۔

”جہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔“ حارث نے اس کے سر پر چپت لگا کر متوجہ کیا تو وہ اس کی طرف گھوم گئی۔

”آپ راہوں میں کیوں؟ آپ تو سر آنکھوں پر۔“ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

\*-\*-\*

ان لوگوں کے آجانے سے دن بہت رنگین ہو گئے تھے نہہا کو یوں کالج آتے جاتے اور زندگی کی طرف لوٹنے دیکھ کر عذرا بیگم بے حد خوش تھیں۔

ان لوگوں کے آجانے سے دن بہت رنگین ہو گئے تھے نہہا کو یوں کالج آتے جاتے اور زندگی کی طرف لوٹنے دیکھ کر عذرا بیگم بے حد خوش تھیں۔

ان لوگوں کے آجانے سے دن بہت رنگین ہو گئے تھے نہہا کو یوں کالج آتے جاتے اور زندگی کی طرف لوٹنے دیکھ کر عذرا بیگم بے حد خوش تھیں۔

# خوابِ صورت اور معیاری ناول

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

رفعت سراج

رفعت سراج

رفعت سراج

نسیم سحر قریشی

ایم سلطانہ فخر

ایم سلطانہ فخر

شوکت رانا

پروین شریف

عینی ارسلان

ذکیہ بلگرامی

ذکیہ بلگرامی

جنت

شعاع

کنول

نبی

شگوفہ

چلمن

عرفانہ

دروانہ

اک لڑکی پاگل پاگل سی

میکر ندیم

سویچ نگر کی رانی

ورد کے فاصلے

آنکھ کا چاند

دل ایک گلشن

بے نام سی غلش

ساگر دریا، بادل، بوند

شاہکار

شہر یاراں

دل دریا تن صحرا

تو شریک سفر رہا

برگِ گل

دل اک گلاب سا

بھتور

گرفتار وفا

شہر وفا

گئے موسم کے گلاب

بندھن

## خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار، کراچی

کیا بالیا ہے میں نے پہلے باہر کر کے۔ وہہ لگوا لیا اپنی معصوم بیٹی کی پیشانی پر۔“  
عذرا بیگم تو اب بڑی خوش اور مطمئن تھیں جب سے حارث کی بات وہاں سے ختم ہوئی تھی۔  
”پی جان بچی جان اور چچا جان نے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں جیسے ہی وہاں بات ختم ہوئی سو حید نے کہہ دیا کہ اب نہہا ہی ان کی سہو بنے گی۔ وحید تو خیر پہلے ہی یہ چاہتے تھے مگر بیگم کا جھکاؤ اپنی بہن کی طرف تھا تو وہ بھی چپ ہو گئے اور ہماری بد نصیبی کہ نہہا کا اوھر ہو گیا۔“

”چلیں امی! چھوڑیں گزری باتیں۔ اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ آئندہ زندگی نبھانے کے لیے گزرتی۔ اب حارث ہے۔ اتنا اچھا نر کا ہے اور پھر گھر کی بات گھر ہی میں رہ جائے گی۔ آپ نے عامیہ سے بات کر لی۔“  
”ہاں۔ ہاں آتے ہی کر لی تھی۔ وہ بھی بے حد خوش ہوا ہے۔“

”لیکن میں نہہا کا سوچ رہی ہوں۔ نہ مان جائے گی۔“

انہی کو نبھانے کیوں یقین تھا کہ نہہا حارث کے لیے قطعی تیار نہیں ہوگی۔

”کیوں نہیں مانے گی۔ ارے بھی فرسٹ کزن ہے۔ ساتھ لیے بڑے ہیں۔ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس واقعہ کے بعد تو حارث ہی اس کا دوست ہرگز سا بھی ثابت ہو سکتا ہے پھر کیسے نہیں مانے گی۔“

”اچھا امی جان! مگر میرے خیال میں ابھی نہہا کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اسے دل لگا کر پڑھ لینے دیں پھر دیکھی جائے گی۔ گھر کی تو بات ہے۔“

”ہاں ہم سب نے یہ ہی فیصلہ کیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ امن سکون کے ساتھ میری بچی کو منزل نصیب فرمائے۔“

”آمین۔“ انھوں نے صدق دل سے آمین کہا۔

\*\_\*\_\*

”وہ ہو بھی یہ تو اچھی نہیں۔ اسی لئے میں کہوں کہ حارث صاحب ہیرو کیوں بنے ہوئے ہیں ویسے رسم کے وقت تو صابری خوش تھی۔“ تنہا کو اس خبر سے واقف دیکھ ہوا تھا۔

”کہاں خوش تھی۔ بناوٹی مسکراہٹ تھی۔ بس موقع پر بھرم رکھ لیا تھا اور جب عباد آیا آسٹریلیا سے تو یہ بھرم بھی ختم ہو گیا اور اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ حارث سے نہیں عباد سے شادی کرے گی اور جب حارث بھائی کو پتا چلا تو انہوں نے خود ہی انکار کر دیا۔“ شہوار نے ساری تفصیل بتائی تو تنہا اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف جب چاپ بیٹھے حارث کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بغور اسے دیکھنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“ حارث مسکرا پڑا۔

”تم نے واقعی دل سے انکار کیا تھا۔“ وہ اس کا چہرہ

پڑھ رہی تھی۔

”ہاں بھی، جس دل کی گلیوں میں اس کا گزر ہی نہیں تھا تو پھر اس باد صبا کے لئے دردانہ بند کرنا کوئی مشکل کام بھی نہیں تھا۔ یوں بھی وہ دونوں آپس میں انوالوتے تو میں دیوار کیوں بننا۔ شادی بچھوتے کے بجائے خوشی سے ہو تو زیاں اچھی گزری ہے اور یہاں تو نہ وہ خوش تھی اور نہ میں یہ تو اچھا ہوا کہ پہلے ہی بات ختم ہو گئی ورنہ بعد میں پچھتاوے رہ جاتے ہیں۔“ حارث کے لہجے کی سچائی اور یقین تنہا کو مطمئن کر رہا تھا۔

”واقعی۔“ اس نے شوخ سی بے یقینی سے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگا۔

”تم تو اچھی طرح جانتی ہو تنہا کہ میں دل پھینک قسم کا آدمی تو ہوں نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم بھائی بہن کی قسمت میں کچھ دفاعی کم ہے۔“

حارث نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہہ کر تنہا کی طرف دیکھا جو جب سے آیا تھا کئی بار بے چینی سے عالیہ کو فون کر چکا تھا اور وہ کمر پر ملی نہیں تھی۔ اس

وقت بھی وہ فون کر رہا تھا۔

”ہیلو جی۔ مس عالیہ سے بات ہو جائے گی۔“

لائسن ملنے پر تنہا نے بے چینی سے کہا تو دونوں لڑکیاں ہر طرف جھونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کون ہے یہ عالیہ۔“ تنہا نے آہستگی سے شہوار سے پوچھا۔ وہ اشارے سے خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا کہہ کر تنہا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”جی میں ان کا کلاس فیلو ہوں اور آج کل اسلام آباد آیا ہوا ہوں۔ جی ہسٹری میں ہولڈ کرتا ہوں۔“

وہ اس وقت اتنا کم تھا کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ تنہا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

”وہ شکر ہے عالیہ! آپ فون پر آمین تو کہہ کیا میں کون ہوں واہ کیا بات سے بھی کہ میں جب سے آیا ہوں فون کر رہا ہوں اور خترم نے پہچاننے سے انکار کر دیا ہے۔“

تنہا نے بڑے سار اور مان بھرے انداز میں شکوہ کر رہا تھا۔ شہوار کے چہرے پر آنکی سختی اور خفگی کے آثار سے تنہا الجھ سی گئی۔

”وہ اچھا نہ سب! آپ ہیں۔ کسے ہیں۔“ عالیہ کے لہجے میں کوئی گرم جوشی یا کسی خاص خوشی کا تاثر نہیں تھا۔

”جناب! یہ بتائیں کہ ملاقات میں پہل کون کرے گا۔ آپ آمین کی یا میں آجاؤں گی؟“ تنہا کو تنہا نے اس سے ملنے کی کیا بے چینی تھی۔

”ملاقات۔“ عالیہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ تنہا نے کہیں اسے تنہا جیسے اچھے اور ذہین لڑکے کا یوں کہیل ہونے والا انداز پسند نہیں آیا تھا۔

”میں تو یہاں خود مہمان ہوں۔ ایڈریس آپ کے پاس ہے۔ آپ آجائیں۔ آنا چاہیں تو ہے۔“ اس نے خاصی بے دلی سے کہا۔

”چھا تو تھک ہے آپ چائے بنائیں۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ خوشی سے بولا۔

”صرف آپ۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کے وہ کزن حارث نہیں آئے اسلام آباد۔“

”حارث ہاں حارث آیا ہے مگر تمہیں تو پتا ہے



اس میں ایک خرابی ہے۔ تو م بے زاری کی۔  
 زہیب نے سڑک حادثے کو دیکھا جو اپنا نام آنے پر  
 چونک کر متوجہ ہو گیا تھا۔

”کتنی عجیب بات ہے۔ کچھ لوگوں کی خرابیاں  
 خامیاں بھی ان پر سوٹ کرتی ہیں اور ان کی شخصیت کو  
 مزید وقار بخشتی ہیں۔“

”ہاں۔ ہیلو عالیہ! تو از نہیں آ رہی۔“

اس کی بات کا کچھ حصہ ہی زہیب کی سمجھ میں  
 آیا۔ لائن میں کھڑے کھڑے کچھ بات سمجھ میں نہیں  
 آتی۔

”یہ سمجھ میں نہ آنے سے بہتر ہے۔“ عالیہ نے  
 ریسیور رکھ دیا۔

زہیب ریسیور رکھ کر پلٹا تو شہوار کی نظروں میں  
 خفگی نہیسا کی نظروں میں سوال اور حادثے کے انداز  
 میں جی جی اور اپنی کچھ دیر پہلے والی حرکت پر شرمندہ  
 سا ہو گیا۔

”یہ عالیہ صاحبہ کی کیا کہانی ہے۔؟“

نہیسا کمر پر ہاتھ رکھے خبر لینے والے انداز میں  
 زہیب کے سامنے کھڑی تھی۔

”کہانی کیا ہے۔ بھئی داغ خراب ہے۔ کلاس فیلو  
 ہے ہماری۔ پوچھ لو حادثے سے۔ اچھی قابل لڑکی  
 ہے۔ اتفاق سے وہ بھی اپنی خالہ کے پاس آئی ہوئی ہے  
 اس نے فون بھنر دیا تو بات کر لی۔ یہ کہانی ہے۔“

زہیب نے شہوار کو دیکھتے ہوئے کھوکھلی سی صفائی  
 پیش کی۔

”اور اس کہانی کا اہم پہلو یہ ہے نہیسا کہ زہیب تو  
 یہاں آتا ہی نہیں چاہتے تھے مگر اب پتا چلا کہ اچانک  
 اسلام آباد آنے کا پروگرام کیوں بن گیا۔ زہیب کم از کم  
 میرے سامنے تو بات نہ کرتے۔ میرا بھرم ہی رہ  
 جاتا۔“

شہوار حساس سی لڑکی تھی اور لڑکیاں تو ایک بار دل  
 کے سنگھاسن پر جس کو بٹھا سکتی ہیں والدین جس سے  
 تعلق کی ڈور جوڑ دیتے ہیں اسی کی ہو رہتی ہیں اور پھر  
 اس نے تو زہیب کو چاہا تھا پھر اسے آئین وفا کیسے  
 توڑنے دیتی۔ وہ ضبط نہ کر سکی۔ دوسرے کمرے میں

چلی گئی۔  
 ”بھائی! یہ سب کیا ہے۔؟“ نہیسا تو پریشان ہی  
 ہو گئی۔

”کچھ بھی نہیں شہوار جمالت کا ثبوت دے رہی  
 ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔“ وہ صاف جھوٹ بول رہا  
 تھا۔ نہیسا کو قطعی یقین نہیں آیا۔ حادثے نے گہرا  
 سانس لیا اور ایک نظر زہیب پر ڈال کر باہر نکل گیا۔

”ہو نہہ! ایک یہ موصوف خود کو خواہ مخواہ ہی ہیرو  
 سمجھ رہے ہیں۔ پانگل ہیں دونوں بہن بھائی۔“

زہیب نے غصے سے کھن دوار بھینکا۔  
 ”زہیب! یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ میں تو  
 سب کو محبت کی وادی میں ایک دوسرے کے لئے جان  
 دینے والی چاہت کو فضا میں چھوڑ کر آئی تھی پھر نفرت  
 کا عفریت کہاں سے آیا۔ کس نے ہماری محبتوں کی  
 فیصل میں درار ڈال دی۔ کون ہے وہ زہیب؟  
 شہوار تو تمہارا جنون تھی۔“

”تمھی کیا ہے۔ شہوار غلط سمجھ رہی ہے۔ سمجھاؤ  
 اس کو اور یہ تم اپنی سیریس کیوں ہو رہی ہو۔ تم مجھے  
 اپنے بھائی کو نہیں جانتی ہو۔“ زہیب اس صورت  
 حال سے خود بھی پریشان ہو گیا۔

”پھر۔ پھر بھائی ایسا کیا ہو گیا ہے۔ شہوار کی  
 آنکھوں میں آنے آنسو بے معنی نہیں تھے۔ حادثے کا  
 انداز اس کا رویہ اس کی نظر۔“

”کچھ بھی نہیں لگا۔ جاؤ ان احمقوں کو سمجھاؤ اور  
 پروگرام بناؤ عالیہ بے حد اچھی اور قابل لڑکی ہے۔ وہ  
 ہمارا انتظار کرے گی۔ دیکھو نہیسا! تم میری بہن ہو  
 ناں۔ مجھے تو غلط نہیں سمجھتیں ناں شہوار کا تو رشتہ ہی  
 ایسا ہے کہ وہ شک کر سکتی ہے مگر تمہیں اور حادثے کو  
 ہرگز شک نہیں کرنا چاہیے۔“

”اس کو خفا تم نے کیا ہے۔ خود ہی مناؤ جا کر۔“

نہیسا نے یہ ذمہ داری بھی اس پر ڈالی تو وہ سر کھجاتا  
 ہوا آگے بڑھ گیا اور نہیسا لان میں چلی گئی جہاں  
 حادثے بچوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

”بھئی! کتنے تو ہم بھی کرکٹ کھیلیں گے۔“

نہیسا نے پوی کے ہاتھ سے بیٹ لے کر سنبھالا۔

آج کل وہ بڑی خوش تھی اور بچوں کے ساتھ ہر کھیل میں شریک ہو جاتی تو وہ خوش ہو جاتے۔ اپنی پھوپھو میں یہ خوشگوار تبدیلی ان کو بہت بھلی لگتی تھی۔  
 ”حارث! مجھے تو تم ہی باؤلنگ کرانا۔ یہ لومی کا بچہ اتنی تیز بال پھینکتا ہے۔ سیدھا کپٹی کا نشانہ لیتا ہے۔“

نہہا نے بال حارث کی طرف اچھالی تو اپنی باؤلنگ کی توہین بر لومی کا موڈ آف ہو گیا۔ تب حارث نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔  
 ”لومی! تم کپٹی کا نشانہ لیتے تھے ناں۔ ہم کو دکھو۔ آکھ کا نشانہ لیتے ہیں۔“

اور پھر حارث نے آہستگی سے بال نہہا کی طرف اچھالی تو بال اس کی ٹاک بر لگی۔  
 ”محمود ذرا حارث کے بچے میں نے تم پر اعتماد کیا اور تمہیں پونی آؤ پکڑو چا جو کوسہ“ اور پھر نہہا اور پونی حارث کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ کتنے عرصے بعد میں یہ خوشگوار ہنگامہ ہوا تھا۔ عذرا بیگم اور انہما بھی وہیں آ گئیں۔

”ماشاء اللہ۔ چشم بد دور خدا میری بچی کی ہنسی کو دوام بخشنے۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں دونوں حارث اور نہہا کیوں ہو۔؟“ انہوں نے اپنی بات کی تائید کے لئے انہما کو دکھا۔

”جی امی جان کیوں نہیں۔ ماشاء اللہ اب تو نہہا بہت خوش رہنے لگی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے زندگی کی تمام خوشیاں دے۔“

”آمین۔ آمین۔“ عذرا بیگم کے دل کی گہرائیوں سے آمین کی توازا آئی۔

”تم محمود تو حارث کے بچے میری ٹاک سرخ ہو گئی ہے۔ تمہیں بخشوں گی تو نہیں۔“ بھاگتے بھاگتے سانس پھول گئی تھی مگر نہہا اور پونی حارث کے پیچھے بھاگ رہی تھی اور اس بار اسے بچانے کس چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ قریب تھا کہ وہ گرتی کسی نے اسے شانوں سے تمام لیا۔ اس نے چکراتے سر کے ساتھ تھانے والے کو دکھا تو وہ احمر تھا جو قدرت کی طرف سے اس حسین

اتفاق بر خوش اور شوخ ہو رہا تھا۔  
 ”دیکھ لو خدا کی مہمانی کبھی نہیں کبچ کر لیتا ہوں“ کبھی تمہاری گیند کو۔“ وہ شوخانہ سوج کر رہ گیا۔ یوں نہہا کے چہرے پر ناگوار تازدیکہ کر اس نے بھی براسا منہ بنا لیا۔

”مگر کیوں گودھیان سے رہنا چاہئے۔ بچانے کیا ہو گیا ہے آج کل کی لڑکیوں کو۔ ہرنیوں کی طرح فلا چھیں بھرتی پھرتی ہیں۔ اس بچہ بھلا میں نہ تمام لیتا تو دن میں مارے نظر آجاتے شکر کریں۔ چاند نے تمام لیا۔“

وہ ڈانٹنے والے انداز کہہ رہا تھا اور وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر وہ پیشہ درست کرنے لگی۔  
 ”اے انکل! آپ اتنے دنوں بعد کیوں آئے ہیں۔ ہم تو اس ہو گئے تھے۔“ دنوں بچے آکر اس سے لپٹ گئے۔

”تو بیٹا! آپ لوگوں نے کون سا یاد کیا تھا۔؟“ اس نے بھی دھیرے سے شکوہ کر دیا نہہا کو دیکھتے ہوئے۔  
 ”کیوں یاد نہیں کیا۔ انکل! ہم نے تو کئی بار پھوپھو سے کہا تھا کہ آپ کو مسیج دیں کہ ہم اداس ہیں۔ پھوپھو نے دیا نہیں تھا۔“

دونوں بچوں نے احمر کے بعد شاکی نظروں سے نہہا کو دیکھا جو نظر حرا گئی کیونکہ دونوں بچوں نے بار بار کہا تھا مگر وہ کیسے اس کو کہتی کہ ہمارے گھر آؤ۔  
 ”بھئی بچو! آپ کی پھوپھو پیغام کی اجیت کو سمجھتی کہاں ہیں۔ رہی بات دینے کی تو نفرت حقارت اور لعن طعن کے سوا یہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتیں اپنی دے کیسے ہو آپ لوگ۔؟ بڑے خوش لگ رہے ہو۔“

”انکل! کراچی سے داوی جان شہوار پھوپھو اور دونوں چاچو آئے ہوئے ہیں۔“ بچوں نے اپنی خوشی کا سبب بتایا تو احمر نے قدرے فاصلے پر نہہا اور حارث کو دیکھا۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

”اے واہ بھئی۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ آئے ہوئے ہیں پھر اب ہمارا کیا کام ہے۔ میں چلا ہوں۔“ احمر واپس پلٹا تو دونوں بچے اس سے لپٹ

مگر نے نذیب اور شہوار کے درمیان چلتی ہوئی  
 نہیہا کو دیکھ کر کہا تو اس بار بھی اس نے ناگوار سا تاثر دیا  
 "اک سردی لہرا حمر کے اندر اتر گئی۔ پھر حمر کا تعارف  
 سب سے ہوا۔ سب ہی خوش ہوئے تھے اس سے مل  
 کر۔"

"چھا تو یہ ہیں ہمارے بچوں کے احمر انکل۔ اور  
 ہماری نہیہا کے کلاس فیلو بھی۔" نذیب نے بڑی  
 خوش حالی سے اس سے مصافحہ کیا۔

"مس نہیہا کا کلاس فیلو ہونا تو اتفاقہ مجبوری ہے۔  
 ویسے یہاں میں اپنے ان ننھے منے دوستوں سے ملنے  
 آتا ہوں۔" حمر نے بھی نہیہا کی بے رخی کا بدلہ لے  
 لیا۔

"بہر حال ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آپ آتے ہیں  
 اور ان سے کھلتے ہیں دل بسلا رتا ہے ان کا۔ اور  
 پڑھائی کے علاوہ کیا کرتے ہیں آپ۔؟"

"جی پڑھائی کے علاوہ موٹر مکینک ہوں۔"  
 "جی موٹر مکینک۔" حارث کے سوال پر حمر  
 نے بے ساختہ کہا تو شہوار نے حیرت سے حمر کو دیکھا۔  
 اتنا خوبو، اسماٹ پنڈہ اور مالی حیثیت بھی شخصیت  
 سے ظاہر ہو رہی تھی پھر موٹر مکینک کیسے ہو سکتا  
 ہے۔

"جی میں کوئی باقاعدہ موٹر مکینک نہیں ہوں۔  
 یوں ہی کبھی کبھار سرراہ کوئی گاڑی خراب ہو جائے تو  
 ٹھیک کر دیا کرتا ہوں۔ کیوں بھابھی۔؟" حمر نے  
 انیقہ کی طرف دیکھا تو وہ ہنس بڑی۔

"یہ شریر ہماری گاڑی کا گمہ رہا ہے۔ اتفاق سے  
 ہماری گاڑی ایک جگہ بند ہو گئی۔ میں اور نہیہا تھیہ  
 بیچارہ گزر رہا تھا۔ اس نے ٹھیک کی تو ہم گھر آئے ویسے  
 حمر! مبارک ہو۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں نئی گاڑی  
 دے دی ہے۔"

"ارے واہ مبارک ہو پھر تو کوئی میٹھی سی چیز ہونی  
 چاہئے۔" اس نے قریب کھڑے نومی کو چوم لیا۔  
 اور پھر وہ اتنی باغ و بہار طبیعت کی وجہ سے چھاسا گیا۔  
 خوبو سایہ لڑکا سب ہی کو پسند آیا تھا۔

"چھا جی اب اجازت۔ ہوٹل گیٹ بند ہو گیا تو

"نہیں انکل! آپ تو سب سے زیادہ اچھے  
 ہیں۔" واقعی ذرا زور سے یہ ہی بات کہو۔" اس نے  
 جھک کر دونوں بچوں کو پیار کر لیا اور نہیہا کو سنانے کے  
 لئے کہا۔

"ارے حمر! آؤ بھئی۔ بڑے دنوں میں آئے۔"  
 انیقہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بھی ان ہی کی طرف آ گیا۔  
 "آؤ اب! بھابھی کیسی ہیں۔" دونوں بچے اس کے  
 دائیں بائیں ہاتھ پکڑ کر کھڑے تھے۔

"اللہ کا شکر ہے۔ تم کہاں رہے۔ ہم نے تو  
 تمہیں بہت مس کیا ہے۔ بچے تو ہر روز اپنی کچھو کو  
 کہتے تھے کہ حمر انکل کو کہہ دیں کہ ہم آؤ اس ہیں  
 آجائیں۔"

"بخدا بھابھی! مجھے ایک بھی مسیح نہیں ملا ورنہ  
 میں ضرور آتا۔ ویسے مجھے نہ آکر احساس ہوا ہے۔  
 آپ لوگ بھی مجھے چاہتے ہیں۔ میری چاہتیں یک  
 طرفہ نہیں ہیں۔" اس نے نہیہا کو قریب آتے دیکھ  
 کر کہا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی عذرا بیگم کے ساتھ بیٹھ  
 گئی۔ اس کے برابر ہی حارث آ بیٹھا۔

"امی جان! یہ حمر ہیں میرا بہت پیارا سا بھائی بہت  
 اچھا بچہ ہے اور نہیہا کا کلاس فیلو بھی ہے۔" انیقہ  
 نے خاص طور پر اس کا نہیہا کا کلاس فیلو کہا تو حمر نے  
 ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھ کر اندر  
 آئی۔

"السلام علیکم آئی! کیسی ہیں آپ۔؟" حمر نے  
 قدرے جھک کر عذرا بیگم کو سلام کیا تو انہوں نے پیار  
 سے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا۔

"جیتے رہو میاں! یہ تعارف تو رسم ہی ٹھہری ہو ورنہ تو  
 بچے ہر وقت حمر انکل کی اس طرح گردان کرتے تھے  
 کہ بن تعارف کے میں پہچان گئی تھی۔ جیتے  
 رہو۔ میرے بچوں کے ساتھ اتنی محبت کرتے  
 ہو۔"

"محبت تو آئی میں اور بھی لوگوں سے کرتا ہوں مگر  
 محبت کا جواب صرف بچے ہی دیتے ہیں۔"

چور و روزے سے جان بڑے گا اور ہو مثل کا سزا ہوا  
 کھانا گرم ہو کر اتنا بڑا ہوا جاتا ہے کہ۔۔۔  
 ”بیٹھو یار! کھانا کھا کر جانا۔۔۔“ زویب اس کا ہاتھ  
 پکڑ کر بٹھانے لگا اور اتر جو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زویب  
 کی بات پر مڑ کر اسے دیکھنے لگا تو پہلی نظر نہیہا کے  
 ناگوار چہرے پر بڑی تو ذری طور پر دو باتیں ذہن میں  
 آئیں۔ اول تو یہ کہ ماں کے چلا جانے کے بعد سہری پہ  
 کہ اس کا تو فائدہ نہیں اصرار کسی کو کیا پتا ہو گا کہ تم  
 خفا ہو کر گئے ہو۔ بہتر ہے کہ محترمہ کو جلایا جائے۔  
 اک شوخ سی چمک آئی تھی اس سوچ کی صورت میں  
 وہ بیٹھ گیا۔

”چھا تو یہ ٹھیک ہے یوں بھی بھابھی کھانا بے حد  
 لذیذ بتاتی ہیں۔ آج تو خوب کھاؤں گا۔۔۔“  
 کوئی جان بھی نہ سکا کہ وہ کس کو جلانے کی خاطر یہ  
 باتیں کر رہا ہے۔

”واہ بھابھی! کیا بات ہے آپ کے ہاتھ کی۔ اب تو  
 میں روز ہی کھانا کھانے آجایا کروں گا۔“ اس نے  
 بے زاری سے نہیہا پر نگاہ ڈالی اور طلب نہ ہونے کے  
 باوجود کباب پلیٹ میں رکھ لیا۔

”بھابھی! کباب تو ایسے بنائے ہیں کہ جی چاہتا ہے  
 جیب میں چھپا کر لے جاؤں۔“

”ارے بھئی چھپانے کی کیا ضرورت ہے تم یوں  
 ہی لے جاؤ ویسے یہ کباب تمہاری کلاس فیلو نے بنائے  
 ہیں۔“

انفجہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو اصرار نے ہاتھ وہیں  
 روک لیا اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ وہ اسے ہی  
 دیکھ رہی تھی۔ اس نے برا سامنہ بنا کر کباب واپس  
 رکھ دیا۔ بولا کچھ نہیں۔ باقی سب اپنے اپنے کھانے  
 میں مصروف رہے۔

”ویسے اصرار! عام طور پر تو کلاس فیلوز آپس میں  
 خوب باتیں کرتے ہیں مگر تم دونوں نے تو اب تک  
 ایک دوسرے سے ایک بات بھی نہیں کی نہ ہی اس  
 تعلق کو ظاہر کیا ہے جبکہ کچھ کلاس فیلوز تو۔۔۔“  
 حارث کے لہجے میں چھپا طنز زویب سمجھ گیا تھا مگر وہ  
 اسے اہمیت ہی کب دے رہا تھا۔

”ارے حارث بھائی! یہ تو محض اتفاق ہے کہ ہم  
 کلاس فیلو بن گئے ورنہ تو میں بھابھی اور بچوں کو چانتا  
 تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ کلاس فیلو ہیں، بہر حال یہ بتائیں  
 کہ کل آپ کا کیا پروگرام ہے۔“

وہ بے نیاز لہجے میں اسے نظر انداز کر رہا تھا تو پہلی بار  
 نہیہا کو اس کا یوں لا تعلق اچھا نہیں لگا۔ مگر وہ کچھ بھی  
 ظاہر کرنے بغیر برتن اٹھا کر کھتی رہی۔

”کل تو ہم لوگ کہیں جا رہے ہیں۔“  
 ”چھا تو ٹھیک ہے کل ہم اور پروگرام ہوتا میں گے  
 مری چلیں گے۔ سٹو فالنگ ہونے والی ہے بڑا لطف  
 آئے گا اور اس دفعہ تو اور بھی مزا آئے گا آپ لوگوں  
 کے ساتھ۔“

”ضرور کیلنڈر نہیں۔“ اور پھر اصرار نے حافظہ کہہ کر  
 چلا گیا۔ بعد میں کتنی ہی دیر اصرار موضوع گفتگو بنا رہا تو  
 نہیہا نے گردنوں سے اٹھ کر باہر آگئی۔ ساتھ ہی شہوار  
 بھی آئی۔

دونوں لان میں ٹپٹپے لگیں۔ بھئی چاندنی کا سکوت  
 پھیلا ہوا تھا۔ نرم اور نرم گھاس پر چلتے ہوئے انہوں  
 نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں، چاند کی ہمراہی میں کبھی  
 ہنس پڑتیں اور کبھی سنجیدہ ہو جاتیں۔

”نہیہا! تم ابھی کہہ رہی تھیں اس تمام مزا ایک  
 سے ہوتے ہیں تو کیا زویب بھی۔“

”نہیں۔ نہیں شہوار! زویب ہمیں شدت  
 سے چاہتا ہے۔ میں بھائی کو بہت اچھی طرح جانتی  
 ہوں۔ وہ تمہاری چاہت کی کتنی گہرائی تک اترتا ہوا  
 ہے کہ۔“

”نہیہا! وہم میرے قدم اکھاڑتا ہے مگر محبت کا  
 یقین تمام لیتا ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”شہوار! وہم بے وجود ہوتے ہیں۔ محض ہیولا  
 ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے اختراع شدہ ورنہ تو ان کا  
 کوئی وجود کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بس اللہ کی ذات پر  
 بھروسہ رکھو۔ یہ تعلق اسی کی پاک ذات نے جوڑا ہے  
 تو اس کی پاک ذات نگہبان بھی ہے۔“ نہیہا نے شہوار  
 کو بڑے اچھے لفظوں میں سمجھایا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا نہیہا! کہ اس لڑکی عالیہ

میں ہے کیا جو زویب اس سے اس قدر متاثر ہے۔  
 ”عالیہ نجیب کیا چیز ہیں دیکھ لیں گے کل جا کر۔  
 زویب نے کل شام کو تیار رہنے کو کہا ہے۔“

\*\_\*\_\*

اگلے روز شام کو وہ لوگ عالیہ کے پاس موجود تھے۔  
 سفید لباس میں سادہ سی بروقار لڑکی ایک ساتھ ہی بیٹھا  
 اور سوار کو پسند آئی اور کتنی عجیب بات تھی کہ سوار  
 جو اسے اپنی رقبہ سمجھ بیٹھی تھی۔ ڈھیروں شکوے  
 شکایات تھیں۔ اس سے ملی تو لگا جیسے کوئی شکوہ نہ ہو۔  
 حسد کی تپش حسرت سی ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری رنگت  
 اور بات کرنے کے انداز سے وہ دونوں متاثر ہو گئی  
 تھیں تو مخالف صنف تو پھر کمزور دل ہوتی ہے سب ہی  
 آپس میں کھل مل گئے تھے۔ البتہ حادثہ چپ چاپ  
 بیٹھا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ عالیہ کتنی بار  
 اسے دیکھ چکی ہے۔ عالیہ کے دو اور کزنز آگئے تھے۔  
 ”اچھا پھر اب جبکہ ہم سب جمع ہیں تو کوئی پروگرام  
 بناتے ہیں۔“ عالیہ کے کزن ساجد نے کہا۔

”جی ہاں ہم بھی چاہتے ہیں۔ تفریح کے دنوں کو  
 یادگار انداز میں گزاریں اس طرح کا ملاپ اتفاق اور  
 خوش قسمتی سے ہوتا ہے۔“

اور پھر زویب اور ساجد پروگرام بناتے رہے بیٹھا  
 اور سوار بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں تو عالیہ  
 آہستگی سے اٹھ کر حادثہ کے پاس آئی۔

”حادثہ! آپ الگ تھلک ہی رہتے ہیں چپ  
 چاپ سے۔“ وہ صوفے پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی  
 تو حادثہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اتنی اچھی سی  
 لڑکی کو کون پسند نہ کرے گا۔

”کوئی خاص وجہ نہیں۔ زویب نے آپ کو بتایا تھا  
 کہ مجھ میں یہ ہی خرابی ہے۔ آدم بے زاری کی؟“  
 حادثہ کی نظریں دور جیسے بنتے زویب پر گئیں۔ لہجے  
 میں ہلکا سا طنز تھا۔

”برائی بڑی ہو یا چھوٹی۔ برائی برائی ہوتی ہے مگر کچھ  
 لوگوں پر سوٹ کر جاتی ہیں ان کی برائیاں اور آپ  
 بھی۔“ اور پھر وہ بات اوچھوری چھوڑ کر اٹھ گئی تو  
 حادثہ کو لگا جیسے اس کی منک اس کے پاس رہ گئی ہو۔

پھر اس نے سر جھٹک دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ  
 زویب کے سامنے نگاہ نیچی کرنا نہیں چاہتا تھا۔  
 درمیان میں اس کی اپنی مخصوص بہن کی خوشیاں  
 تھیں۔

”عالیہ عالیہ ارے بھئی تمہارے مہمان آئے  
 کہ نہیں۔ ہمارا پروگرام بھی خراب ہو رہا ہے  
 اور۔“

احمر بولتا ہوا اندر آ گیا تو حیرت سے سب اس کو اور  
 وہ سب کو دیکھنے لگا۔

”اوہ نوہ یہاں بھی۔“ نیہا نے برا سامنہ بنایا  
 سوار نے ہاتھ دبا کر چپ رہنے کی تاکید کی۔

”حمر! تم یہاں۔“ زویب اور حادثہ ایک  
 ساتھ احمر کی طرف بڑھے۔

”آپ یہاں کیسے احمر صاحب۔“ سوار نے  
 مسکرا کر پوچھا تو وہ اس کی طرف گھوم گیا۔ برابر ہی نیہا

کھڑی تھی۔ احمر نے اس پر نظر ڈالی۔  
 ”آپ کے چہرے پر جو تحریر لکھی ہے ہاں کہ میں  
 کسی گھٹیا فلم کا گھٹیا سا ہیرو ہوں کہ جہاں آپ ہوں  
 وہیں پہنچ جاؤں۔ تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہ الگ  
 بات ہے کہ کچھ فلمی سے اتفاقات ضرور ہو رہے  
 ہیں۔ عالیہ اور میں آپس میں فرسٹ کزنز ہیں اور جس  
 گھر میں ہم کھڑے ہیں۔ یہ ہماری مشترکہ سکی خالہ کا  
 گھر ہے۔ عالیہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کچھ مہمان  
 آنے والے ہیں اور میں اس لئے آیا تھا کہ اگر اس کے  
 مہمان آکے جا چکے ہوں تو اس کو آپ لوگوں کے ہاں  
 لے کر جاؤں گا۔ اب مجھے کیا معلوم تھا ہماری منزل  
 ایک ہی ہے۔“

ساری تفصیل بتا کر احمر نے ایک نگاہ نیہا پر ڈالی  
 جس کے چہرے پر اس کے... سچائی کی چمک اور تعین  
 کی ملائمت آچکی تھی تو اک تسکین آمیز سا احساس  
 احمر کے اندر تک اتر گیا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”واہ بھئی۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ احمر بھائی! یہ  
 زویب اور حادثہ میرے کلاس فیلوز ہیں اور بہت  
 قابل لوگ ہیں۔ اور مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نیہا  
 کلاس فیلو ہیں۔“ عالیہ نے پیار سے نیہا کو دیکھا۔

”ہاں مگر میں یہ جھوٹ کسے بولوں کہ یہ بہت ذہین اور قابل آدمی ہیں۔“ احمر کی آنکھوں میں شوخیاں تھیں اس نے کن اکھیوں سے دیکھا سب کے ساتھ وہ بھی اس کی بات پر مسکرا دی تھی۔

”بھئی یہاں تو کلاس فیلو برادری بیٹھی ہے ہم جلتے ہیں۔“ ساجد اٹھ کھڑا ہوا تو احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔  
”صاف کیوں نہیں کہتے کہ ان کا فون آتا ہے یا کرنا ہے۔“ احمر نے ”ان“ پر زور ڈالا تو ساجد کھسکا سا ہو گیا کیونکہ وہ جا بھی اسی لئے رہا تھا۔ حنا اس کی منگیتر تھی اور وہ اسی کو فون کرنے جا رہا تھا۔

”یونانی۔“ ساجد کھسکا سا ہو کر اس کے شانے پر مکا مارتا ہوا نکل گیا۔ اور پھر وہ سب کتنی ہی دیر بائیں کرتے رہے۔ میرد تفریح کے پروگرام بناتے رہے۔

”چھاب اجازت چاہیں گے عالیہ! کیونکہ امی کہہ رہی تھیں یہاں آکر تم لوگوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ خود انجوائے کرتے پھرتے ہو۔ بچے الگ خفا ہوں گے۔“ وہ سب کھڑے ہو گئے۔  
”عالیہ! ہمیں آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔“

شہوار نے واقعی دل سے کہا تو ڈھیر سارا سکون زوہیب کے اندر اتر گیا۔

”عالیہ! بعض لوگوں کی شخصیت میں ایسی کوئی بات ہوتی ہے ایسا سمجھتا ہے کہ ہر کسی کو اپنا بنالیتے ہیں اور آپ بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں۔“

”کاش میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا جو دوسروں کو اپنا بنالیتے ہیں۔“ تنہا کی بات پر احمر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا سب مسکرا دیے۔

\*-\*-\*

”دبا! تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا جن لوگوں نے ہمیں دھوکا دیا تمہیں اغوا کرنے کی انتہائی کھنیا اور سچ حرکت کی اور تم پھر بھی۔ پھر بھی ان پر اعتماد کر رہی ہو۔ کیا جادو کر دیا ہے ان باپ بیٹے نے تم پر۔“

دبا کی بات پر جہاں ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔ زبیر کی

رکھیں غصے سے پھٹ جانے کی حد تک تن گئی تھیں۔ عائشہ غصے سے پاگل ہو گئی مگر وہ اپنے مضبوط ارادوں اور فیصلے پر چٹان بنی کھڑی تھی۔

”محبت اور اعتماد سے بڑا کوئی جادو نہیں ہوتا خالہ جانی! اس ڈرامے کے بعد تو مجھے ان لوگوں پر اندھا اعتماد ہو گیا ہے! دکھ اس بات کا ہے کہ آپ اپنی سمجھ دار ہونے کے باوجود دھوکا کھا رہی ہیں۔ بڑا بڑے کا فیصلہ کر چلی ہیں تو۔ تو میں آپ کے ساتھ اپنی برادری نہیں کر سکتی۔ میرے خدا کے بعد انکل قریشی اور شہباز ہی میرے سرپرست ہیں میں اس شخص پر قطعی اعتماد نہیں کر سکتی! انکل! ایک بار میرے ابو نے خدا اور رسول کے بعد آپ کو مختار اور میرا سرپرست بنایا تھا آج میں خود آپ کو یہ ذمہ داری دے رہی ہوں۔ یہ میری امانت ہے آپ کے پاس۔“

پورے اعتماد کے ساتھ اس نے فائل قریشی صاحب کے ہاتھ میں دے دی۔ تو انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے فائل پکڑ لی ایک نظر اس پر ڈالی وہ کل کی لٹھی سی بچی جب اس کے والدین خدا کو پیارے ہوئے تھے تو سال بھر کی تھی جس کو گود میں لے کر وہ شدت سے روئے تھے آج خود اپنی ذمہ داری ان کو دے رہی تھی پھر انہوں نے عائشہ کی طرف دیکھا جس کا بس اگر چلتا تو دبا کو مار ڈالتی۔ زبیر کے اندر تو طوفان اٹھ رہے تھے مگر چہرہ سرد خشک اور بے تاثر تھا۔ دبا نے ایک حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

”نکل! مجھے اب اپنی خالہ جانی پر اور ان کے شوہر پر بالکل اعتماد نہیں۔ یہ شخص۔“

”دبا میں تمہاری جان نکال دوں گی احسان فراموش لڑکی! یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے میری قربانیوں کا۔ زبیر میرے شوہر ہیں۔ تمہاری جرات کہ ان سے گستاخی کرو۔“

عائشہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ اس نے دبا پر ہاتھ اٹھایا مگر زبیر نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

”مہل۔ نال عائشہ! وہ تو بچی ہے، نا سمجھ ہے، تم کیوں بچی بن رہی ہو اور پھر تم سب کچھ جانتے ہوئے اس پر ہاتھ کیوں اٹھا رہی ہو اس میں اس کا قصور بھی

”ہونہ اور اکارہ“ ویانے نفرت سے سوچا اور  
 قریشی صاحب کے قریب چلی گئی  
 ”عائشہ! تم آج چھوڑو ان باتوں کو، موت زندگی کا  
 کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ دولت جائیداد نجانے کس کا  
 مقدر ہوتے ہیں۔ کون استعمال کرتا ہے، اولاد اگر  
 گستاخ ہو جائے تو اسے پیار سے سمجھانا چاہیے نہ کہ  
 اسے کاٹ کر پھینک دینا چاہیے اور یا، چلو پہلی گھر  
 چلتے ہیں، گھر کی باتیں باہر نہیں آنی چاہئیں چلو  
 شاباش۔“

زہیر نے آگے بڑھ کر ویانے کو شانے سے تھاما تو اس نے  
 نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس کی یہ حرکت  
 عائشہ کو مزید کھولا گئی۔

”آپ لوگ جائیے۔ میں یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں  
 جب آنا ہوگا صندریا باا کو فون کروں گی۔ وہ آکر لے  
 جائیں گے مجھے۔“ ویانے پر اعتماد لہجے میں کہا، وہ نہ تو  
 زہیر سے خوفزدہ تھی اور نہ ہی عائشہ کے ساتھ اس قسم  
 کے بدلے پر کسی قسم کے ملال کی جھلک تھی۔ اور یہ  
 ہی بات عائشہ کو تیا جانی تھی۔

”دیکھا۔ دیکھا اس احسان فراموش کا حال کہ  
 جان دینے والی ماں جیسی خالہ کے مقابلے میں اسے  
 ابرے غیروں پر اعتماد ہے تو کرفوں پر اعتماد ہے۔“  
 عائشہ کا بس چلنا تو وہ ویانے کا گلا دبا دیتی۔

”اس لئے خالہ جانی کہ یہ ہی میرے سچے دوست  
 اور ہمدرد ہیں، کاش۔ کاش خالہ جانی میں۔ میں آپ  
 کو ڈوبنے سے بچا سکتی۔ کاش۔ آپ کا خدا ہی محافظ  
 ہے بس۔“

”زہیر۔ زہیر چلیے کیا سوچ رہے ہیں آپ، اس  
 سے زیادہ میں اپنی اور آپ کی انسلٹ برواشت نہیں  
 کر سکتی۔“ عائشہ نے زہیر کو کھینٹا  
 ”عائشہ! جذباتی نہ بنو، وہ سچی ہے اور۔“

”بھاڑ میں گئی پچی۔“ چھوٹے سے جملے کا یہ تیر  
 سیدھا ویانے کے نازک دل میں پوست ہو گیا۔ گرم گرم  
 اچھے پانی سے رخساروں کی نرم جلد جل گئی اس نے  
 آنسوؤں کی دھند میں عائشہ کو زہیر کا ہاتھ پکڑے باہر  
 جاتے دیکھا اور پلٹ کر قریشی صاحب کے ساتھ لگ کر

کیا ہے۔ اوکے بے بی جیسے تمہاری مرضی۔ اب تم  
 بالغ ہو اگر سمجھتی ہو کہ تم اپنے بارے میں اچھا اور بہتر  
 فیصلہ کر سکتی ہو تو ٹھیک ہے۔ ہم تم پر اپنا فیصلہ مسلط  
 نہیں کریں گے۔ رائٹ نہیں اگر اپنے ابو کے ان  
 دوست پر اتنا ہی اعتماد ہے تو کوئی بات نہیں لیکن یہی  
 یہ نہ سمجھنا کہ ہم تم سے لا پرواہ ہو گئے ہیں۔ اپنی ٹائم تم  
 ہمارے پاس آ سکتی ہو۔ رہی جائیداد کی بات تو مجھے اس  
 سے کیا لینا دینا۔ قریشی بھائی کے پاس اختیارات  
 رہیں۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو بیمار آدمی ہوں،  
 اپنی بے شمار جائیداد سنبھال سکتا تو۔ قریشی بھائی یہ  
 عائشہ کی فائلیں بھی آپ ہی سنبھالیں۔ یہ سچ ہے۔“

”زہیر۔“  
 ”زہیر! آپ یہ کیا کر رہے ہیں اگر اس نا سمجھ کو ان  
 لوگوں نے شیعے میں اتار لیا ہے تو کیا ہوا لیکن میں آپ  
 کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں اور میرا سب کچھ آپ  
 کا ہے، اور تمہ۔“ عائشہ تورا کر ویانے کی طرف پلٹی تو  
 اس نے غصے سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

”تم کھانا کھاؤ گی دیا۔ خوب بدلہ دیا ہے تم نے میری  
 محبتوں کا خدمتوں کا احسانات کا، مجھے کیا خبر تھی کہ تم  
 میری اپنی ہو کر مجھے ہی غیروں کے سامنے رسوا کرو گی  
 اور میرے اس شوہر کو ذلیل کرو گی جس نے تمہیں ان  
 کے تختوں سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچایا،  
 اتنی چاہت اور محبت دیتے ہیں اور تم یہ صلہ دے رہی  
 ہونا سمجھ لڑکی! اپچا لو اپنے دوست دشمن کو“

وقت اور حالات نے ایک دوسرے پر جان دینے والی  
 خالہ بھانجی کو آمنے سامنے لاکھڑا کیا تھا۔  
 ”نا سمجھ کون ہے خالہ جانی! یہ تو وقت بتائے گا انشاء  
 اللہ۔“

ویانے عائشہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ کتنی  
 عجیب بات تھی کہ وہ اپنی اس جان دینے والی خالہ ت  
 گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اب وہ اس  
 کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی اس نے حقارت بھری  
 ایک نگاہ زہیر پر ڈالی جس کے چہرے پر اذیت ناک  
 تاثرات ابھرنے لگے تھے اور وہ دائیں ہاتھ سے سینہ  
 مسلاتا تھا۔

READING  
 Section

شدت سے رو پڑی وہ اسے ساتھ لگا کر پیار کرنے لگے۔

”بابا سے کہو میں ابھی آتی ہوں انکل وہ شہباز کہاں ہیں۔“

وہ شہباز کو دکھانا چاہتی تھی ماسی نے جو کچھ اسے بتایا تھا اس سے اسے بہت تکلیف ہوئی تھی اور وہ شہباز سے ملنا چاہتی تھی۔

”وہ اسے کمرے میں سے بیٹا۔“ انہوں نے بتایا تو وہ شہباز کے کمرے کی طرف آگئی۔

اور شہباز جو زخموں سے چور تھا۔ غصے اور نفرت کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ اس کے الفاظ ٹھنڈی پھوار کی صورت اسے پر سکون کر گئے، اس کو تو زخم بھی بھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، وہ اس کے اعتماد نے اسے اپنی نگاہوں میں کرنے سے بچالیا تھا، اسے تو اب یہ زخم عزیز ہو گئے تھے جن کے لگنے سے اسے وہاں کے دل میں اپنی حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

وہ دروازے پر آکر کھڑی ہوئی۔ رضوان اور شہباز کی نظریں ایک ساتھ اس پر آئیں، اس نے شرمندہ ساہو کر آنے کی اجازت چاہی۔

”آئیں ناں پلیز روبا۔“ رضوان اچھک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا، روبا آہستگی سے شہباز کے بیڈ کے قریب آگئی۔ ایسے بہت نرم انداز میں ہو رہی تھی کہ اس کی وجہ سے ان دونوں کو اسے حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

”آپ کیسے ہیں۔“ اس نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا۔

”الحمد للہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں، ہاں خوشی ہے تو اس بات کی کہ تم نے عائشہ باجی کی طرح مجھے غلط نہیں سمجھا، اگر تم بھی مجھ پر شک کرتیں تو شاید یہ زخم میری موت بن جاتے اور میں اپنی نظروں میں گر جاتا۔“

اس کی بات پر وہاں کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”دل میں رہنے والے کبھی نظروں سے نہیں گرا کرتے۔“

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی اور شہباز اس کے آنے اور جانے کے مسکور کن احساس کے

”آنا۔ نہیں بولنا چاہیے تھا بیٹا کچھ بھی سہی وہ ہے نہیں تمہیں انکل، آپ نے ان کو دکھا تھا، اس مکار اور اکار کی باتوں میں اگر مجھے کیا کہہ گئی ہیں انہوں نے کاٹ پھینکا ہے مجھے، انکل، خالہ جانی ڈوب رہی ہیں، ان کو بچائیں، انکل پلیز کچھ کریں۔ وہ زندہ ان کو مار دے گا، اغوا کے اس ڈرامے نے اس مکار آدمی کا پروہ چاک کر دیا ہے، انکل، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور آنکھوں سے دیکھا ہے مگر خالہ جانی کو کیسے جتاؤں، وہ دیوانی ہو گئی ہیں۔ انکل، میری خالہ جانی کو بچالیں۔“ وہ روئے گئی۔

”روبا بیٹے! جہاں تک میرے اختیارات تھے میں نے استعمال کیے اور سر توڑ کوشش کی مگر بیٹا جب انسانی کوشش کے چوار ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں ناں تو خود کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور ہم بھی طوفان میں گھری عائشہ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے ضرور بچالے گا۔ تم اپنے دلیے پر غور کرو، تمہیں بہر حال وہیں رہنا ہے ان ہی کے ساتھ۔“

روبا کو کہنی صاحب سے اپنے ابو جیسی خوشبو آئی تھی۔ اس کی بات پر انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ کتنی کم سن تھی لیکن کتنی ذہین تھی یہ بچی اور کتنے دکھ دیکھ لیے تھے اس نے کیسے حالات میں کھرنی تھی۔

”اس گھر میں آنا، رہنا تمہارا حق ہے بیٹی! مگر حالات نے ایسے دروازے پر لاکھڑا کیا ہے کہ میں اپنا حق بھی استعمال نہیں کر سکتا۔“

”تو انکل! آپ مجھے اس دروازے پر تنہا چھوڑ دیں گے۔“ وہ سسک پڑی۔

”بیٹا! کوئی انسان تنہا نہیں ہوتا، خدا ساتھ ہوتا ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”صاحب! بی بی کا ڈرامہ سب آگیا ہے۔“ ملازم کی آواز پر دونوں نے چونک کر دیکھا، وہاں چہرہ صاف



ساتھ اس کی بات کی لطافتوں میں کھو گیا۔

\*-\*-\*

”بہت احسان کیا ہے آپ کے بھائی صاحب نے یہ بے کار فائلیں آپ کے حوالے کر کے شکر یہ کے ساتھ واپس کر دیں۔“ زبیر نے فائلیں اٹھا کر عائشہ کے سامنے پٹھیں تو کچھ دیر کے لئے عائشہ کو بھی غصہ آگیا۔ ”کیا چاہتا ہے یہ شخص۔“

”کیوں زبیر اب کیا ہو گیا ہے؟“

”اس میں آپ کے والد صاحب کی تحریر ہے کہ جب تک قریشی آپ کو اجازت نہ دے، آپ اپنی جائیداد استعمال نہیں کر سکتیں اور وہ بڑھاناگ مرگ بھی اتھارنی لیٹر نہیں دے گا۔“

زبیر جو فائلیں مل جانے پر بہت خوش تھا اس بابندی پر سچا ہو گیا اور عائشہ کو بھی اس بات پر غصہ آگیا۔ ”زبیر! آپ فکر نہ کریں میں قریشی بھائی سے مختار نامہ لے آؤں گی۔“

”بس رہنے دو تم کیا کرو گی، قریشی بھائی جائیداد پر ناگ بن کر بیٹھا ہوا ہے، لڑکی کو الگ پٹی پر دھا رکھی ہے۔ اسے ذرا لحاظ نہیں ہمارا، ادھر میں ہوں کہ اپنی بیمار جان کے ساتھ تم لوگوں کو حق دلوانا چاہتا ہوں یہ کم بخت درد بھی جان لے کر چھوڑے گا۔“ زبیر نے پتھر سینہ تھام لیا۔

”زبیر! خدا کے لئے خود کو سنبھالیں، میں اس مکار انسان کی عیاری سمجھ گئی ہوں۔ اہم پتا اس نے اپنے باپس رکھا ہے، نچالے کیا مقصد ہے اس کا آپ فکر نہ کریں میں اب دیکھ لیتی ہوں اس قریشی کو بہت ہو گیا لحاظ۔“

اور عائشہ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنا ذاتی زیور اور کچھ جائیداد جو اس نے بعد میں بنائی تھی وہ سب زبیر کے نام کر کے فائل اس کے حوالے کر دی۔ ماسی سکیٹ اور دیبا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں اور اب وہ قریشی صاحب کے سامنے مختار نامے کے لئے کھڑی تھی۔

”عائشہ! میری بیٹی! کشتیاں نہ جلاؤ کہ کبھی لوٹنا تمہاری مجبوری بن جائے تو آگ کا سمندر تمہیں عبور

کرناڑے اور۔  
”مجھے فضول دلائل سے نہ بہلا میں قریشی صاحب! اس جائیداد سے اگر آپ کا کوئی تعلق نہیں کوئی مقصد نہیں تو پھر اس کو استعمال کرنے کا حق دیں، مجھے مختار نامہ لکھ کر دیں۔“

وہ بد تمیزی پر اتر آئی تو وہ بھی سخت ہو گئے۔  
”وہ کھو عائشہ لی بی! وہ جائیداد تمہاری تھی میں نے کاغذات تمہارے حوالے کر دیے۔ میری مرضی پر میرا حق ہے۔ میرا اختیار ہے میں مختار نامہ لکھ کر دوں نہ دوں یہ میری مرضی ہے۔“

”تو تھیک ہے قریشی صاحب! میں تو چاہتی تھی کہ پرانے تعلقات باقی رہیں لیکن آپ ایسا نہیں چاہتے تو دیکھا جائے گا پھر۔“ وہ غصے میں پرس اٹھا کر آگے بڑھ گئی

”پرانے تعلقات، عزت، محبت، وفاداری، تم نے باقی چھوڑا ہی کیا ہے۔“  
اک بیس سی ان کے بیمار دل کو تڑپا گئی۔

## خوبصورت اور معیاری ناول

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

شادہ خاتون

رضیہ جمیل

رضیہ جمیل

جنت

شعبان

کنول

نہشتی

شگوفہ

چلمین

عرفانہ

فروانہ

اک لڑکی پاگل پاگل سی

میکر ندیم

خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار، کراچی

جائیداد جو اب اس نے میرے نام کی ہے اتنی ہے کہ  
 بانی کی نہ بھی ملے تو مزے ہو جائیں گے۔“  
 ”اور چھوٹی بیگم کا کیا سوچا ہے۔“  
 ”ہائے۔ ہائے اظہر لہو تو آفت قیامت ہے یار! وہ  
 تو بن جائیداد کے بھی مل جائے تو زندگی کا مقصد پورا  
 ہو جائے کیا چیز ہے کیا بات ہے اس کے وقار میں کیا  
 کشش ہے اس کی ہر ادا میں۔ اس کی نفرت میں  
 بس اب میرے دل کی ملکہ ہے۔“

”کم آن اظہر لہو تو جس مقصد کے لئے استعمال کی  
 گئی وہ پورا ہوئی گیا“ اچھا خیر چھوٹو میرے رقیب  
 شہباز اور اس کے باپ کو ٹھکانے لگانا اب تمہارا کام  
 ہے۔“

”تم فکر ہی نہ کرو“ مگر لفظی لفظی والا وعدہ نہ  
 بھولنا۔“

”یا ممکن“ اچھا اوکے لگتا ہے عائشہ آ رہی ہے۔“  
 زبیر نے جلدی سے فون ہینڈ کر کے پیچھے دیکھا تو اماں  
 کیکنہ جلدی سے پلٹ رہی تھیں۔ زبیر عیسے سے پاگل  
 ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اماں نے ساری باتیں سن  
 لیں۔

”تم بڑھی خبردار جو ایک لفظ بھی بتایا ہو۔“ اس نے  
 اماں کے بال پکڑ لیے۔

”مم۔ مم۔ مم۔ میں نے کچھ سنا نہیں صاحب  
 کچھ۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ زبیر نے بڑی بے دردی  
 سے اماں کیکنہ کو بیڑھیوں سے دھکا دے دیا اور وہ  
 گرتی چلی گئیں۔

\*-\*-\*

”ہیلو۔ قریبی صاحب سے بات ہو سکتی  
 ہے۔“ بات کرنے والا اجنبی تھا۔

”جی میں بات کر رہا ہوں۔“ وہ اندر سے گھبرا گئے۔  
 ”بری خبر ہے قریبی صاحب! آپ کے بیٹے شہباز کو  
 قتل کر دیا گیا ہے۔“  
 ”کیا۔؟“

(باقی آئندہ)

”اوہو کم آن جاناں اگر بڑھا نہیں مانتا تو نہ سہی ہم  
 نے تو لحاظ کیا جب اسے ہی عزت راس نہیں تو پھر  
 جوڑیاں تو ہم نے بھی نہیں پہن رکھیں ہاں۔“  
 زبیر کے زہریلے لہجے کی تلخی اس کے چہرے پر آگئی،  
 اس کی نظروں کے سامنے وہاں بھی جولی دی دیکھ ہی  
 گئی۔ وہ کتنی ہی دیر دبا کو دکھتا رہا تو عائشہ نے ٹوک  
 دیا۔

”یہ آپ دبا کو ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔“  
 ”ہوئی۔۔۔“ وہ چونک کر اس کی طرف مڑا۔ ”یہ  
 ہی کہ کتنی بڑی اور کتنی حسین ہو گئی ہے ہماری بی  
 بی۔“

اس کی دبا کے لئے یہ نظریں، یہ انداز، عائشہ کو  
 اچھا نہیں لگا اور زبیر نے اس کی سوچ بڑھلی۔  
 ”وہ کھوٹاں کتنی بڑی ہو گئی ہے اور قریبی کے ہاں  
 آنا جانا مناسب نہیں خیر میں یہ دیکھ لوں گا جان تم فکر  
 نہ کرو ڈرائیو پر جا رہا ہوں چائے تو ہیں بھیج دیتا۔“  
 اک پر اسرار قسم کی سوچ کی چمک آنکھوں میں

لپے مہمل سی باتیں کرتا ہوا اٹھ کر بیٹرس رہ گیا۔  
 عائشہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھ کر وہ گئی پھر  
 سر جھٹک کر خود چائے بنانے چل دی حالانکہ اب تک  
 اماں کیکنہ ہی سارے کام کرتی تھیں مگر زبیر کی فرمائش  
 پر وہ اس کے تمام کام کیا کرتی تھی۔ وہ چلی گئی تو زبیر  
 موبائل پر باتیں کرنے لگا۔

”میں یار! ایک ہی حل ہے اس مسئلے کا کہ باپ  
 بیٹے کو فارغ کر دیا جائے ارے نہیں نہیں عائشہ بیگم  
 تو تنگی میں ہیں۔ البتہ یہ جو چھٹانک بھر کی لڑکی ہے  
 نا۔ بہر حال جب یہ حمایتی ہی نہ رہیں گے تو دیکھ لوں  
 گا“ اس دبا کو بھی ہاں ہاں۔ مرے گیوں جا رہے ہو  
 مالک تو بن جانے دو پھر مل بانٹ کر ہی کھائیں گے  
 اپنے دھندے میں تو دھوکہ دی چلتی ہی نہیں۔“

”تو تم عائشہ کو ان لوگوں سے متفر کرنے میں  
 کامیاب ہو گئے ہو۔“

”ارے ایسا ویسا“ عائشہ تو پوری کی پوری کھوٹی چوٹی  
 کی طرح جیب میں ہے خیر کھوٹی تو نہیں اس کی ذالی

تحریم حسن کو گھر میں پیار سے رانی کہا جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں آنرز فائنل کی طالبہ تھی۔ اس کا نکاح بچپن میں ہی شاہ زیب حسن سے ہو چکا تھا۔ شاہ زیب حسن تحریم کے چچا زاد تھے۔ ان کی پرورش نئیوال میں ہوئی۔ ان کے نخیال والوں اور والدہ نے انہیں تحریم سے بظن کر دیا تھا لیکن جب شاہ زیب نے یونیورسٹی میں تحریم حسن کو دیکھا تو پہلی ہی ملاقات میں اس سے متاثر ہو گئے، اور انہیں جب بتایا کہ تحریم ہی ان کی منگوانہ ہے تو انہوں نے اسے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ شاہ زیب کی والدہ کسی صورت تحریم کو بہو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔

تحریم کے والد نے شاہ زیب کو ان کی تمام جائیداد سوئپ دی تھی، جبکہ ان کے ماموں وسیم الرحمن نے بہن بھائی کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔

تحریم شاہ زیب سے بظاہر سمجھتی تھی، لیکن پکنک کے موقع پر جب شاہ زیب کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تو اس کے سارے جذبے عیاں ہو گئے۔ اس نے شاہ زیب کو صاف صاف بتا دیا کہ جب تک ان کی والدہ راضی نہیں ہوں گی۔ وہ انہیں قبول نہیں کرے گی۔

مسلسلہ کاوی

فریڈہ اشتہاق



۲۹  
انتیسویں قسط

وہ ریپور پھینک کر پلا۔  
”کچھ کیجئے شاید بھائی خدا کے لئے کچھ تو کیجئے مگر جلدی کیجئے۔“ اس نے انہیں شالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔  
”تم اسے اٹھا کر لاؤ میں گاڑی نکالتا ہوں۔“ شاید غلٹ میں دروازے کی سمت بڑھے۔  
جولفانہ انہوں نے اٹھایا تھا بدستور ان کے ہاتھ میں ہی تھا واپس ڈالنے کے بجائے دیکھے بغیر پونہی توڑ موٹر کار جیب میں ٹھونس لیا۔

وہ سب ہی کچھ اس طرح حواس باختہ ہوئے تھے کہ گھر میں موجود گاڑیوں کو بھی فراموش کر بیٹھے۔  
”ارے ہاں بھائی جان کی گاڑی تو خاصی بڑی ہے با آسانی لے جا سکیں گے۔ اتالی آپ کسی بیگ میں پانی کی بوتل اور گلاس بھی ڈال لیجئے۔“ رفعت کے اڑے ہوئے ہوش بھی مائل بہ ایسی ہوئے۔  
ڈاکٹر رفیق کا ہاتھ اب بھی رانی کی نبض پر تھا اور نظر رستہ داچ پر۔  
”تو اپنی پیسج No any Change کوئی امپروومنٹ نہیں ہے۔“ آصف کے قریب آنے پر سر کو منہ جینش دیتے ہوئے میسرے سے بولے۔

وہ سب بڑی تیزی سے ہاسپٹل پہنچے تھے۔  
آصف صرف کالج ہی کی حد تک نہیں ہاسپٹل کی حدود میں بھی بے حد مقبول تھا۔



Scanned By Waqar Azeem Pakistanipoint.com

REAR SECTION



یوں بھی اس کی ڈیوٹیز آج کل اسی شعبے میں لگ رہی تھیں۔  
”ڈاکٹر آصف کی بہن آئی ہے ایمر جی میں۔“

پورے شعبے میں کھلبلی مچ گئی۔

جو نیوز سہنڈ ہی نہیں سارا پیرامیڈیکل اسٹاف بھی دوڑ پڑا۔  
آدمے گھنٹے کے اندر اس کے اساتذہ بھی سب جمع ہو گئے۔  
غرض یہاں سے وہاں تک اور نیچے ہر طرف بل چل مچ گئی تھی۔  
ہر شخص بے حد مستعد اور فعال دکھائی دینے لگا۔  
رائی کو سیدھا آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا۔  
رفعت اور انالی کو باہر ہی رک جانا پڑا۔

گلاس بیورویشنز پر مشتمل کارپڈور میں موجود آصف اور شاید بھائی کو شیشے کی دیوار کے اس پار وہ مشینوں میں جکڑی  
ڈاکٹرز کی مکمل توجہ اور مسلسل جدوجہد کا مرکزی صاف نظر آ رہی تھی۔  
آصف راہداری کی دیوار سے پشت نکائے بالکل خاموش کھڑا ایک تک رائی کی صورت تک رہا تھا۔ یوں محسوس  
ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں پیروں کی جان ہی نکل گئی ہو۔ قوت گویائی بھی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔  
آگے سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر رضوان نے اس کے شانے پر حوصلہ افزائی کی تھی۔  
اس نے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔

ان کے چہرے پر وہی بے حد مانوس قسم کی پراعتاد مسکراہٹ جگمگائی۔

اور پھر جیسے سارے بند ٹوٹ گئے وہ بے اختیار ان سے لپٹ کر ان کے شانے پر سر ٹکا کر بلک کر رو دیا۔

”ہمت پکڑیں آصف! حوصلہ رکھیں! آپ تو خود بھی قریب قریب مکمل ڈاکٹر بن چکے ہیں، کسی بات سے ناواقف  
تو نہیں ہیں۔“ وہ اسے دھیرے دھیرے تسلیاں دیتے سمجھاتے اپنے ساتھ باہر لے گئے، شاید بھائی نے گردن کھما کر  
دیکھا ضرور لیکن اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی۔

انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ خود بھی پتھر ہو چکے ہیں۔ سرد اور بے جان۔

ان کے لب تو خاموش تھے، لیکن روح مسلسل دعا گو اور دل خدا کے حضور سجدہ ریز۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے سراسر امیری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، میری بہن تو بہت صحت مند تھی۔ کبھی کسی معمولی سی  
تکلیف میں بھی جھلا نہیں ہوئی پھر یہ اچانک کیا ہوا ہے؟“  
آصف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرے۔

”یہ ایک کنڈیشن اب بھی نہیں ہے۔ اسے ازنات سم کا منڈ آف ڈیز اور نائٹ اینی ہارٹ پروبلیم ہے۔“

”بلڈ پریشر (Low)۔“ ہو گیا ہے، خطرناک حد تک، کیس سیریس ضرور ہے، لیکن مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ آپ  
خود کو سنبھالیے خود نگرانی کیجئے۔ ریزاب ہو جائے گا انشاء اللہ۔“

”اسے ریزاب ہونا چاہیے، سر مجھے ہر قیمت پر اپنی بہن چاہیے آپ کچھ کیجئے، لیکن اسے بچا لے لے، ورنہ میں بھی  
زندہ نہیں رہوں گا، آپ میری زندگی لے لیں مگر ہمیں زندہ رہنا ہو گا۔“

وہ اس وقت صرف اور صرف ایک بھائی تھا اور بس۔

”گو شش کرنا بندوں کا کام ہے، لیکن باقی سارا اختیار تو اس کے ہاتھ میں ہے، ہم سب کو مل کر ہی جدوجہد کرنی ہے  
اپنی تمام تر اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ اگلے چھتیس گھنٹے خطرناک ہیں ان کے لئے، پارہ گھنٹے کے اندر اندر ہوش  
آ گیا تو سبھی خطرہ بالکل ختم ہو گیا تم تو خود ڈاکٹر ہو، عام لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو، کپ اپ پور سیلف مائی

READING

Section

”نہ۔“  
ہوں نے پھر اس کے شانے پر جھکی دی۔

”خدا سے بہتری کی امید رکھنی چاہیے ہمیشہ اور خود کو کھو۔ کارڈ ایگرا (F.C.C) ایسوسی ایشن ہارٹ لنڈز  
مارے ٹیسٹ کلیم آرے ہیں۔ وہ جو بیٹ مس ہو رہی تھی وہ بھی اب نہیں ہے پلڑی ٹھوڑا ڈسٹرب ہے۔ وہ  
میں بہتر ہو جائے گا انشاء اللہ بی بی مزید کرنے سے تو روک لیا گیا ہے مگر کونسلٹنٹ ہو گیا ہے۔ اسے اوپر جانا  
چاہیے۔“

رات سے ساتھ لیے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرتے دیکھ لیکن مضبوط قدموں سے مشینوں میں جھکڑی رانی  
کے بستر تک گئے۔

مجھے کے بہترین دلغ اس کے گرد موجود اسے زندگی کی جانب لوٹانے کی سعی میں مصروف نظر آرہے تھے۔ وہ کچھ دیر  
سین کی صورت تکرا رہا۔ وہ جو اس وقت زندگی کے سارے جھنجھٹوں جھکڑوں سے بے نیاز ان سب کی کیفیتوں  
اور احساسات سے بے خبر بے سدھ بڑی ہوئی تھی۔

وہ جھنجھٹوں کے بل فرس پر نکا تھا اور اس کی پیٹی بر سر نکا کر گیا اپنی سدھ بدھ بھی کھو بیٹھا ڈاکٹر اس نے آگے بڑھ کر  
سنبھالنا چاہا مگر پرویسر خالد اور سرجن رحمان نے بیک وقت ہاتھ اٹھا کر انہیں ہر قسم کے اقدام سے باز رکھا۔  
اس کے بے آواز آنسو رانی کا بستر بھگوتے رہے۔

\*\_\*\_\*

”تم مجھے شاہ زیب کے پاس لے چلو افتخار۔“ انہوں نے نتیجے کو سامنے پاتے ہی ہاتھ تھام کر پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔  
”ضرور لے چلوں گا پھپھو مگر پہلے آپ ٹھیک تو ہوں یہ ڈاکٹر آپ کو یہاں سے نکلنے کی اجازت تو دیں نا۔“ وہ  
دھیرے سے ان کے بیڈ پر ہی ٹک گئے۔

”میں اب ٹھیک نہیں ہو سکتی ہوں تم مجھے یہاں سے لے چلو میں ایک دفعہ اس کی شکل تو دیکھ لوں مرنے سے  
پہلے اس کے سامنے یہ اقرار تو کر سکوں کہ ہاں میں ہی غلطی پر تھی۔“ ان کی آنکھوں نے پھر پرنا شروع کر دیا۔  
”کیسی باتیں کرتی ہیں خالہ بی کچھ نہیں ہوا ہے آپ کو بہت چھٹی کی۔ انشاء اللہ یہ وقتی کیفیت ہے بہت جلد  
اچھی ہو جائیں گی آپ“ ٹوسیہ نے ان کے ہانڈ پر اپنا حنائی ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

”ہاں اور کیا ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی انشاء اللہ شیزی کے ساتھ رہے گا اپنے ہاتھوں  
سے اس کے سر پر سراسجا میں گی۔ اس کی دلہن گھر میں لائیں گی۔“ مسیلہ آلی نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی  
طرح ہلاوے دیئے۔

”ہائے یہ کچھ اچھا تو نہیں کیا بھٹھے بھائی نے میرے ساتھ میرا کلیجہ شق کیوں نہیں ہو جاتا میں کیسے مان لوں کیسے  
کہوں کہ دنیا میں کوئی رشتہ قابل اعتبار نہیں رہا؟“  
انہوں نے افتخار کا ہاتھ چھوڑ کر ٹوسیہ کا خوبصورت نیل بوتوں سے سجا مندی کی خوشبو سے رچا بسا ہاتھ تھام کر لیوں  
سے لگا۔

”سچ کہتے تھے انصرا رشتے تعلق خون کے یا گوشت پوست کے نہیں دل کے ہوتے ہیں جن کے آگے ساری  
دنیا کی نعمتیں دولت ثروت جاہ و جسم سب بے حقیقت ہو جاتا ہے۔“

پا پھر غرض کے ہوتے ہیں جس کے سامنے کسی رشتے ناتے کسی خلوص چاہت کی کوئی اہمیت کوئی حیثیت حقیقت  
نہیں رہتی۔ تم بھی تو میری بھانجی ہو میری جان میرے بھتیجا بھتیجی ہو۔ جو اپنی ساری خوشیاں سارے دکھ پریشانیاں  
بھول کر لوں میری بی بی سے لگے بیٹھے ہونے ہمارے تو سہی کیا اس نے سچ مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے؟ میری صورت

دیکھنے کا بھی روادار نہیں رہا ہے۔  
 ”نہیں پھپھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے اس کا غالباً ٹیلی فون خراب ہو گیا ہے میں اس سے رابطہ نہیں کر پارا ہوں۔“ وہ نظر اگے تھے۔

”مجھے بسلاؤ نہیں۔ اس طرح کے بہانے کیوں دیتے ہو جو اصل حقیقت ہے مجھے بتا کیوں نہیں دیتے۔ رابطہ کی کوئی ایک ہی صورت تو نہیں ہوتی۔“ وہ پھر رونے لگیں۔

”خدا کی قسم پھپھو! میں آپ کو بسلا نہیں رہا۔ اس کے دوستوں میں سے صرف ایک ہی کا نمبر میرے پاس ہے۔ آپ یقین کریں جیسے ہی اسے علم ہو گا اطلاع ملے گی۔ وہ پہلی فلائیٹ سے آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ نہیں تو آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ میں خود کنگ کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سینٹس کنفرم ہوتے ہی میں اور یہ آپ کو خود کراچی لے چلیں گے۔ مگر پہلے آپ سفر کے قابل تو ہوں۔“

”میں بھی چلوں گی افتخار میرا ٹکٹ ضرور بنوانا ڈراشیزی کے کان کھینچوں گی جا کر۔ کبھی یوں بھی کوئی بے خبر ہوتا ہے۔“ سہیلہ آبی نے پھرمان اور محبت کا احساس دلایا۔

”بھلا وہ انہیں یہ کیسے بتا دیتے کہ نجی نے انہیں آج ہی یہ اطلاع دی ہے کہ وہ اپنے فلیٹ میں موجود ہی نہیں ہیں۔ پچھلے دو تین روز سے کسی ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔“

یہ سن کر تو شاید ان کا دل ہی بند ہو جاتا وہ اچھی طرح جانتی تھیں اسلام آباد جانے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے اور اس بات پر تو کبھی ہرگز یقین نہ کرتیں کہ وہ اسلام آباد ہی میں ہوں گے امریکہ روانہ نہیں ہوئے ہر چند کہ وہ سہیلہ آبی کو آگاہ کر چکے تھے۔

”میں نے کنفرم کر لیا ہے۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں اس کا نام بھی شامل ہے جب تک تمام معاملات کلیئر نہ ہوں اصل صورت حال سامنے نہ آئے شامل تفتیش تو انہیں بھی کیا جائے گا۔ لیکن یہ بات صالحہ پھپھو کے علم میں نہیں لائی جا سکتی۔“

وہ جو خدشہ ان سب کو بریشان کئے ہوئے تھا وہ افتخار کے دلہے کے دوسرے ہی دن کسی زلزلے کی مانند سامنے آیا تھا شدید قسم کا طوفان تھا جس نے ان سب کو جزیروں سے ہلا کر رکھ دیا تھا وہ سب کچھ جو بڑی رازداری بہت احتیاط سے کیا گیا تھا۔ اچانک ہی اظہر من الشمس ہو گیا تھا۔

فرح کو فاروق اعوان نے مصدقہ اطلاعات کے ساتھ یکے واپس بھیج دیا تھا جن کے بارے میں وہ اس روز افتخار سے بڑا واضح قسم کا اظہار خیال کر چکے تھے۔

اور جو افتخار نے گھر کے ذمہ دار مردوں اور بڑی پھوپھی جان کے علاوہ کسی اور کے علم میں قطعی نہیں آنے دیا تھا فرح کی سرال دالے نہیں چاہتے تھے کہ وہ کسی بھی معاملے میں و سیم الرخص کے ساتھ تھی کئے جائیں۔ وہ خاصے اثر و رسوخ والے لوگ تھے اور اب وہ بہتی گنا اپنا سنبھل چکی تھی۔ جس میں انہوں نے بھی ہاتھ دھونے کی کوشش کی تھی۔

اور کیونکہ یہ شادی بھی اثاثوں کی تحقیقات کے سلسلے میں حقائق تک پہنچنے کا ایک موثر ذریعہ قرار پا سکتی تھی بے شمار گواہیوں کے ساتھ۔ اس لئے ان کا خیال تھا کہ فرح کا اپنے باپ کے گھر میں رہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ وہ اپنی لاعلمی کو معتبر قرار دے سکیں۔

گاڑی کی واپسی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اور دوسری ایسی تمام اشیاء بھی فرح کے ساتھ ہی واپس لوٹا دی گئی تھیں۔ جن کی برآمدگی کا کوئی امکان کسی قسم کا ثبوت بن کر ان کے لئے خطرہ کا موجب بن سکتا تھا اور میاں و سیم الرخص اپنے شریک کار گروپ آف انڈسٹریز کے دیگر مالکان کے تعاون سے جعلی ویزے اور پاسپورٹ کے ذریعے

راتوں رات ملک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔  
جس کا علم ان کے بیوی بچوں کے علاوہ باقی تمام اہل خانہ کو دوسرے روز فرح کو اس سارے ساز و سامان کے ساتھ  
موجود اور انہیں موجود نہ پا کر ہوا تھا کہ اب منجھلی تائی اماں کے لئے اس اتنی بڑی بات کو چھپالینا ممکن ہی نہیں  
رہا تھا۔

ذرا دست قلم کے دھماکے کے ساتھ گویا سب ہی کچھ سامنے آ گیا تھا۔  
وہ سب تو عز میں بچانے اور معاملات کو جو ذمہ دار ہے، صرف اس کی حد تک محدود رکھنے کی فکر اور تک و دو میں لگ  
گئے تھے۔

اور صالحہ بیگم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہاسپتال بزرگ کرنا پڑا۔  
منجھلی تائی اماں کو اب بالکل چپ لگ گئی تھی۔ ان کا وہ سارا تہیہ اور تنگنا صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا  
سچ کہا ہے کسی نے رام تیری لیلانیاری اس دنیا کے بھی کیسے اور کتنے رنگ ہیں۔ کوئی نہیں جان سکتا وقت پڑنے  
پر تو سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے، کل کے وہ یار عمار، آج کس قدر اجنبی ٹھہرے!

\*\_\*\_\*

شاہ زیب ویزا ہی کے سلسلے میں اسلام آباد گئے تھے۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ امریکہ کا چکر لگا چکے تھے اس لیے ویزا  
مسیکشن ہونے میں تو کوئی وقت نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ لگانہ انہوں نے ویزا ہاتھ میں آ جانے کے بعد ہی تحریم حسن  
کے نام روانہ کیا تھا۔

لیکن اسلام آباد میں ہی انہیں مختلف ذرائع سے علم ہو گیا تھا کہ وسیم الرحمن صاحب پوری طرح زور پر آ چکے ہیں۔  
اور بہت جلد اس پورے گروپ آف اینڈ سٹریز کے خلاف باضابطہ کارروائی کا آغاز ہو جائے گا۔  
اصل مسئلہ یہ تھا کہ بیشتر معاملات میں فرنٹ مین کے فرائض انہوں ہی نے انجام دیئے تھے۔  
شاہ زیب نے سوچا تھا لاہور کا چکر لگائیں لیکن پھر دل آناہ نہیں ہوا اور انہوں نے سیدھے کراچی کا رخ کیا۔ شاہ  
زیب نے فوری طور پر افکار سے رابطہ کی کوشش کی تھی۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔  
”تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے، میں یہ اور سہیلہ آتی، صالحہ چھپو کو لے کر تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں  
کل کسی بھی وقت کی فلائیٹ سے۔ انشاء اللہ تفصیل ملاقات پر بتاؤں گا۔“  
”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا، تم فلائیٹ روانہ ہونے سے پہلے مجھے رنگ ضرور کرنا۔ ایرپورٹ پر ملوں گا  
انشاء اللہ۔“

انہوں نے اپنے اضطراب پر قابو پانے کے لئے خود کو مصروف رکھنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن طبیعت اندر سے  
کچھ عجیب بے چینی کا شکار تھی۔

دھیان پلٹ پلٹ کر آیا جان کے گھر کی طرف جاتا رہا۔

چتا نہیں کیا صورت حال رہی ہوگی۔ کیا تاثرات ہوں گے ان سب کے میرے اس اقدام پر۔

اور تحریم حسن؟ کیا سچ مٹھسن ہو گئی ہوگی۔

وہ مجھے قبول کرنا، میری زندگی میں شامل ہونا نہیں چاہتی۔

وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اپنے اندر ہونے والے اس جمع تفریق کے سلسلے کو روک نہیں پارہے تھے۔

\*\_\*\_\*

سب سے پہلے ہاسپتال پہنچنے والے سینٹی تھے۔ ان کی شکل دیکھ کر شاہد بھائی کے دل کو تعویذ کا احساس ہوا تھا۔  
انہوں نے اپنی جگہ سے جھپٹس کی۔



”یہ تو نکل اینکڑا بیٹی ہے شدید قسم کا ڈپریشن اور ٹینشن لیکن اس طرح کا پینٹر ایسا م سے اس حد تک ڈاؤن ہو جانے کی فوری وجہ کیا بیٹی ہے؟ ہوا کیا تھا؟“

رائی کی تشویش ناک حالت کو دیکھ کر سیفی پریشانی کے ساتھ ہی سخت ترین الجھن کا مار بھی ہوئے۔  
 ”فوری وجہ؟“ اب شاہد بھائی کو اس لفافے کا دھیان آیا جو انہوں نے آمد کی انٹار کے تعاقب میں قالین پر سے اٹھایا تھا۔

”مسز تحریم شاہ زبیب حسن مگر یہ تو بند ہے۔ کھولا ہی نہیں کیا۔“ انہوں نے، اٹھل انداز میں ابولب بڑھاتے ہوئے اسے چاک کیا۔

وہ طلاق تفویض کے کاغذات تھے شاہ زبیب نے طلاق کا حق تحریم الجبم کی طرف لے لیا تھا۔  
 ”آف میرے خدا! میرے خیال میں یہ لفافہ کسی شدید غلط فہمی کی صورت میں اس اینکڑا بیٹی کا سبب بنا ہے سیفی؟“

”کیا...؟ کیا مطلب؟“ آساف کے بوجھ سے ڈو جی آواز پر سیلی نے تلمچم تک کر شاہد بھائی کی شکل دیکھی۔  
 اور ہاتھ برسھا کر کاغذات تمام لیے۔  
 اس کے ساتھ ایک خاصا تفصیلی خط بھی تھا۔  
 تحریم حسن!

جان کہوں یا روح؟

تم میری جرات مخاطب پر کتنی ہی ناراض کیوں نہ ہو یہ سچ ہے کہ میری زندگی کی آس ہو تم! تمہیں یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا تم میری ہو۔ میرے نام میری زندگی سے منسلک ہو چکی ہو اور اب ہمیشہ صرف اور صرف میری ہی رہو گی۔ مجھ سے دور رہ کر بھی یہ بندھن جو بابا جان کی خواہش پر قائم ہوا اب ٹوٹ نہیں سکتا۔ میں وہ کسی صورت کسی قیمت پر اور کسی حالت میں بھی نہیں ہونے دوں گا۔ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا تھا یہ فیصلہ جو پہلے کبھی صرف ہمارے بزرگوں کا تھا۔ اب میرا بھی ہے۔

میں اپنے اس دعوے اس وعدے پر کج بھی قائم ہوں۔ میں تمہیں خود طلاق نہیں دوں گا، مگر بات ساری یہ ہے کہ یہ رشتے یہ تعلق یہ بندھن جو دونوں کے ہوا کرتے ہیں نہ تو زبردستی قائم ہوتے ہیں اور نہ ہی زبردستی قائم کرانے یا رکھے جاسکتے ہیں۔

میں انے دعوے میں تخلص تھا۔ تخلص ہوں اور ہمیشہ تخلص ہی رہوں گا۔ لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ میں تمہیں مجبور کرنا یا درکھنا نہیں چاہتا۔ چاہت میں کیا دنیا داری؟ عشق میں کیسی مجبوری؟

اور تم نے مجھ سے کہا تھا کسی مرحوم کی خواہش کی نسبت زندہ لوگوں کے عزائم زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ہو گا وہی جو آپ کی امی جان چاہیں گی۔ پھر جس راہ چلنا نہیں اس کے کوس کیا گننا؟ آپ بھی رہی کیجئے جو آپ کی والدہ محترمہ چاہتی ہیں۔ یہی آپ کے حق میں بہتر ہے اور۔ اگر آپ چاہیں تو میں اجازت نامہ لکھ کر دینے کو بھی تیار ہوں۔ ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے۔

(حالانکہ ان کی خواہش کی تکمیل کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تکمیل ساری زندگی نہیں ہو سکتی۔)  
 اور یہ کہ۔ آپ بہت خوش قسم انسان ہیں اور خوش قسمی انسان کو حقائق کا ادراک نہیں ہونے دیتی۔  
 (یہ بالکل سچ ہے تب ہی تو ہم ان کی سنگینی سے واقف نہیں ہوتے!)

اور یہ کہ میرے یا آپ کے نزدیک اس نام نہاد بندھن کی کوئی اہمیت نہ سہی (ہر چند کہ تمہیں میرے متعلق اتنی قطعیت سے یہ فیصلہ گرتے کا کوئی حق نہیں تھا) لیکن میرے ابو بنر حال اپنے عزیز اکلوتے بھائی آکا جان مرحوم کی اس قسم کے اسیر ہیں جو آخر وقت میں اس بندھن کو قائم کرتے وقت انہوں نے دلائی تھی۔ کہ وہ کسی حال میں بھی

اسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اور یہ یقین میں دلا سکتی ہوں کہ اس کی موجودگی آپ کی راہ کی رکاوٹ نہیں بنے گی۔ آپ حقیقت پسند بلکہ حقیقت شناس نہیں اسی میں آپ کی فلاح ہے۔“

میں نے تمہارا یہ مشورہ قبول کر لیا ہے حالانکہ تم نہیں جانتے۔ حقیقت پسند یا حقیقت شناس ہونا تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں اصل چیز تو حقیقت کو ایذا اٹا کر As it is تسلیم کر لینا ہوتا ہے۔ وہ زہر جو ہم نے اتار لیا۔ لیکن تم اس کا حال کیا جانو؟۔

تم میرا ساتھ قبول کرنا نہیں چاہتے۔ اور تایا جان کا کہنا ہے کہ یہ زندگی کے معاملات ہیں ایسے مسائل کسی موبہوم سی آس یا امید ر حل نہیں کیے جاتے۔ زندگی کا سفر کتنا طویل ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا اور اب وہ مزید کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ اگر کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر وہ راستہ اپنا لینا چاہیے جو بہتری کی سمت لے جائے!

اور مزید یہ کہ ان کے خیال میں میرے پاس بھی بہت زیادہ وقت نہیں ہے اور وہ بھی خود کو مزید انتظار کی پوزیشن میں نہیں پارے۔ متبادل تو دونوں ہی طرف موجود ہیں۔ (حالانکہ مجھ سے متعلق ان کا یہ خیال بھی قطعی غلط ہے۔ میری طرف تو کوئی متبادل نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی تمام عمر ہو سکے گا۔ کبھی کوئی اپنی رنج کو بدل کر بھی زندگی پاسکا ہے؟ دلی بدکنے کے تجربے تو شاید پھر بھی کامیاب رہے ہوں گے۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ سیفی تمہارے لئے ایک بہتر متبادل ثابت ہو جائیں، جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے وہ بے حد مخلص، بے لوث محبت کرنے والے اور بہت حساس انسان ہیں۔ تایا جان کے کہنے کے مطابق رضوانہ خالہ نے ان سے فون پر تفصیلی گفتگو کی ہے ان کے بقول سیفی ماشاء اللہ خود کو اسٹیبلشمنٹ کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں اور رضوانہ ایک مدت سے اس مسئلے کے حل کے لئے کوشاں رہی ہیں۔ اور اب میں بھی اسے بے عرصے تک کیے التوا میں رکھنے کا حامی نہیں ہوں۔“

ہاں تحریم حسن! اگر بات صرف ائی کی حد تک ہوتی تو میں مسہد لیتا مسہد ہی رہا تھا اور شاید کوئی راہ نکال لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا، لیکن خیر۔ بہر حال۔۔۔

جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی دخل نہیں اور میری کوئی خطا نہیں اسے شاید ایسے ہی ہونا تھا۔

اور میں نے تم سے آخری بات یہی کہی تھی کہ میں امر کا جانے کے انتظامات کر رہا ہوں لیکن جانے سے پہلے اس معاملے کو آخری شکل دینی ضروری ہے، میں یہاں سے کوئی حتمی فیصلہ کر کے فیصلہ کن قدم اٹھا کر جاؤں گا اور اب۔۔۔ یہ فیصلہ وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو یا چاہو گی۔

سو فیصلہ تو مجھے کرنا ہی تھا۔ آج مجھے ”دیرا“ مل گیا اور یہ بھی عجیب حسن اتفاق یا سفارت خانے کی عنایت ہے کہ انہوں نے لمبی بل دیرا کا اجرا کیا ہے۔

ہاں تو تحریم حسن! میں روانہ ہونے سے پہلے بغیر کسی رباؤ اور جبر کے اپنی مرضی سے طلاق تفویض کی صورت یہ حق نہیں منقل کر رہا ہوں۔ تاکہ تم جب چاہو ”برضا اور رغبت اپنی خوشی سے۔“ اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں جو چاہو فیصلہ کر سکو!

اور میری دعا ہے تایا جان اور ثانی جان کی خواہش کی تکمیل کی صورت میں تم سیف الحسن کے ساتھ ایک بہت خوش و خرم اور بہترین زندگی گزارو۔

جو زندگی میں دعا میں کبھی ماچی تمہیں اپنے لئے  
تمام دعائیں میں تمہارے نام تمہیں اپنی لئے  
شاہد نب حسن ہوں

جو تمام تر تمہارا ہو کر بھی تم تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہی رہا۔  
خط کے اختتام تک آتے آتے سیفی کا چہرہ بالکل سرخ پڑ گیا تھا۔

شاید بھائی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے انکوٹھے اور انکھوں کی مدد سے پیشانی دبائے غالباً آنسوؤں کے ابال کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان دونوں نے وہ خط بیک وقت شانے سے شانہ ملا کر اکٹھے ہی پڑھا تھا۔

”مائی لارڈ! یہ کیا گزر رہا ہے! احتشام ہاموں۔“ سیفی شدید قسم کے احساس جرم اور پشیمانی کی زد میں آگئے۔ ان کا جی چاہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوڑتے ہوئے جائیں اور شاہ زیب حسن کو ہتھیار ڈال کر کہیں کہ یہ سب بزرگوں کی باتیں ہیں جس کے بیچ میں ہمیں کہیں موجود نہیں ہوں۔

تم بھی مجھے یوں بنیاد بنا کر کوئی فیصلہ کر لینے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

میں نے تو اپنے تمام جذبے خود اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھے تھے پھر تمہیں یہ حق کس نے دے دیا۔ کہ تم مجھے یوں بے نقاب کرنے کی کوشش کرو؟۔

گھر وہ اس وقت قطعی بے بس تھے۔

رفعت انابی کے پاس سے اٹھ کر کچھ آگے بڑھی۔ تو ان لوگوں پر نظر پڑ گئی اور دونوں کو یوں ششدر کھڑے دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے ان کی طرف آئی۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟ کیا ہے یہ؟۔“ اس نے سیفی کے ہاتھ میں تھامے کاغذات کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سیفی نے خط والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے باقی تمام اس کی طرف بڑھا دیئے۔

”نہیں سیفی! وہ دے دے یہ بھی۔ ان تمام لوگوں کے علم میں آنا چاہیے کہ کیا ہوا ہے، کیا جیتی ہے ان دونوں کے بیچ۔“ شاید بھائی کے لہجے میں حد درجے شکستگی اتر آئی۔

”لیکن لفافہ تو تم نے ابھی کھولا ہے اس کا مطلب ہے اس نے تو یہ خط پڑھا ہی نہیں۔“

سیفی نے وہ بھی رفعت کو تھماتے ہوئے شاید بھائی کی شکل دیکھی۔

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ لفافہ ہی کوئی بہت بڑی غلطی بنا ہے، میں آصف کو بلاتا ہوں۔“ وہ ادھر بڑھے تھے۔

”ہائے میرے اللہ! اسی یقین نے تو اسے اس حال کو پہنچایا ہے سیفی بھائی! وہ تو بڑے وثوق سے کہتی رہی تھی کہ شاید زیب کوئی قدم اٹھا ہی نہیں سکتے۔ کاش اس نے یہ خط پڑھ لیا ہوتا دیکھ تو کہتی یہ تو اس کے یقین کی جیت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اسے طلاق نہیں دے سکتے۔“ رفعت کے آنسوؤں کو ایک نئی راہ مل گئی۔ اس کے لئے تو کچھ بھی نیا نہیں تھا اس خط میں۔

”چھاب آپ بالکل خاموش رہے گا۔ آصف کے سامنے قطعی کچھ نہیں کہیں گی بلکہ ایسا کریں۔ آپ واپس انابی کے پاس چلی جائیں۔ ان کی بھی حالت اچھی نہیں ہے انہیں اکیلا مت چھوڑیے۔“ سیفی نے دھیرے سے ہدایت کی۔

اور سارے پیرزاس کے ہاتھ سے لے کر پھر سے لفافے میں ڈال دیئے۔

رفعت نے ان کی شکل دیکھی۔ چہرے پر سے آنسوؤں کے نشان صاف کرتی واپس پلٹ گئی کہ یہ حوصلہ تو خود اس میں بھی نہیں تھا۔

”یہ بے ہوش کیسے ہوئی تھی؟۔“ آصف کے قریب آنے پر سیفی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”وہ میں۔۔۔ ہاں یہ لفافہ کیا ہے اس میں؟۔“ اس نے وہ سیفی کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔

”اسے چھوڑو تم یہ بتاؤ۔۔۔ ہوا کیا تھا؟۔“

”میں کلج سے واپس آیا تھا۔۔۔“ آصف نے بالتفصیل دہرایا۔

”میں نے لفافہ ان کی گود میں پھینکا ان کے پوچھنے پر کہ کیا ہے یہ، میں نے کہا شاہ زیب بھائی نے طلاق کے کاغذات بھجوائے ہیں غالباً اس کے بعد آگے کچھ دیکھنے چکھنے کی توہمت ہی نہیں آئی۔“  
 ”یہ تم نے کیا کیا احمق انسان؟ کم از کم دیکھ تو لیتے۔“ شاہد بھائی کے ضبط نے بھی ساتھ چھوڑ ہی دیا۔  
 ”میں نے کہا بھی تھا تم سے، میری ایک بات یاد رکھنا آصف کہ بچپن کے ان رشتوں کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط ہوتی ہیں پھر بھی تم نے وہ بیان نہیں کیا، کوئی توجہ نہیں دی۔“ وہ خود پر قابو پانے کے لئے دوسری طرف مڑ کر کئی قدم آگے بڑھ گئے۔

”کیا۔؟ کیا مطلب۔۔۔؟“ اس نے کچھ ہونق ہو کر انہیں دیکھا۔  
 ”تم نے بہت برا کیا آصف! یہ طلاق نامہ نہیں ہے۔“ سیفی نے دیر سے کہا۔  
 ”پھر۔؟ کیا ہے یہ۔“ آصف نے مزید وحشت زدہ ہو کر سیفی کی شکل دیکھی۔  
 ”دیکھ لو۔ کیا ہے۔؟“ انہوں نے آہستگی سے وہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔  
 ”آف میرے خدا۔؟ تو انہیں اس حال کو پہنچانے والا میں خود ہوں۔“

وہ بری طرح لڑکھرایا۔ لفافہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اگر سیفی سنبھال نہ لیتے تو خود بھی گرا ہوتا۔ شاہد بھائی حیزی سے پلٹ کر ان کی طرف آئے تھے۔

\*-\*-\*

اس ساری ضرب تقسیم سے گھبرا کر تھک ہار کر بالا خورشاہ زیب نے رفعت کے نمبر ڈائل کئے رانی کا رو عمل وہ صرف اسی سے معلوم کر سکتے تھے۔

”جی گھر پر تو اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔“ فون ریسیو کرنے والی کوئی ملازمہ تھی۔  
 ”اس کا مطلب ہے حالات معمول پر ہیں۔“ وہ قدرے مایوس ہوئے۔  
 ”کہاں گئے ہیں۔؟“

”ہسپتال میں ہیں جی۔“

”ہاسپتال میں؟ کون تمام لوگ کیوں؟“ وہ بری طرح چونکے۔  
 ”جی وہ ادھر والے گھر میں جو رانی بلبل ہوتی ہیں۔ ان کی کچھ طبیعت خراب ہو گئی ہے ان ہی کے ساتھ ہیں سب لوگ۔“  
 ”رانی بلبل کی کیا طبیعت خراب ہو گئی ہے؟“ ان کے حواس کو شدید جھٹکا لگا۔  
 غلٹ اور پنے در پنے کئی سوال کرنے پر بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر انہوں نے تباہ جان کی طرف کا نمبر ملایا۔ فون اٹھانے والی زحمت تھی۔

”بہت سخت طبیعت خراب ہوئی ہے بڑے بھیاں وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔“  
 اس نے ان کی آواز سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔

”ہا نہیں جی، صرف آصف بھائی تھے ان کے پاس اس وقت۔“

اور پھر جو کچھ تفصیل اس نے بتائی وہ ان کے حواس پر سچ بجلی بن کر گری تھی۔

اس قسم کا اور اتنا شدید رد عمل ہو گا۔ یہ تو ان کے تصور کے کسی دور افتادہ گوشے میں بھی کہیں موجود نہیں تھا۔ زینو نے کسی خط کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا انہوں نے گھما پھرا کر بے شمار سوال کیے لیکن وہ سچ سچ وجہ کی طرف سے بے خبر تھی۔

اور اب شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔  
 حواس بالکل معطل ہو کر رہ گئے تھے۔

”تم نے ٹکٹ تو بنوالیے افتخار! لیکن صالحہ اس حالت میں بھی ہے کہ جہاز کا سفر کر سکے۔“ پھپھو بیگم کو سخت تشویش ہوئی۔

”میں نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد ہی بنگلہ کرائی ہے پھپھو بیگم! آپ فکر نہ کریں۔ شاہ زیب کے پاس پہنچ کر یہ بالکل ریپلیکس ہو جائیں گی مجھے یقین ہے۔“ افتخار مطمئن تھے۔  
 ”پچلو جیسی تمہاری مرضی، لیکن بہتر یہی تھا کہ تم شاہ زیب کو یہاں بلا لیتے۔“ پھوپھی جان کا تردد بھی کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ شاہ زیب کا یہاں آنا تو قطعی نامناسب ہے۔ میرے خیال میں بھی صالحہ ہی کا جانا زیادہ بہتر رہے گا۔“ بڑی مائی ماں فوراً بولی تھیں۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں پھوپھی جان! میں ساتھ جاتو رہی ہوں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا انشاء اللہ۔ جب شاہ زیب خود اپنے مکان میں رہ رہے ہیں تو پھر کسی مشکل کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے اور ڈاکٹر کی بھی کوئی کمی تو نہیں ہے وہاں بھی۔“ سہیلہ آپلی نے تسلی دی۔

”پچلو خدا جو کچھ کرے بہتر ہی کرے۔ ہاں نہیں اور کیا کچھ سامنے آنے والا ہے۔ میرا دم تو مستقل ہولوں پر ہی رہنے لگا ہے اب۔“ پھوپھی جان نے فحشٹی سانس لی۔

”ہاں نہیں، کس کی ہائے بڑی ہے خدا تمہیں بخشے بچھے بھالی جیسا کچھ تم نے کیا ہے، سر اٹھانے کے قابل نہیں رکھا۔“ پھپھو بیگم پھر غمگین تھیں۔ وہ ان کے لئے کوئی برا کلمہ بھی تو نہیں نکال سکتی تھیں کہ وہ ان کا اپنا خون کسکے بھالی تھے۔

”جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب جو کچھ سامنے آئے گا۔ انشاء اللہ بہتر ہی ہو گا، بس آپ یہ دعا کرتی رہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح غلط میں تیز اور درست فہمے کرنے کی توفیق عطا کرے۔“ افتخار نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔  
 دونوں پھوپھیوں کے ساتھ ہی ان کی امی نے بھی خاصے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔  
 مگر وہ سہیلہ آپلی سے مخاطب ہو گئے تھے۔

\*\_\*\_\*

رائی کی بے ہوشی کو ساڑھے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ حالت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے مزید دواؤں کے استعمال کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا، مشینی مدد بدستور جاری تھی۔ اور سینیٹر ڈاکٹر کی نگرانی بھی سب ہی ڈیوٹی روم میں موجود تھے۔

اور اب تو ردی، عمران وغیرہ کے علاوہ آصف کے اور بہت سے کولیک بھی جمع ہو گئے تھے، سرائے پر چھائے ہوئے کھل بنانے کے ساتھ بالکل جب احتشام حسن کچھ عجیب سکتے کی سی کیفیت میں تھے۔ اس مختصر سی جگہ میں شل شل کرانا کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں لیکن اندر کا اضطراب بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ رحمانہ بیگم تو جیسے کسی پتھر کی مورت میں ڈھل گئی تھیں۔ بالکل ساکت اور خاموش۔ آنکھوں کے سامنے دنیا لٹ رہی تھی۔ عمر بھر کی کمائی ڈوب رہی تھی۔ اور وہ تماشائی بنے رہنے پر مجبور تھیں۔

ارم بھائی اور رفعت کا رورو کر رہا حال تھا۔  
 انابی نے مستقل جائے نماز سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ سجدے سے سر اٹھانے کو تیار ہی نہیں تھیں۔  
 صفیہ چچی اور مای جان کبھی لوافل ادا کرنے لگتیں۔ کبھی قرآن شریف کھول کر بیٹھ جاتیں۔  
 عرفان، نجما، عثمان، ماموں، قیضان، عمران، بھائی وغیرہ کبھی اس دیوار سے ٹیک لگا لیتے، کبھی اس ستون سے ٹک جاتے۔  
 ایک گھنٹے کے اندر اندر یکے بعد دیگرے سب ہی ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔ اور اب کوئی وہاں سے ہٹنے کو بھی تیار

نہیں تھا، بھوک پیاس سے بے نیاز، وہ سب پیوستہ لب، ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے بغیر ایک دوسرے کی ڈھارس بنے اللہ کی رضا کے منتظر تھے۔  
وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اور ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے دوڑتی گھڑی کی سوئیاں ان سب کے اعصابی دباؤ میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔

صغیر ٹھہرے ہوئے یہ لمحے گزر کیوں نہیں جاتے۔  
آصف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی زندگی دے کر اس کے اندر زندگی کی لہر دوڑا لیتا۔  
اترار گئے، انکار گئے، ہم ہار گئے،  
چینے کے سب آثار گئے ہم ہار گئے،  
پتھر یادیں اس کی بیچ سمندر ڈوب گئیں،  
کچھ سننے اپنے وہ اس پار گئے ہم ہار گئے،  
اک عمر رہے ہیں بیت سے بے پروا لیکن،  
جب جیتنا چاہا جیون وار گئے ہم ہار گئے۔  
شاہ زیب بالکل بے جان اور ٹھکے ہارے قدموں سے سیڑھیاں طے کرتے اور آئے۔  
اسی وقت آصف بھی نگاہیں ڈور کھول کر باہر آیا۔ انہیں یوں اچانک سامنے پا کر اس کے اندر صدمے، غصے اور بے بسی کا ایک عجیب ابال سا اٹھا تھا۔

”میری بہن کی اس حالت کا ذمہ دار یہ شخص ہے۔“ ان کی شکل پر نظر پڑتے ہی لمحے بھر کو اس کا ذہن جیسے جنون کی حدود کو چھو گیا۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے۔“ وہ بڑی پھرتی سے ان کے مقابل آیا۔  
”تم نے میری بہن کی زندگی ختم کر دی، بے رحم، سنگدل انسان بنی چاہتا ہے قتل کروں تمہیں۔“  
اس نے ان کے شانے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

”ارے رس۔۔۔ دلغ خراب ہو گیا ہے؟“ عمران بھائی بڑی تیزی سے ان کے درمیان آئے۔  
”پاکل ہو گئے ہو آصف! یہ کیا کر رہے ہو تم۔“ دوسری طرف سے شاہد بھائی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

”کیا احتمالہ حرکتیں کرتے ہو، غلطی شاہ زیب کی تو نہیں ہے بیٹے۔“ عثمان ماموں نے اس کی اعصاب شکنی اوزار ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

اور آصف جیسے جھٹکے سے حواسوں میں واپس آیا۔

”شازے بھائی۔“ وہ تڑپ کر عثمان ماموں کی گرفت سے اٹلا تھا۔

”ہاں شازے بھائی! سچ کہہ رہے ہیں ماموں جان، غلطی آپ کی نہیں ہے، تصور تو سارا میرا ہے۔ میرے ایک غیر ذمہ دارانہ، غیر محتاط جملے نے یہ صورت حال پیدا کی ہے۔“ دوسرے ہی لمحے وہ ان سے لپٹ کر ڈھارس مار مار کر رو دیا۔

”آپ ہی انہیں اس طوفان سے نکال سکتے تھے۔ جس میں وہ مستقل گھری ہوئی تھیں۔ مگر آپ نے بہت دیر کر دی شازے بھائی! بہت دیر کر دی۔ اگر رانی آپ کو کچھ ہو تو میں بھی جان دے دوں گا۔ میں انہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے اپنا سر ان کے شانے پر پٹخ دیا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں ہو گا انشاء اللہ۔ کہیں نہیں جاسکتیں۔ ہم سب مل کر اللہ تعالیٰ سے ان کی زندگی مانگیں گے انہیں زندہ رہنا ہو گا ہماری خاطر وہ رب رحیم انہیں زندگی ضرور دے گا کہ خدا نہ تو ظالم ہے اور نہ ہی بے رحم۔“ شاہ زیب

کے اندر اپنے کھولتے لادے نے بھی جیسے راہپالی۔

اپنی اپنی جگہ منجمد ہو جانے والے بالکل ساکت و صامت کھڑے لوگوں کے جسموں میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے احتشام حسن ہی سست روی سے قدم اٹھاتے ان دونوں کی طرف آئے۔

”اس طرح حوصلہ پاروینے سے بھی کیا حاصل ہے بیٹا۔“ انہوں نے بیک وقت دونوں کو بازو کے حلقے میں لیا تھا۔ ”کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ سب تو قدرت کے کھیل ہیں۔ اور مقدر پر کسی کا زور نہیں ہوتا وہی ہے جو قدرت کرنا چاہتی ہے۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی طرح ہو گا جس طرح وہ قادر مطلق چاہے گا۔ ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنا ہے اور استقامت کے ساتھ جھیلنا ہے کہ یہ تقدیر کے نعلے ہیں اور ان سے بفر ممکن نہیں ہے۔“ ان کے بھاری گہبیر لہجے میں کسی گہرے سمندر کی سطح کی مانند ایک گونہ سکون کی کیفیت تھی۔ اندر کے اس اضطراب کا شائبہ تک نہیں تھا۔ انہوں نے آہستگی سے دونوں کو الگ کیا تھا۔

”نہیں ابو! یہ مت کہیے۔ غلطیاں تو ہم خود کرتے ہیں اور الزام تقدیر کو دیتے ہیں۔ کیوں؟ یہ ہماری ہی خطاؤں کی سزا ہے پھر اسے ہم مقدر کا نام کیوں دیں۔“ وہ تڑپ کر باپ کی طرف مڑا۔ ”ہوش کرو آصف! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ شاید بھائی نے آگے بڑھ کر سنبھالنا چاہا۔ ”آصف۔“ پیچھے سے امی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”تم تو اپنے حواس قائم رکھو بیٹی! رانی کے ساتھ ہی تمہیں بھی۔“ ان کا ضبط ایک دم ہی ساتھ چھوڑ گیا۔ ”نہیں امی نہیں میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ ہی کے پاس رہوں گا لیکن مجھے بتائیے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ کیوں ہو رہا ہے؟“ وہ تو کچھ اس طرح بکھرا تھا اس وقت کسی طرح بھی خود کو سمیٹ نہیں پاریا تھا۔ ”تم ادھر آؤ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہے ہو اس طرح سے صورت حال کچھ بدل جائے گی کیا؟“ فیضان بھائی اور روی اسے گھسیٹ کر دوسری طرف لے گئے۔

”مجھے معاف کر دیجئے تائی جان!۔“ شاہ زیب سسک کر ان کے گلے لگے تھے۔ ”کس بات کی معافی بیٹا! تمہیں تو کسی نے کوئی الزام نہیں دیا کوئی کسی کے قصور کا تعین نہیں کر سکتا سچ کہہ رہے ہیں تمہارے تایا جان۔ بس دعا کرو خدا سے زندگی بوسے دیں۔ وہ کر دے جو میری بچی کے حق میں بہتر ہو۔“ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ اور پھر اسی طرف پلٹ گئی تھیں۔ جہاں سے اٹھ کر آئی تھیں۔

شاہد بھائی نے شاہ زیب کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ وہ رانی کو دیکھنے کے لئے شیشے کے اس کیبن کی طرف بڑھ گئے جہاں اب سیئی اینڈنٹ کے طور پر اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

وہ تو اس وقت سارے زمانے سے بے نیاز تھی۔ ”میں جانتا تھا تحریم حسن کہ تم مجھ سے بچھڑ کر جی نہیں سکو گی تب ہی تو میں نے یہ اختیار تمہیں دینا چاہا تھا۔ تم اپنے جذبوں سے ہار کر بھی مجھ پر اعتبار نہ کر سکیں۔“

گاش مجھے یہ اندازہ ہو جاتا کہ تم جو بظاہر مجھے اتنی مضبوط نظر آ رہی ہو۔ اندر سے اس قدر خوفزدہ ہو اتنی کمزور پڑ چکی ہو؟

میں تمہیں کسی آزمائش میں تو نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف تمہارے اندر احساس جگانا چاہتا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارے احساسات اس قدر نازک آئینوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں کہ ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔“

ان کے اندر سے امنڈنے والی طغیانوں میں وہ رنجیدہ سا مگر انتہائی پرسکون چہرہ ڈوب ڈوب کر ابھرتا اور ابھرتا بھر کر

ڈونٹا رہا۔

وہ اپنی آنکھوں کی برسات سے خود بھی لے خبر تھے۔

تیزی سے گزرتے ہوئے وقت نے اب ڈاکٹر خالد اور ڈاکٹر رمن کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔

”صل میں اعصاب پر دوا بہت زیادہ ہے، انہیں ریپلیکس ہونا چاہیے اور دوا میں استعمال کرنے میں رسک ہے اتنے عرصے میں کچھ تو رسک ہونا چاہیے تھا۔ مگر؟“ ڈاکٹر خالد ہسپتال کی شکل دیکھ کر خاموش ہوئے تھے۔

اس وقت دوا سے کہیں زیادہ دعا کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے انٹروٹیس انجکشن دے کر دیکھیں۔ کوئی سلائیٹ جسم کی پہنچ بھی اگر آئی ہے تو۔۔۔“ دونوں ڈسٹکس کرتے واپس ریٹائرنگ روم کی طرف بڑھ گئے، آصف نے سیٹی کی شکل دیکھی سو نظر حراگئے اس نے پلٹ کر رانی کی طرف دیکھا۔

خاموشی سے باہر آیا۔ سانی جان کے ہاتھ سے قرآن شریف لیا۔

پور اسی طرح چپ چاپ واپس پلٹ گیا۔

وہ سب بوکھلا کر اس کے پیچھے بڑھے تھے۔ سیٹی نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔ شاید بھائی نے اندر جا کر تازہ ترین صورت حال دیکھی۔

وہ سب ہی وقتوں وقتوں سے اندر کا چکر تو لگا ہی رہے تھے۔

آصف رانی کے سیدھے ہاتھ پر سہانے کی طرف رخ کیے اس کی کلائی تھامے قرآن شریف کھولے بیٹھا تھا۔ ہتھریج اس کی آواز بلند ہوئی جلی گئی۔

سورہ رحمان کی آیات اور اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز تو جیسے دل سے نکل رہی تھی۔ بار بار قرآن شریف اس کی نظروں میں دوھنڈلا جاتا۔

لیکن پڑھنے کے سلسلے اور رفتار میں کمی نہیں آ رہی تھی۔

ان سب کی پریشانی اور بے یقینی کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سیٹی تسلی کی خاطر باہر آگئے تھے۔

دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار کو ظاہر کرنے والی مشین کی آواز اور گرانے سے خفیف سی تھریلی کا اظہار ہوا۔ رانی کو محسوس ہوا جیسے کوئی ددر سے پکار رہا ہے۔

اس کے حواس میں تحریک ہوئی۔ آہستہ آہستہ آواز صاف ہوتی گئی۔

اس کی سماعتوں کا احساس جاگا کوئی قرآن شریف پڑھ رہا ہے، بے حد خوش الحانی سے

اسے ایک انجالی سی مقناطیسی کشش محسوس ہوئی جیسے رفتہ رفتہ اس آواز کے ذریعے اس میں طاقت آ رہی ہو۔ اس کے احساسات بیدار ہو رہے تھے۔ قوت بڑھ رہی تھی۔

آصف بڑھتے بڑھتے کبھی پلٹنا پلٹ رہا اور کبھی رانی کی صورت پر نظر ڈال لیتا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا، پلٹنا پلٹنے کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔

اس کا حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ رندھے گلے سے نکلتی آواز بار بار بالکل بھرا جاتی تھی۔ مگر ایک پکار کی سی کیفیت تھی۔

”اور تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ آواز کی سمت دیکھا۔

آصف اس کی مزیز ترین ہستی کا جو اس سے صرف تھوڑے فاصلے پر تھا۔

”ہاں یہ میرے اسی مزیز ازجان کی آواز ہے۔“

نظروں نے سماعتوں کو پہچان کر رانی اور روح میں تقویت بن کر اتر گئی۔

آصف نے سورۃ کملہ کہنے کے رالی کی طرف دیکھا۔



اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

آصف کے ہاتھ کانپ گئے۔

”رائی کیا؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

رائی کی آنکھوں میں پہچان اور چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ جاگی۔

آصف قرآن شریف اس کے سرہانے بستر پر ہی چھوڑ کر تیزی سے باہر بھاگا۔

”سب ہوش آگیا۔ رائی تپا کو ہوش آگیا ہے سر۔“

اس کی حالت بالکل دیوانوں جیسی تھی۔

وہ سب بیک وقت اس کے بستر کی سمت دوڑ پڑے۔

واقعی اسے کھل ہوش آگیا تھا۔

ڈاکٹرز نے مکمل چیک اپ کیا۔ فوری طور پر پے در پے دو انجکشن دیے گئے۔ ڈاکٹر خالد اور سرجن رحمن کے

نزویک تو معجزہ ہوا تھا اس وقت آصف گھٹنے کے اندر اندر۔

پورے آٹھ گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں، جو جہاں تھا وہیں سجدہ میں چلا گیا۔ ان لوگوں کی خوشی قابل دید

تھی۔

احتشام حسن کی آنکھوں نے اپنے تمام شہرے ہوئے آنسو اس خوشخبری کے ملنے پر بہائے۔ عرفان چچا نے وہیں

سے فراست صاحب کو ٹیلی فون کر کے صبح سب سے پہلے کام کے طور پر مزید بکروں کے صدف کی ہدایت دی تھی۔

شاید بھائی شاہ زیب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

اسے تمام لوگوں سے ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔

”لیکن بیک وقت نہیں ایک وقت میں صرف ایک شخص۔!“

اس بات کا رد بیان رکھیے گا کسی بھی قسم کا جذباتی تغیر ان کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے ابھی پوری

طرح کنٹرول اور بحال نہیں ہوئے ہیں ان کے اعصاب۔

بہتر یہی ہے کہ کم سے کم لوگ ان کے پاس جائیں۔“

ڈاکٹرز نے خاص طور پر ہدایت کی تھی۔

صرف رائی ہی نہیں جیسے وہ سب بھی اس کے ساتھ ہی ہوش میں آئے تھے وہ جب ٹوٹ کر ایک مسرت بھری

دھیمی دھیمی چکار میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان سب کے لبوں کی مہریں اور ذہنوں کا جمود بھی ٹوٹ گیا تھا۔ سب سے

پہلے اس کے پاس جانے والی امی تھیں۔

رائی ایک دم سے بے تاب ہوئی لیکن ابھی مشینوں کی بندش پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ

بھی بدستور ڈرپ میں جکڑا ہوا تھا۔

”نہیں رونادھو نایا لکل نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہو چکی ہیں اب آپ۔“ سیفی نے اس کے سر پر تھپکی دی۔

امی نے جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا بے تحاشا پیار کرتی رہیں۔ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ سیفی

انہیں تمام لے گئے۔

ڈاکٹر ہونے کے ناتے انہیں اور آصف کو بہت سارے ایڈوانسج حاصل ہو گئے تھے۔ انہیں المل خانہ میں شامل

نہیں کیا گیا تھا۔ لہذا ہر قسم کی پابندیوں سے بھی قطعی مستثنیٰ تھے۔

”ہشت بگلی رونے کی کیا بات ہے اب جلدی سے ٹھیک ہو جائے گی ہماری بیٹی بس صبح تک ہم گھر لے چلیں

گے انشاء اللہ“ ایونے چھلکتی آنکھوں رندھے گلے کے ساتھ اس کے گلے تھپتھپائے۔ اس کے آنسو صاف کئے۔

یکے بعد دیگرے مختلف لوگ اس کے پاس جاتے اور باہر آتے رہے۔ سب اکٹھے ایک ہی جگہ جمع ہو کر ڈسکسی

READING  
Section

کر رہے تھے۔ اس کی کیفیات دہرا رہے تھے۔ سیفی کی نظموں نے شاہ زیب کو تلاش کیا۔  
وہ سب سے الگ تھلک ریٹنگ پر بازو نکائے تھا کھڑے میز میوں سے نیچے دیکھ رہے تھے۔  
”شازے۔“

”ہوں؟“ سیفی کی دو جیسی سی بکار پر چونک کر متوجہ ہوئے۔  
”ایک بات کہوں، مائنڈ تو نہیں کرو گے۔“ سیفی کے انداز میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کے بجائے خود اعتمادی تھی۔  
”کہو! میرے پاس اب کسی کی کوئی بھی بات مائنڈ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔“ انہوں نے گہرا طویل  
سانس لیا۔

”تمہارا اس وقت رانی کے سامنے آنا اس کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ شازے وہ تمام باتوں سے  
لا علم ہے جس طوفان جس بحر ان سے گزری ہے بہت ممکن ہے تمہاری یہاں موجودگی اسے دوبارہ اسی کیفیت میں  
دھکیل دے یا پھر اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین صورت حال کی طرف۔“

”نہیں۔ میں نے پہلے بھی ایسا کچھ نہیں چاہا تھا سیفی۔“ انہوں نے بے اختیار ان کا بازو تھام لیا۔  
”اور میں اب بھی یہ نہیں چاہوں گا“ میں تو اسے ڈریشن اور مینشن سے نکالنا چاہتا تھا یہ صورت حال تو میرے  
تصور کے کسی دور افتادہ گوشے میں بھی کہیں موجود نہیں تھی وہ تو جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔  
سیفی چپ چاپ ان کی شکل دیکھتے رہے۔

”وہ تمہو شازے! جو فیصلہ تم کر چکے ہو۔ صرف فیصلہ ہی نہیں انتظامات بھی ظاہر ہے تمہیں اس پر عمل بھی کرنا  
ہے۔“ انہوں نے خامسے توقف کے بعد پھر بات شروع کی۔

”تو پھر اس کو اتنی سہولت ضرور دے دو کہ وہ خود کو سمیٹ سکے خود کسی فیصلے پر اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ اسے  
ذہنی طور پر سنبھالنے کے لئے تمہوڑا سادقت چاہیے تاکہ فیصلے کی گھڑی اس کی گرفت میں آسکے۔“ خاموشی کا ایک  
طویل لمحہ پھر ان کے درمیان آٹھرا۔

”میرا خیال ہے۔ تم میری بات لفظوں میں ڈھلے بغیر بھی بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہو شازے۔“ یہ توقف خود  
سیفی کے لئے بھی اعصاب شکن ہی تھا۔

”سمجھ رہا ہوں۔“ شاہ زیب کے شکستہ لہجے میں دل کرچی کرچی ہوا تھا۔ انہوں نے سراونچا کر کے چھت بننے  
آخری سرے تک نظر دوڑائی۔

(م تم ٹھیک کہہ رہے ہو سیف الحسن میں فیصلہ کر کے بھی بے اختیار ہی ہوں کہ فیصلے کی اس گھڑی پر بھی میری  
گرفت مضبوط نہیں ہو سکتی ہے مجھے صرف اور صرف وقت کے دھارے پر چلنا ہے۔ کہ میں مزاحمت کے تمام

حقوق سارے حوصلے کھو چکا ہوں، بے بس ہوں تمہا ہوں اور لاکھ چاہتے ہوئے اپنی تمام تر کوشش کے باوجود فیصلے  
کی گھڑی پر گرفت کر لینے سے قاصر۔“

”تھینک یو، سیفی! مجھے اس کی حالت سے باخبر رکھنے کی کوشش کرنا۔“ انہوں نے اسی ہارے ہوئے سے انداز  
میں مصافحہ کیا۔

سیفی اپنے اندر بے انتہا اضطراب سمیٹے، چپ ساکت کھڑے ان کے تھکے تھکے دماغی قدموں کو لفٹ کی سمت  
بڑھتا دیکھتے رہے۔

”سیفی! یہ شاہ زیب طے گئے ۲۲۲۔“ پیچھے سے ان کے شانے پر گرفت کرنے والے شاہد بھائی تھے۔  
”ہوں؟۔۔ ہاں!۔“ سیفی چونک کر ان کی طرف مڑے۔

(آخری قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

# شگفتہ صحابہ

## عزیز و عزیز

### ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا۔ جب کوئی حاجت مند مسائل سائل کرے تو اس کی سفارش کرو کہ تم کو سفارش کا ثواب ملے اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی زبان سے جو حکم جاسنابے جاری فرماتا ہے۔ وہ بخاری مسلم مشکوٰۃ حیوۃ المسلمین

کمال ہے یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ تم بہت مشہور ہو مگر تمہیں تو یہ بتائے تک جلتے ہیں یا آرنڈ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ مگر اس کی اصل وجہ میرا بیٹا ہے جو شہر کی فٹ بال ٹیم کا کاپٹن ہے۔ صائمہ سلیم۔ فروغی کالونی کراچی

### بقد ر ظرف

ایک شخص ایک ایسے بزرگ کے پاس پہنچا جو اسم اعظم جانتے تھے۔ اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اسم اعظم سکھاویں۔ اس بزرگ نے کہا۔ تمہارے باہر دروازے پر جا کر بیٹھا اور وہاں جو کچھ نظر آئے اسے غور سے دیکھنا اور پھر مجھے آکر بتانا۔ وہ شخص جو اسم اعظم سکھانے کی نیت سے حاضر ہوا تھا۔ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے شہر کے باہر دروازے پر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ ایک ضعیف شخص اپنے گدھے پر نکلے اور شہر لا رہا ہے۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو ایک سپاہی نے اس شخص سے نکلے اور چھین لیں اور اسے مارا بھی۔ وہ شخص واپس آ گیا اور سارا ماجرا کہ سنایا۔ بزرگ نے پوچھا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تم اسم اعظم جانتے تو کیا کرتے؟

صائمہ بشیر۔ لاہور

### نفس

صیب بن زبیر کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر دو فرشتوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی۔ ایک نے کہا۔ میں دنیا میں جا رہا ہوں تاکہ فلاں پھلی کو ماہی گیر کے دام میں پھنساؤں کہ فلاں۔ یہودی کو اس کی بڑی خواہش ہو رہی ہے۔ دوسرے نے کہا۔ میں بھی جا رہا ہوں اور مجھے اس پیالے کو زہن پر گرانے سے جسے لوگ فلاں عابد کی خواہش کے مطابق روغن سے بھر کر اس کے پاس لا رہے ہیں۔

صائمہ صولت اسلم۔ بہاول پور

### وجہ

ایک روز مشہور موسیقار آرنڈ شو بزرگ کا ایک دوست اس سے ملنے کسی دوسرے شہر سے آیا۔ آرنڈ دوست کو لے کر ٹہلنے نکلا۔ دوست نے دیکھا کہ محلے کے نیچے بڑے احترام سے آرنڈ کو سلام کر رہے ہیں۔ اس نے تعجب سے کہا۔

اس شخص نے جھٹ کہا۔ میں اس سپاہی کی ہلاکت کی دعا کرتا ہوں۔ بزرگ نے کہا۔ وہ نکلے لائے والا ضعیف اور بڑھا۔ میرا مرشد ہے۔ میں نے اسی سے اسم اعظم سیکھا ہے۔ جب اس نے خود اس سپاہی کی ہلاکت نہیں چاہی تو تم کون ہوتے، ہوا لسا کرنے والے۔ جاؤ تم اسم اعظم

یکھنے کے قابل نہیں ہوئے

معدیہ عصمت - دھرمیہ

یہ فریج کا دروازہ ہے۔ قدر سے مایوسی سے جواب ملا۔  
عظلی - فخریہ - کراچی

### منہ بولتی ڈائری

ایک اخبار کے ایڈیٹر اور رپورٹر میں ایک واقعے کی تاریخ کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ آخر میں رپورٹر نے کہا۔

اس واقعے کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ہے۔ میری ڈائری اس بات کا ثبوت پیش کرے گی۔

رپورٹر نے اپنی ڈائری کھولی۔ ایک صفحہ نکالا اور ڈائری ایڈیٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔  
لو خود بڑھ لو۔

ایڈیٹر نے پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ امانک بدل گیا۔ اس میں لکھا تھا: ایڈیٹر مجھ سے کہتا ہے کہ یہ بات غلط ہے لیکن وہ تو کا پتھا، حرامی اس قدر خوبصورت ہے کہ خدا کی پناہ!

### مجموری

ایک بازار کے ایک فلیٹ میں آتشزدگی کی اطلاع پر فائر بریگیڈ کا عملہ پہنچا۔ عمارت میں بجلی بند ہو چکی تھی۔ تاریک راہ داری میں ایک سینئر فائر مین نے زیرِ تربیت فائر مین کو ہدایت کی۔

دیوار کو ٹوٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہو اور جہاں دروازہ ملے اسے کھول کر مجھے اطلاع دو۔  
فائر مین نے کچھ دیر بعد اندھیرے میں چیخ کر اطلاع دی۔

دروازہ مل گیا ہے اور میں نے اسے کھول لیا ہے۔  
سینئر فائر مین نے جلدی جلدی موٹا پائپ کھینچ کر اس تک پہنچایا اور ہدایت کی: پانی ڈالو۔  
"یہاں پانی نہیں ڈالا جاسکتا" زیرِ تربیت فائر مین کی آواز ابھری۔  
"کیوں؟" سینئر فائر مین نے جھنجھلا کر پوچھا۔

### مختصر مختصر

6 جھوٹ بولنے کے لیے طر مندہ ہونے کا حوصلہ چاہیے۔

6 نشانہ بننے والا برابر کا لطف لے تو مزاج ہے

وردہ طنز ہے۔

6 حساس آدمی زیادہ دیر زیادتی سہہ سکتا ہے نہ

کر سکتا ہے۔

6 لوگوں کی چالاکی ہمارا اتنا جی نہیں جلاتی جتنا ان کی حماقت۔

6 میرے لیے وہی بادشاہ ہے جس کا مجھ پر احسان ہے۔

عمرانہ ببول - کبیر والا

### آٹے نہ پھیر

خوابوں کی دیکھ بھال میں آنکھیں اجڑ گئیں

تنبہائیوں کی دھوپ نے چہرے جلا دیے

لفظوں کے جوڑنے میں عبارت بکھر چلی

آئینے ڈھونڈنے میں کئی عکس کھو گئے

آٹے نہ پھیر وہ لوٹ کے اک بار تو گئے

عظلی - صائمہ - گورنمنٹی کراچی

### جو اہر پارے

عمل دل کو اس طرح زندہ کرتا ہے جیسے کہ بارش زمین

کو۔ (حکیم نعمان)

زندگی دوسرے سے اُدھار نہیں لی جاتی۔ اسے

خود ہی اپنے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے۔

(علامہ اقبال)

بغیر سوچے سمجھے تقلید کرنا کمزور دماغ کی علامت

ہے۔ (برنارڈ شاہ)

ایک ہی پتھر سے دو بارہ ٹھوکر کھانا ہے تو تونی اور

بدنامی کی بات ہے۔

## اکتوبر ۱۹۹۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

۲۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ماہنامہ "کرن" کے بانی، ہم سب کے پیارے محمود پارہی (۱۹۱۷ء) کی چوتھی برسی ہے، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی یادیں اور دیگر خصوصی تحریریں اس شمارے میں شامل کی جا رہی ہیں،

- \* ڈرامہ سیریل "انہونی" کے فیصل قاضی اکبر سے شاہین رشید کی ملاقات
- \* مزاح نگاری میں منفرد نام "اطہر شاہ خان" ریحانہ علی احمد کے سوالات کی زد میں
- \* خواب باتیں کریں، ذکیہ اسلم کا دلچسپ سلسلہ
- \* "کچن کا راز" میں آپ کی میزبان "فسح سجادر او"
- \* "بہتی چاندنی کا سکوت" ناہید چودھری کا سلسلے وار ناول
- \* انشاں آفریدی کا سلسلے وار ناول "دنگ، خوشبو ہوا بادل"
- \* معروف مصنفہ ثمرہ بخاری کا مکمل ناول "عمر گزشتہ کی صداہیں"
- \* شگفتہ بھٹی اور عالیہ حرا کے طویل و دلکش ناولٹ
- \* نگہت عبداللہ، شاہین ملک، ریح چودھری، سعید عزیز آفریدی، میمونہ خورشید، فوزیہ یاسمین اور فریحہ ظہیر کے افسانے
- اور
- \* مستقل انعامی سلسلے

## مفت

صاف ستھرے اور خوبصورت آرٹس و ڈیزائنز پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے، اور یہ سلیقہ مند خواتین کی پہچان ہے۔ آپ بھی خود کو سلیقہ مند خواتین کی صف میں شامل کر سکتی ہیں۔ اسی سلیقے کے موضوع پر کرن کتاب "گھر سجائیے" اس شمارے کے ہمراہ مفت پیش خدمت ہے۔

"کرن" کا اکتوبر کا شمارہ آج ہی خرید لیں

(سرد)  
سیدہ عابدہ عروج - جنگ صدر

## ایک سوال اور جواب

6 - تم دیر سے کیوں آئے ہو پورے دس منٹ لیٹ؟

سر! میں دسویں منزل کی کھڑکی سے گر گیا تھا،  
جبوٹ مٹ بولا دس منزلیں گرنے میں دس منٹ نہیں لگتے۔

6 - تم دیر سے کیوں آئے ہو؟

سر! میری نانی کا انتقال ہو گیا تھا،  
اچھا آئندہ خیال رکھنا۔ دوبارہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

6 - تم دیر سے کیوں آئے ہو؟

سر! بس نہیں مل رہی تھی،  
اسی لیے کہتا ہوں کہ دفتر جانے کے لیے رات ہی سے چھتوس ڈھونڈ لیا کرو۔

6 - تم دیر سے کیوں آئے؟

سر! آج میری منگنی تھی،  
دفتر سے باہر ہونے والے حادثات کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

6 - تم دیر سے کیوں آئے؟

سر! میں بیٹھیوں سے پھسل گیا تھا،  
اس قسم کے ذاتی کام دفتری اوقات کے بعد کیا کرو۔

6 - تم دیر سے کیوں آئے؟

سر! میں سانس سے چھٹکارا ہلانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا،

تم مجھے رشوت دینا چاہتے ہو؟

6 - تم دیر سے کیوں آئے؟

سر! میں بے ہوش ہو گیا تھا،  
اسی لیے کہتا ہوں ہوش میں رہا کرو۔  
جینا، روزینہ - کوٹلی پنجاب

## تجسس

مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی۔ ملزم نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔

جج صاحب ناگواری سے بولے: پولیس نے تمہیں جیولرنز کی ڈکان میں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ ڈکاندار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔ زیورات تمہارے قبضے سے برآمد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم اسٹریٹس کے سزا یافتہ ہو۔ تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وکیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے؟  
"ہی تو میں جاننا چاہتا ہوں، ملزم نے جواب دیا۔  
ٹینڈا صغریٰ - گلگت منڈی

## سنہرے موتی

6 گالی کا جواب نہ دو کہ کبوتر کو سے کی بولی نہیں بول سکتا۔  
(فیثا غورث)

6 میں نے حسن کی تعریف تو بہت سنی ہے لیکن آج تک حسن دیکھا نہیں۔

(ہٹلر)

6 زندگی بغیر محنت کے مصیبت اور بغیر عقل کے حیوانیت ہے۔

(عکیم بطلموس)

6 عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی نہیں۔

(ایمرسن)

6 کامیابی کا سب سے بڑا راز خود اعتمادی ہے۔

(ایمرسن)

6 محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھی جاتی ہے۔

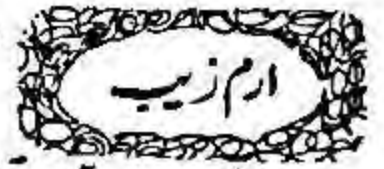
(ٹیکسٹ)

فرزانہ تندر - گجرات

# حالات کی ڈاڑھی

میں کیسی دعاؤں کو یاد کروں  
میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں  
میرے دل میں بہت بے اثر دعائیں ہیں  
بہت دعاؤں کے بجائے میرے دل میں  
ایک دعا ہوتی تو اچھا ہوتا۔

کیسے ڈاڑھی سے



میری ڈاڑھی میں تحریر رقم جیل کی یہ غزل مجھے  
بہت پسند ہے۔  
میں مورفی تیرے عشق کی ہوں میں تیرے پیار کی ناگن ہوں  
میں پائل تیرے پاؤں کی ہوں میں تیرے ہاتھ کا انگلیں ہوں

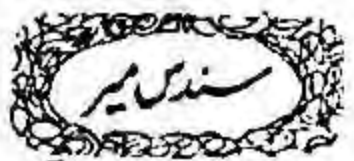
میں پاند ہوں تیرے گالوں کا، میں شعلہ تیرے بالوں کا  
میں تیرے دھل کی ہنسی ہوں، میں تیرے ہجر کی جانچن ہوں

میں ہنجرہ تیری شاخوں کا، میں کونل تیرے باغوں کی  
میں سورج تیرے سائے کا، میں تیری ذات کا انگلیں ہوں

میں تیرے پیار میں زندہ تھی، میں تیرے پیار میں مرنے والی ہوں  
میں تیرے برہ کی ماری ہوں، میں اپنی جان کی دشمن ہوں

تو چاہے مجھ سے پیار کرے، تو چاہے مجھ کو توڑ دے  
میں تیرے شہر کی واسی ہوں، میں تیرے خواب کی توڑن ہوں  
بارش لانے والے بادل، ہوں کیلئے رہتے ہیں  
جس پر رنگ بکھیرے، پیتم میں وہ اجلا دامن ہوں

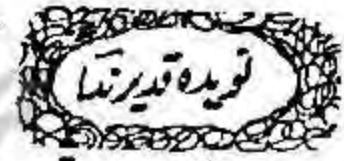
کیسے ڈاڑھی سے



میری ڈاڑھی میں تحریر نیر نازی کی یہ خوبصورت  
نظم مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے کہ آپ کو بھی پسند  
آئے گی۔

میری دعائیں پیچیدہ بہت ہیں  
شام کا وقت ہے دعاؤں کی نذر، رات کا وقت ہے

کیسے ڈاڑھی سے



میری ڈاڑھی میں تحریر سعد اللہ شاہ کی ایک  
خوبصورت سی غزل جو کہ مجھے بے حد اچھی لگتی ہے۔  
خواتین ڈائجسٹ کی نذر کرتی ہوں۔  
تم نے یہ کیسا رابطہ رکھا  
نہ ملے ہو نہ فاصلہ رکھا

نہیں چاہا کسی کو تیرے سوا  
تم نے ہم کو بھی پار سا رکھا

پھول کھلتے ہی کھل گئیں آنکھیں  
کس نے خوشبو میں ساخہ رکھا

تو نہ رسوا ہو اس لیے ہم نے  
اپنی چاہت پہ دائرہ رکھا

تعبوٹ بولا تو عمر بھر بولا  
تم نے اس میں بھی ضابطہ رکھا

کوئی دیکھے یہ سادگی اپنی  
پھول یادوں کا اک سجا رکھا

سعداً لہجہ رہا مگر اُس نے  
تجھ سے ملنے کا راستہ رکھا

اغراض کے بندوں سے نہ اخلاص طلب کر  
محو میں گھنے یہ سبڑوں کے سائے نہیں ملتے

سمیرا صدیقی کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر روشی گیلانی کی ایک غزل  
آپ سب کی تذرہ

جو درد کے صحرا میں اکیلا بھی بہت ہے  
اُس کے لیے ویلوار کا سایہ بھی بہت ہے

دیکھا نہیں تنہائی میں تم نے کبھی اُس کو  
پنچھڑے ہونے لوگوں کو وہ رویا بھی بہت ہے

کچھ تجھ کو محبت پر یقین تھا نہ دفا پر  
کچھ دُکھ میری تعدیر میں لکھا بھی بہت تھا

بینائی اندھیروں سے بھلا کیسے پہچاتا  
اک شخص تیرے بحر میں جاگا بھی بہت ہے

وہ ادب ہیں جو جنوں کے تجھے دیکھنا چاہیں  
مجھ کو تو میرے خواب کی دنیا بھی بہت ہے

کردار سے محروم تھا یہ شہر تو اُس نے  
ہم کو درو ویلوار پر لکھا بھی بہت ہے

نکلت بہار کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سید عارف کی یہ خوبصورت  
غزل جو مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب تازین بہنوں  
کے لیے۔

اب دل میں ہمتے ہونے جذبے نہیں ملتے  
اُجرے ہونے گلشن میں پرندے نہیں ملتے

کیوں چٹکے سے وہ لوگ اُتر جاتے ہیں دلی میں  
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے

وہ جھوٹ کا خوگر تو صداقت میرا مسلک  
دونوں کے مزاج اوروں سے نہیں ملتے

برہم ہے کہ اس کو میری خود داری جس سے  
اپنے لیے تعظیم کے سجدے نہیں ملتے

جو زخم دیے اس نے وہ غنیمت میں کر عاقبت  
ہر شخص کو یہ قیمتی تحفے نہیں ملتے

صدف حمید کے ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر حبیب جالب کی یہ غزل  
مجھے بہت پسند ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے  
گی۔

دل والو کیوں دل کی دولت یوں بے کار لٹاتے ہو  
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو

تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے کوئی نہیں  
پھران گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

سندر کیوں اکومل پھولو یا یہ تو بتاؤ یہ تو کہو!  
آخر تم میں کیا جادو ہے کیوں من میں بس جلتے ہو

یہ موسمِ رمِ جہم کا موسم یہ برکھا یہ مست فضا  
ایسے میں آؤ تو جا نہیں ایسے میں کب آتے ہو

ہم سے روٹھ کے جانے والو اتنا بھید بتا جاؤ  
کیوں نت راتوں کو پسینوں میں آتے ہوں جاتے ہو

چاند ستاروں کے تھرمٹ میں پھولوں کی مسکابٹ میں  
تم چپ چپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو





**شمیٹہ سید** ————— **پگ پتن شریف**  
 ہم پچھلے بارہ سال سے آپ کے تینوں شمارے سے گرنہ شائع  
 خواتین پر پڑھ رہے ہیں۔ میں نے ب۔ ا سے کیا ہوا ہے۔ ایک  
 مقامی اسکول میں سی۔ ٹی ریڈر ہوں۔ میرا نام شمیٹہ سید ہے۔  
 اور میں لاہور کے ایک ماہنامے ————— میں پچھلے  
 دو سال سے لکھ رہی ہوں ملازمت کے باعث کم کم نکلتی  
 ہوں۔ دو سال میں میرے چار ناولٹ چھپ چکے ہیں۔  
 یا میں نشاط اسے ————— باقاعدگی سے خریدتی ہیں۔ پہلے  
 اس میں لکھتی بھی رہی ہیں۔ میرا ناولٹ محبت الیسا دریا ہے،  
 ایک ڈاکہ نرالا۔ اور جبار روتوں کی آہیں۔ پڑھ کر یا میں نشاط  
 نے خوب تقریبی کلمات لکھے۔ مگر کیا فائدہ ہوگی۔ میری شدید  
 خواہش ہے کہ آپ لوگوں سے رابطہ استوار ہو۔  
 ج۔ شمیٹہ سید: خط لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ  
 کا خط شائع کر رہے ہیں۔ آپ افسانہ جبرادیں تھا بالمشافہت  
 ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ اچھی تحریروں کے تو ہم ہمیشہ منتظر  
 رہتے ہیں۔

**سین نظام** ————— **راولپنڈی**  
 مجھے نگہت عبدالقدیم بہت پسند ہیں۔ بکسٹی تو اور بھی  
 سب اچھا ہیں۔ کسی ناول اور افسانے کیسے ہوتے ہیں کہ وہ  
 دل کو لگیں۔ لیکن نگہت جی کی کہیا بات ہے۔ وہ واقعی بہت  
 ہیں۔ میں انہیں بہت پسند کرتی ہوں۔

**بشدری نقور** ————— **لاہور**

میں لایف۔ اسے کہہ چکی ہوں۔ اور قرآن مجید ترجمہ کے  
 ساتھ پڑھ رہی ہوں اس کے ساتھ لاہور میں اسلامک ویلفیئر  
 انسٹیٹیوٹ میں کورس کر رہی ہوں۔ جب آپ میرا خط پڑھ  
 رہی ہوں گی اس وقت تک ختم ہو چکا ہوگا کیونکہ وہ دو ماہ  
 کا تھا جس مسئلے کی طرف آپ کی توجہ کر دانی ہے۔ وہ یہ کہ  
 خواتین ڈاکٹ کے لیے لکھا جاتا ہے اور اس میں خواتین کے  
 مسائل ہوتے ہیں، اگر آپ شریعت کے مطابق خواتین کے  
 مسائل کے بارے میں بتائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ جن کے  
 بارے میں آپ کی توجہ دلوانا چاہ رہی ہوں۔ وہ یہ مسائل  
 ہیں۔ جیسے ایک عورت کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے  
 وہ ایک ماں، بیٹی یا بیوی، بہن ہے تو شریعت کے مطابق  
 کس طرح زندگی گزار سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے  
 میں کیا فرمایا ہے۔ سورۃ بقرہ، سورۃ نساء، سورۃ احزاب۔  
 سورۃ نور، سورۃ تحریم، سورۃ طلاق ان میں ایک عورت کو  
 اپنے شوہر کے ساتھ اور شادی سے پہلے کس طرح زندگی گزارنے  
 کا حکم ہوا ہے۔ ایک عورت کا یا اس کا خاندان کے لوگوں کا  
 میت کی وراثت میں کیا حصہ ہے۔ حق مہر کے بارے میں  
 اور اس طرح کے بہت سے مسائل ہیں۔ دوسری بات یہ  
 کہ رائیٹر کو بھی چاہیے وہ ان مسائل کو شریعت کے مطابق اپنی  
 کہانیوں میں لکھیں۔ تیسری بات آپ کی توجہ ٹائٹل کی طرف  
 کر دانی ہے کیا یہ بہت کمزوری ہے کہ یہ شمارے خواتین  
 کے ہیں تو ان پر تصویریں بھی خواتین کی ہی ہونی چاہئیں۔

**نزہت ہاشمی** ————— **سندھ لائووالی**

رفتہ سراج صاحبہ کے لگتا ہے دماغ میں کمپیوٹر  
 نصب ہے جو کٹ سے ظاہر لاہور کی۔ ناول شروع کر دیا۔  
 واہ ریبا کا کردار زبردست ہے۔ اس وفد تو جمال صاحب

**جنا** ————— **لاہور**

ہمارے نام "سلسلے میں ایک خط میں ایک معزز بہن  
 نے رفتہ سراج کو ماہ نور کی شادی پاشا سے کر دینے کی فرمائش  
 کی ہے۔ یہ فرمائش سے زیادہ بھینسا ہے۔ ہم روکیاں جانتے  
 کیوں کہ رتوں کی وحشت کو آجکل کچھ لگتی ہیں۔ فیصلہ ہم  
 رفتہ صاحبہ پر چھوڑتے ہیں۔ ان کا سزا ناول اور افسانہ میں  
 ہمیشہ شوق سے پڑھتی رہی ہوں۔ ظاہر لاہور کی جیسے خوب عورت  
 ناول کو شروع کرنے کا شکر یہ۔ ناولٹ میں "میری دوستی ترے  
 نام ہو" ایک بیوی اور بیچارہ منزل نہ کھو تا جس اچھے لگے۔  
 اس کا رجحان ہے "آب تھریل اور بور ہو تا جا رہا ہے۔ اس  
 کو اب اختتام پذیر ہونا چاہیے۔ افسانوں میں۔ آک عمر کا  
 حاصل" ہیں اپنی والدہ کی کو باقی لگی۔ اور اسی لیے بالخصوص  
 انہیں پڑھانی بھی ناول "کے نام جفاک راہوں پر نہ لکھتے  
 کچھ جلد ہی میں لکھیں۔ نہ تیرے کے البی لورٹے اور نہ ہی صفو  
 کے انجام کا علم ہوا۔ کم از کم اتنی حیرت مندی کو کہ تو سبق ملتا۔  
 شاعرانہ انداز کی باتیں دلچسپ تھیں مگر ان کے علم میں کیا کوئی خاص  
 بات ہے باقی سب سلسلے میں اچھے ہیں۔

کی گود میں انڈے ہی ڈالنی رہی، پھر اجمال بہت مبارکباد  
 دیکھے گا رفت صاحب کو۔ رنج چوہدری صاحب کا ناول بھی  
 اچھا جا رہا ہے۔ بہر حال، شہباز، بیچارے کو اتنا پتہ نا نہیں  
 چاہیے تھا۔ رنج صاحب سے گزرتی ہے کہ اپنے کرداروں پر  
 اتنا تصدق نہ کیا کریں کہ اتنی پہلے ہی وہ ہشت گردی کی  
 ٹیسٹ میں رہتا ہے، زبیر کا کردار بہت منفی ہے، بڑا اچھا  
 جا رہا ہے، شکست ٹیپ، پتا نہیں شیطان کی آنت کی  
 طرح بھول بھلیوں میں گم ہو چکا ہے، پلینر فریڈرہ اشفاق بی  
 آپ کے ان کو ملو اور دیکھیے۔ باقی تمام ناولٹ اچھے رہے  
 خاص طور پر منزل نہ کوٹا، افشاں آفریدی نے کمال لکھا۔  
 انسانے بھی تمام بس سو سو رہے، مگر نہ بہت شہباز حیدر  
 صاحب نے اچھا لکھا۔ (دعوت آسان۔ تھا) باقی شاید آفریدی  
 کی باتیں اچھی لگیں۔ ڈاکٹر فیاض صاحب کا انٹرویو اچھا تھا۔  
 خاص طور پر عدنان صاحب کا، فیاض ازدواجی انجینئر بہت  
 اچھا جا رہا ہے، کئی روٹیاں راہ راست پر آچکی تھیں۔ خدا سب  
 کو کھلیں، کئی توفیق دے آمین۔

شہباز اشرف — گوجر والہ

ٹائٹل بس سو سو تھا، شاید آفریدی کا انٹرویو دے کر  
 آپ نے ہمیں بہت بڑا مسرہ لائزہ دیا۔ ان کی نماز پڑھنے  
 کی عادت ہمیں بہت پسند آئی۔  
 افشاں آفریدی اور فرہت شہباز حیدر کے انسانے  
 اچھے تھے، شہباز بخاری کا ناول بڑھ کر مزا آگیا، شکستے شب  
 کی نئی قسط آنے تک ہم پچھل بھول چکے ہوتے ہیں، اس میں  
 فلاسفی بہت زیادہ ہے، رنج چوہدری نے چھوٹی سی کہانی  
 کو لاکھ پلے کی شکل دے دی ہے، خیریں وبری میں  
 کرکٹر زکی ظہیر بھی دیکریں۔ رفت آپ سے یہ پوچھنا ہے  
 کہ ریسا کے صال اور کرکٹر کے ناموں میں کلام بہت نمایاں  
 ہے جیسے اظہار، ظہیر، مظہر، مظاہر وغیرہ وغیرہ، دنیا میں  
 اور بھی تو کتنے نام ہیں، وہ کیوں نہیں رکھے پلینر وجہ ضرور  
 بتائیں۔

ریحانہ علی — گلور گوٹ

افشاں آفریدی نے منزل نہ کوٹا میں عشر کو بہت  
 خوب پسند دیکھایا۔ ہمارے معاشرے پر تو ویسے ہی مردکی  
 اجارہ داری ہے، آپ لوگ تو اس کا ساتھ نہ دیں۔ نگہت  
 سیما کی منظر و تحریر میری روشنی تیرے نام ہو میں مردکی  
 محبت کو معتر کر دیا۔ ویسے نگہت بی آپ تک ہر قربانی تو  
 عودت کا فرض تھی۔ پھر بھی ایک خوبصورت اور منظر و تحریر  
 کالی حرم سے فارحہ خد لا پتیا ہیں۔ ان کی بہت کمی محسوس  
 ہو رہی ہے۔ ضرور بتائیے۔

طاہرہ حسین — جڑ والہ

اس ماہ کے خواتین ڈائجسٹ کا ٹائٹل سادہ سا تھا لگا  
 سلسلے دار و دونوں ناول اچھے تھے۔ اور جناب شاہ زیب من  
 کی جڑ والہ نے تو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ خدا خیر کرے اب تو اگلے  
 خواتین کا خدمت سے انتظار ہے۔ باقی انسانے اور ناولٹ  
 معمول کی طرح اچھے تھے اور جناب یہ ہما کوکب، بخاری کارسٹ  
 نالم بہت اورو ہو گیا ہے۔ اب ان کو جگائیں اولم ان کی  
 تحریر کے شدت سے منتظر ہیں۔

اسلمہ انصاری — ملتان

میری پسندیدہ رائٹرز میں خواتین اور شعاع میں لکھنے  
 والی تقریباً سب رائٹرز کا نام شامل ہے مگر خیرہ سید ماما ملک  
 نگہت عبداللہ، شہباز بخاری، شہباز بخاری اور آسیہ مرزا  
 کا نام فیوٹ رائٹرز کی فہرست پر سب سے اوپر ہے۔  
 میں نے خیرہ سید کا سب سے پہلا ناول جو پڑھا تھا  
 وہ تھا اشتیاق خرد و نظر، جس وہ دن اور آج کا دن، جہاں  
 بھی ان کی کوئی تحریر نظر آتی ہے، میں سب کام پھرد کر کے  
 پڑھنے بیٹھ جاتی ہوں۔

سمیرا علی — نوشہرہ

ستمبر کا شمارہ لا جواب تھا۔ لیکن ایک چمڑے میں بہت  
 مایوسی کیا۔ وہ تھا شہباز بخاری کا ناول، جسے نام جفا کی راہوں  
 پر وہی پرانا اور بڑا پاک، نالم رشتہ دار اور بیرو کر پوتون  
 بناتے، مجھے خوب دتوف بن جانے والی بیرو من خیر  
 اس کی کسر نگہت سیما کے ناولٹ میری روشنی تیرے نام ہو  
 نے پوری کر دی، واقعی محبت ہرگز نہیں سے پاک، ہوتی ہے  
 یہ لینے کا نہیں بلکہ دینے کا نام ہے۔ عالیہ بخاری اور افشاں  
 آفریدی کے ناولٹ بھی بس ٹھیک تھا کہ تھے۔ انسانے  
 البتہ میں چاروں کے چاروں پسند آنے، خاص کر کھیل کھیل  
 میں، بڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

اب میرا خیال ہے میں آپ کو خط لکھنے کی اصل وجہ بھی  
 بتا دوں، اصل وجہ خواتین ڈائجسٹ کا سرواں ہے آپ  
 سے ہماری نہایت ہی مؤدبانہ گزارش ہے کہ خطا کے لیے اس  
 اجنبی حیدر کا نام بتا کر ہماری اطمینان دود کریں۔ کیا یہ سدید  
 امام ہیں، یا ڈراما پیل دوپل میں نلویہ خان کی بیٹے والی بڑی  
 ہیں جو کہ فکٹر ہوتی ہے وہ ہے۔  
 ج۔ ۱۔ سمیرا حسین، آپ کی بھابی کا کہنا صحیح ہے۔ ستمبر کا ٹائٹل  
 عندلیب اقبال کی تصویر تھی۔ جنہوں نے پہل دوپل میں نادیہ  
 خان کی بڑی بہن کا رول کیا۔

فاثرہ کوئل شریف — ٹنڈو محمد خان

رفت بی نے اس بار بھی بلاشبہ حد خوبصورت ناول  
 کا آغاز کیا، طاہرہ لہرتی، اس کی پہلی قسط پڑھ کر ہی اندازہ

ہو گیا تھا کہ یہ بھی یقیناً دل و یاد ہنر کی طرح دلچسپ اور بے حد پیارا ہو گا۔ ظاہر ہے ہمیں ہمارے نیورٹ رائیٹر کے قلم سے جو تعلق ہو رہا ہے۔ رفت جی کو میری طرف سے ایک بار پھر دھروں دھیر مبارک ہو۔ ویسے میرے خط لکھنے کی ایک خاص وجہ تھی اس سے قبل بھی میں اس بارے میں لکھ چکی ہوں۔ ۲۵ اکتوبر ایک ایسا دن جو ہم باوجود کوشش کے میں نہیں بھلا سکتے۔ جب بھی یہ پچیس اکتوبر آتی ہے تو سر سے سے یادوں کے گہرے زخم چھوڑ جاتی ہے۔ اس دن ہم سے ایک نہایت عزیز ہستی جدا ہو گئی اور ہم اس کے لیے تھے بھی آنسو بہائیں۔ ذرا غمزدگی میں جہاں واقعہ ایک اچھے رحم والی انسان اور مجھے انسان تھے ان کی تقریب میں تھنے الفاظ کہے جائیں کہ میں نے شک اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے گو کہ میں بھی ان سے علی نہیں تھی لیکن بغیر طے ہی جانے کیوں وہ ہمیں اپنے گے بھائیوں کی مانند لگتے تھے۔ میں جناب محمود ہاشمی صاحب کے اس غم میں برابر شریک ہوں اللہ تعالیٰ محمود با بر فیصل صاحب کی مغفرت۔ فرمائے۔ آمین۔

### ارم خان ————— جہلم

میں آپ کا رسالہ خواجین ڈاکٹسٹ گزشتہ پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ شاع اور غزلیں ڈاکٹسٹ مجھے بہت پسند ہیں۔ اور اس بات پر بہت خوشی ہے کہ یہ پہلے سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ اللہ سے ان کی مزید ترقی تمہیں لیے دعا گو رہوں۔ مزید خوشی کی بات کہ کٹر شاہد آفریدی کا انٹرویو تھا۔ باقی پلیز اس میں کٹر علسر سہیل اور نقین مشتاق کا انٹرویو شائع کریں۔ رنج جوہری کا ناول اس کا وقت میں "اچھا ہے لیکن بہت طوالت اختیار کر گیا ہے۔ باقی کہانیوں میں مزہ بخاریا ٹاپ پر رہیں انشاں آفریدی کی مزہ بہت شہانہ حیدر اور شکیہ شاہ کی کہانیاں اچھے موضوعات پر تھیں۔"

### سیدہ عابدہ مہر وج ————— جھنگ صدر

کیس ہیں آپ؟ ستمبر ۹۴ کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا۔ سب سے پہلے رفت سراج کا ناول پڑھا۔ طاہر لاہوری خوبصورت موثر پر آ رہا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے، غزالہ نگار اور کون کیا خوب سفر نامہ لال ہیں۔ پڑھ کر بہت ابھرائے گیا۔ عالیہ بخاری کا ناولٹ بیکر جی ادر سے چارہ پڑھا ابھی کاوش تھی۔ میرے خیال میں عالیہ بخاری جاکو کتب بخاری کی ہیں میں۔ ضرور بتائے گا۔ مزہ بخاری کا مکمل ناول "بے نام جفاکداریوں پر اچھا تو تھا لیکن حقیقت سے کچھ دور لگا۔ مزہ جی کے لیے نشورہ ہے کہ آپ مزاج پر زیادہ توجہ دیں تو بہتر ہے۔ عابدہ روف کو کافی عرصے بعد پڑھنا اچھا لگا۔ اس بار بارہ غلام نبی نے خبریں دبیریں، میڈیول و دو کو بڑھا پڑھا کر پیش

کیا جو کہ ظاہر ہے پسند نہیں آیا۔ انٹرویو میں شاہد آفریدی اور کٹر فیاض سے ملاقات پسند آئی۔ شاہین رشید کے انٹرویو کرنے کا انداز بے حد اچھا ہے۔ رنج۔ عابدہ ہاشمی، خط لکھنے کا شکر۔ عالیہ بخاری، جاکو کتب بخاری کی ہیں۔

### نازیہ اسلم ————— چشتیاں

مجھے رفت سراج کا ناول طاہر لاہوری بہت پسند ہے ماہ نور اور پاشا کی شادی ہو جانے کی خبری اچھی بات ہے۔ ستمبر کے ناولوں میں مزہ بخاری کا ناول بے نام جفاکداریوں پر سب سے بازی لے گیا انشاں آفریدی کا ناولٹ منزل نہ کھڑا اور رنج جوہری کا ناولٹ اس کا رحمت میں اس میں اس وقت رسالے کے گردانے سب کو حیران کر دیا اور شاہد آفریدی کا انٹرویو پسند آیا خاص کر اس کا تقویر بنوانے کا اسٹائل بہت پسند آتا۔ عدنان جہاں بہت اچھے مشورے دیتے ہیں سب کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔ خدا ان کو اس کا اجر دے۔

### ہاشمہ ریاض ————— اٹک شہر

ستمبر کا شمارہ ملا عندلیب عامر اقبال کو سرورق پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی عندلیب کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں ہم ان کے متعلق جانتا چلتے ہیں۔ ابن انشاء کا ایک دن جو کٹر کے ہاں پڑھ کر حقیقتاً لطف آیا۔ میری روشنی تیرے نام پر کا سرورق کافی بزدل دکھایا گیا ہے مجھے یہ کہنا کہ رحمت پر ہر بار ایک شخص ہی قربان ہو جائے یہ تو طے ہے کہ ایسا ہر بار کو ذرا سے رحمت نہیں تھی وہ بھی اپر کلاس کی ان لڑکیوں کی صف میں شامل تھی جو ہر پسندیدہ چیز یا انسان کو اپنی دسترس

میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کا رحمت میں ۱۰۰ حیران کر دیا کہ ان مشورہ ٹاپنگ کا دکھایا گیا ہے جس کی حرکتیں ایک سو برس کی لڑکی کو واقعی غصہ دلا سکتی ہیں۔ دیکھا تو اپنی مثال سے کہیں زیادہ تعجب نہ نکلیں۔

### زحمتی گل ————— لنگاری

یہ ایک صاف ستھرا رسالہ ہے اس لیے میرے گھر والوں کو اور مجھے پسند ہے سب رائیٹرز اچھا لکھتے ہیں۔ لیکن میری گزارش ہے کہ میوزک خورشید علی بھی ہر ماہ ناولٹ لکھا کریں۔ رفت جی کو مشورہ ہے کہ پاشا کو رہی ہو رکھیں۔ کہانی میں رفت جی کا طاہر لاہوری نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ "شہر باران، دل و یاد ہنر، ہم اچھا تھا لیکن طاہر لاہوری نے ہی منفرد اور اچھوتی تحریر ہے۔ پاشا کا کردار جان دار ہے۔ اسے کہانی میں مزید جگہ دیں ماقی کہانیوں میں مزہ بخاری کی کہانی کافی عرصے بعد بہتر پڑھنے کو ملے۔ نگہت سراج اور عالیہ بخاری کی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ کافی عرصے سے کہانیاں لکھنا سب کا شکر ہو چکی ہیں پلیز آپ کو ترجیح دیں۔





عجائب خانہ کے محقق

## تَبِیل سے باتیں

شاہین رشید

- ۱۳۔ میرا نام ترمین پروگرام؟
- ناظرین کی نظر میں شاید کوئی ہو لیکن میری نظر میں کوئی نہیں ہے۔
- ۱۵۔ کس خاتون فنکارہ کے ساتھ کام کرنے کو چاہتا ہے؟
- جولیا رابرٹس۔
- ۱۶۔ پسندیدہ کمپیئر؟
- اللہ درجات بلند کرے مجھے دلدار پرویز بھی بہت پسند تھے۔
- ۱۷۔ پسندیدہ نیوز کا سٹر؟
- مجھے خبریں سننے سے مطلب ہوتا ہے اس لیے کوئی خاص پسند نہیں ہے۔
- ۱۸۔ مجھے یاد ہے اب تک؟
- چپوڑیں۔ یہ مصروف ٹھیک ہے کہ یاد ماضی قداب ہے یا رب۔

- ۱۔ مجھے تبیل کہتے ہیں۔
- ۲۔ اصل نام؟
- ندیم ظفر۔
- ۳۔ گھروالے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
- ندیم۔ اور اب تو تبیل بھی کہنے لگے ہیں۔
- ۴۔ سن پیدائش اور جلنے پیدائش؟
- یکم ستمبر ۱۹۶۷ء / ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
- ۵۔ میرا قد (بغیر تبیل کے)؟
- تبیل توڑ کر کیا بنتی ہیں۔ ویسے میرا قد چھ فٹ ہے۔
- ۶۔ بہن بھائیوں کی تعداد / میرا نمبر؟
- ہم پانچ بھائی ہیں۔ اور ہماری ایک بہن ہے۔ میرا نمبر پانچواں ہے اسی لیے میں گھر بھر کا جیتنا اور لاڈلا ہوں۔

۷۔ میرا ستارہ؟

سنبھ (VIRGO)

۸۔ تعلیمی قابلیت؟

ایم۔ اے۔

۹۔ شادی کب ہوگی؟

غیب کا علم خدا کو معلوم ہے۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ انسان کو کچھ پتا نہیں ہوتا۔

۱۰۔ آئیڈیل کیا ہے؟

آئیڈیل بنانا ہے و تو فی ہے کیونکہ کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ پر لیکن صرف اللہ کی ذات ہے۔

آئیڈیل کے پیچھے بھاگنا ہے و تو فی ہے۔

۱۱۔ فی وی پی متعارف کرنے کا سہرا؟

لاہوری وی کے پروڈیوسر عبدالعزیز کے سر پر سہرا جاتا ہے۔

۱۲۔ فی وی پی پہ پہلا پروگرام؟

پنجابی کھیل لڑاں چاٹن۔

۱۳۔ وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟

خدا کا شکر ہے کہ میرا پہلا ہی سیریل ناظرین نے پسند کیا۔ اور اس کا نام تھا "ون" اس کے پروڈیوسر ایوب خاوند تھے جو میرے استاد بھی ہیں۔ سیریل

و سوال نے مجھے ایسی شناخت دی کہ اب یہی

READING  
Section

- ۱۹۔ زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟  
اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس پر غلوں لوگوں کی  
کمی محسوس ہوتی ہے۔
- ۲۰۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں؟  
اپنے ملک میں فرقدارانہ تعصب دیکھ کر۔ خدا  
ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔
- ۲۱۔ میرا مشن ہے کہ؟  
کراچی پاکستانی قوم اپنی قوم کے لیے اچھا سو میں  
اور اس ملک کے تمام لوگ مل جل کر باہم محبت کے  
ساتھ رہیں۔
- ۲۲۔ کیا عشق کے بغیر زندگی ناممکن ہے؟  
عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کراہ  
وہ مجھے یاد کراؤ تا ہے مگر کام کے بعد
- ۲۳۔ ایک سوال جو بار بار کیا جاتا ہے؟  
کہ آپ اداکاری کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟
- ۲۴۔ میں معاف کر دیتا ہوں؟  
میں جس کو بھی معاف کرتا ہوں پتھے دل سے  
کرتا ہوں۔
- ۲۵۔ مجھے رحم آتا ہے؟  
مجھے رحم آتا ہے۔
- ۲۶۔ ایک نغمہ جو میں اکثر گنگناتا ہوں؟  
مائیں فی میں کنول اکھاں درد و تھوڑے وا  
ماں فی۔
- ۲۷۔ آٹو گراف بک میں کیا لکھتا ہوں؟  
BE HAPPY
- ۲۸۔ میری آئیڈل شخصیت؟  
عمران خان اور اشفاق احمد۔
- ۲۹۔ اگر میں قومی اسمبلی کا ممبر ہوتا تو؟  
ترجمہ یقیناً لوٹا ہوتا۔
- ۳۰۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کس چیز کی  
طلب ہوتی ہے؟  
گریپ فروٹ کی۔
- ۳۱۔ آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو کیا کرتا ہوں؟  
کرنال کیلے چپ کر کے دوبارہ سو جاتا ہوں۔
- ۳۲۔ جب ڈپریشن ہوتا ہے تو کیا کرتا ہوں؟  
یقین کریں گی؟ میں کامیڈی کرتا ہوں۔
- ۳۳۔ پسندیدہ مشروب؟  
آؤر نیچ جوس۔
- ۳۴۔ پسندیدہ کھانا؟  
سبزی گوشت۔
- ۳۵۔ ناپسندیدہ کھانا؟  
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرتا۔
- ۳۶۔ پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا  
جائزہ لیتا ہوں؟  
شخصیت کے لباس کا اور اس کی گفتگو کا۔
- ۳۷۔ میرے نزدیک سائنس کی بہترین ایجاد؟  
فیکس مشین۔
- ۳۸۔ مجھے غصہ آتا ہے؟  
سناقت کرنے والوں پر۔
- ۳۹۔ ایک وہم جو مجھے پریشان کرتا ہے؟  
کہ میں مجھ سے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو  
گئی ہو۔
- ۴۰۔ حکومت پاکستان اگر کوئی عہدہ دینا چاہے تو  
کون سا عہدہ قبول کروں گا؟  
ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ مجھے تو اپنی جان  
عزیز ہے۔
- ۴۱۔ بڑھا یا کیسے گزاروں گا؟  
جیسے جوانی گزار رہا ہوں۔
- ۴۲۔ زندگی کا کوئی لمحہ جس کا تصور آج بھی خوفزدہ  
کرتا ہے؟  
اپنے والد کی موت کی خبر۔
- ۴۳۔ میرا قیمتی اثاثہ؟  
میری پیاری ماں۔
- ۴۴۔ ایک شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟  
میرے والد مرحوم۔

۴۵۔ کبھی ایک جگہ سے دو مرتبہ دھوکا کھایا۔  
 انجانے میں دھوکا نہیں کھایا بلکہ جان بوجھ کر اپنے  
 ایک ساتھی سے کئی مرتبہ دھوکا کھایا۔  
 ۴۶۔ اگر مجھے ویران جگہ بھی جانے تو کس شخصیت کو  
 ساتھ لے جانا پسند کروں گا؟  
 اپنے لنگار دوست تسنیم کی کو۔ کیونکہ وہ مجھے ہنسانے  
 کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔  
 ۴۷۔ مجھے مزا آتا ہے؟  
 اپنے ساتھی لنگار نیرا عجاز کو تنگ کر کے۔  
 ۴۸۔ پسندیدہ کھانا؟  
 پیٹے بھی عمران تھے اور اب بھی۔  
 ۴۹۔ پسندیدہ کھیل؟  
 بیڈمنٹن اور کرکٹ۔  
 ۵۰۔ پسندیدہ موسم؟  
 بے شک مجھے سردی کا موسم اچھا لگتا ہے لیکن اس  
 حقیقت سے انکار نہیں کہ انسان کے اندر کا موسم  
 اچھا ہو تو ہر موسم اچھا لگتا ہے۔  
 ۵۱۔ غصے کے وقت کیا کرتا ہوں؟  
 میرے نزدیک تو غصے کو قابو میں رکھنے کا بہترین  
 طریقہ خاموشی ہے اور میں اس پر عمل بھی کرتا  
 ہوں۔  
 ۵۲۔ بارہ مہینوں میں کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟  
 ظاہر ہے ہر شخص کو وہی ہیمنہ اچھا لگتا ہے جس  
 سے اس کی کوئی یاد وابستہ ہو۔ ستمبر کا ہیمنہ مجھے  
 اچھا لگتا ہے کیونکہ یہ میری پیدائش کا ہیمنہ ہے۔  
 ۵۳۔ ایک خواب نیند والا جو سچ ثابت ہوا؟  
 خواب کہاں سچ ثابت ہوتے ہیں۔  
 ۵۴۔ اپنی ہی ایک عادت جو مجھے بہت پسند  
 ہے؟  
 عزت کرنا اور عزت کروانا۔  
 ۵۵۔ آئینہ دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے؟  
 میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔  
 ۵۶۔ کس جانور سے خوف آتا ہے؟

۵۷۔ پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرف اس  
 ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں  
 ۵۸۔ چوبیس گھنٹوں میں کون سا وقت اچھا لگتا  
 ہے؟  
 شام کا۔  
 ۵۹۔ طالب علمی کے زمانے میں کس مضمون سے نفرت  
 تھی؟  
 جغرافیہ۔  
 ۶۰۔ کسی ملک کی سربراہی کا موقع ملے تو میرا  
 انتخاب کون سا ملک ہوگا؟  
 صرف اور صرف پاکستان۔  
 ۶۱۔ زندگی کا وہ لمحہ جس نے میری زندگی بدل دی؟  
 جب میں نے سوچا کہ مجھے کچھ کر کے دکھانا ہے۔  
 ۶۲۔ پسندیدہ اخبار؟  
 جس میں تیری تعریف لکھی ہو۔ کیونکہ تعریف ہر  
 انسان کی کمزوری ہے۔  
 ۶۳۔ پسندیدہ میگزین؟  
 وہ جس میں میری تصاویر چھپی ہوئی ہوں۔  
 ۶۴۔ پسندیدہ صحافی؟  
 طاہر سرور میر۔  
 ۶۵۔ اپنے باپ سے میں ایک جملہ جسے سننے کے  
 لیے کان منتظر ہوں؟  
 ہر وہ جملہ جس میں مجھ پر تنقید ہو مگر اس میں  
 اصلاح کا پہلو ضرور ہو۔  
 ۶۶۔ میری زندگی کا خوبصورت ترین دن؟  
 زندگی بہت مختصر مگر خوبصورت دین ہے خدا  
 کی۔ اس لیے ہر دن خوبصورت سمجھ کر اور خوبصورت  
 بنا کر گزارتا ہوں۔  
 ۶۷۔ ایک دعا جو ہر وقت پوری ہوتی ہو؟  
 اللہ کا شکر ہے میری ہر دعا پوری ہوتی ہے۔  
 ۶۸۔ میری کس عادت سے گھر والے بے زار رہتے  
 ہیں؟  
 ایک ہی عادت بڑی ہے۔ مجھے دیر تک سونے

کی عادت ہے۔  
۶۸۔ میں بھول جاتا ہوں؟۔

کسی سے اچھائی کر کے۔  
۶۹۔ کس شخصیت کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں؟

اپنی ماں کی خاطر۔  
۷۰۔ میرا پسندیدہ شعر؟

۷۱۔ زندگی ایک شگفتگی سی چتا ہے ساحر  
شعلہ بنتی نہ رہے بجھے کر دھواں ہوتی ہے

۷۲۔ کون سی چیز زندگی کی حد تک پسند ہے؟  
شاعری۔

۷۳۔ پسندیدہ رشتہ؟  
ماں کا۔

۷۴۔ پسندیدہ ذریعہ اظہار؟  
شعر۔

۷۵۔ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کسے دیکھنا  
پسند کرتا ہوں؟  
اپنی ماں کو۔

۷۶۔ جب تنہا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے؟  
تنہا، میرے دوست مجھے تنہا نہیں چھوڑتے۔

۷۷۔ رقم کو محفوظ کرنے کا بہترین ذریعہ؟  
غزلیوں میں تقسیم کر دو۔

۷۸۔ شدید تکان کے باوجود کہاں جانے کے  
لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں؟  
سر سبز علاقے میں۔

۷۹۔ مجھے افسوس ہوتا ہے؟  
اُن لوگوں پر جو پاکستان میں رہ کر پاکستان کے  
لیے بڑا سوچتے ہیں۔

۸۰۔ انسان کے سر میں غزور کب سماتا ہے؟  
جب اُسے یہ یاد نہیں رہتا کہ دنیا فانی ہے۔

۸۱۔ اگر ایک دن پہلے مجھے خدا نخواستہ اپنی موت  
کا علم ہو جائے تو؟  
تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ موت

بھی ایک زندگی ہے۔  
۸۲۔ زندگی کی ایک خواہش جس کے پورا ہونے  
تک میں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟

۸۳۔ میں خواہشات کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہتا۔  
۸۴۔ کون سے سفر سے خوف آتا ہے؟

۸۵۔ جہاز کے سفر سے۔  
۸۶۔ پسندیدہ پھل؟

۸۷۔ انار۔  
۸۸۔ پسندیدہ پھول؟

۸۹۔ زعفران۔  
۹۰۔ پسندیدہ خوشبو؟

۹۱۔ ایک کارنامہ جو انجام دینے کو جی چاہتا ہے؟  
جی تو چاہتا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو  
ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دوں۔

۹۲۔ زندگی کے وہ دن جو میں چاہتا ہوں کہ  
لوٹ آئیں؟  
میرا بچپن۔

۹۳۔ کوئی سواری جسے استعمال کرنے سے پیدل  
چلنا بہتر سمجھتا ہوں؟  
ٹریڈ سائیکل۔

۹۴۔ اگر میری ملاقات شیطان سے ہو جائے تو؟  
تو اسے پھینک کر بھاگ جاؤں گا۔

۹۵۔ چودھویں کا چاند دیکھ کر میں سوچتا ہوں؟  
۹۶۔ چاندنی راتوں میں تیرا حسن دیکھوں چپ رہوں  
بس اسی صورت میں آنکھوں میں بینائی رہی

۹۷۔ پسندیدہ سواری؟  
کار۔

۹۸۔ پسندیدہ لوک فنکار؟  
نصرت فتح علی خان مرحوم۔ اور عطل اللہ خان  
عینی خیلوی۔

۹۹۔ پسندیدہ لوک فنکار؟  
۱۰۰۔ پسندیدہ تہوار؟  
عید کا۔

۱۰۱۔ پسندیدہ لوک فنکار؟  
۱۰۲۔ پسندیدہ تہوار؟

۱۰۳۔ پسندیدہ تہوار؟  
عید کا۔

۱۰۴۔ پسندیدہ تہوار؟  
عید کا۔



## جویریہ جلیل ہے ملاقات

شاہین رشید

پرفارم کر رہی ہیں۔ جویریہ جلیل ایک باصلاحیت فنکارہ ہیں۔ انہونی ان کا پہلا ڈراما سیریل ہے مگر اتفاق دیکھیں کہ اس سیریل کے ان ایرٹے سے پہلے ہائے جدیدی اور ایک لونگ پلے ٹمر قیدہ ان ایر آچکا ہے لیکن بہر حال ڈراموں میں متعارف کرنے کا کریڈٹ انہونی کے پروڈیوسر قیصر خان کو ہی جلتے گا۔  
”تقریر! آج کل ہم تمہیں ہائے جدیدی اور انہونی

جس کثرت کے ساتھ پروڈیوسرز میں اضافہ ہو رہا ہے اور پرائیویٹ پروڈکشن کی بھرمار ہو رہی ہے اس کثرت سے اچھے فنکاروں میں اضافہ نہیں ہو رہا۔  
انہونی میں زیادہ تر فنکار نئے ہیں اسی لیے اسے دیکھتے میں مزا بھی آ رہا ہے۔ جویریہ جلیل انہونی کا ہی ایک کردار ہیں وہ بڑی خود اعتمادی سے



میں دیکھ رہے ہیں۔ بہت اچھا پر فلم کر رہی ہو  
 اور بہت اچھی لگ رہی ہو۔  
 شکر ہے۔ میرا ایک فدا نامہ قیدہ چلا تھا اس میں  
 بھی میں بہت اچھی لگی تھی۔

یہ بتاؤ کہ معروف آرٹسٹ راشدہ یعقوب سے  
 تمہارا کیا رشتہ ہے؟  
 ”راشدہ یعقوب میری امی کی کزن ہیں اور اس  
 لحاظ سے وہ میری خالہ ہیں۔“

تم بتا رہی ہو کہ عمر قیدہ میں تمہارا رول بہت اچھا  
 تھا اور ایک بڑی عمر کے شخص کی بیوی کا رول تم نے کیا  
 تھا۔ انہونی میں بھی تم نے بیوی کا رول کیا ہے۔ کیا  
 بات ہے کہ ابتدا سے ہی تمہارے حقے میں ایسے رول  
 آ رہے ہیں؟

اب یہ تو پروڈیوسر کی مرضی ہے کہ وہ کس قسم کا  
 رول دیتا ہے۔ ہمیں تو جو رول ملیں گے ہم تو ظاہر  
 ہے کرتے گئے۔

کرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہو رہی؟  
 ”رومینٹک رول اور بیوی والے رول کرنے میں  
 دشواری بھی ہوتی ہے اور جھجک بھی آتی ہے مگر کیا  
 کریں گے نا پڑتا ہے۔ ایسے سین کرتے وقت مجھے ہنسی  
 آ جاتی ہے۔“

انہونی میں قیصر خان نے تم سے بہت اچھے طریقے  
 سے کام لیا ہے۔ تم نے قیصر خان کو کیسا پایا؟  
 قیصر خان بہت اچھے پروڈیوسر ہیں اور ان کے  
 ساتھ کام کر کے بہت مزا آیا۔ اور ویسے بھی مجھے  
 اس فیلڈ میں آ کر اور کام کر کے اچھا لگا۔  
 ”نی وی پہ متعارف کس نے کروایا؟“

مجھے ناہید حسن زیدی (پروڈیوسر کراچی نی وی)  
 نے متعارف کرایا اور انہوں نے بھی یکشیت  
 نعت خزاں کے مجھے متعارف کرایا اور میری چھ نعتیں  
 ریکارڈ کیں جو کہ آن ایر بھی آئیں۔  
 ”یہ کب کی بات ہے؟“

یہ مسئلہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے اور میری ایک نعت

جس میں لڑکیاں دف بجاتی ہیں، ابھی بھی کبھی  
 نی وی سے دکھانی جاتی ہے۔“

تم بتا رہی ہو کہ تم ۹۲ء سے اس فیلڈ میں ہو تو  
 یہ بتاؤ کہ اب تک کیا کیا کر چکی ہو؟ مگر اس سے پہلے  
 اس سوال کا جواب دو کہ ہائے جیدی میں تمہارے  
 کام میں وہ چٹنگلی نہیں ہے جو انہونی میں ہے اور  
 اسکرین پر تم اچھی بھی نہیں لگ رہیں۔

”اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہائے جیدی میں مرکزی رول  
 رولنی نیازی کر رہی ہیں اور میرا چونکہ مرکزی رول۔

نہیں ہے اس لیے نہ میں اسکرین پر نظر آ رہی ہوں  
 اور نہ ہی میرا رول ابھر کر سکنے آ رہا ہے۔ منظور قریشی  
 نے مجھے فون کیا تھا کہ آپ اس سیریل میں کام کریں  
 لہذا میں نے کر لیا۔ ورنہ بیچ ہات تڑپے کہ کامیڈی  
 تو مجھے آتی ہی نہیں ہے۔ لائٹ کامیڈی تو چل جاتی  
 ہے مگر ہائے جیدی میں تو مجھے بہت ہی بے وقوف  
 دکھایا گیا ہے۔ بس کامیڈی کر لیتی ہوں مگر کس طرح یہ نہیں  
 معلوم، یقین کریں کہ میرے گھر والے بھی یہ پروگرام  
 نہیں دیکھتے۔“

”اب میرے اس سوال کا جواب دو کہ ۹۲ء میں  
 تم نی وی پہ متعارف ہوئیں کیا کیا کر چکی ہو؟“

”میں نے ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء تک نی وی پر کام  
 کیا اور پھر کام کرنا چھوڑ دیا اور جو تین سال میں نے  
 کام کیلئے نعتیں لکھیں، رنگ ترنگ، یہ جہاں اور  
 ایک دو دستاویزی فلموں میں کام کیا تھا اور اب  
 ۹۷ء میں میں نے کام دوبارہ شروع کیا ہے اور ۹۵ء  
 تک جو کام کیا وہ ناہید باجی کے ہی پروگرام تھے۔“

ناہید حسن زیدی سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟  
 ”یہ سمجھ لیں کہ ناہید باجی میری بہن بھی ہیں۔ میری  
 اتنی جیسی بھی ہیں، پھوپھو اور خالہ جیسی بھی ہیں۔  
 ناہید باجی ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور وہ  
 بہت عرصے سے نی وی پر کام کر رہی تھیں۔ اچانک  
 انہیں ایک دن نہ جلے کیا خیال آیا کہ کہنے لگیں۔  
 کہ نعتیں پڑھو گی۔ میں نے کہا کہاں کہنے لگیں نی وی

پہلے میں نے کہا جیسے آپ کہیں۔ پھر وہ فی وی ایٹھی لے گئیں۔ میری نعیتیں ریکارڈ کیں اور پھر ہم گھر آئے۔ پہلے تو میں ناہمید باہمی کے ہی پروگراموں میں کام کرتی تھی اور کسی کے ساتھ کام کرنے کی گھر والوں کی طرف سے اجازت نہیں تھی۔ پھر ایک دن یعنی ۵ دے بعد گیب دے کر ایک دن ہم پریس کلب گئے۔ تو وہاں قیصر خان صاحب نے مجھے اونگھا اور کہا کہ آپ ڈراموں میں کام کریں گی تو میں نے کہا کہ مجھے گھر کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ کہنے لگے اجازت تم لے لیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بابا سے بات کی۔ بابا کو ان کی باتیں اچھی لگیں لہذا بابا نے کام کرنے کی اجازت دے دی!

کس رائٹر اور پروڈیوسر کے ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش ہے؟

کسی ایک کا نام نہیں لوں گی۔ اس طرح دونوں کا دل بڑا ہو گا اور ویسے جی میں یہ دیکھتی ہوں کہ کہانی کیا ہے۔ کہانی اچھی ہونی چاہیے خواہ کھینے والا کوئی بھی ہو!

• ویسے اس فیلڈ میں کیا کشش ہے؟

• میرے خیال میں شہرت کے علاوہ کوئی کشش نہیں ہے۔ شہرت کا نثر کسی دوسرے نئے سے کم نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک پیسے کی بات ہے تو میرے تو کہیں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو اگر اچھی جاہ مل جائے تو اچھا پیسہ کمایا جاسکتا ہے مگر شہرت تو ظاہر ہے فی وی سے ہی مل سکتی ہے!

• اب کچھ نئی زندگی کے بارے میں باتیں ہو جائیں لیکن پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ!

• میں ۹ جون ۱۹۶۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہیں اور ہماری زبان سرائیکی ہے۔ یوں تو میں نے بہت اسکول بدلے لیکن میرٹک میں نے سپر ماڈل اکیڈمی کریم آباد سے کیا۔ انٹرنگ سائنس پڑھی اور اب ٹیکنالوجی ڈیزائننگ کا کورس کر رہی ہوں۔ میں کچھ معمول رہی ہوں۔ چھٹی اور ساتویں کلاس سپر ماڈل اکیڈمی میں پڑھی اور

میرٹک ابراہیم علی بھائی اسکول سے کیا اور آج کل میں بھائی انسٹی ٹیوٹ میں ٹیکنالوجی ڈیزائننگ کا کورس کر رہی ہوں!

• انٹرنگ تمہارے سائنس پڑھی پھر لائٹن تبدیل کرنے کی کیا وجہ تھی؟

• میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں انجینئر بنوں والدین ہی کیا بلکہ سب بڑوں کی خواہش تھی کہ میں سول انجینئر بنوں۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ والدین کو بچوں کا رجحان ضرور دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اپنی مرضی نہیں تقویٰ چاہتے۔ میں نے کہا مجھے آرٹس لینا ہے۔ کہا کہ سائنس تو شکر ہے میرٹک اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ کالج میں داخلہ لیا اور ری انجینئرنگ لی۔ مجھے اس لائن سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ والدین کے دباؤ میں آکر پڑھے جارہی تھی مگر تک۔ آخر ایک دن میں نے کہہ دیا کہ میں مزید انجینئرنگ نہیں پڑھ سکتی۔ مجھے تو ٹیکنالوجی ڈیزائننگ کا شوق ہے فائن آرٹس انہیں پسند نہیں تھا لہذا اس فیلڈ کے لیے وہ راضی ہو گئے۔ اب سب مجھے کہتے ہیں کہ جب انجینئرنگ نہیں پڑھنی تھی تو کیوں لی تھی۔ کیا والدین کے ڈر سے پڑھ سہی تھیں۔ تو میں نے کہا کہ ڈرتے ان سے ہیں جن سے کوئی خطرہ ہو۔ میں والدین سے ڈرتی نہیں ہوں بلکہ مجھے تو ان کی عزت عزیز ہے اور ان کی عزت کی خاطر ہی میں نے انٹرنگ تک سائنس پڑھی۔ بچوں کا جہاں رجحان ہو اسے اسی طرف جانا چاہیے۔ اب اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کی فتنے داری میری ہی ہوگی!

• یہ بتاؤ بہن بھائی کتنے ہیں؟

• ہم تین بہنیں ہیں اور دو بھائی ہیں۔ میرا نمبر پہلا ہے!

• بچپن کیسا گزرا؟

• بہت اچھا گزرا۔ مجھے بچپن کے دن بہت یاد آتے ہیں اور میں اکثر اپنے بچپن کے دن یاد کرتی ہوں!

”تمہارا بچپن کون سا گزر گیا ہے؟“

”امی بھی یہی کہتی ہیں کہ اب تم بچپن سے باہر آ جاؤ۔ ہائے بچپن کے دن کتنے لطفے تھے۔ بچپن کے مزے یہ تھے کہ گھومتے پھرتے تھے جب دل چاہتا تھا باہر نکل جاتے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ اب فلا باہر نکل جاؤ۔ امی خدا آواز دیتی ہیں چلا اندر آؤ۔“

”شادی کے کب ارادے ہیں۔ اور ایڈیل کیا ہے؟“

”ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ ابھی مجھے پڑھنا ہے اور ایڈیل کوئی نہیں ہے۔ اور میرا خیال تو یہ ہے کہ کسی کو ایڈیل بنانے کے بجائے خود کسی کا ایڈیل بننا چاہیے۔ اور اگر ایڈیل مل بھی جائے اور وہ اگر توقعات پر پورا نہ اترے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ کسی کو آزمائے بغیر اس کے ایڈیل ہونے کا پتا نہیں چلتا۔“

”بچپن سے لگاؤ ہے؟“

”جی بالکل لگاؤ ہے اور خود میں بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔ میری امی نے اور میری دادی نے مجھے سب کچھ سکھایا ہے۔ مگر امی مجھے کچھ کرنے نہیں دیتیں لیکن جب کہیں وہ پنجاب جاتی ہیں تو میں ہی کچھ سنبھالتی ہوں۔ ان کہتی ہیں کہ اپنے گھر جا کر تو کرنا ہی ہے جب تک۔ ہمارے پاس بومیش کر لو۔“

”مزان کی کیسی ہو؟“

”بہت اچھی ہوں۔ مگر غصہ بھی آتا ہے اور ان لوگوں پر زیادہ غصہ آتا ہے جو تھوٹ بولتے ہیں۔ اول تو مجھے زیادہ غصہ نہیں آتا اور جب آتا ہے تو زبردست طریقے سے آتا ہے۔ چنانچہ یا تو میں روٹی ہوں یا پھر چیزیں توڑتی ہوں۔ اور اپنے غصے کی وجہ سے گھر والوں کا بہت نقصان کیا ہے میں نے۔ تم بتا رہی تھیں کہ تمہیں موسیقی سے لگاؤ ہے تو کس قسم کی موسیقی تمہیں پسند ہے؟“

”لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں پاپ میوزک اچھی لگتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں میوزک اچھا لگتا ہے۔“

میں کہتی ہوں کہ میوزک تو میوزک ہے جس حالت میں بھی ہوا اچھی لگتی ہے۔ ہاں اگر مجھے گلے لگے تو اس وی جانے تو پھر میں سلو میوزک گلے لگانا پسند کروں گی۔“

”گھر۔ بلو کاموں میں کون سے کاموں سے دلچسپی ہے؟“

”ایک تو گھر کی سیننگ کرنے میں مزا آتا ہے اور نئی ڈش پکانے سے دلچسپی ہے۔ نئے کھانے پکانے میں لطف آتا ہے۔“

”گھر آئے مہمان کیسے لگتے ہیں؟“

”مہمانوں کی آمد اچھی لگتی ہے۔ اگر مہمان رحمت بن کر آئیں تو بہت اچھے لگتے ہیں اور رحمت بن کر آنے والوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔“

”اس فیلڈ میں کس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے میری شدت سے خواہش ہے کہ میں انور مقصود صاحب کے ساتھ کام کروں اور خدا کا شکر ہے کہ میری خواہش پوری ہوئی۔ ڈراما اداکار میں میں نے انور مقصود کے ساتھ کام کیا ہے۔“

”کس قسم کے لوگ ناپسند ہیں؟“

”خود غرض اور خوشامد کرنے والے لوگ مجھے بالکل ناپسند ہیں۔“

”مردوں اور خواتین میں کون سی خصوصیات اچھی لگتی ہیں؟“

”مرد اگر ذوق کے اچھے لگتے ہیں۔ ذوق قسم کے مرد قطعی اچھے نہیں لگتے اور خواتین وہ اچھی لگتی ہیں جو ادھر کی بات ادھر نہ کریں۔“

”تمہاری کوئی عادت جو گھر والوں کو پسند نہ ہو؟“

”میں ہر وقت اپنی دوستوں سے فون پر باتیں کرتی رہتی ہوں اور تیز آواز میں گلے سنتی ہوں۔ بس ان دو عادتوں سے گھر والے گھبراتے ہیں۔“

”جمیرہ جلیل اس فیلڈ میں نووارد ہے مگر باصلاحیت ہے۔ جمیرہ کی صورت میں پی ٹی وی کو ایک اچھی فنکارہ مل گئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پروڈیوسر اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔“

# خبریں ویریں

ساتھ غلام نبی

بہی اس نے اپنے سامنے کی پیدا ہونے والی لڑکیوں کو شرمندہ کیا ہوا ہے۔

## کمانی

کاجول اپنی کمانی کہاں خرچ کرتی ہے کیونکہ اس کی توجہ کمپوزوں اور ڈراموں پر نہیں نظر آتی۔ اس بارے میں اس کا کہنا ہے۔

• میں کتابوں اور میوزک پر سے خرچ کرتی ہوں اور جو پیسے بچ جاتے ہیں وہ بینک میں لکھ دیتی ہوں تاکہ برسات کے دنوں میں خرچ کر سکوں۔ مجھے بارش کا موسم بہت پسند ہے۔

## آپریشن

بچلے دنوں وہم اکرم کا لندن کے ایک اسپتال میں بائیں کندھے کا آپریشن ہوا ہے۔ بہت دنوں سے ان کے کندھے میں تکلیف تھی۔ اس سیزن میں وہ بالکل بولنگ نہیں کر سکے۔ ان کے بازو کا آپریشن کروا گیا ہے۔ ان کی اہلیہ نے بتایا ہے کہ ابھی ایک اور آپریشن کیا جائے گا۔



## آلو

سونالی باندرے کو لوگ آلو کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو ہر اس فلم میکر نے سائن کر رکھا ہے جس کی فلموں کو ٹاپ کی ہیرا کمپنوں نے انکار کر دیا ہے۔ اس بارے میں سونالی کہتی ہے۔

• میں اپنے اس نئے نام کو پسند کرتی ہوں کیونکہ آلو میری پسندیدہ سبزی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ میں ڈیمانڈ میں ہوں۔

## دعویٰ

شلیا شیشی کا دعویٰ ہے کہ۔

• میں دیگر لڑکیوں کی طرح اپنی عمر کبھی نہیں چھپاؤں گی۔ بات یہ ہے کہ جب میں لوگوں کو اپنی اصل عمر بتاتی ہوں تو لوگ یقین نہیں کرتے۔ میرا لمبا قد اور چہرہ بلا بدن مجھے بڑی عمر سے بڑا ظاہر کرتا ہے۔ ویسے اس حوالے سے میں ریگیا پر رشک کرتی ہوں۔ آج

## ذتے داری

سیف علی خان کہتا ہے -

مجھے احساس ہے کہ لوگ مجھ سے میری ماں جیسی اداکاری کی توقع رکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لوگوں نے میری فلم "عاشق آوارہ" کو پسند کیا۔ شاوی نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب مجھے بجلی اور گیس کے بلوں سے آگاہ ہونا پڑتا ہے۔ ذتے داری پڑتی ہے تو انسان خود ہی بدل جاتا ہے۔ میری ازدواجی زندگی بے مدستہ ہے۔ ہم لوگ اکثر کبھی کھانا کھانے اور کبھی سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں۔ خادی ذرا مشکل تو ہے مگر لوگ تو حیرتیں تو ساری زندگی کا لطف اس میں موجود ہے۔ امرتا ضرورت سے زیادہ مٹھ پھٹ اور زبان دراز واقع ہوتی تھی لیکن میرے کہے بغیر اس نے اپنے آپ پر قابو نہ لیا ہے۔ خادی سے قبل صرف ایک لڑکی کے ساتھ میری جذباتی وابستگی ہوئی تھی لیکن طویل فاصلوں کی وجہ سے یہ ملن کامیاب نہ ہو سکا۔

## آئیڈیل

شاہد آفریدی آج کل سب کے آئیڈیل ہیں۔ وہ اپنے آئیڈیل کے بارے میں کہتے ہیں -



## سوشل سٹار

معین خان اپنے ریکارڈ بنانے کے بارے میں

کہتے ہیں -

"ریکارڈ بنانے پر گھر والے تجھے تحائف تو نہیں دیتے لیکن مبارکباد ضرور دیتے ہیں۔ جب کوئی کارنامہ سرانجام دے کر گھر پہنچتے ہیں تو سب گھر والے مبارکبادیں دیتے ہیں۔ جب میں نے ون ڈے کرکٹ میں کم پچوں میں سوشل سٹار کے کاؤنڈر ریکارڈ برابر کیا، اس بارے میں بھی مجھے گھر آکر بتایا کہ میں نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جب میں گھر آیا تو میری والدہ نے بتایا کہ تم نے ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اس ون گھر والے میری کئی پسندیدہ ڈشیں بناتے ہیں۔"

## عصیب کی حسین

اگر ہاں اور ماہ نیشا کو نزار پر مر  
منا ہے۔ یہاں میں امور ہر حسین لڑکی ہر مر مٹتا ہے۔  
کہا جاتا ہے کہ ماہ اور نیشا افسر اس وقت چلا  
جب کلیم ۱۰ کی شرننگ ہو رہی تھی۔ ایک اتفاقیہ  
ملاقات نے کام کر دکھایا۔ رامو نے یہ بھی بتایا کہ اس  
ملاقات کے بعد ہی اس نے اس کی چند فلمیں دیکھیں  
اور یہ بھی اعتراف کیا کہ نیشا عصب کی حسین لڑکی  
ہے۔ یہاں میں ہوا وہاں رامو ہوتا ہے دل و جان سے۔  
اس سلسلے میں رام گریال ورما کہتا ہے۔

آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ میں ہر  
خوبصورت لڑکی کا دلوانہ ہوں مجھے تو سب سے دل کا کرک  
جسم بھی اچھا لگتا ہے۔ میں نے اسے کہہ سکی کہ  
دیکھا ہے۔ وہ بہت زبردست لگتا ہے۔

## پہلی نظر

ماہ صوری کا گناہ ہے کہ اسے پہلی نظر میں متاثر  
کر سکتا ہے۔ اس میں گریوری پیک جیسا ہارم، سلویٹر  
اسٹیلون جیسا مضبوط جسم اور کینی باجر جیسی مضبوط آواز  
ہوتی چلیے۔ بس صرف اتنا ہی کافی ہے کیونکہ میں اسے  
ڈھونڈ چکی ہوں۔



جب میں نے کرکٹ کیلئے شروع کی تو اس وقت  
عمران خان میرے آئیڈیل کرکٹر تھے۔ ہر لحاظ سے وہ مجھے  
پسند تھے۔ جو وہ دور دورے کھلاڑیوں میں چار کھلاڑی ایسے  
ہیں جن کو بیشنگ کرتے دیکھنا میں بہت پسند کرتا ہوں  
خصوصاً ون ڈے کرکٹ میں یہ چار کھلاڑی پنچن ٹنڈو کرک  
مارک وائبرٹن لارا اور سعید انور ہیں۔

## کام کرنے کی عادت

جاوید میاں نادر اپنے بچپن کے بارے میں کہتے ہیں۔  
"یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انسان جو چاہے کر سکتا  
ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں کرتا مجھے بچپن سے  
ہی لوگوں کے کام کرنے کی عادت تھی۔ مجھے کے لوگوں  
کے گھروں کے کام تک کر دیا کرتا تھا۔ کسی کو سبزی دکان  
سے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے مجھے کہا اور میں نے  
بھاگ کر سبزی لا دی۔ کسی کو پان کی ضرورت ہے۔ میں  
نے فنانٹ اسے پان لا دیا۔ اس طرح سب کچھ میں اپنے  
لوگوں کے کام کرنے کے لیے مشہور تھا۔ لوگ مجھے پیار  
بھی بہت کرتے تھے اور دعا میں بھی دیتے تھے۔"

ہیں یا بھڑ بول دیتے ہیں۔ پوچھا بھٹ کو فون کریں تو اس کی جواب دینے والی مشین تامل زبان میں ایک لمبی سی گالی دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے ایک بڑی رقم کا نقصان کر لیا۔ اس کی تو مجھے پروا نہیں، میں نے طے کر لیا ہے کہ میں کسی بھی قیمت پر وہ ساڑھی واپس لے کر رہوں گی!

### ایوارڈ یافتہ

جس طرح شبانہ اعظمی دنیا بھر کے ایوارڈ وصول کر رہی ہے تو اس کا شوہر جاوید اختر بھی اس سے بچے نہیں ہے۔ جاوید ایک لڑکی کو دیکھا۔ اسے شہرت کی بلندیوں پر موجود ہے۔ اوداب اسے ایک پاکستانی فلم پچا گھر کے گانے تحریر کرنے کے لیے سائن کر لیا ہے۔ اس فلم میں شبانہ کے مقابلہ میں کام کریں گے۔ اور اس کی شوٹنگ پاکستان، بھارت، سری لنکا اور دبئی میں ہوگی۔ اس کا اسکرپٹ گلزار نے لکھا ہے۔



### ساڑھی کی واپسی

ماضی کی اداکارہ نادرہ کہتی ہے۔

گزشتہ دنوں میں نے اپنی سب سے زیادہ خوبصورت ساڑھی تمنا کے لیے دے دی۔ جس کی پروڈیوسر پوچھا بھٹ اور ڈائریکٹر اس کا باپ ہمیش بھٹ تھا۔ فلم اب مکمل ہو کر ریلیز بھی ہو چکی ہے۔ اب کوئی بھی نہیں جانتا کہ میری سب سے زیادہ پسندیدہ ساڑھی اس وقت کہاں ہے۔ ہمیش بھٹ سے لے کر اس کا پورا خاندان اور لیٹ والے بھی نہیں۔ یا تو وہ ملتے ہی



READING  
Section

# میری خاصیت

شہرت زدی شاہ \_\_\_\_\_ کراچی  
وہ بارش میں بھیگنا وہ ڈھونڈ لینے کی خواہش!  
وہ ہاتھ ہاتھوں میں ڈالتا وہ پینے سارے کدھر گئے  
کبھی چھینا پیر کی آڑ میں کسی کے ڈھونڈ لینے کی طلب  
نہ پلٹ کے آئیں گے کبھی کہ وہ کارواں گزر گئے  
\_\_\_\_\_ میاں والی

بہت بلند متے انا کے بعد کے پہاڑ بھی  
میں بار بار آ کے تیر کی رام سے پلٹ گیا  
\_\_\_\_\_ کورٹلی بخت  
چینے۔ رو پینے  
آنکھوں میں کچھ خواب سجے ہیں رات گئے  
میرے گھر میں پھول کھلے ہیں رات گئے  
جاننے سے کر نل پھول سے نرم لمحوں میں  
آس کو میں نے خط لکھے ہیں رات گئے

فرزادہ ہیل \_\_\_\_\_ ساں چنوں  
محبت سے جو خالی ہوں وہ گھر چھے نہیں لگتے  
مکان اچھے نہیں لگتے، بشر اچھے نہیں لگتے  
وہ پورے جن کی سنی میں جڑیں گہری نہیں ہوتیں  
ان پیڑوں پہ میری جاں مٹا چھے نہیں لگتے

شاپانہ بتورق \_\_\_\_\_ خان پور  
وقت کی آنج پہ پتھر بھی پگھل جاتے ہیں  
تہقے ٹوٹ کے آنسوؤں میں بکھر جاتے ہیں  
کون کسی کو یاد رکھتا ہے عمر بھر کے لیے  
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

کے ارم \_\_\_\_\_ ڈی جی خان  
مہنت کدوں ہوا کے پتھر ڈول کو سینے پہ روکا مگر  
اگے جانے کہاں تک چلے سلسلہ زندگی تھک گئی  
تیر کی کے پروں سے اڑے اور تم چوہوں پر گئے  
چہچہے اک بار تو مڑ کے دیکھو ولا زندگی تھک گئی

نجمہ یاسمین بختی \_\_\_\_\_ اداکارہ  
تو کہ سنا تو رنگ دجاں کی حدوں میں سمٹا  
میں کہ بکھرا تو سنا نہ گیا تیرے بعد  
یہ انگ بات کا فشا نہ ہوا تجھ پہ ورنہ  
کتنا محسوس کیا میں نے تجھے تیرے بعد  
\_\_\_\_\_ حویلی بگال

زمیدہ کنول \_\_\_\_\_  
تمام عمر جیسے اور کچھ نہ کر پلٹے!  
کسی کے ہو کے رہے اور نہ اپنا کر پائے  
زمانہ اس کے حوالے سے یاد کرتا ہے  
کہ جس سے اپنے تارے کبھی نہ مل پلٹے  
\_\_\_\_\_ کپور والی

عمرانہ بتول \_\_\_\_\_  
اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
وگھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد میں  
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
\_\_\_\_\_ ملتان

عظمنی بتول \_\_\_\_\_  
تم ترک تعلق کا کسی سے ذکر نہ کرنا  
میں لوگوں سے کہہ دوں گا فرمت نہیں ملتی  
\_\_\_\_\_ جتوئی

غزالہ ذکی \_\_\_\_\_  
اس میں شامل ہے میرے بخت کی تاریکی بھی  
تم سیاہ رنگ جو پہنو گے تو یاد آؤں گا  
اب تو ریا شک میں ہونٹوں سے خراپتیا ہوں  
ہاتھ سے خود انہیں پور چھو گے تو یاد آؤں گا

ساجدہ زید \_\_\_\_\_ ویروالی  
شدید دکھ تھا اگرچہ تیری جدائی کا  
سوا ہے رنج ہیں تیری بے وفائی کا  
\_\_\_\_\_ حال کو چھو آئے  
بہ نارسائی کا



نوریدہ قدیر نندا  
اسلام آباد  
ہمارے بعد چلی رسم دوستی کہ نہیں  
ہوا کی زد پر کوئی شمع پھر جلی کہ نہیں  
دیار ہجرت سے آئے ہو کچھ گہو محسن  
کہ شام غم بھی کسی موڑ پہ ملی کہ نہیں  
صائمہ نذیر  
تم لاکھ چھٹاؤ جہرے سے احساس ہماری چاہت کا  
دل جب بھی تمہارا دھڑکا ہے اولاد یہاں تک آئی ہے  
بلیتیس فاطمہ  
کیروالا

کتنا و نشین سا لگتا ہے  
بے ارادہ تجھے دکھی کرنا  
کتنا مشکل ہے اُنکے لیے  
سارے ماحول کی نفی کرنا

مہمیدہ  
دل کی بات لبوں پر لاکر اب تک ہم دکھہ ہستے ہیں  
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل دلوے بھی رہتے ہیں  
بست گیا سادوں کا مہینہ موسم نے نظر میں بدلیں  
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو ہستے ہیں  
مس ناز گل  
حیدرآباد

پیر کے سائے میں بٹھا ہوں مگر جانتا ہوں  
شاخ سے ٹوٹتے پتے کا جدا ہو جانا  
نر جس خاتون  
پچھرا کچھ اس اداسے کہ رت ہی بدل گئی  
انگٹھن سارے شہر کو ویران کر گیا  
نوشین کرن خان  
گجرات

وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا بتاؤ کیسا لگا  
تم اگلے زخم کو چھوڑو ایہ گھاؤ کیسا لگا  
عجب سوال کیا آنکھوں سے بچوں سے  
شجر سے ٹوٹ کے گرنا بتاؤ کیسا لگا  
فوزیہ شکر  
گجرات

اس دل کے چندا تاتوں میں اک موسم ہے برساتوں کا  
اک صحرا صحرا ہجر کی باتوں کا اک جنگل وصل کے خوابوں کا  
اُس چوڑھویں رات کے سامنے میں جب آخری بار ملے تھے ہم  
یہ دل پاگل کب بھولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا

عمرانہ اسحاق  
فیصل آباد  
وہ کون لوگ تھے اُن کا پتا تو کرنا  
میرے لبوں میں نہا کر جنہیں نکھرنا تھا

سمیرا الطیف  
سکھ تھکے ہارے پرندوں نے نصیحت کی مجھے  
شام ڈھل جانے تو محسن تم بھی گھر جایا کرو  
عرفانہ خواجہ  
جتوئی

ہم فرہاد نہ تھے پر محسن اُس کو راہ پر لائے ہیں  
ہم نے اُس کے پتھر دل سے پیاز کی ہنر نکالی ہے  
عالیہ تقویر رفتی  
سرگودھا  
عمر ساری راہ کے پتھر ہٹاتے کٹ گئی  
زخم میرے ہاتھ میں اک سنی لامامل کے ہیں  
زخمی گل  
لغاری

جل اُٹھتے ہیں یادوں کی منڈیروں پر شام  
جو خواب بچا لایا تھا جلتے ہوئے گھر سے

شاہدہ عزیز نسیم  
میسرو ڈاسندہ  
جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کبہ و دیکھل ان سے  
جو دامن پر نہیں گرتا وہ آنسو دل پر گرتا ہے  
ثمینہ اصغر  
گکھنڈی

ہم ایسے سادہ لوگوں کو ازل سے ایک عادت ہے  
ہم اسے گھر سے بڑھ کر دل میں وسعت مانگ لیتے ہیں  
ہمیں تو علم رکھتے ہیں ہمیشہ اپنے ہارے میں  
وہ ہم سے ساری باتوں کی وضاحت مانگ لیتے ہیں  
ریحانہ علی  
کلور کوٹ

موسم کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں اس کے عہد  
اس پر یہ ضد کہ اس پر کرو اعتبار بھی  
باہر سے مٹھن تھا کھلی جھیل کی طرح  
لیکن وہ اپنی تہ میں رہا ہے قرار بھی  
سعیدہ حسن  
گھارو

اس دفعہ تو بارشیں رکتی نہیں ہیں دو دستوں  
ہم نے کیا آنسو پیے کہ سال کے موسم رو پڑے  
اسامہ انصاری  
ملتان

دو چار دن اور ہے خوابوں کا سلسلہ  
پھر حشر تک رہے گا غدا بوں کا سلسلہ

# خواتین کے مسائل

مجموعہ بابر فیصل نے یہ سگفتہ سلسلہ ۱۹۷۷ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں اپریل ۱۹۸۲ء کے شمارے کے سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



خالدہ رفیق \_\_\_\_\_ سہ ماہی  
س۔ نین جی: یہ والدین ہمارے پیار میں دیوار کیوں بن جاتے ہیں؟

ج۔ اس لیے کہ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔  
س۔ نین جی: اگر میرے والدین میری شادی میری پسند سے نہ کریں تو میں کیا کروں، خودکشی؟  
ج۔ میری ماں تو ابھی جلدی سے کر لو، کیونکہ تمہارے والدین تمہاری شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔  
نوزیدہ رول \_\_\_\_\_ ڈیرہ اسماعیل خان

س۔ کیا اب بھی عورت کو نازک چیزوں سے تعبیر دینا مناسب ہے۔ اس دور میں تو عورت مرد سے بھی دو ہاتھ اٹگے نکل گئی ہے۔  
ج۔ کتنے ہاتھ؟

ریحانہ غلام حسین \_\_\_\_\_ گلگت ٹھنڈی

س۔ اے پرنس، الکل، رات خوب میں میں نے آپ کو گدھے کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا اور آپ کہہ رہے تھے کہ میں اس لیے خواتین کی فعل میں نہیں شکل دکھانا کہیں وہ مجھے گدھانہ سمجھیں؟  
ج۔ پھر پتا ہے کیا ہوا، گدھے نے دو ٹی کرٹے کے ایکٹن میں اٹھان اور مجھے جھوکار ہٹا پڑا۔

شناز پروین باسٹی \_\_\_\_\_ کراچی  
س۔ جیتا: اگر کسی شمارے میں سب بہنیں آپ نے ایک ہی طرح کے سوال کریں تو آپ کیا کریں گے؟

ج۔ ویسے ہی نہ ہنٹے۔ پتہ ایس دن تو مسلسل

پیش کے اپنا سر۔

راشدہ حاکم علی \_\_\_\_\_ ماٹلی

س۔ کبھی آپ کی ملاقات ابلیس سے ہوئی؟  
ج۔ کبھی سے کیا مراد؟ کب نہیں ہوتی۔ رات رات بھر شرطیج کی بازی جی رہتی ہے۔

فرحت حاکم علی \_\_\_\_\_ ماٹلی

س۔ لوگوں کو آپ کی آنکھیں پسند ہیں جبکہ مجھے تو آپ کی ناک بہت پسند ہے، آخر کیا وجہ ہے؟

ج۔ ہر وقت بہتی جو رہتی ہے۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety](https://twitter.com/paksociety)

لال پوری \_\_\_\_\_ جبلم  
 س۔ میاں ہوی سیر کو جائیں تو پیر سے اٹھانا چاہیے  
 ج۔ اسے لال پوری۔ ذرا ہوش کے ناخن لو۔ میاں ہوی  
 سیر کو جا رہے ہیں، بجیہ اٹھانے نہیں۔  
 کو شربلتیس \_\_\_\_\_ بہاول نگر  
 س۔ میری سہیل آپ کو خط لکھتے وقت پتا نہیں کیوں  
 شرمائی ہے کئی ہے۔۔۔۔۔  
 ج۔ اس لیے کہ وہ بے چاری ان پرٹھ ہے۔  
 سیدہ افسانہ انجم افشانی \_\_\_\_\_ املیہ کالونی  
 س۔ میں نے دیکھا دو خواتین ایک جگہ بالکل خاموش  
 بیٹھی تھیں جھلا کیوں؟  
 ج۔ دونوں ایک خاوند کی بیوی تھیں۔  
 فرزانہ انور بھٹی \_\_\_\_\_ لاہور  
 س۔ ویسے راز کی بات ہے۔ آپ اس مغل میں بیچ  
 نہیں رہے۔ ذوق بھیا کو واپس بیچ دیں۔ ایک  
 فریادی کی فریاد۔  
 ج۔ تمہاری فریاد سن لی گئی ہے۔ فریادی کا ٹھکانہ  
 آگے پوچھ لو۔  
 عارفہ بیٹ \_\_\_\_\_ سیالکوٹ  
 س۔ سنتوا اب تم آئے ہو تو ذرا سیالکوٹ کے لوگوں  
 کا خاص خیال رکھنا۔ یہ زمین نے تو ہم کو بیت  
 تنگ کیا ہے۔ امید ہے تم ایسا نہیں کرو گے؟  
 ج۔ میں نے پڑھ لیا۔ اور کرو برائیاں تیری۔ وہ  
 دکان اپنی بڑھا گئے جن سے ہو رہی ہیں برائیاں  
 میری۔  
 نسreen کنول \_\_\_\_\_ کراچی  
 س۔ اگر آپ کو پاگل خانے کا پتہ چارج بنا دیا جائے تو  
 ج۔ امید ہے تم پہلے فارغ ہو جاؤ گی؟  
 فرزانہ گل \_\_\_\_\_ حیدرآباد  
 س۔ قمری جی بسنا ہے، تیری مغل میں آج رات جگا  
 ہے؟  
 ج۔ صرف آج؟  
 عمرانہ رشید \_\_\_\_\_ کراچی  
 س۔ کیوں بھی پیار سے گوگلو کیا حال چال ہیں؟

ج۔ گوگلو اب ٹھیک ہے۔ چوٹی کی جگہ منہ میں مگرٹ  
 یعنی شروع کر دی ہے۔  
 راحت افزا نگینت \_\_\_\_\_ ڈیرہ غازی خان  
 س۔ جب شادی ہوئی ہے لڑکی کے ہاتھ پہلے کرتے  
 ہیں۔ لڑکے کا کیا کرتے ہیں؟  
 ج۔ بیڑا غرق۔  
 فوزیہ رولی \_\_\_\_\_ ڈیرہ اسماعیل خان  
 س۔ اپنی نقویر میں لوگ کون کون سے درکشاپ کے چھوٹے  
 لگ رہے ہوتے مگر تم کسی درکشاپ کے چھوٹے  
 ج۔ درست کہا ملکہ؟  
 پانے کے نمبر بھی زورکشاپ کے چھوٹوں کے  
 نمبر تھے۔ وہ نہیں بتائے۔  
 رخشندہ اینڈ بچہ محمد \_\_\_\_\_ لیاقت آباد  
 س۔ شعر کا جواب شعر کے۔  
 تیرے انداز تم کو کسے۔  
 تیری فطرت نہ کہ بدل دوں کو تیرا نام نہیں  
 ج۔ ماں داوے آسے کب کا نام کیا ہے؟  
 فرزانہ گوٹل فری \_\_\_\_\_ روبری سندھ  
 س۔ باادب با ملاحظہ کلمہ ہو شیار کہ مابدولت کی سواری  
 آپ کے جگمگاتے شہر میں آ رہی ہے۔ کیوں ڈر  
 گئے تیرے؟  
 ج۔ جی بی روبری سے کراچی آنے کا آپ نے اپنی  
 سواری کا کیا کلام کر دیا بھلا؟  
 روحی خانم چوہدری \_\_\_\_\_ ایٹ آباد  
 س۔ بھئی یہ خواتین کی آپ کو انکل کیوں کہتی ہیں جبکہ  
 خواتین ڈائجسٹ کی کامطالعہ کرنے والی چھوٹی تو نہیں  
 ہوتیں؟  
 ج۔ انہیں میری عمر کا صحیح اندازہ ہے۔  
 قمری زیدی \_\_\_\_\_ پلیرٹی  
 س۔ آپ اتنے دن کب کہاں تھے؟  
 ج۔ ہم سو رہے تھے۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ اماں  
 مار رہی تھیں؟

